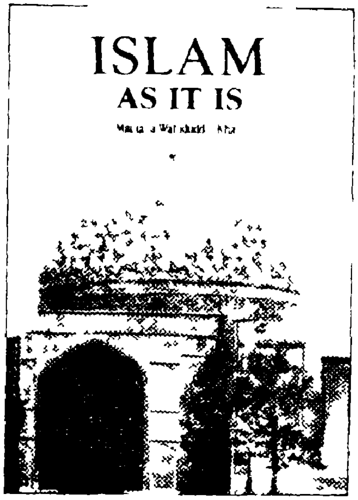
الرسالہ

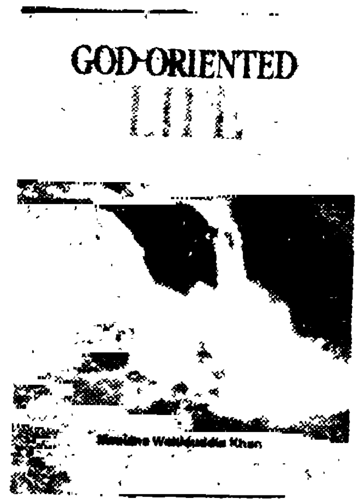
زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

حقیقت اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے
حقیقت کو اگر آپ عزت کے ساتھ نہ مانیں
تو آپ کو اسے ذلت کے ساتھ ماننا پڑے گا

فروری ۱۹۹۳ شمارہ ۱۹۵

Rs. 6





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs 40

In *Islam As It Is* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam

Simple and straightforward in style *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religon of submission to God

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs 60

he traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad upon whom e peace, and the lives of his companions and those closely asociated with them serve as a major source of religious enlightenent in theory and in practice This book endeavours to present iese ideas in the simplest and most direct way In that it culls from uthentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those spired by him it brings to us a complete and above all human cture of true Islamic behaviour

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

SV02

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۲ ، شمارہ ۱۹۵

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013
Telephone : 697333, 611128
Fax : 91-11-3312601 (Attn : Tel. 697333)

روزہ کا فائدہ

جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو شیاطین کو باندھ دیا جاتا ہے اور خدا کی رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں (سُلسِلَتِ الشیاطین و فُتِحت ابوابُ الرحمۃ)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب امتوں میں سے کوئی امت روزہ کا التزام کرتی ہے تو اس کے شیطانوں کو بیڑیوں میں باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور آگ کے دروازے اس کے اوپر بند کر دیے جاتے ہیں (واذا التزمتہ امۃ من الامم سُلسلت شیاطینھا وفتحت ابواب جنانھا وغلقت ابواب النیران عنھا) حجۃ اللہ البالغہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسانوں میں بھی ہوتے ہیں اور جنات میں بھی (الانعام ۲) حدیث کے مطابق، روزہ ان دونوں ہی قسم کے شیطانوں سے نجات دینے والا ہے۔ جو قوم حقیقی طور پر روزہ کے اوپر قائم ہو جائے وہ ان دونوں ہی قسم کے شیطانوں سے محفوظ ہو جائے گی

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کے شیاطین کے لیے انسان کے اوپر قابو پانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ خود انسان کا اپنا نفس ہے، شیاطینِ جن لوگوں کے نفس کو خواہشوں کے فریب میں مبتلا کر کے ان کے اوپر قابو پاتے ہیں اور پھر جدھر چاہتے ہیں ان کو ادھر لے جاتے ہیں۔

شیاطینِ انس کے لیے بھی انسان کے اوپر قابو پانے کا راستہ یہی ہے، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے انسان کا نفس بھڑک اٹھے۔ اور جب انسان کا نفس بھڑک اٹھتا ہے تو وہ اپنی عقل کھو دیتا ہے۔ اور پھر شیاطینِ انس کو موقع مل جاتا ہے کہ جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں

روزہ آدمی کے نفس کو زیر کرتا ہے۔ وہ آدمی کے حیوانی جذبات کو گھٹاتا ہے اور اس کے ملکوتی جذبات کو ابھارتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی خواہشوں کا شکار نہ ہو۔ وہ اشتعال انگیز باتوں پر بھڑک کر قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ اس طرح روزہ شیاطینِ جن اور شیاطینِ انس دونوں کو گویا اس طرح زنجیروں میں باندھ دیتا ہے کہ وہ انسان کے اوپر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

الرسالہ فروری ۱۹۹۳

خیل نہیں خیر

زید بن مُہَلہِل نجد میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ وہ زید الخیل کہے جانے لگے۔ خیل عربی زبان میں گھوڑے نیز گھوڑے سوار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے اسلام سے پہلے فارس (شہ سوار) اور شمشیر زنی کی تعریف پر ایک پر جوش نظم کہی تھی۔ اس میں وہ اپنے قبیلہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ میری قوم لوگوں کی سردار ہے۔ اور سرداری اس وقت قائد بنتا ہے جب کہ شعلہ بار ہتھیلیوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا ہو :

وقومي رؤوسُ الناسِ والرأسُ قائدٌ إذا الحربُ شبَّتْها الأكفُّ المساعِرُ

زید الخیل ہجرت کے بعد مدینہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیل کا نام پسند نہیں کیا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر زید الخیر رکھ دیا۔ ۹ ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔

اس واقعہ سے اسلام کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو "زید شہ سوار" بنانا نہیں ہے بلکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی "زید صاحب خیر" بنے۔ قدیم عرب میں گھوڑا دوڑانا اور تلوار کا کمال دکھانا ہیروانہ کام سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام نے ان کے جذبات کو موڑا۔ اور ان کو یہ ذہن دیا کہ وہ خیر کے حامل بنیں، وہ خیر کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ وہ لوگوں کو موت کا تحفہ نہ دیں بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا تحفہ دینے کی کوشش کریں۔

آجکل کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اسلام کا مقصد تخلیقی (creative) انسان پیدا کرنا ہے۔ اللہ پر ایمان آدمی کے اندر تخلیقی اوصاف کو جگا دیتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ عام سوچ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس کا کردار دوسرے لوگوں کے کردار سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ زمین میں رہتے ہوئے ایک آسمانی انسان بن جاتا ہے۔

مومن کا کام زید الخیل بننا نہیں بلکہ زید الخیر بننا ہے۔ یہی مومنانہ شخصیت کا خلاصہ ہے۔

ایک میدان

ونگ کمانڈر محمد یوسف خان (پیدائش ۱۹۴۳) پروفیشن کے اعتبار سے پائلٹ ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ انھیں صحافت کا ذوق بھی ہے۔ اور وہ انگریزی اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے انگریزی مضامین یہاں کے قومی روزناموں میں چھپتے رہے ہیں۔ ۲ دسمبر ۱۹۹۲ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ کئی سبق آموز واقعات ان کی زبانی معلوم ہوئے۔

آج کل وہ انڈین مٹل کمپنی (Indian Metal & Ferro Alloys Ltd.) میں سینیر پائلٹ ہیں۔ اس کمپنی کا ہیڈ آفس بھوبنیشور (اڑیسہ) میں ہے۔ حال میں ان کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپا۔ یہ مضمون بچوں کی تعلیم کے بارہ میں تھا اور اس کا عنوان یہ تھا کہ کیا آپ انھیں ٹیچروں پر چھوڑ دیں گے:

Can you leave them to the teachers?

ایک اور مضمون دہلی کے پانیر (۴ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپا۔ یہ ٹورزم (سیاحت) کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا: ایک ہفتہ اڑیسہ میں (A week in Orissa)

کمپنی والوں کے علم میں یہ مضامین آئے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کمپنی کے ذمہ داروں نے ان مضامین کو اپنے دفتر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیا۔ اور ان کی فوٹو کاپی کرکے انھیں اپنی مختلف شاخوں کے نام روانہ کیا۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد کمپنی کے حلقوں میں یوسف خان صاحب کی عزت و وقعت بڑھ گئی۔ کمپنی میں ہیومن ریسورس ڈولپمنٹ کے جنرل مینجر مسٹر پاشینے نے کہا کہ ہم کو فخر ہے کہ آپ اخبارات میں لکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام کارکن یہ جانیں کہ ہمارے یہاں اس صلاحیت کا ایک شخص ہے جو قومی روزناموں میں لکھتا ہے:

We are proud that you write for the news papers. We would like all our employees to know that we have a person of this calibre who writes for the national dailies. (Mr Pashine, General Manager, Human Resource Development)

اگر آپ لوگوں کے درمیان عزت چاہتے ہیں تو لوگوں کے کام آئیے حتیٰ کہ ان کے لیے فخر بن جائیے۔

الرسالہ فروری ۱۹۹۳

سبب کیا ہے

بارسلونا (اسپین) میں جولائی۔ اگست ۱۹۹۲ کے درمیان اولمپکس کے مقابلے ہوئے۔ اس میں ۱۷۱ ملکوں نے حصہ لیا۔ ان میں سے ۶۴ ملکوں نے مختلف کھیلوں میں اعلیٰ کارکردگی دکھا کر تمغے حاصل کیے۔

ہندستان جو ۸۶ کرور افراد کا ملک ہے وہ ایک بھی تمغہ حاصل نہ کر سکا۔ نہ گولڈ میں نہ سلور میں نہ برانز میں۔ حتیٰ کہ تیر اندازی جو بھارت کی روایات میں شامل ہے اس میں بھی دوسرے ملکوں کے لوگ آگے نکل گئے۔ ۶۴ جیتنے والے ملکوں کی فہرست میں ابتدائی دس ملکوں کے نام بالترتیب یہ ہیں ——— سی آئی ایس، امریکہ، جرمنی، چین، اسپین، ہنگری، ساؤتھ کوریا، کیوبا، فرانس، آسٹریلیا۔

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے۔ جو لوگ بیرونی دنیا کا سفر کرتے ہیں یا جن کی عالمی حالات پر نظر ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بین اقوامی سطح پر آج ہندستان کی کوئی اہمیت نہیں۔ مثلاً بڑے صنعتی ممالک کی فہرست میں ہندستان کا نام آخری سطروں میں بھی نہیں ملتا۔ جدید سائنسی ریسرچ میں ہندستان سرے سے قابل تذکرہ نہیں سمجھا جاتا۔ ہندستان کے تعلیمی ادارے اپنے معیار کے اعتبار سے سب سے کمتر ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس پچھڑے پن کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف ایک مبصر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ——— لوگوں کے دماغ ناقابل لحاظ چیزوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ وہ وقت کے اصل قابل لحاظ مسائل کی طرف متوجہ نہیں :

Men's minds are lost in trivialities, and not attune to the challenging issues of the time.

خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ، اس دنیا میں اعلیٰ ترقی کا صرف ایک ہی راز ہے۔ اور وہ یہ کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کیا جائے، اور صرف ان باتوں پر سارا دھیان لگایا جائے جو مستقبل کو بنانے یا بگاڑنے میں حقیقی طور پر موثر ہوتی ہیں۔ ہندستان کے لوگ اس فرق کو نہیں جانتے، اسی لیے نصف صدی کے ہنگاموں کے باوجود وہ کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکے۔

غصہ کا انجام

دہلی میں قرول باغ کے علاقہ میں اجمل خاں روڈ ہے۔ یہاں ایک ساتھ جوتے کی دو دکانیں تھیں۔ ایک دکان کے مالک کا نام سریندر کمار (۲۵ سال) ہے اور دوسری دکان کے مالک کا نام بلراج اروڑا (۴۵ سال)۔ ایک ہفتہ پہلے سریندر کمار کی دکان سے ایک شخص نے ایک جوڑا جوتا خریدا۔ دکاندار نے اس کی قیمت ۱۸۰ روپے حاصل کی۔ گاہک باہر نکلا تو دوسرے دکاندار بلراج اروڑا نے اس کو آواز دے کر بلایا۔ اس کا جوتا دیکھ کر پوچھا کہ اس کو تم نے کتنی قیمت میں خریدا۔ اس نے بتایا کہ ۱۸۰ روپے میں۔ بلراج اروڑا نے اسی قسم کا جوتا اپنی دکان سے نکال کر دکھایا اور کہا کہ دیکھو، یہ وہی جوتا ہے اور یہ میں تم کو صرف ۱۲۵ روپے میں دے سکتا ہوں (دی پاینیر ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۲)

گاہک غصہ ہو گیا۔ وہ جوتا لے کر دوبارہ سریندر کمار کے یہاں آیا اور کہا کہ تم نے قیمت زیادہ لی ہے۔ مجھ کو ۵۴ روپے واپس کرو۔ اس پر سریندر کمار بگڑ گیا۔ اور پڑوس کی دکان پر جا کر بلراج اروڑا کو ڈانٹنے لگا۔ کچھ لوگوں نے درمیان میں پڑ کر فوری طور پر دونوں کو اپنی اپنی دکان میں واپس بھیج دیا۔ مگر غصہ بدستور باقی رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲ کو سریندر کمار نے بلراج اروڑا سے تیز تیز باتیں کیں، اور آخر کار جیب سے ریوالور (.32 bore Smith and Wesson) نکالا اور ایک کے بعد ایک چھ گولیاں اس کے اوپر خالی کر دیں۔ بلراج اروڑا کو فوراً لوہیا اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کو مردہ قرار دیا۔

اب قاتل کا معاملہ عدالت میں ہے۔ اب یا تو مقتول کی طرح قاتل کو بھی پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ یا قاتل لاکھوں روپیہ خرچ کر کے مقدمہ کو اپنے موافق بنائے اور عدالت سے رہائی کا فیصلہ حاصل کر لے۔ ایک صورت اگر قاتل کے لیے جسمانی موت ہے تو دوسری صورت اس کے لیے مالی موت۔

قاتل اگر غصہ اور انتقام سے مغلوب نہ ہوتا تو بہت آسانی کے ساتھ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ وہ مذکورہ گاہک کو ۵۴ روپیہ ادا کر کے اسے رخصت کر دے اور پھر جہاں تک پڑوسی دکاندار کا مسئلہ ہے، اس کو تجارتی انداز میں حل کرنے کی کوشش کرے۔

اعتراض برائے اعتراض

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ایک سمپوزیم تھا۔ اس کا موضوع تھا: مذہب فرقہ پرستی کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خود خدا کی تخلیق اسکیم کے تحت اس دنیا میں آزادانہ مسابقت جاری ہے۔ اسی مسابقت کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ بار بار ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف اور ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عین فطری ہے اور وہ ہمیشہ اس دنیا میں باقی رہے گی۔ ایسی حالت میں پُرامن زندگی گزارنے کی تدبیر صرف ایک ہے، اور وہ اعراض ہے۔ یعنی زندگی کی سرگرمیوں میں جب بھی ایسا ہو کہ ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کا اندیشہ پیدا ہو تو وہاں اعراض کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اس طرح عملی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئے گی اور ہر ایک کے لیے محفوظ طور پر اپنی زندگی کی تعمیر ممکن ہو جائیگی۔

اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ آپ نے سڑکوں پر دیکھا ہو گا کہ جگہ جگہ اس مضمون کا بورڈ لگا رہتا ہے کہ فاصلہ پر رہو (keep distance) اس ٹرافک اصول کو اختیار کرنے کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ سڑک پر بیک وقت بہت سی سواریاں دوڑیں، پھر بھی ان کے درمیان حادثہ کے واقعات پیش نہ آئیں۔ اسی اصول کو ہمیں عام زندگی میں بھی اختیار کرنا ہے۔

تقریر کے خاتمہ پر سوال و جواب کا وقفہ تھا۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے "فاصلہ پر رہو" کے جس اصول کی تلقین کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں الگ الگ خانوں میں بٹ جائیں اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ ایسا کرنے کے بعد تو ہندستان میں ہمارے مسائل اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔

میں نے کہا کہ "فاصلہ پر رہو" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الگ الگ زندگی گزارو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نزاع کی صورت پیش آنے پر ٹکراؤ سے بچو۔ سڑک پر اس مضمون کے بورڈ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اپنی گاڑیاں گھروں پر کھڑی رکھیں، وہ ان کو سڑک پر نہ چلائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ چلتے ہوئے جب کبھی ٹکراؤ کا اندیشہ ہو تو اپنی گاڑی کنارے کر لیں۔ اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر سنجیدہ نہ ہو تو وہ سیدھی بات کا بھی الٹا مطلب نکال سکتا ہے۔

ایک مثال

مالیگاؤں کے فساد کے بارے میں دہلی کے ایک اردو ماہنامہ (افکار ملی ستمبر ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کا خلاصہ خود اسی کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"مالیگاؤں میں ۱۹ جولائی ۱۹۹۲ کو فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس فساد میں تین کروڑ روپے کی مالیت لوٹ لی گئی یا اسے جلا دیا گیا۔ تین مسلمان جاں بحق ہو گئے۔ ۱۲۵ سے زائد افراد زخمی ہو کر اسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔ کاروبار بند ہونے کی باعث یہاں کی آبادیاں، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، مایوسی اور افسردگی کی شکار نظر آتی ہیں۔ مزدور طبقہ بھوک مری کے اندیشہ میں مبتلا ہے اور تاجر پیشہ افراد اقتصادی مشکلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

۱۹ جولائی کو بابری مسجد کے مسئلہ پر اپنے غم و غصہ کے اظہار کے لیے مسلمانوں نے اپنے کاروبار اور دکانیں بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ "بابری مسجد بچاؤ" تحریک کے ضمن میں مقامی جنتا دل کے ایم ایل اے جناب نہال احمد نے مسجد کے تحفظ کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل دینے کے بعد ۱۸ جولائی کی شب میں قدوائی روڈ پر ایک جلسۂ عام منعقد کیا اور ۱۹ جولائی کو مالیگاؤں بند رکھنے کے اعلان کے ساتھ احتجاجی جلوس کے اہتمام کا اعلان بھی کر دیا۔ عام طور پر مسلمانوں میں اس تجویز کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ شہر میں موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا نقطۂ آغاز یہی تھا۔

دوسرے دن ۲۵ - ۳۰ ہزار افراد پر مشتمل ایک مورچہ (احتجاجی جلوس) جناب نہال احمد کی قیادت میں قلعہ کے پاس سے نکلا۔ مگر یہ مورچہ موسم پل تک بھی نہیں پہنچا ہو گا کہ انتشار و اشتعال کا شکار ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک غیر مسلم فوٹو گرافر نے مورچہ میں شامل چند مسلمانوں کے منع کرنے کے باوجود تصویریں کھینچنے کا کام بند نہیں کیا تو اس سے کیمرہ چھیننے کی کوشش کی گئی۔ اس چھینا جھپٹی کے دوران پولس کے آدمی وہاں پہنچ کر معاملہ کو رفع دفع کر رہے تھے کہ جلوس کے کچھ افراد نے سنگ باری شروع کر دی اور پھر وہیں سے عمل اور ردعمل کا ہولناک سلسلہ شروع ہو گیا"

برداشت والے لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام مظاہرہ ہے۔ اور بے برداشت لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام فساد۔

دردناک انجام

ہندستان ٹائمس (۲۰ نومبر ۱۹۹۲) میں ایک دردناک واقعہ چھپا ہے۔ اس کی سرخی رپورٹر نے ان الفاظ میں قائم کی ہے ——— فتح کے بعد ٹریجڈی :

Tragedy after the triumph

یہ لفٹننٹ سندیپ لمبا کا قصہ ہے۔ وہ ۲ ستمبر ۱۹۶۵ کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے خالصہ کالج میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی یونی ورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری لی۔ اپنی اسپرٹ آف ایڈونچر" کے تحت وہ ڈیفنس سروس میں بھرتی ہوگئے۔ ایڈونچر والے کھیلوں (adventure sports) میں انھوں نے امتیاز حاصل کیا، وہ ترقی کرتے ہوئے لفٹننٹ کے عہدہ پر پہنچ گئے۔

نومبر ۱۹۹۲ میں وہ اپنی ترقی کی انتہا پر تھے۔ انھیں پہاڑوں کی چڑھائی (mountaineering) کا شوق تھا۔ ایک فوجی ٹیم لے کر انھوں نے ۱۸ اگست ۱۹۹۲ کو گڑھوال کی ایک چوٹی (Abi Gamin Peak) پر چڑھائی شروع کی۔ یہ چوٹی ۷۲۱۰ میٹر اونچی ہے۔ لفٹننٹ لمبا چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی آخری اونچائی پر پہنچ گئے۔ رپورٹر کے الفاظ میں، ان کے خاتمہ کا وقت خود چوٹی پر آگیا جب کہ وہ اس کے اوپر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت برف کا ایک ریلا آیا اور وہ ہزاروں فٹ نیچے موت کے گڑھے میں گر گئے :

His end came at the summit itself, soon after he had stood there with a triumphant smile. The snow pack on the summit gave way and he fell to his death thousands of feet down below. (p.12)

یہ کسی ایک آدمی کا قصہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی کی کہانی لفٹننٹ لمبا کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنے دائرہ میں زندگی کا سفر شروع کرتا ہے۔ وہ محنت کرتے کرتے اپنی ترقی کی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔ عین اس وقت موت کا فرشتہ آتا ہے اور اس کو بڑائی کی چوٹی سے اٹھا کر پستی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ اس المناک انجام (tragic end) سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہے جو خدا کا تابعدار ہو۔ جو ربانی زندگی گزارتا ہوا اپنے آخری انجام تک پہنچے۔

فساد کا مسئلہ

جناب ایم۔ ساجد صاحب (دہلی) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مجھے آپ کی سب باتوں سے اتفاق ہے۔ مگر ایک بات ایسی ہے جس سے میں اتفاق نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذمہ دار آپ مسلمانوں کو بتاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ مسلمان فساد کرتے ہیں۔ ہم کیوں کر اس کو مان لیں۔ یہ تو واقعہ کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ آپ نے میری بات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان پر فساد کرنے کی ذمہ داری ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ مسلمان پر فساد کو نہ روکنے کی ذمہ داری ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں ہے: وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا (آل عمران ۱۲۰) یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو مخالفین کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ سازش کی موجودگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ صبر و تقویٰ کی غیر موجودگی ہے۔ اس کے مطابق، فساد کا واقعہ پیش آنے کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہاں سازش ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں صبر و تقویٰ کا طریقہ اختیار نہیں کر پاتے۔

میں نے کہا کہ خواہ ہندستان کا مسئلہ ہو یا کسی اور ملک کا مسئلہ، ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کچھ لوگ ایسی کارروائی کریں گے جس سے دوسروں کے جذبات بھڑکیں۔ اس مسئلہ کا حل دوسروں کو روکنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے جذبات پر کنٹرول کرنا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے جہاں بھی ردعمل کا اور مشتعل ہونے کا طریقہ اختیار کیا، وہاں بات بڑھ کر فساد تک پہنچ گئی۔ اور جہاں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا وہاں بات پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو گئی اور عمومی فساد کی نوبت نہیں آئی۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایڈمنسٹریشن کبھی فساد کو روک نہیں سکتا۔ فساد جب بھی رکے گا وہ مسلمانوں ہی کے روکنے سے رکے گا۔ اور اس کو روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں۔ وہ ناخوش گوار باتوں پر صبر کریں۔ اور اگر ضرورت ہو تو پہلے ہی مرحلہ میں اس کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو اس ملک میں ہمیشہ کے لیے فساد کی جڑ کٹ جائے۔

حاکم اور محکوم

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفۂ راشد ہیں۔ ان سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حالات درست تھے، مگر حضرت علی کے زمانہ میں حالات بگڑ گئے۔ اس سلسلہ میں ایک شخص سے آپ کی گفتگو اس طرح نقل کی گئی ہے :

سأل رجل علیاً رضی اللہ عنہ ما بال المسلمین اختلفوا علیک ولم یختلفوا علی ابی بکر وعمر۔ فقال : لأن ابابکر وعمر کانا والیین علی مثلی وانا الیوم والٍ علی مثلک، یشیر الیٰ وازع الدین (مقدمہ ابن خلدون ۲۱۱)

ایک شخص نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے کہ وہ آپ سے اختلاف کر رہے ہیں حالانکہ انھوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ ابوبکر اور عمر میرے جیسے کے اوپر حاکم تھے اور میں آج تمھارے جیسے کے اوپر حاکم ہوں۔ ان کا اشارہ لوگوں کے دینی رجحان کی طرف تھا۔

خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ صالحہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔ اور اس کے قیام کے اصول و شرائط کیا ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح نظام حکومت قائم ہونے کے لیے صرف صالح حکمراں کا ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ ماتحت عوام میں بقدر ضرورت صلاح کی کیفیت پائی جا رہی ہو۔ اس قول کے مطابق، خلیفہ اول اور خلیفۂ ثانی کی کامیاب حکومت کا راز یہ تھا کہ ان کے زمانہ میں اصحاب رسول بڑی تعداد میں موجود تھے اور معاشرہ پر انھیں کا مزاج غالب تھا۔ مگر خلیفہ چہارم کے زمانہ میں نومسلموں کی کثرت کے بعد اصحاب رسول اقلیت بن گئے اور معاشرہ پر ان لوگوں کا غلبہ ہو گیا جو اصحاب رسول جیسا ذہن اور مزاج نہیں رکھتے تھے۔

حکمراں افراد کی تبدیلی سے پہلے معاشرہ کے افراد کی تبدیلی ضروری ہے۔ معاشرہ اگر برا ہو تو صحابیٔ رسول جیسے حکمراں کی موجودگی بھی صالح نظام کے قیام کی ضمانت نہیں بن سکتی۔

اعتراف اور بے اعترافی

گلبرٹ کیتھ چسٹرٹن (G.K. Chesterton) ایک انگریز مصنف ہے۔ وہ ۱۸۷۴ میں لندن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول ہے کہ لوگ اکثر جھگڑتے ہیں کیوں کہ وہ اپنی بات کو دلیل سے ثابت نہیں کر پاتے :

People generally quarrel because they cannot argue.

دو آدمیوں کے درمیان کسی اختلافی موضوع پر بات ہو رہی ہو۔ اس کے بعد ان میں سے ایک آدمی تیز تیز بولنے لگے یا الزام تراشی کی زبان استعمال کرنا شروع کر دے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ دلیل کے میدان میں اپنے کو کمزور پا رہا ہے اور دلیل کی کمی کو الفاظ کی زیادتی سے پورا کرنا چاہتا ہے۔ گفتگو میں جھگڑنا خود اپنی کمزوری کا ثبوت ہے نہ کہ فریق ثانی کی کمزوری کا۔

دلیل غصہ سے زیادہ طاقت ور ہے، جس طرح بم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔ جس آدمی کے پاس زیادہ طاقت کا ہتھیار ہو وہ کبھی کم طاقت کا ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح جس آدمی کے پاس دلیل کا زور ہو وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کبھی غصہ کا زور نہیں دکھائے گا۔ دلیل کی زمین پر کھڑا ہونے کا احساس آدمی کے اندر پُر اعتماد سنجیدگی پیدا کرتا ہے، اور دھاندلی کی زمین پر کھڑا ہونے کا احساس جھنجلاہٹ اور بے یقینی۔

جب دو آدمیوں کے درمیان کسی موضوع پر گفتگو ہو۔ اور دلائل کے سامنے آنے کے بعد یہ ظاہر ہو کہ ایک آدمی کا نقطۂ نظر صحیح تھا اور دوسرے آدمی کا نقطۂ نظر غلط، تو اس کے بعد دوسرا آدمی کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ اپنی غلطی مان لینے کے بجائے طیش میں آجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اعترافِ حق کی عظمت کو نہیں جانتا۔ وہ اپنی عظمت سے واقف ہے مگر وہ حق کی عظمت سے واقف نہیں۔

آج ہر آدمی لذتِ بے اعترافی میں جی رہا ہے۔ کسی کو بھی لذتِ اعتراف کی کیفیت معلوم نہیں۔

مسجد کا مسئلہ

مسجد کے لفظی معنی ہیں ——— سجدہ کرنے کی جگہ۔ اصولی طور پر ساری زمین مسجد ہے۔ کیوں کہ زمین میں جہاں بھی اور جس حصہ میں بھی نماز ادا کی جائے وہ کسی کمی کے بغیر پوری طرح ادا ہو جائے گی۔ حدیث میں اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات نقل ہوئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

اَینما صلّیتم فھو مسْجد۔	تم جہاں بھی نماز پڑھ لو وہی مسجد ہے۔
جُعلت لی الارض مسْجداً وطَھوراً۔	پوری زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنادی گئی۔
اَینما کُنتم فصلّوا	تم جہاں ہو وہیں نماز پڑھ لو۔

(الجامع لاحکام القرآن ، ۱۹/۱۹)

مسجد کے نام سے مخصوص عمارت جو بنائی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی عبادت صرف اسی مسجد کے اندر ادا کی جا سکتی ہے۔ کسی آبادی میں مسجد بنانے کا خاص مقصد نماز کی تنظیم ہے۔ کیوں کہ جگہ کی تعیین کے بعد جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا لوگوں کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

مساجد کا درجہ

دنیا میں اس وقت چھوٹی اور بڑی تقریباً چالیس لاکھ مسجدیں ہوں گی۔ مگر تین مسجدوں کو چھوڑ کر، تمام مسجدوں کا درجہ شریعت میں یکساں ہے۔ یہ تین مسجدیں یہ ہیں ——— مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد نبوی اور فلسطین کی مسجد اقصیٰ۔

یہی تین مسجدیں ہیں جن کو اسلام میں امتیازی درجہ دیا گیا ہے۔ ان تین کے علاوہ جو مسجدیں ہیں وہ سب کی سب بالکل یکساں ہیں، خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، تاریخی ہوں یا غیر تاریخی، مشہور ہوں یا غیر مشہور۔ حتیٰ کہ مذکورہ تین کے علاوہ بقیہ مسجدوں کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ آدمی ان کے علاوہ کسی اور مسجد میں فضیلت کے خیال سے جائے یا قریب کی مسجد کو چھوڑ کر بلا سبب دور کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا تُشَدُّ الرِّحالُ اِلاّ اِلیٰ ثلاثۃ سفر نہ کیا جائے مگر صرف تین مسجدوں کے لیے۔

مساجدَ ۔ المسجد الحرام ومسجدِ مسجد حرام اور مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔
الرسول والمسجد الاقصیٰ (اخرجہ البخاری ومسلم)

مذکورہ تین مسجدوں کے سوا سب مسجدیں اسلام کی نگاہ میں برابر ہیں ۔ اِلا یہ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی استثنا ثابت ہو۔ ان تین کے علاوہ کسی اور مسجد کو بطور خود اگر کوئی بڑا نام دے دیا جائے، مثلاً اس کو شہنشاہی مسجد کہا جائے تو ایسا نام ان ھی الا اسماء سمیتموھا (یوسف) کا مصداق ہوگا، وہ لوگوں کا اپنا خود ساختہ نام ہوگا۔ ایسے کسی نئے نام کی وجہ سے وہ مسجد امتیازی اہمیت کی حامل نہیں بن جائے گی۔

مسجد کس لیے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو (الجن ۱۸) دوسری جگہ مدینہ کی مسجد کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ مسجد ہے جو اول دن سے تقوی کی بنیاد پر تعمیر کی گئی (التوبہ ۱۰۸) ان آیتوں سے مسجد کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد وہ عمارت ہے جو صرف اللہ کی نسبت سے بنائی جاتی ہے۔ اس میں صرف اللہ کی یاد اور اللہ کی عبادت ہونا چاہیے۔ مسجد کو صرف ان اعمال کا مرکز ہونا چاہیے جو بندہ کو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں۔

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں (المساجد بیوت المتقین) دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسجد تقوی کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد کا یہ مقصد خود متعین کر دیتا ہے کہ مسجد کو کیسا ہونا چاہیے۔ مسجد کی زمین، اس کی تعمیر، اس کا نظام، اس کے اندر کی سرگرمیاں، اس کا ماحول، سب کچھ تقوی کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس بات کا خصوصی اہتمام کیا جانا چاہیے کہ مسجد سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی معاملہ ایسا نہ ہو جو تقوی کے مقصد کو مجروح کرنے والا ہو۔ مسجد کے تمام معاملات میں اصل معیار تقوی ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز۔

مسجد کے معاملہ میں اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس پہلو کو ہمیشہ خاص اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ ایسی باتوں سے ہمیشہ احتراز کیا گیا ہے جو کسی بھی درجہ میں تقوی کے مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ یہاں ہم مساجدِ اسلامی کی تاریخ سے چند چیزوں کا ذکر کریں گے۔ یہ باتیں احاطہ کے طور پر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت علامتی مثالوں کی ہے۔

مسجد کی زمین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے تو آپ نے مدینہ میں ایک مسجد
ں۔ یہ وہی مسجد ہے جس کو مسجد نبوی کہا جاتا ہے۔ آپ مدینہ پہنچے تو اس وقت وہاں ایک میدان تھا۔
نے اس جگہ کو مسجد کی تعمیر کے لیے پسند فرمایا۔ اس زمین کے مالک انصار کے دو یتیم لڑکے تھے۔
م سہل اور سہیل تھا، روایت میں آتا ہے کہ :

ھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ۔
لا بل نھبہ لک یا رسول اللہ۔ فابی
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی ابتاعہ
ما بعشرۃ دنانیر

(الروض الانف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں لڑکوں سے زمین کی قیمت کا معاملہ کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ زمین ہم آپ کو بلا قیمت دیتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا۔ اور زمین کو ان دونوں سے دس دینار میں خریدا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے اسلام کا یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی زمین
ہونی چاہیے جس میں ذاتی ملکیت کا کوئی شبہ نہ ہو۔ تاکہ کوئی شخص یہ گمان نہ کر سکے کہ مسجد کی
ن میں اس کا کوئی خصوصی حق ہے، مسجد ایک عبادت خانہ ہے اور اس کو ہر اعتبار سے خدا
بادت خانہ ہی ہونا چاہیے۔

غصب کی زمین نہیں

قرآن کے مطابق، کسی مذہب کے عبادت خانہ کو ڈھانا ایک ظالمانہ فعل ہے (الحج ۴۰) خلیفہ ثانی
فاروق رض کے زمانہ میں شام و فلسطین کے عیسائی علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ اس
ت مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو عہدنامے لکھے گئے ان میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ
درج تھا کہ ان کے گرجا میں رہائش نہ کی جائے گی اور ان کو ڈھایا نہ جائے گا اور نہ ان میں کچھ کمی کی
ئے گی (لا یُسکن کنائسھم ولا تُھدم ولا یُنتقص منھا)

اسلام میں یہ بات سراسر ناجائز ہے کہ کسی کی زمین پر زبردستی قبضہ کر کے وہاں مسجد بنائی
ئے۔ اگر غصب کی ہوئی زمین پر مسجد بنائی جائے تو اسلامی فقہاء کا کہنا ہے کہ ایسی مسجد میں نماز

پڑھنا جائز ہیں (لا تسجو رتیــہ (لصفحہ ۰)

بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق کے ایک گرجا پر قبضہ کر کے مسلمانوں نے وہاں مسجد بنالی تھی۔ اس کے بعد جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے جو نہایت صالح اور راشد حکمراں تھے، عیسائیوں نے اس کی شکایت ان کے سامنے پیش کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا کہ یہ مسجد عیسائیوں کے حوالے کر دی جائے۔ اس واقعہ کی تفصیل عبد العزیز سید الاھل کی کتاب الخلیفۃ الزاھد عمر بن عبد العزیز (مطبوعہ قاہرہ) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

نزاعی مقام سے پرہیز

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس موقع پر خود حضرت عمر مدینہ سے فلسطین گئے تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل کریں۔ اس سلسلہ میں جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ بات چیت کے دوران ایک بار حضرت عمر یروشلم کے کنیسۂ قیامہ (Church of Resurrection) میں تھے۔ اس اثنا میں نماز کا وقت آ گیا۔ انھوں نے وہاں کے بطریق (Patriarch) سے کہا کہ مجھے نماز پڑھنا ہے۔ بطریق نے کہا کہ آپ اپنی نماز یہیں گرجا کے اندر پڑھ لیجئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ نہیں۔ اگر میں یہاں نماز پڑھوں گا تو بعد کے مسلمان یہ کہیں گے کہ یہاں ہمارے خلیفہ نے نماز پڑھی ہے، اس لیے ہم یہاں مسجد بنائیں گے۔ اور اس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مسجد اور چرچ کا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔

حضرت عمر نے اس کے بعد یہ کیا کہ وہ چرچ سے نکل کر اتنے فاصلہ تک گئے جس کو پتھر پھینکنے کی دوری (stone's throw) کہا جاتا ہے۔ اور پھر وہاں اپنی عبا بچھا کر نماز ادا کی۔

بعد کو وہی ہوا جس کا اندیشہ حضرت عمر نے ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ بعد کے مسلمانوں نے آپ کے نماز پڑھنے کی جگہ پر قبضہ کیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ مسجد آج بھی یروشلم میں موجود ہے اور اس کا نام مسجد عمر ہے۔ یہ مسجد کنیسۂ قیامہ سے رمیۃ حجر کے فاصلہ پر ہے۔ یعنی ایک پتھر زور سے پھینکا جائے تو وہ جتنی دور پہنچے گا اتنی ہی دوری پر یہ مسجد بنی ہوئی ہے۔

(عبد اللہ التل، خطر الیہودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ، القاہرہ ۱۹۶۴، صفحہ ۱۲۹)

پروفیسر آرنلڈ (T.W. Arnold) نے اپنی مشہور کتاب تاریخ دعوت اسلام (The Preaching of Islam) میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

In company with the Patriarch, Umar visited the holy places, and it is said while they were in the Church of the Resurrection, as it was the appointed hour of prayer, the Patriarch bade the caliph offer his prayers there, but he thoughtfully refused, saying that if he were to do so, his followers might afterwards claim it as a place of Muslim worship. (p.57)

عمرؓ نے بطریق کے ساتھ یروشلم کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ دونوں کنیسۂ قیامہ میں تھے تو وہاں نماز کا وقت آگیا۔ مسیحی بطریق نے مسلم خلیفہ سے کہا کہ آپ کنیسہ ہی میں اپنی نماز پڑھ لیں۔ مگر انھوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو مسلمان بعد کو یہ دعوی کریں گے کہ یہ ایک اسلامی عبادت خانہ ہے (صفحہ ۵۷)

خلیفۂ اسلام کا یہ عمل بتاتا ہے کہ نزاع کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنا اسلام میں غیر مطلوب ہے۔ مسجد روحانی پاکیزگی کے لیے ہے، اور جس مسجد کے ساتھ جھگڑے کا ماحول قائم ہو جائے وہ مسجد کبھی روحانی پاکیزگی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ نزاعی زمین پر اگر کوئی مسجد بنائی جائے تو وہ اللہ کی یاد کا مرکز بننے کے بجائے انسانی ٹکراؤ کا مرکز بن جائے گی۔ ایسی مسجد خود مسجد کے مقصد کی نفی کرنے والی ثابت ہوگی۔

مزید یہ کہ ایسی مسجد امکاناتِ دعوت کو قتل کرنے کے ہم معنی ہے۔ اسلام کے لیے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اہل اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ دوسری قومیں اگر تمہارے ساتھ زیادتی کریں تب بھی تم یک طرفہ طور پر ان کے معاملہ میں صبر کا طریقہ اختیار کرو (ابراہیم ۱۲) اس حکم کا مدعا یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلق قائم رہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ اسلام اس کو پسند کرے کہ خود اہل اسلام ایسا فعل کریں جو داعی اور مدعو کے درمیان نزاع پیدا کرکے باہمی تعلقات میں تلخی پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔

اس حکمت کی بنا پر لازم ہے کہ اہل اسلام ایسی جگہ مسجد بنانے سے مکمل پرہیز کریں جس کے بارہ میں یہ اندیشہ ہو کہ حال یا مستقبل میں اس کو طرفین کے درمیان نزاع کا مسئلہ بنایا جا سکتا ہے۔

ٹکراؤ کے بغیر

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر کے بعد اگر مسجد کے معاملہ میں کوئی مسئلہ کھڑا ہو تو اہل اسلام کو ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ اس کی ایک انتہائی مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔

مکہ کی مسجد حرام تمام مسجدوں میں سب سے زیادہ مقدس مسجد ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے، اس وقت یہ مسجد اہل شرک کے قبضہ میں تھی، انھوں نے اس مسجد میں ۳۶۰ بت رکھ دیے تھے۔ یہ بلاشبہ مکہ کا اہم ترین مسئلہ تھا۔ مگر اس وقت قرآن میں جو آیتیں اتریں ان میں رسول اللہ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ مکہ کی مسجد کو بتوں سے پاک کرو، یا اس کے اخراج کے لیے مکہ میں احتجاجی مہم چلاؤ۔

اس کے بجائے قرآن میں پہلی آیت یہ اتری کہ اقرأ باسم ربك الذی خلق (اللہ کے نام سے پڑھو جس نے تم کو پیدا کیا) مکہ کے تیرہ سالہ دور میں اسی قسم کی دعوتی آیتیں اترتی رہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے مکی دور میں کبھی بھی مسجد سے بتوں کے اخراج کو اشو نہیں بنایا۔ مسجد سے بتوں کو نکالنے کے بجائے آپ دلوں سے بت کو نکالنے کی مہم میں لگے رہے۔ گویا مسجد میں بت کے مسئلہ کو آپ نے لوگوں کے دلوں میں داخلہ سے حل کیا نہ کہ خود مسجد میں داخلہ سے۔

مسجد ضرار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ مدینہ کے اطراف میں کچھ لوگوں نے ایک مسجد بنائی اور اس میں نماز پڑھنا شروع کیا۔ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد میں لے جانا چاہا مگر آپ اس میں داخل نہیں ہوئے اور بعد کو آپ کے حکم سے وہ مسجد توڑ دی گئی (التوبہ ۱۰۷)

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مسجد کچھ شرارت پسند مسلمانوں نے بنائی تھی۔ یہ لوگ بظاہر مسلمان تھے۔ مگر اندر اندر وہ رسول اللہ کی سیادت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی یہ مسجد اس لیے بنائی تھی کہ وہاں نماز کے پردہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کریں۔ مسجد اس

قسم کی مخالفانہ سرگرمیوں کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذکر اور تقوی والے اعمال کے لیے ہے۔ اس لیے اس مسجد کو ڈھایا گیا اور اس کو جلا کر ختم کر دیا گیا (التفسیر المظہری ۴/۲۹۷)

دورِ رسالت کے اس واقعہ سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کا سیاسی استعمال اسلام میں درست نہیں۔ یہ مسجد کے مقصد کی نفی ہے کہ اس کو سیاسی نظام کے خلاف سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے۔ مسجد صرف عبادت خانہ ہے، اور اس کو عبادت خانہ ہی کی حیثیت سے باقی رہنا چاہیے۔ عبادت سے تعلق رکھنے والے شعبے مسجدیں قائم کیے جا سکتے ہیں مگر عبادت کے خلاف شعبے نہیں۔

مسجد کی حفاظت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالے کے قوانین میں سے ایک قانون دفع ہے۔ اس کے ذریعہ وہ حالات میں ایسی تبدیلی کرتا رہتا ہے جو مسجد اور دوسرے عبادت خانوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ قرآن کی یہ آیت حسب ذیل ہے:

ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا۔ ولينصرن الله من ينصره، ان الله لقوى عزيز (الحج ۴۰)

اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھا دیے جاتے۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، زور والا ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو آزادی عطا کی ہے۔ مگر اس آزادی کی ایک حد ہے۔ اور وہ حد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ اپنی آزادی کو یہاں تک لے جائے کہ وہ مذاہب کے عبادت خانوں کو اور مسجدوں کو ڈھانے لگے تو ایسے شخص یا گروہ کو اقتدار کے مقام سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ ایسے سرکش لوگوں کے خلاف ہمیشہ کوئی جوابی طاقت ظاہر ہوتی ہے جو ان کو دھکیل کر پیچھے کر دیتی ہے۔ تاکہ وہ عبادت خانوں کی تخریب کے قابل نہ رہیں۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال سوویت یونین ہے۔ اس نے اپنے زیرِ قبضہ علاقہ میں

مسجدوں اور عبادت خانوں کو ختم کرنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کیے کہ خود سوویت یونین کا خاتمہ ہو گیا۔

مسجد کی بے حرمتی

البخاری، مسلم، النسائی، الترمذی، ابو داؤد اور مؤطا امام مالک میں یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ کی مسجد نبوی میں تھے۔ اس اثناء میں ایک دیہاتی آیا۔ وہ مسجد میں کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ آپ کے اصحاب اس کو پکڑنے کے لیے دوڑے تو آپ نے فرمایا کہ ٹھہرو۔ اس کو کر لینے دو۔ دیہاتی آدمی جب پیشاب کر چکا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ پانی لے کر پیشاب کے مقام پر بہادو اور اس کو صاف کر دو۔ پھر آپ نے دیہاتی کو بلایا اور اس سے نرمی کے ساتھ کہا :

إنَّ هذه المساجدَ لا تصلحُ لشيءٍ من هذا البولِ والقذرِ انما هي لذكر الله والصلاة وقرأة القرآن۔	یہ مسجدیں پیشاب اور گندگی جیسی چیزوں کے لیے نہیں ہیں، وہ اللہ کی یاد کے لیے اور نماز کے لیے اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں۔

اس حدیث کو امام البخاری نے باب الرفق فی الامر کلہ کے تحت نقل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد کی اتنی بڑی بے حرمتی کرے کہ وہ اس میں داخل ہو کر پیشاب کر دے تب بھی مسلمانوں کو مشتعل نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو ہر حال میں نرمی اور بردباری کی روش پر قائم رہنا چاہیے۔ ان کی توجہ گندگی کی صفائی پر مرتکز رہنا چاہیے نہ کہ گندگی پیدا کرنے والے سے انتقام لینے پر۔

خدا کا معاملہ

مساجد کے تاریخی واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو برٹانیکا کے بیان کے مطابق ۵۷۰ء میں عرب میں پیش آیا۔ اس وقت یمن میں ایک مسیحی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام ابرھہ تھا۔ اس نے اپنی راجدھانی صنعا میں ایک بہت بڑا کلیسا بنایا۔ اور چاہا کہ اس کو سارے جزیرۂ عرب کی زیارت گاہ بنا دے۔ اس وقت کعبہ عربوں کا سب سے بڑا مقدس عبادت خانہ سمجھا جاتا تھا۔ ابرھہ نے طے کیا کہ وہ کعبہ کو ڈھا دے، تاکہ اس کے مقصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

ابرھہ ایک بڑی فوج لے کر یمن سے روانہ ہوا۔ اس میں ۶۰ ہزار سپاہی اور تقریباً ایک

درجن ہاتھی تھے، مکہ کے قریب پہنچ کر اس نے پڑاؤ ڈالا۔ اس کے فوجیوں نے یہاں لوٹ مار کی۔ اس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب بن ہاشم کے دو سو اونٹ بھی تھے جن کو ابرھہ کے فوجی ہنکا لے گئے۔

عبد المطلب اس کے بعد روانہ ہو کر ابرھہ کے پاس پہنچے اور اس سے ملاقات کی۔ وہ نہایت وجیہہ آدمی تھے اور شاندار شخصیت کے مالک تھے، جب وہ ابرھہ کے خیمہ میں داخل ہوئے تو ابرھہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اتر کر فرش کے اوپر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ترجمان کے ذریعہ دونوں میں بات ہوئی۔

ابرھہ نے ترجمان کی معرفت عبد المطلب سے پوچھا کہ آپ کے آنے کی غرض کیا ہے۔ عبد المطلب نے جواب دیا کہ تمہارے آدمیوں نے میرے دو سو اونٹ پکڑ لیے ہیں۔ یہ اونٹ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ ابرھہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں آپ سے متاثر ہوا تھا۔ مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا۔ آپ پر تعجب ہے کہ آپ مجھ سے اپنے اونٹ کی بات کر رہے ہیں، اور اس مقدس گھر کی بات نہیں کرتے جس کو ڈھانے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ اس کے جواب میں عبد المطلب نے کہا:

انا ربُّ الإبل وللبيت رب يمنعه — میں اونٹ کا مالک ہوں۔ اور مقدس گھر کا مالک خدا ہے، وہ اس کی حفاظت کرے گا۔

(الکامل فی التاریخ لابن اثیر، ۱/۴۴۴)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵ نازل ہوئی جو خاص اسی واقعہ کے بارہ میں ہے، اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ قریش کے سردار عبد المطلب بہت بزدل تھے کہ انھوں نے مکہ کی مقدس مسجد پر حملہ کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس سورہ میں صرف اللہ کی اس کارروائی کا ذکر ہے کہ اس نے حملہ آوروں کو پسپا کر کے مکہ کی مسجد کو بچا لیا۔ اس طرح قرآن کی یہ سورہ گویا عبد المطلب کے عمل کی تصدیق ہے۔ وہ بالواسطہ انداز میں اس اصول کو بتا رہی ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد کے خلاف اقدام کرے تو اس وقت اہل مسجد کو کیا کرنا چاہیے۔ اہل مسجد کو چاہیے کہ اس وقت اپنے آپ کو سنبھالیں، اور مسجد کے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دیں۔

مسجد یا عبادت گاہ کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اگر ضد کا ماحول نہ ہو تو خود انسان کا ضمیر مسجد کا چوکیدار بنا رہے گا۔

مسجد کی عظمت

مسجد خدائے برتر کی عظمت کا مقام ہے۔ اس نسبت نے مسجد کے اندر ایک فاتحانہ شان پیدا کر دی ہے۔ حتیٰ کہ مسجد اپنی نگہبان آپ بن جاتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی نے مسجد کو نقصان پہنچایا تو جلد یا بدیر مسجد خود اسی کے اوپر غالب آ گئی۔ یہاں تک کہ مسجد کو نقصان پہنچانے والوں ہی نے مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا۔

اس سلسلہ کا ایک نمایاں واقعہ وہ ہے جو عباسی سلطنت کی تباہی (۱۲۵۸ء) کے بعد پیش آیا۔ یہاں ہم ایک عرب محقق کے الفاظ نقل کریں گے۔ انھوں نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے درست طور پر لکھا ہے :

وهاجم المغول عالم الاسلام من الشرق وخربوا البلاد واهلكوا العباد، ولكنهم لم ينتصروا على الاسلام، بل هزمهم الاسلام وغزا قلوبهم، وفي نفس المساجد التي خربها المغول في طريقهم من سمرقند الى حلب وجعلوا معظمها اطلالا ركع المغولي المغلوب على امره وسجد للواحد القهار تحت سقوف المساجد، وقام احفاد هولاكو باعادة بناء المساجد وفيها اصلوا وتحولوا الى بشر مسلمين، ولم يلبثوا ان خرجوا هم انفسهم مجاهدين في سبيل الاسلام حاملين رايته مدافعين اعداءه وسائرين باسمه في معارج الرقي والعمران (دکتور حسین مونس، المساجد، المجلس الوطنی للثقافۃ والفنون والآداب، کویت ۱۹۸۱، صفحہ ۳۲)

مشرق سے منگولوں نے عالم اسلام پر یلغار کی۔ انھوں نے شہروں کو تباہ کیا اور انسانوں کو ہلاک کیا۔ مگر وہ اسلام پر فتح نہیں پا سکے۔ بلکہ اسلام نے انھیں شکست دی اور ان کے دلوں کو مفتوح کر لیا۔ وہی مسجدیں جن کو سمرقند سے لے کر حلب تک کے راستے میں منگولیوں نے ڈھا دیا تھا اور ان میں سے بیشتر کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا، بالآخر انھیں مسجدوں کو ہلاکو کے پوتوں نے دوبارہ تعمیر کیا۔ اور اس کی چھتوں کے نیچے انھوں نے عاجزانہ طور پر خدائے واحد و قہار کے آگے سجدہ کیا۔ وہ سب بالآخر مسلمان بن گئے۔ اور اسلام کا پرچم لے کر اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکل پڑے۔ انھوں نے اسلام کے دشمنوں کا دفاع کیا۔ اور اس کے ذریعہ ترقی و تمدن کے اعلیٰ مراحل طے کیے (صفحہ ۳۲)

الرسالہ فروری ۱۹۹۳

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسجد کے ساتھ خدا کی خاص نصرت ہوتی ہے۔ حتی کہ مسجد اپنی نگہبان آپ بن جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد کا معاملہ سورج جیسا ہے۔ بادل سورج کو وقتی طور پر ڈھانپ سکتا ہے، مگر بادل سورج کی روشنی کو بجھا نہیں سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص یا گروہ وقتی طور پر مسجد کو نقصان پہنچا سکتا ہے، مگر وہ مستقل طور پر مسجد کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ مسجد وہ مقام ہے جس کو خداوند ذوالجلال کی نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور کون ہے جو ایسے مقام کو مٹا دے جس کو خداوند ذوالجلال کی نسبت حاصل ہو۔

زرتعاون الرسالہ

بحری ڈاک	ہوائی ڈاک		ہندستان کے لیے
	بیرونی ممالک کے لیے		
	$ 1.5/£1	Rs 6	فی پرچہ
$ 10/£5	$ 20/£10	Rs 72	ایک سال کے لیے
$ 18/£8	$ 35/£18	Rs 135	دو سال " "
$ 25/£12	$ 50/£25	Rs 200	تین سال " "
$ 40/£18	$ 80/£40	Rs 300	پانچ سال " "
	$ 100/£50	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)

تعمیر یا تخریب

بھارتیہ جنتا پارٹی نے ۳ نومبر ۱۹۹۲ کو بھارت بند منایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گورنمنٹ کے خلاف احتجاج کی علامت کے طور پر ایک روز کے لئے پورے ملک میں ہر قسم کی سرگرمیوں کو معطل کر دیا جائے۔ اس قسم کی کال عوام کے تعاون ہی سے کامیاب ہو سکتی تھی۔ مگر عوام نے بہت کم اس کا ساتھ دیا۔ چنانچہ بھارت بند کا منصوبہ عملاً غیر موثر ہو کر رہ گیا۔ اگر کہیں بظاہر کامیابی ہوئی تو وہ زبردستی کی کامیابی تھی۔ اس کی ایک مثال نیچے کی تصویر میں نظر آتی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے آدمیوں نے دہلی کی ایک بس کے ٹائر سے اس کی ہوا نکال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بس کو سڑک پر کھڑا ہو جانا پڑا۔

بند اور ہڑتال خواہ کسی بھی پارٹی کی طرف سے ہو اور کسی بھی ملک میں ہو، بلاشبہ وہ تخریب ہے، اور ہر حال میں قابل مذمت ہے۔ تخریب کاری کا طریقہ زندگی کی چلتی ہوئی گاڑی کو روک سکتا ہے۔ مگر تخریب کاری کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ رکی ہوئی گاڑی کو زندگی کی شاہراہ پر رواں دواں کر سکے۔

اس وقت ملک کا اصل مسئلہ گاڑی کو روکنا نہیں ہے۔ بلکہ رکی ہوئی گاڑی کو چلانا ہے۔ ملک کی آزادی پر نصف صدی کی مدت پوری ہو رہی ہے، مگر اب تک ہمارا ملک ترقی کی شاہراہ پر



BJP workers deflated tyres of a DTC bus during the 'Bandh'

رواں دواں نہ ہوسکا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ جو شخص بھی ملک کی ترقی کے نام پر اٹھتا ہے، وہ کوئی ایک یا دوسرا لفظ بول کر توڑ پھوڑ کی سرگرمیاں شروع کر دیتا ہے۔ وہ تعمیر کے بجائے تخریب کا کارنامہ انجام دینے لگتا ہے۔ اس منفی ذہن کو بدلنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ یہی ہوگا کہ دنیا تو سفر کرتی ہوئی آگے نکل جائے گی اور ہم ایک دوسرے سے لاؤڈ اسپیکر چھین کر جھوٹی تقریریں کرنے کا کرتب دکھاتے رہیں گے۔

ہندستان کی ترقی کو جو چیز سب سے زیادہ روکے ہوئے ہے وہ ایک لفظ میں عدم رواداری ہے، اور اس ترقی کو جو چیز جاری کر سکتی ہے وہ دوبارہ ایک لفظ میں، رواداری ہے۔ اس کے کوئی بھی تدبیر اس ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والی نہیں۔

اسی رواداری کی فضا کو پیدا کرنے کے لئے ملک کے ابتدائی لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ ملک کا نظام سیکولرزم کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا۔ یعنی اسٹیٹ کسی ایک فرقہ یا مذہب کی پابند نہ ہوگی۔ بلکہ ہر ایک کو اس کے اپنے دائرہ میں آزادی دیتے ہوئے ریاستی امور کو مشترک ملکی مفاد کی بنیاد پر چلائے گی۔

آزادی کے بعد جن لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ یہاں "سیکولر انڈیا" کی تعمیر کرنا ہے، انھوں نے ایک ممکن اور قابل حصول چیز کا فیصلہ کیا تھا۔ کیوں کہ جس معاشرہ میں مختلف مذہب اور کلچر کے لوگ بستے ہوں وہاں سیکولرزم ہی ایک قابل عمل نظریہ ہوسکتا ہے۔ یعنی لوگوں کو اپنے اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی دیتے ہوئے ریاست کا نظام فلاح عامہ کی بنیاد پر چلایا جائے۔

مگر کچھ دوسرے لیڈروں نے ہندتو اور انڈینائزیشن کا نظریہ بنایا اور یہ نعرہ لگانا شروع کیا کہ: ہندی، ہندو، ہندستان۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک کے تمام لوگ "ہندو" ہیں اور اکثریتی فرقہ کے کلچر ہی کو سارے ملک کا کلچر ہونا چاہئے۔ یہ دوسرا نظریہ ناقابل عمل نظریہ تھا۔ چنانچہ اس نے جھگڑا پیدا کیا۔ وہ ملک کو ترقی کی طرف نہ لے جاسکا۔ اس نے صرف ترقی کے سفر میں بریک لگانے کا کام انجام دیا۔

ہندستان کی سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اس قسم کے کمیونلزم کے خلاف بیان (ٹائمس آف انڈیا ۲۳ مئی ۱۹۷۸) دیتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی بھی چیز ملک کے مستقبل کے لئے اتنی خطرناک نہیں جتنا کہ کمیونلزم کا کینسر ہے۔ ہندستان یا تو سیکولر ہندستان کے طور پر زندہ رہے گا یا وہ سرے سے زندہ ہی نہ رہے گا:

آزمائش کا قانون

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ پس اللہ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا (العنکبوت ۱-۳)

مومن خدا کا مطلوب بندہ ہے۔ مومن کے لیے خدا کے یہاں ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔ مگر مومن کسی نسلی گروہ کا نام نہیں اور نہ زبانی اقرار سے کوئی شخص مومن بن جاتا۔ مومن اس سچے خدا پرست کا نام ہے جس کی سچائی حالات کے امتحان میں ثابت شدہ بن گئی ہو۔ ایک شخص جب یہ کہے کہ میں مومن ہوں تو وہ ایمان کے دروازہ میں داخل ہو گیا۔ مگر یہ کہنا آغاز ہے نہ کہ اختتام۔ اس کے بعد حالات کا عملی امتحان شروع ہوتا ہے۔ اس امتحان کے دوران یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا تھا، یا وہ سچا نہیں تھا۔ اس امتحانی مرحلہ سے گزرنے کے بعد ہی خدا کے یہاں اس کا مرتبہ متعین ہوتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔

سچائی کا اعلان اگر ایک معروف اور مسلّم شخصیت کرے تو یہ امتحان کی بات نہیں ہوگی۔ کون ہوگا جو ایسی شخصیت کا انکار کرے۔ اس لیے سچائی کا اعلان ہمیشہ غیر مشہور اور غیر مسلّم شخص کے ذریعہ کرایا جاتا ہے۔ اب جو لوگ سچائی کو سچائی کے اعتبار سے پہچاننے کا مادہ رکھتے ہوں وہ فوراً اس کا اقرار کرکے امتحان میں پورے اتریں گے۔ اور جو لوگ سچائی کو شخصیت کے واسطے سے پہچاننے کا مزاج رکھیں، وہ اس کا انکار کر دیں گے۔ اس طرح وہ امتحان میں ناکام رہیں گے۔

حق کے ساتھ مادی نفع کو حذف کر دیا جاتا ہے تاکہ جو شخص صرف حق کا طالب ہو وہ اس کو لے لے، اور جو شخص مادی نفع کا طالب ہے وہ اس کو چھوڑ کر ثابت کرے کہ وہ حق کا سچا طالب نہیں۔ دین کے ساتھ مقبولیت ملتی ہو تو ہر آدمی ایسے دین کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس لیے دین کے ساتھ اجنبیت کو جوڑ دیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ کون فی الواقع حق کا طالب ہے اور کون حق کا طالب نہیں۔

الرسالہ فروری ۱۹۹۲

آپ ڈاکٹر ہیں

۲۴ مئی ۱۹۹۲ کو حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان سید عارف الدین قادری (۳۴ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں جناب ریاض احمد صدیقی (فتح منزل) کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ وہ ہمیشہ ہم کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم داعی ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے مدعو ہیں۔ اور داعی کو مدعو کے مقابلہ میں ہمیشہ صبر ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ عارف بھائی، آپ پاگلوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اگر کوئی پاگل آپ کو پتھر مار دے تو کیا آپ بھی اس کو پتھر سے ماریں گے۔ نہیں۔ آپ اس کا علاج کریں گے، کیوں کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور وہ مریض۔

ایک شخص آپ کو گالی دے یا آپ کے اوپر کیچڑ پھینکے تو اس کے مقابلہ میں آپ کے ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو وقار کا مسئلہ بنالیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس کو علاج کا مسئلہ بنائیں۔ اگرچہ واقعہ ایک ہی ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف جذبات آپ کے اندر ابھریں گے۔

پہلی صورت میں آپ کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کو سزا دیں۔ اس کو کچل ڈالیں۔ اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کریں تاکہ اس کو ہمیشہ یاد رہے۔ جوابی کارروائی کے بغیر کسی طرح آپ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوگا۔

دوسری صورت میں آپ کو اس سے ہمدردی پیدا ہوگی۔ آپ اس کو حریف نہیں بلکہ مریض سمجھیں گے۔ آپ اس کو شریر کی نظر سے نہیں بلکہ معذور کی نظر سے دیکھیں گے۔ آپ کی توجہ اس پر نہیں ہوگی کہ اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا ہے، بلکہ آپ کی ساری توجہ اس پر مرتکز ہو جائے گی کہ آپ کس طرح اس کی برائی کو دور کریں اور اس کو ایک اصلاح یافتہ انسان بنا دیں۔

جو آدمی پہلی نوعیت کا کردار ادا کرے اس کے صبح و شام فرشتوں کی صحبت میں گزرنے لگتے ہیں۔ اور جو آدمی دوسری نوعیت کا کردار ادا کرے وہ شیطان کا ہم صحبت ہے۔ شیطان برا ہے۔ جو لوگ شیطان کی صحبت اختیار کریں وہ خود بھی برے بن جائیں گے۔ فرشتے پاکباز ہیں، جو لوگ فرشتوں کی صحبت اختیار کریں وہ خود بھی پاکباز بن جائیں گے۔

ایک سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو جنگی مقابلے پیش آئے ان میں سے ایک جنگ احد (۳ھ) ہے۔ اس جنگ میں ابتداءً اہل اسلام کو فتح ہوئی۔ مگر عین اس وقت کچھ مسلمانوں کی غلطی سے رخ بدل گیا اور مسلمان وقتی شکست سے دوچار ہوئے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے :

فأُصيب سبعون قتيلاً واشرف ابو سفيان فقال - افي القوم محمد - فقال لا تُجيبوه - فقال افي القوم ابن ابي قحافة - فقال لا تجيبوه - فقال افي القوم ابن الخطاب فقال لا تجيبوه - فقال : ان هولاء قتلوا - فلو كانوا احياء لأجابوا

(البدایہ والنہایہ ۴/۲۵)

پس مسلمانوں میں سے ستر آدمی مارے گئے۔ اور مشرکین کے سردار ابوسفیان نے بلندی سے پکار کر کہا۔ کیا قوم کے اندر محمدؐ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے جواب نہ دو۔ کہنے والے نے پھر کہا۔ کیا قوم کے اندر ابن ابی قحافہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے جواب نہ دو۔ کہنے والے نے پھر کہا۔ کیا قوم کے اندر ابن خطاب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے جواب نہ دو۔ اس کے بعد کہنے والے نے کہا : کہ یہ لوگ مارے گئے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔

جنگ احد کے بعد فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیز باتیں کہی گئیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کو ہدایت فرمائی کہ تم لوگ جوابی انداز اختیار نہ کرو، بلکہ خاموش رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔

اس سنت رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے ہیجانی مواقع پر اہل اسلام کو ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ وہ نعرہ کا جواب نعرہ سے نہ دیں۔ اس کے بجائے وہ ایسا کریں کہ یک طرفہ طور پر خاموشی اختیار کر لیں۔ اگر وہ اللہ کی خاطر چپ ہو جائیں گے تو اللہ کے فرشتے ان کی طرف سے جواب دیں گے۔ اور جن لوگوں کی طرف سے اللہ کے فرشتے جواب دیں، ان کو زیر کرنا یقیناً کسی کے بس کی بات نہیں۔

صبر: نفسیاتی قربانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں اور عیسائیوں کی اکثریت نے آپ کا انکار کیا۔ تاہم ان کے کچھ لوگ آپ پر ایمان لائے۔ ان مومنین کے بارہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب وہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کا اجر دُہرا دیا جائے گا اس پر کہ انھوں نے صبر کیا (القصص ۵۲ - ۵۴)

یہاں صبر سے مراد نفسیاتی صبر یا نفسیاتی قربانی ہے۔ مذکورہ اہل کتاب (عبد اللہ بن سلام وغیرہ) نے جس ایمان کا ثبوت دیا وہ نفسیات کی سطح پر صبر کی قربانی کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

ارشاد ہوا ہے کہ ان کو دہرا اجر دیا جائے گا۔ ایک اس بات پر کہ انھوں نے اپنی کتاب پر ایمان رکھا۔ اور دوسرا اس بات پر کہ وہ قرآن پر ایمان لائے (مرة علی ایمانهم بکتابهم ومرة علی ایمانهم بالقرآن) صفوة التفاسیر ۲/۴۳۹

پہلا ایمان ان کو اس "صبر" کی قیمت دینے پر ملا کہ انھوں نے اپنے آپ کو قومی دین سے اوپر اٹھایا اور پیغمبرانہ دین کا حامل بننے کا ثبوت دیا جو قومی روایات میں گم ہو چکا تھا۔ دوسرے ایمان کے لیے ان کو اس "صبر" کی قیمت دینی پڑی کہ انھوں نے ایک "اجنبی دین" کو پہچانا اور تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر کے اس کا ساتھ دیا۔ اس دوگونہ صبر پر وہ دہرا اجر کے مستحق قرار پائے۔

حقیقی ایمان کسی آدمی کو اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو حالات سے اوپر اٹھانے کے لیے تیار ہو۔ اس کے لیے آدمی کو اپنی قوم سے کٹنا پڑتا ہے۔ اکابر کی حمایت سے محرومی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ ظواہر سے بلند ہو کر حقائق کو دیکھنا پڑتا ہے۔ مفادات کو نظر انداز کر کے اصول کو اپنا رہنما بنانا پڑتا ہے۔

یہ ایک بے حد سخت امتحان ہے۔ غیر معمولی نفسیاتی قربانی کے بغیر اس درجہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ اس نفسیاتی صبر کے بغیر کوئی شخص حق کو نہیں پا سکتا اور نہ اعلیٰ ایمانی ترقی حاصل کر سکتا۔

ایک واقعہ

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا ایک واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آیا ہے۔ ابوسعید خدری رض کہتے ہیں کہ مدینہ میں ابوموسیٰ اشعری رض ایک بار عمر فاروق رض سے ملنے کے لیے ان کے گھر آئے۔ دروازہ پر کھڑے ہو کر انھوں نے کہا کہ آپ پر سلامتی ہو، یہ ابوموسیٰ الاشعری ہے (السلام علیکم ھذا ابوموسی الاشعری) اس طرح انھوں نے تین بار کہا۔ مگر انھیں اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔

حضرت عمر غالباً کسی کام میں مشغول تھے۔ فوری طور پر جواب نہ دے سکے۔ بعد کو جب انھیں معلوم ہوا کہ ابوموسیٰ الاشعری رض واپس چلے گئے تو اگلے دن حضرت عمر نے ان کو بلوایا اور پوچھا کہ تم واپس کیوں چلے گئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تین بار اجازت مانگے، اور پھر بھی اس کو صاحب مکان کی طرف سے اجازت نہ ملے تو اس کے بعد وہ واپس چلا جائے۔

حضرت عمر رض نے ابوموسی الاشعری رض سے کہا کہ اس قولِ رسول پر تم گواہ پیش کرو، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا (والا اوجعنك) راوی کہتے ہیں کہ میں انصار کی مجلسوں میں سے ایک مجلس میں تھا کہ وہاں ابوموسی الاشعری رض آئے۔ وہ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں عمر رض کے یہاں گیا اور تین بار سلام کیا۔ مگر اجازت نہ ملی، اس لیے واپس ہو گیا۔ اس کے بعد عمر نے مجھ سے واپسی کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی کے یہاں ملنے کے لیے جاؤ تو تین مرتبہ سلام کرو۔ اگر تین بار کے بعد اجازت نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔

عمر رض نے کہا ہے کہ تم اس حدیثِ رسول پر گواہ لے آؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہتے ہوئے سنا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو ایک معلوم بات ہے، اور اس کو بہت سے لوگوں نے سنا ہے۔ پھر ابوسعید الخدری رض

اٹھ کر ان کے ساتھ روانہ ہوئے اور حضرت عمر کے پاس پہنچ کر اس قول رسول کی تصدیق کی۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنا حکم واپس لے لیا اور کہا کہ بازار کی مشغولیت نے مجھے اس مسئلہ سے غافل رکھا (شغلني الصفق بالاسواق) فتح الباری ۱۱/۳۲

حضرت ابی بن کعب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت عمر سے کہا کہ اے عمر، تم رسول اللہ کے اصحاب پر عذاب نہ بنو۔ انھوں نے جواب دیا کہ سبحان اللہ، میں نے تو ایک بات سنی۔ پھر میں نے چاہا کہ اس کی حقیقت معلوم کروں (لا تكن عذاباً على اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم - فقال عمر، سبحان الله، إنما سمعت شيئاً فأحببت ان اتثبت) فتح الباری ۱۱/۳۲

اس روایت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص کسی سے ملنے کے لیے جائے اور صاحب مکان اس وقت اس کو ملاقات کا وقت نہ دے تو اس پر جانے والے کے دل میں ملال نہیں آنا چاہیے۔ اسلامی مزاج کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کو کسی معقول عذر پر محمول کرے اور بخوشی وہاں سے واپس چلا جائے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی اگر غلط فہمی کی بنا پر کسی کے بارہ میں ایک غیر واقعی رائے قائم کرلے تو اس پر لازم ہے کہ معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ معاملہ کی وضاحت کے بعد اپنی سابقہ رائے پر قائم رہنا مومن کا طریقہ نہیں۔

تیسری بات جو اس واقعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دوسرے شخص کے اوپر تنقید کرے، تو خواہ یہ تنقید کتنے ہی سخت الفاظ میں ہو، زیر تنقید شخص کو اسے برا نہیں ماننا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ تنقید کو ٹھنڈے دل سے سنے اور کسی اشتعال کے بغیر اصل بات کا جواب دے کر ناقد کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔

ایک سفر

۵ اجنوری ۱۹۹۲ کو مجھے حیدر آباد پہنچنا تھا۔ صبح ۴ بجے نظام الدین سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ سڑکوں پر کہر تھی۔ تاہم وہ زیادہ گہری نہیں تھی۔ گہری کہر ہو تو تیز روشنی میں بھی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح انسانی زندگی میں بھی وہ چیز ہوتی ہے جس کو عام طور پر ذہنی کہر آلودگی (befogging of minds) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم دانشور اور مسلم رہنما یہی کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنی غیر واقعی باتوں سے مسلم ذہنوں کو اتنا زیادہ کہر آلود کر رہے ہیں کہ انھیں اپنے دائیں اور بائیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآن کے مطابق، اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر ہوتا ہے۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے فضا میں ہر طرف عسر عسر کے الفاظ بکھیر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ یسر کی روشنی جلائے تب بھی الفاظ کے گہرے کہر کی وجہ سے لوگوں کو یسر کا پہلو دکھائی نہیں دیتا۔

ایرپورٹ کی بس وقت پر ایرپورٹ سے جہاز کی طرف روانہ ہوئی۔ بس کے اندر دو مسافر بات کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کچھ اس طرح تھی :

تم تلگو، میں پنجابی۔ میرا تمہارا جوڑ نہیں ہو سکتا۔ تم پانی ہو تو میں آگ ہوں۔

آندھرا اسے سے ہے۔ وہ سب سے آگے رہے گا۔

کیا بات کہتے ہو۔ پنجاب ہمیشہ آگے رہے گا۔

وہ لوگ اگرچہ مذاق میں یہ بات کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے سوچا کہ یہ صرف مذاق نہیں بلکہ حقیقت بھی ہے۔ آزادی سے پہلے ہندستان ایک تھا۔ مگر آزادی کے بعد وہ کئی ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے کی ایکتا منفی بنیاد پر تھی۔ انگریز کا مشترک خطرہ تمام گروہوں کو ایک کئے ہوئے تھا۔ جب انگریز کا لشانہ ہٹا تو سب کا تشخص الگ ہو گیا۔ ایک ملک کا باشندہ ہونے کے باوجود سب متفرق ہو کر آپس میں لڑنے لگے۔

عین یہی صورت حال پاکستان میں بھی پیش آئی۔ پاکستان کا مطالبہ ہندو خطرہ کی بنیاد پر اٹھا تھا۔ لوگ اس نعرہ پر متحد ہو گئے۔ مگر یہ منفی نعرہ تھا۔ چنانچہ جب پاکستان بن گیا تو منفی بنیاد پر متحد ہونے والے مثبت بنیاد پر متحد نہ ہو سکے۔ ہر ایک اپنا تشخص الگ قائم کر کے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگا۔

دہلی سے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۳۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ اپنے مقرر وقت پر صبح ۶ بجے جہاز روانہ ہوا۔ راستہ میں پڑھنے کے لئے آج کے اخبارات موجود تھے۔ پہلے ہی صفحہ پر یہ خبر تھی کہ احمد آباد کے قریب بس حادثہ میں ۳۵ مسافر ہلاک ہوگئے :

35 burnt to death in bus mishap.

زندگی کا سفر کتنا غیر یقینی ہے، مگر آدمی جب تک اپنے آخری انجام سے دوچار نہ ہو جائے وہ حقیقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اسٹیٹسمین (۱۵ جنوری) میں صفحہ ۶ پر ایک رپورٹ تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ سابق وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر نے الکشن مہم کے لئے انڈین ایئر فورس کے جہاز استعمال کئے۔ اس کا قرض ابھی تک ان کے اوپر باقی ہے جس کی مقدار چار کرور روپیہ ہے۔ یہ لیڈروں کے اس کرپشن کی صرف ایک بوند ہے جس نے آزادی کے بعد ملک کو اقتصادی دیوالیہ پن کے کنارے پہنچا دیا۔

روسی دانشور مسٹر الکزینڈر (Alexander Esaulov) دہلی یونیورسٹی میں ریڈر رہ چکے ہیں۔ ان کی ایک اپیل انڈین اکسپریس (۱۵ جنوری) میں دیکھی۔ اس میں انھوں نے انسانی مدد (humanitarian aid) کی اپیل کی تھی۔ انھوں نے ہندستانیوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے روسی بھائیوں کی مدد کریں جو بہت ہی زیادہ مشکل میں مبتلا ہیں :

He called on Indians to help their Russian brothers in their hour of great, very great hardship.

انھوں نے کہا تھا کہ روسیوں کو گفٹ پارسل، فوڈ اسٹف، گرم کپڑے اور دوائیں بھیجی جائیں۔ انھوں نے شکایت کی تھی کہ انڈیا نے روس کو بھیجے جانے والے گفٹ آئٹم پر پوسٹل ریٹ میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ جب کہ امریکہ نے گفٹ پارسل کے لئے ایرمیل ریٹ بہت کم کر دئے ہیں اور فرانس سے لاریوں میں بھر کر مفت سامان بھیجا جا رہا ہے۔ حالاں کہ فرانس اور امریکہ روسیوں کے لئے دشمن ملک تھے اور ہندستان اس کا دوست ملک۔

ہندستان ٹائمس (۸ جنوری ۱۹۹۲) میں انڈین ایئرلائنز کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا —— جاڑے کے موسم میں پرواز اب بھی خطرناک :

Flying in winter still hazardous

انڈیا میں ۷۵ ہوائی اڈے ایسے ہیں جہاں سردی کے موسم میں گہرے کہر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے پائلٹ رن وے کو دیکھ نہیں پاتا اور جہاز کو اتارنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا حل مشینی لینڈنگ سسٹم ہے۔ ہوائی اڈہ پر لگی ہوئی مشینیں ہوائی جہاز کو صحیح رخ کی رہنمائی دیتی ہیں اور جہاز نہایت صحت کے ساتھ رن وے پر اتر جاتا ہے۔ جاپان وغیرہ ملکوں میں ایسے آلات بنا لئے گئے ہیں جو تقریباً بے خطا (fault-free) انداز میں کام کرتے ہیں۔

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی، جو خود بھی ایک پائلٹ تھے اور اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھتے تھے، انھوں نے اس اسکیم کو منظوری دے دی تھی کہ مشینی لینڈنگ کا نظام تمام ان ہوائی اڈوں پر لگایا جائے جہاں کہر کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ معاملہ اب بھی وہیں باقی ہے جہاں وہ اس حکومتی منظوری سے پہلے ۱۹۸۵ میں تھا:

Even though former Prime Minsiter Rajiv Gandhi, who himself was a pilot, had san'ctiond the scheme for installation of instrument landing system at all the fog-prone airports, the goal remains as elusive today as it was when it first visualised in 1985-85.

وزیر اعظم کے باقاعدہ حکم کے باوجود کیوں ہندستانی ہوائی اڈوں پر سابقہ صورتحال باقی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا معیاری مشینی نظام صرف باہر کے ملکوں (مثلاً جاپان) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر انڈیا کے پاس زر مبادلہ کی شدید کمی ہے۔ اس نے ایک ہندستانی کمپنی (گجرات الکٹرانکس لمٹڈ) سے یہ مشینی نظام خریدا۔ مگر جب انھیں استعمال کیا گیا تو وہ انتہائی ناقابل اعتماد (highly unreliable) ثابت ہوئے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں حکومت کا حکم حاصل کرنا بجائے خود اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ عملی حل کے لئے دوسرے بہت سے عوامل بھی لازمی طور پر ضروری ہیں۔ اگر ان دوسرے عوامل کی مساعدت حاصل نہ ہو تو اعلیٰ سطح کے حکومتی آرڈر کے باوجود مسئلہ غیر حل شدہ حالت میں پڑا رہے گا۔

مشہور انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین (۵ اجنوری) دیکھا۔ اس میں سو سال قبل شائع ہونے والا

اسی اخبار کا اداریہ نقل کیا گیا تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــــ ڈیوک آف کلارنس کی موت:

Death of the Duke of Clarence.

ڈیوک آف کلارنس (Albert Victor) ایک برطانی شہزادہ تھا۔ وہ ۱۸۶۴ میں پیدا ہوا۔ وہ مستقبل کا بادشاہ (future king) کہا جاتا تھا۔ اس کی شادی شاہی خاندان کی ایک لڑکی سے طے ہو چکی تھی۔ ۱۰ جنوری ۱۸۹۲ کو یہ خبر آئی کہ شہزادہ کو انفلوئنزا ہو گیا ہے۔ چند دن تک شاہی مریض (royal patient) کا چرچا رہا۔ اور ۱۵ جنوری ۱۸۹۲ کو موصوف کا انتقال ہو گیا۔

ڈیوک آف کلارنس شاہانہ شادی اور برطانی تخت کے عین کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر لوگوں کو خوشن کن فخر (pleasurable pride) کا ایک احساس جھلکتا ہوا نظر آتا تھا۔ مگر مسرت واقتدار کے دروازہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی موت نے ان کو اس دنیا سے اٹھا لیا۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ دروازۂ عظمت میں داخل ہو رہا ہے۔ مگر موت اس کو یاد دلاتی ہے کہ وہ دروازۂ عجز کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔

آٹھ بجے ہندی اور انگریزی میں اعلان ہوا کہ اب سے کچھ ہی دیر بعد ہمارا ویمان حیدرآباد ایئر پورٹ پر اترے گا:

In a few minute, we shall be landing at Hyderabad.
Please fasten your seat belt.

یہ الفاظ سن کر ایسا محسوس ہوا گویا کہ موت کا فرشتہ اعلان کر رہا ہے کہ کچھ ہی دیر بعد تم آخرت کی دنیا میں اتارے جانے والے ہو۔ ایک لمحہ تاخیر کے بغیر اس کی تیاری شروع کر دو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی ہر آواز آخرت کی آواز ہے۔ مگر غافل انسان ہر آواز کو بس دنیا کی آواز سمجھتا ہے۔ وہ اس سے اپنی آخرت کے لئے سبق نہیں لیتا۔

ایئر پورٹ سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حبیب بھائی کے مکان پر پہنچا۔ حیدرآباد میں میرا قیام انھیں کے مکان پر تھا۔ یہاں لوگ آتے رہے اور ان سے الرسالہ مشن کے بارہ میں اور ملی تعمیر کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

حیدر آباد کو قطب شاہی نے ۱۵۹۱ میں آباد کیا تھا۔ اپنے وقت کا وہ نہایت خوبصورت شہر شمار کیا جاتا تھا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ وہ منصوبہ بندی اور تعمیر کا ایک حیرت ناک نمونہ تھا:

It was a marvel of planning and an architentural wonder. (9/75)

۱۶۸۵ میں مغل حکمراں اورنگ زیب نے حیدر آباد کو سلطنت دہلی میں شامل کرلیا۔ مگر اس کوشش میں شہر برباد ہوگیا۔ دو سو سال تک شہر ایسا ہی پڑا رہا۔ جب مغل سلطنت کو زوال ہوا اس وقت آصف جاہ نظام الملک مغلوں کی طرف سے یہاں کا گورنر تھا۔ اس نے آزادی کا اعلان کرکے حیدر آباد پر قبضہ کرلیا۔ اس عمل میں اولاً فرانچ اور اس کے بعد برٹش نے اس کی مدد کی۔ ریاست نظام نے حیدر آباد میں ترقی کے بہت سے کام کئے۔

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد رضاکار تحریک نے دوبارہ حیدر آباد کو تباہ کیا۔ نااہل لیڈروں نے حیدر آباد کو صرف بربادی کا تحفہ دیا تھا۔ تاہم حالات کے دباؤ کے تحت کچھ افراد کے اندر حرکت پیدا ہوئی۔ ملی سطح پر اگرچہ یہاں کی قوم لیڈروں کے ناعاقبت اندیشانہ انجام کی شکار ہے۔ تاہم افراد کی سطح پر آپ کو یہاں ایسے لوگ ملیں گے جو اپنے ذاتی دائرہ میں مختلف میدانوں میں ترقی کر رہے ہیں۔

ریاست کے دور میں حیدر آباد میں صدر الصدور کا عہدہ ہوا کرتا تھا جو تمام امور مذہبی کا نگراں ہوتا تھا۔ آصف جاہ سابع نے جب جامعہ عثمانیہ کے قیام کا ارادہ کیا تو اس وقت مولانا انوار اللہ خاں صدر الصدور تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کو دینی لحاظ سے مضر بتا کر اس کی مخالفت کی اور والیٔ دکن کو اس سے باز رکھا۔ مولانا موصوف کے انتقال کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن شروانی صدر الصدور مقرر ہوئے تو انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی پرزور حمایت کی۔ انھیں کے زمانہ میں اس کا قیام ہوا۔ اندرونی اختلافات کی بنا پر ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ کو انھوں نے اس عہدہ سے استعفا دے دیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے مولانا عبد الباری ندوی کو جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے شعبہ کا استاد مقرر کردیا۔ اس پر دربار کے لوگوں نے والیٔ دکن کو یہ شکایت پہنچائی کہ شروانی صاحب نے ایک ایسے شخص کو فلسفہ کا پروفیسر مقرر کیا ہے جس کے پاس اس مضمون کی کوئی ڈگری نہیں۔ والیٔ دکن میر عثمان علی خاں نے باز پرس کی تو مولانا شروانی نے مولانا عبد الباری ندوی کے رسالہ "مذہب

وعقلیات" کے ساتھ ایک خط والائی دکن کو بھیجا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ میں نے فلسفہ کے شعبہ کے لئے ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جس کے ہاتھ پر فلسفہ مشرف بہ اسلام ہوا ہے (قومی آواز ۸ مارچ ۱۹۹۲)

یہاں حبیب بھائی کے ذاتی کتب خانہ میں ایک کتاب دیکھی۔ وہ بزنس مینجمنٹ کے موضوع پر تھی۔ اس نام یہ ہے:

The Art of Japanese Management,
by Anthony G. Athos, and Richard Tanner Pascale.

اس کتاب میں بہت سی کام کی باتیں تھیں۔ اس کتاب کا خلاصہ اس کے اس جملہ میں تھا کہ کوالیٹی کبھی اتفاقی طور پر حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ہوشمندانہ محنت کا نتیجہ ہوتی ہے:

Quality is never an incident. It is always the result of intelligent ettort.

حبیب بھائی گوا گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک مسیحی پادری سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ ہر آدمی ایک باپ سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ بھی ایک باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر عیسیٰ مسیح کا کوئی باپ نہیں وہ براہ راست خدا سے پیدا ہوئے۔ ہم اور آپ انسان کے بیٹے ہیں۔ مگر عیسیٰ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔

حبیب بھائی نے کہا کہ مسیح کی تو پھر بھی ایک ماں تھی۔ مگر آدم کی تو نہ ماں تھی اور نہ باپ۔ اس لیے آپ کے اصول کے مطابق آدم زیادہ حقیقی طور پر خدا کے بیٹے تھے۔ اس لئے آپ کو ماننا چاہیے کہ آدم خدا کے بیٹے تھے اور بقیہ انسان آدم کے بیٹے، اس لئے آپ کے اصول کے مطابق، میں خدا کا پوتا ہوا:

So Aaam was the son of God, and I am a grandson of God.

یہ سن کر پادری چپ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دے — حق تمام حقیقتوں کے مطابق ہے اور باطل تمام حقیقتوں کے غیر مطابق۔ یہی حق کی سب سے بڑی طاقت ہے اور یہی باطل کی سب سے بڑی کمزوری۔

ایک گجراتی بچہ بڑا ذہین تھا۔ کچھ بڑے لوگ بیٹھے ہوئے بات کر رہے تھے۔ ہر ایک اپنی

کامیابیوں کو بیان کر رہا تھا۔ بچہ خاموش سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا: اصل مشکل تو زیرو سے ایک تک پہنچنا ہے۔ اس کے بعد گیارہ تو اپنے آپ آتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہی اصول الرسالہ مشن پر صادق آتا ہے۔ اس مشن کے سلسلہ میں اصل مشکل اس کو زیرو سے ایک تک لانا تھا۔ اب خدا کے فضل سے وہ ایک تک پہنچ چکا۔ اس کے بعد ایک کا گیارہ بننا خود اپنے زور پر ہوتا ہے اور وہ انشاء اللہ ہو کر رہے گا۔

کرنل جے بی سیٹھی بزنس ایگزیکیٹو ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے سماج میں ہزاروں لوگ (مثلاً مارواڑی وغیرہ) ہیں جن کے پاس کوئی بزنس ایجوکیشن نہیں۔ اس کے باوجود وہ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے غور کیا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ حبیب بھائی نے جواب دیا کہ اس کا خاص سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے کھونے کا اندیشہ (fear of loosing) سہارے والے آدمی کو کھونے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ جب کہ بے سہارا آدمی ہر لمحہ کھونے کے اندیشہ میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قسم کے لوگ ہمیشہ زیادہ ترقی کرتے ہیں۔

ایک مجلس میں حبیب بھائی نے کہا کہ تمام کامیابیوں کی کنجی سنجیدگی (sincerity) ہے۔ مصطفیٰ صدیقی صاحب نے اس کی تکمیل کرتے ہوئے کہا کہ دو چیز ہے جو آدمی کو سنجیدہ بناتی ہے — شوق یا ڈر۔ یہ بات لفظ بلفظ صحیح ہے۔ اسی شخص سے گہرے عمل کا صدور ہوتا ہے جس کے اندر یا تو شوق کی آگ لگی ہوئی ہو یا ڈر کی نفسیات نے اس کو اندر سے ہلا رکھا ہو۔

۱۵ جنوری کو میں حیدرآباد پہنچا تھا۔ یہاں پہلا اجتماع ظہر کی نماز کے بعد عزیز باغ میں ہوا۔ یہ شہر کے قارئین الرسالہ کا اجتماع تھا۔ اس میں خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو عوامی احساسات کی بنیاد پر یا کوئی برننگ اشو لے کر اٹھے۔ ایسی تحریک کی آواز کو لوگ فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ بہت جلد اس کے گرد بھیڑ لگ جاتی ہے۔ مگر الرسالہ ایک نامانوس پیغام کو لے کر اٹھا ہے۔ اس لئے اس کو قابل فہم بنانے کے لئے پہلے ہمیں لوگوں کا ذہن بنانا ہوگا۔

موجودہ حالات میں اگر الرسالہ کے پیغام پر عوامی بھیڑ جمع نہیں ہو رہی ہے تو اس پر کسی تعجب کی ضرورت نہیں۔ دوسرے پیغامات کے لیے سماج میں تیار ذہن (prepared mind) موجود ہے۔ جب کہ الرسالہ کے لئے خود ہم کو ذہن تیار کرنا ہے۔ جس دن یہ کمی پوری ہوگی اسی دن

انشاءاللہ الرسالہ کی آواز ہی لوگوں کے لئے واحد قابل توجہ آواز بن جائے گی۔ اور حالات بتاتے ہیں کہ اس دور کا اب آغاز ہو چکا ہے۔

۵ا جنوری کو تقریباً نصف دن حیدر آباد میں گزارنے کے بعد محبوب نگر کے لئے روانگی ہوئی۔ میں نے اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے پوچھا کہ روڈ اکسیڈنٹ سے بچنے کا راز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ دوسرا اگر ہٹنے کے لئے تیار نہ ہو تو اپنے آپ کو سامنے سے ہٹا دینا۔ میں نے سوچا کہ کار کا یہ گمنام ڈرائیور زندگی کے مسائل کو جس طرح جانتا ہے، ملت کے مشہور ڈرائیور اس راز کو کیوں نہیں جانتے۔ دل نے جواب دیا کہ گم نام ڈرائیور اپنی فطرت پر ہے، جب کہ مشہور ڈرائیور اپنی استحصال پسند ذہنیت کی بنا پر فطرت سے بہت دور چلے گئے ہیں۔

۵ا جنوری کی شام کو ہمارا قافلہ محبوب نگر پہنچا۔ یہاں تین دن قیام رہا۔ اس دوران ملاقاتوں کے علاوہ مسلسل خطابات کا سلسلہ جاری رہا۔ بیشتر خطابات کریسنٹ پبلک اسکول میں ہوئے۔ ایک عمومی خطاب مدرسہ سراج العلوم میں ہوا۔ یہ تمام خطابات دعوتی اور تربیتی موضوعات پر تھے۔ حیدر آباد اور محبوب نگر کے علاوہ قریبی مقامات کے لوگ بھی اس تربیتی کیمپ میں شریک تھے۔ خطابات کا خلاصہ اگلے صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

محبوب نگر کے سفر کا خاص مقصد یہاں کے تربیتی کیمپ میں شریک ہونا تھا۔ یہ تربیتی کیمپ مولانا امیر اللہ خاں صاحب، مولانا سید اکبر الدین قاسمی اور جناب احمد بختیار الدین ایم ایس سی کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔

یہ تربیتی کیمپ اپنی نوعیت کا منفرد کیمپ تھا۔ موجودہ سفرنامہ میں اس کا تفصیلی نقشہ پیش کرنا مشکل ہے۔ دوسرے پروگراموں کے علاوہ اس موقع پر ایک درجن خطابات ہوئے۔ ان خطابات میں جو باتیں کہی گئیں اور سوالات کے جوابات دئے گئے ان کا خلاصہ اگلے صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

محبوب نگر کے تربیتی اجتماع کے موقع پر الرسالہ اکیڈمی، آندھرا پردیش کی طرف سے ۳۲ صفحات کا ایک پمفلٹ چھاپا گیا تھا جو لوگوں کے درمیان مفت تقسیم کیا گیا۔ اس کا نام تھا — تاریخ دعوت حق: اہمیت، ضرورت اور تقاضے۔ اس پمفلٹ میں الرسالہ کی کچھ تحریریں جمع کی گئی تھیں۔ آغاز میں

جناب احمد بختیار الدین صاحب کی طرف سے ایک "ابتدائیہ" شامل تھا۔ لوگوں نے اس کو کافی پسند کیا۔

مولانا عبدالقدیر قاسمی (خطیب مسجد عابدین، ناندیڑ) نے بتایا کہ ناندیڑ میں ہر سال شیوجینتی کا جلوس نکلتا ہے جو ان کی مسجد کے سامنے سے گزرتا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جلوس گزرنے کے وقت مسلم نوجوان مسجد کے سامنے جمع ہو جاتے۔ جلوس والے ان کو دیکھ کر نعرے لگاتے۔ اس سے جوان مشتعل ہو جاتے اور ٹنشن کی صورت پیدا ہو جاتی۔

۱۹۹۰ میں مولانا عبدالقدیر صاحب نے مسلم نوجوانوں کو سمجھایا کہ جس نعرہ پر تم غصہ ہوتے ہو وہ نعرے دراصل اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ تم جلوس کے وقت مسجد کے سامنے سڑک پر جمع ہو جاتے ہو۔ تم کو دیکھ کر جلوس والوں کو جوش آتا ہے اور وہ نعرے کی صورت میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر تم وہاں کھڑے نہ ہو تو ان کے نعرے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔

مولانا عبدالقدیر صاحب کئی دن تک مسلم نوجوانوں کو سمجھاتے رہے۔ آخر کار وہ راضی ہو گئے ۱۹۹۰ میں حسب معمول شیوجینتی کا جلوس آیا۔ وہ سڑک سے گزرتا ہوا مسجد کے سامنے پہنچا۔ مگر اس بار وہاں کوئی مسلمان موجود نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس والے بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ خلاف معمول اس بار انھوں نے مسجد کے سامنے کوئی نعرہ نہیں لگایا۔ بس سڑک سے گزرتے ہوئے آگے چلے گئے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ اُن واقعات کو ابتدائی مرحلہ ہی میں ختم کر دیا جائے جو بڑھ کر فرقہ وارانہ فساد تک پہنچ جاتے ہیں اور جان و مال کی تباہی کا سبب بنتے ہیں

محمد عبدالقادر صاحب (پیدائش ۱۹۵۵) پولٹری کی تجارت کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کے مواقع موجود ہیں۔ تعصب ہمیشہ مصنوعی ہوتا ہے۔ آپ ہوشیاری کے ساتھ تعصب کی ہر دیوار کو گرا سکتے ہیں۔

انھوں نے اپنے کئی تجربات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ۱۹۸۳ میں بنک سے ایک لاکھ روپیہ قرض لے کر پولٹری فارم کھولا۔ ابھی اس کی قسطیں ادا نہیں ہوئی تھیں کہ ۱۹۸۵ میں میں نے دوبارہ بنک کو مزید قرض کی درخواست دی۔ مقامی بینک منیجر سخت متعصب تھا۔ اس نے چاہا کہ مجھے قرض نہ ملے اور میرا کاروبار فیل ہو جائے۔

اس درمیان میں زونل منیجر حیدرآباد سے یہاں آنے والا تھا۔ وہ ان فارموں کا معائنہ کرنا چاہتا تھا جنھوں نے ہمارے یہاں بینک سے قرض لیا ہے۔ ایک ہندو جو پولٹری فارم چلا رہا تھا اس نے بھی مزید قرض کی درخواست دی تھی۔ منیجر نے اس ہندو کو دو ہفتہ پہلے بتا دیا تھا کہ زونل منیجر آنے والے ہیں تم فاؤنڈیشن اسٹون کا انتظام کرلو۔ دوسری طرف عبدالقادر صاحب سے کچھ نہیں بتایا۔ ان سے زونل منیجر کی آمد کو چھپایا۔

جب آخری وقت آگیا اور معلوم ہوا کہ وہ کل آنے والے ہیں تو آج شام کو عبدالقادر صاحب کو بلا کر کہا کہ کل زونل منیجر آرہے ہیں تم اگر قرض لینا چاہتے تو فاؤنڈیشن اسٹون کا انتظام کرلو۔ اس کے ذہن میں یہ نقشہ تھا کہ اتنے کم وقت میں عبدالقادر صاحب انتظام نہ کرسکیں گے اور ان کے قرض کی درخواست بھی رد ہو جائے گی۔ مگر عبدالقادر صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ اس دن انھوں نے ساری رات کام کیا اور فاؤنڈیشن اسٹون کا شاندار طور پر انتظام کرلیا۔ اگلے دن زونل منیجر آیا تو ہندو فارم پر معمولی انتظام تھا۔ چنانچہ وہاں وہ صرف پانچ منٹ رکا۔ مگر عبدالقادر صاحب کے فارم پر وہ ایک گھنٹہ تک ٹھہرا رہا۔ ان کے کام کی بہت تعریف کی اور فوراً ان کے قرض کی رقم جاری کردی۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمل کی طاقت سازش کی طاقت سے زیادہ ہے۔ اگر آپ کے پاس عمل کی طاقت ہو تو آپ ہر سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ سازش خود آپ کی ترقی اور کامیابی کا زینہ بن جائے۔

مفتی سید تمیز الدین قاسمی (ناندیڑ) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کو الرسالہ سے سب سے پہلے ایک ہندو افسر نے متعارف کرایا تھا۔ یہ مسٹر اروند پانڈے (اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ) ہیں۔ وہ انگریزی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کئی مسلمانوں کے پاس الرسالہ کا اردو ایڈیشن حاصل کرکے بھجوایا۔ اور کہلایا کہ یہ ایک اچھا رسالہ ہے، اس کو آپ لوگ پڑھیں۔ انھیں میں سے ایک مفتی سید تمیز الدین قاسمی بھی ہیں۔ ان کو بھی مسٹر اروند کے ذریعہ الرسالہ ملا۔ اور پھر انھوں نے مسلسل اس کو پڑھنا شروع کردیا۔

۱۹ جنوری کی شام کو محبوب نگر سے دوبارہ حیدرآباد کے لئے واپسی ہوئی۔ یہاں ۱۹ - ۲۰ جنوری کے درمیان کئی پروگرام ہوئے۔ فتح منزل میں ایک تفصیلی خطاب تھا جس میں ایمان واسلام

ا حقیقت واضح کی گئی۔

جہانگیر پلازا کے ہال میں عمومی اجتماع ہوا۔ یہاں خطاب کا موضوع "اسلام اور امن عالم" تھا۔

بینہ ایجوکیشن سنٹر میں دو پروگرام ہوئے۔ ایک، پریس کانفرنس۔ اور دوسرے، شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ فراد کا اجتماع جس میں سوال و جواب کی صورت میں گفتگو ہوئی۔ سوال و جواب مجموعی طور پر اگلے صفحات یں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۲ کو مدرسہ ریاض الاسلام کے سنگ بنیاد کی تقریب میں شرکت کی۔ یہاں ایک عمومی جلسہ ہوا جس میں میری بھی ایک مفصل تقریر ہوئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبد القدوس زبعمی نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں ایک مدرسہ کے ساتھ تعاون کرتا تھا۔ یہ ۱۹۵۰ کی بات ہے۔ ایک تاجر گیارہ روپے سال مجھے مدرسہ کا چندہ دیا کرتے تھے۔ اگلے سال میں ان کے یہاں چندہ کے لئے گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم وہابی ہو۔ ہم وہابیوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں تم کو چندہ نہیں دوں گا۔

ڈاکٹر عبد القدوس صاحب نے ان سے کہا کہ آپ جیسے بہت سے لوگ مجھے کافر سمجھتے ہیں۔ مگر کسی نے اب تک میرے منھ پر یہ بات نہیں کہی تھی۔ آپ نے میرے منھ پر مجھ سے یہ بات کہہ دی۔ یہ آپ کے اخلاص کا ثبوت ہے۔ میں آپ کو مومن و مخلص سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبد القدوس صاحب نے مذکورہ تاجر کا ہاتھ پکڑ کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور کلمہ شہادت ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ گواہ رہیں، آج میں آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہوں۔

اس واقعہ نے مذکورہ تاجر کو بہت متاثر کیا۔ اس نے اپنے آدمی کو بلا کر کہا کہ گیارہ روپیہ انھیں دے دیدو۔ ڈاکٹر عبد القدوس صاحب نے کہا کہ میں اس کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ آپ نے "کفر" کی حالت میں مجھ کو گیارہ روپے سال دیا۔ اب "ایمان" کی حالت میں بھی کیا آپ مجھ کو وہی گیارہ روپے دیں گے۔ انھوں نے کہا پھر اور کتنا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ایک سو گیارہ روپیہ سال۔ انھوں نے فوراً ایک سو گیارہ روپے نکال کر پیش کر دئے۔

جامعہ ریاض الاسلام کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ یہ ادارہ تقریباً دس سال سے حیدر آباد شہر میں دینی تعلیمی اور اسلامی تربیت کی خدمات اپنے محدود وسائل کے مطابق انجام دے رہا ہے۔ جہاں حفظ، ناظرہ، قاعدہ تجوید کے علاوہ دینیات، حساب، اردو، انگلش اور تلگو کی تعلیم کا نظم ہے۔ شہر کے علاوہ

ہات وقصبات کے طلبا قیام وطعام کی سہولت کے ساتھ تعلیم وتربیت حاصل کر رہے ہیں ، غریب ، یتیم طلباء
کفالت مدرسہ کی جانب سے کی جاتی ہے ۔ اس وقت مدرسہ اوپل کی قدیم بستی کے ایک سفال پوش
ایہ کے مکان میں چل رہا ہے جو مدرسہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے اعتبار سے ناکافی ہے ۔ عرصے سے ضرورت
سوس کی جارہی تھی کہ ایک کشادہ آراضی پر مدرسہ کی تعمیر کی جائے جس پر ، درس گاہیں ، ہاسٹل ، دفاتر ،
لیخ کے علاوہ کھیل کود کے لئے میدان ہو ، چنانچہ اس منصوبے کے تحت ۲ ہزار گز آراضی اوپل بس ڈپو سے
فاصلے پر میونسپل حدود میں خرید کر مدرسہ کے نام رجسٹری کرائی گئی ہے اور ایک مخیر خاتون نے اپنے مرحوم
وہر کے ایصال ثواب کی خاطر زمین پر بورویل کا نظم کر دیا ہے ، جس پر جٹ پمپ اور کمرے کی تعمیر بھی ہو چکی
ہے ۔ اور ایک تجربہ کار آرکٹیکٹ کے ذریعہ نقشہ تیار کرایا گیا اور تعمیر کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے ۔ اس منصوبہ کی
یل کے لئے تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی ۔

۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد سابق ریاست حیدر آباد میں جو تباہی آئی تھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں
ے لئے فریاد و ماتم کا موضوع بنی رہی ۔ اس کے بعد یہاں کے مسلمانوں میں بیداری آئی ۔ انھوں نے
تلف اقتصادی شعبوں میں اپنی محنت سے داخل ہونا شروع کیا ۔ دینی تعلیم اور سیکولر تعلیم کے ادارے
ئم کئے جانے لگے ۔ یہاں تک کہ اب حیدر آباد میں اتنی کثرت سے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے ہیں کہ حیدر
باد کو مسلمانوں کا تعلیمی ایمپائر کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا ۔ میرا اندازہ ہے کہ حیدر آباد کے مسلمان
ج اس سے بھی زیادہ بہتر حالت میں ہیں جیسا کہ وہ ۱۹۴۷ سے پہلے تھے ۔ ریاست پر بھروسہ سے انھیں
ے جتنا پایا تھا ۔ اس سے زیادہ انھوں نے اپنے آپ پر بھروسہ سے پالیا ۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۲ کو میں جامعہ ریاض الاسلام کی نئی عمارت کی سنگ بنیاد کی تقریب میں شریک تھا ۔
ھوڑے فاصلہ پر ایک بلند اور شاندار عمارت نظر آئی ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک مسیحی ادارہ ہے ۔
سیحی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لئے قائم کیا گیا ہے ۔

اس کے بعد میں نے جلسہ میں جامعہ ریاض الاسلام کے ذمہ داروں کی تقریریں سنیں ۔ ان تقریروں میں سامنے
کھائی دینے والے بلند مسیحی ادارہ کے خلاف کوئی احتجاج نہ تھا ۔ تقریروں کا سارا خلاصہ یہ تھا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ
ہاں ایک عظیم اسلامی ادارہ بنا کر کھڑا کر دیں جو دور تک اسلام کی روشنی پھیلانے کا ذریعہ بن جائے ۔ میں
نے کہا کہ یہی مطلب ہے اس قدیم مثل کا کہ کسی کی لکیر کو چھوٹا ثابت کرنے کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ

ہے کہ تم اپنی لکیر کو بڑا کر دو۔ اس کے بعد دوسرے کی لکیر اپنے آپ چھوٹی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر عزیز احمد خاں صاحب ایڈووکیٹ سے ملاقات ہوئی۔ ان کے خاندان کے تمام لوگ اچھے تعلیم یافتہ ہیں۔ اور اس کا کریڈٹ خود عزیز احمد خاں صاحب کو حاصل ہے۔

انھوں نے کہا کہ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں عام طور پر لوگ اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو کسی اچھے اسکول میں داخل کر دو اور مزید ضرورت ہو تو ان کے لیے ٹیوٹر مقرر کر دو۔ مگر بچوں کی صحیح تعلیم کے لیے ماں باپ کو ان کے ساتھ محنت کرنا بہت ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں عزیز احمد خاں صاحب نے کامیاب تجربہ کیا ہے۔ وہ پانچ سال کی عمر سے بچوں پر محنت شروع کر دیتے ہیں۔ ان کو گھر میں آسان انداز میں ضروری باتیں بتاتے ہیں۔ کہانیوں کے ذریعہ ان کے اندر اخلاقی احساس ابھارتے ہیں، وہ ماحول کی چیزوں کو بتا کر مختلف فنون سے انھیں آشنا کرتے ہیں۔ مثلاً سورج، چاند اور ستارے کے ذریعہ فلکیات، موٹر کی پلیٹ نمبروں کے ذریعہ ریاضی، عمارتوں کے ذریعہ انجینیرنگ، اشتہاری بورڈوں کے ذریعہ تجارت، ندی پہاڑ، جنگل کے ذریعہ جغرافیہ، کہانیوں کے ذریعہ تاریخ، وغیرہ۔ اس طرح وہ بچوں کو ہر روز کئی کئی گھنٹے پڑھاتے ہیں۔ اور تیار کر کے ان کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد حسب استعداد آگے کی تعلیم میں بڑھاتے ہیں۔ ان کے گھر کے اکثر بچوں نے امتیاز کے ساتھ امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے۔

انھوں نے کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم بھی بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ یہی لڑکیاں مائیں بن کر بچوں کی پہلی معلم بنتی ہیں، اَن پڑھ ماں کے بچہ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ بچہ اپنی ابتدائی عمر میں ماں کے قریب پرورش پاتا ہے۔ اور ماں جب علم کے چراغ سے محروم ہو تو اس کے بچوں کو کس طرح علم کی روشنی ملے گی۔

وہ اکثر اپنے بچوں کو باہر لے جاتے ہیں۔ کہیں نظر آیا کہ مزدور لوگ دھوپ اور مٹی میں مشقت کے ساتھ کام کر رہے ہیں تو بچوں سے کہا کہ دیکھو، انھوں نے پڑھا نہیں، اس لیے اب وہ مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ کسی کو لڑتے ہوئے دیکھا تو بتایا کہ دیکھو، اس نے علم حاصل نہیں کیا۔ اس لیے اس کو زندگی کا طریقہ نہیں معلوم۔ اب وہ غیر ضروری طور پر لوگوں سے لڑ رہا ہے۔ بچہ کا گھر اس کی پہلی تعلیم گاہ ہے۔ گھر اگر تعلیم گاہ نہ بنے تو صرف باہر کا ادارہ اس کی تعلیم کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

خبر نامہ اسلامی مرکز ۸۶

۱ اجتماع کے پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے بھوپال کا سفر کیا۔ ۲۲ اکتوبر سے ۲۸ اکتوبر تک کے درمیان وہاں متعدد خطابات ہوئے اور سوال وجواب کی شکل میں لوگوں سے گفتگوئیں ہوئیں۔ اس کی روداد "اجتماع نومبر" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بھوپال کے اجتماع کی مکمل روداد انشاء اللہ اجتماع نمبر کی صورت میں آئندہ الرسالہ میں شائع کی جائے گی۔

۲ الرسالہ کو اللہ کے فضل سے یہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ جو شخص بھی اس کا ایک دو شمارہ پڑھتا ہے وہ اس کا مستقل قاری بن جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو روزانہ خطوط ملتے رہتے ہیں۔ ایک مفصل خط کی دو سطریں یہ ہیں:

I have gone through a few issues of Al-Risala and wish to subscribe. Please send me the details of your yearly subscription. (Avinash Bodhankar, Director, Copewatch Foundation, Pune).

۳ گول مارکٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ اصحاب کے ایک اجتماع میں درس دیا گیا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بتایا گیا کہ اسلام میں مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اہل اسلام کے لئے ہر حالت امید کی حالت ہے۔

۴ ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۲ کو اسلامک اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن کے ایک اجتماع میں تقریر کی گئی۔ تقریر کا موضوع تھا: اسلامی دعوت کے جدید امکانات۔ تقریر کے آخر میں سوال وجواب ہوا۔ یہ پروگرام تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک رہا۔ اس تقریر کا آڈیو ٹیپ اسلامی مرکز میں موجود ہے۔

۵ یکم نومبر ۱۹۹۲ کو نیو فرینڈز کالونی (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس میں حدیث کا درس دیا گیا۔ ان حدیثوں کا تعلق زیادہ تر اخلاقیات اور حقوق العباد سے تھا۔ درس کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ اس درس کا آڈیو ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۶ نرنکاری مشن کے انگریزی ماہنامہ سنت نرنکاری (نومبر ۱۹۹۲) نے انگریزی الرسالہ کا ایک مضمون (The Precipice) نقل کیا ہے۔ اس مضمون میں حیات دنیا کے مقابلہ میں حیات آخرت کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اکثر جرائد الرسالہ کے مضامین چھاپتے رہتے ہیں اور

اس طرح اس کا پیغام وسیع تر حلقہ میں پہنچ رہا ہے۔

۷ آکاشں وانی ناگپور نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۵ نومبر ۱۹۹۲ کو نشر کی۔ اس تقریر کا عنوان تھا : ترقی کا راز۔ دس منٹ کی اس تقریر میں بتایا گیا تھا کہ اس دنیا میں کوئی فرد یا قوم اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب کہ وہ اعراض کے اصول پر عمل کرے۔ اس کے بغیر اس کا سفر تباہی کے گڑھے کے سوا کہیں اور نہیں پہنچ سکتا۔

۸ الرسالہ فورم کی شکل میں ایک ملی فورم کی تشکیل ہو چکی ہے۔ فورم کی طرف سے یہ اپیل جاری کی گئی ہے کہ ہر جگہ کے تعمیر پسند مسلمان "الرسالہ فورم" کی صورت میں اپنا مقامی حلقہ بنائیں اور مثبت تعمیری انداز میں ملی مسائل کے حل کی تدبیر اختیار کریں۔ اس سلسلہ میں ضروری ہدایات اور مشورہ مرکز سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۹ ترنم روحی صاحبہ آسنسول سے لکھتی ہیں : ماہنامہ الرسالہ پابندی سے مطالعہ کر رہی ہوں۔ میری ایک غیر مسلم سہیلی دارجلنگ میں رہتی ہیں۔ ان کی زبان بنگلہ ہے۔ میں ہر مہینہ الرسالہ کے کچھ مضامین بنگلہ میں ترجمہ کر کے ان کے پاس بھیجتی ہوں۔ اس سے وہ کافی متاثر ہیں۔ ہر ماہ وہ بنگلہ شدہ مضامین کا شدت سے انتظار کرتی ہیں۔ اس سے الرسالہ کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۰ صدر اسلامی مرکز نے اردو سماچار کی دعوت پر ناگپور کا سفر کیا۔ چند روزہ قیام میں وہاں مختلف اجتماعات میں خطاب کیا اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۱ ۳ دسمبر اور ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ کو آل انڈیا ریڈیو سے دو تقریریں نشر کی گئیں۔ ایک تقریر کا عنوان تھا : حوصلہ مندی۔ اور دوسری تقریر کا عنوان تھا : حقیقت پسندی۔ دونوں تقریروں میں زندگی کی تعمیر سے متعلق سبق آموز باتیں پیش کی گئیں۔ یہ تقریریں آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائیں گی۔

۱۲ لاہور سے مولانا صدیق شاہ بخاری ایک خط میں لکھتے ہیں : عرصہ سے آپ کی تحریروں کا قاری ہوں۔ اور اس کو پڑھ کر اللہ کی حمد و شکر کرتا ہوں۔ ہم چند دوست یہاں جامعہ الحرم کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ تشکیل دے رہے ہیں۔ اس کا بنیادی آئیڈیا آپ کی تحریروں سے

ہی ماخوذ ہے"۔ ایسے اداروں کے قیام کی خبریں مختلف مقامات سے موصول ہو رہی ہیں۔

۱۳ الرسالہ کے ایک قاری نے اطلاع دی ہے کہ وہ "اسلامک انفارمیشن سروس" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ٹیلیفون نمبر کے ساتھ اخباروں میں اس مضمون کا اشتہار شائع کر رہے ہیں کہ جو لوگ اسلام پر معلومات یا لٹریچر چاہتے ہوں وہ ٹیلیفون پر مطلع کریں۔ ان کو مطلوبہ چیز فراہم کر دی جائے گی۔ یہ سلسلہ ہر شہر میں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۴ الرسالہ انگریزی کے شمارہ جولائی ۱۹۹۲ میں "سوشل جسٹس اِن اسلام" کے نام سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ جناب ایم ٹی خان صاحب نے پٹنہ سے اطلاع دی ہے کہ انھوں نے اس مقالہ کی کاپیاں تیار کرائیں اور ان کو عدالت کے لوگوں میں اور قانون داں حلقہ میں تقسیم کیا۔ اسی طرح مختلف مقامات پر لوگ اردو، انگریزی، ہندی کے مضامین فوٹو کاپی کرکے تقسیم کرتے ہیں۔

۱۵ بمبئی سے جناب فاروق فیصل صاحب نے خبر دی ہے کہ محترمہ بیگم ڈاکٹر نائک کی رہنمائی میں وہاں حلقہ خواتین قائم کیا گیا ہے اور الرسالہ فورم کے مقاصد کے تحت خواتین میں کام کا نقشہ بنایا گیا ہے۔ اس طرح کی خبریں دوسرے مقامات سے بھی مل رہی ہیں۔

۱۶ محمد ابو طالب رحمانی صاحب (بنگلور) لکھتے ہیں کہ میں الرسالہ کے مشن کو اس طرح پھیلا رہا ہوں کہ اپنے بعض دوستوں کو اس کا ممبر بنایا ہے۔ اسی طرح میں اپنے تمام دوستوں کو الرسالہ کا قاری یا اس کا مستقل ممبر بنانا چاہتا ہوں۔ یہ ایک فطری اور صحیح طریقہ ہے۔ اسی طرح الرسالہ سے اتفاق رکھنے والے تمام لوگوں کو اپنے اپنے حلقہ احباب میں الرسالہ کی اشاعت کرنا چاہئے۔

۱۷ "پیغمبر انقلاب" زیر مطالعہ ہے۔ میری ناقص نظر اور مطالعہ میں دعوتی نقطۂ نظر سے سیرت پر یہ پہلی کتاب ہے۔ عربی کا وسیع ذخیرہ واقعات کا مجموعہ ہے تو اردو انگریزی وغیرہ میں لکھی گئی کتابیں خود مؤلف کے کسی خاص نقطۂ نظر کی حامل۔ لیکن رسولِ انقلاب کی سیرت، انقلابی دعوت کو اجاگر کرنے کے لئے شاید اللہ رب العزت نے صرف آپ کو توفیق دی۔ اللہ آپ کو اس کا بہتر سے بہتر بدلہ ضرور نصیب فرمائے گا (ظفر ندوی، پربھنی)

۱۸ "علماء اور دورِ جدید" اب ان شاء اللہ مئی ۱۹۹۳ میں شائع ہوگا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 60	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 110	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 150	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 240	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 300	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مارچ ۱۹۹۳، شمارہ ۱۹۶

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)
Single Copy Rs 6; Annual Subscription Rs 72/ $25 (Air-mail)

ایک نشانی

پچھلے روز ایک لیڈر کا انتقال ہوگیا۔ آج ٹی وی پر اس کے حالات دکھائے گئے۔ اتفاق سے مجھے اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کل کے اخبار میں میں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ آج میں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ وہ چل رہا ہے۔ وہ تقریر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے ملاقات اور بات چیت کر رہا ہے۔ اس طرح دیر تک ٹی وی پر اس کی زندگی دکھائی دیتی رہی۔

اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ٹی وی مجھ سے یہ کہہ رہا ہو کہ جس آدمی کو تم نے سمجھا تھا کہ وہ مر گیا، وہ مرا نہیں۔ وہ اب بھی زندہ حالت میں موجود ہے۔ وہ اب بھی ٹھیک اسی طرح زندہ ہے جیسا کہ وہ موت کا واقعہ پیش آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اگر تم کو "ٹی وی" کی نگاہ حاصل ہو جائے تو آج بھی تم اس کو پہلے کی طرح چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہو۔

ٹی وی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں کو دکھا رہا ہے۔ وہ آج محدود طور پر ان چیزوں کو ظاہر کر رہا ہے جو آئندہ مکمل طور پر تمام لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔ وہ گویا کل مشاہدہ سے پہلے حقائق کا جزئی مشاہدہ ہے۔

آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ بچہ سے بڑا ہوتا ہے۔ صبح و شام کی صورت میں اس کے دن گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا آخر وقت آجاتا ہے۔ وہ دنیا کے ماحول سے نکال لیا جاتا ہے تاکہ اس کو آخرت کے ماحول میں بسایا جائے اور اس کے اعمال کے مطابق اس کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے۔

ہر وہ شخص جو پیدا ہوا ہے، وہ ضرور ایک دن موت سے دوچار ہوگا۔ اور موت کے بعد ضرور وہ آخرت کی دنیا میں داخل کیا جائے گا جہاں اس کو خدا کی عدالت میں اپنا مکمل حساب دینا پڑے۔ جس طرح زندگی یقینی ہے، اسی طرح موت یقینی ہے۔ اور جس طرح موت یقینی ہے، اسی طرح قیامت اور آخرت کا معاملہ بھی یقینی ہے۔ آدمی اس سے بھاگ نہیں سکتا، البتہ وہ تیاری کر کے اس کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دانش مند وہ ہے جو آج کے اندر کل کو دیکھ لے۔ جو آج کے واقعہ میں اپنے کل کے لیے نصیحت حاصل کر لے۔

فرضی وہم

ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کو ہائپو کونڈریا (hypochondriasis) کہا جاتا ہے۔ جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو وہ خیالی طور پر اپنے کو بیمار سمجھنے لگتا ہے حالانکہ فی الواقع وہ بیمار نہیں ہوتا۔ اس مرض میں مبتلا ہونے والے لوگ یہ یقین کر سکتے ہیں کہ بیماریاں موجود ہیں، اگرچہ فی الواقع ایسا نہ ہو:

The hypochondriac may become convinced that diseases exist even though they are absent. (V/257)

۲۸ جولائی ۱۹۹۲ کی ملاقات میں پونہ کے جناب فرحات ہارون خاں صاحب نے بتایا کہ ۱۹۷۱ میں ان کی ملاقات ایک ۲۰ سالہ عرب طالب علم محمد عبد الغفار سے ہوئی۔ وہ بحرین کا رہنے والا تھا اور پونہ میں تعلیم کے لیے آیا تھا۔ اس کو اپنے بارہ میں یہ خیال ہو گیا کہ ہندستانی غذائیں کھاتے کھاتے اس کی صحت تباہ ہو گئی ہے۔ وہ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ اس نے فرحات ہارون صاحب سے کہا کہ مجھے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلئے۔ فرحات صاحب اس کو پونہ کے ڈاکٹر ایس ایم ایچ مودی کے یہاں لے گئے۔ ڈاکٹر مودی نے نوجوان کا معائنہ کیا۔ مختلف قسم کے ٹیسٹ لیے۔ چند دن کے بعد اس نے فرحات صاحب سے کہا کہ ان کو بتا دیجئے کہ ان کو کوئی بیماری نہیں، وہ گھوڑے کی طرح ٹھیک ہیں:

He is as fit as a horse.

ڈاکٹر مودی کا فیصلہ معلوم ہونے کے بعد اچانک عرب نوجوان کی ساری پریشانی ختم ہو گئی۔ وہ معتدل آدمی کی طرح رہنے لگا۔ اب وہ ایسا ہو گیا جیسے کہ وہ کبھی بیمار ہی نہ تھا۔

بیماری کی یہ قسم صرف افراد تک منحصر نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کو بھی یہی نفسیاتی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کے رہنماؤں کی غلط رہنمائی اس کو اس بے بنیاد اندیشہ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ ہر طرف سے اس کو خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ ایسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کو اس فرضی وہم سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد وہ آپ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے گی۔

روزہ کیا ہے

روزہ کیا ہے۔ روزہ اپنے آپ پر قابو پانے کی تربیت ہے۔ وہ سلف کنٹرول کی مشق ہے۔ سلف کنٹرول کی اس مشق کے لیے ایک ایسی چیز کو چنا گیا ہے جو انسان کی تمام ضرورتوں میں سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے۔ یعنی کھانا اور پانی۔ رمضان کے مہینہ میں ۳۰ دن تک صبح سے شام تک کا کھانا اور پانی چھڑایا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ چاہنے کے باوجود کسی چیز کو چھوڑ سکے۔ تاکہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ جب وہ یہاں کسی چیز کو لے تو اصول کی بنیاد پر لے، اور جب کسی چیز کو چھوڑے تو اس کو بھی اصول کی بنیاد پر چھوڑے۔ اس کی چاہت اس کے شعوری فیصلہ کے تحت ہو نہ کہ شعوری فیصلہ سے آزاد۔

روزہ کے مہینہ میں کھانا اور پانی کا ترک حقیقۃً ایک علامتی ترک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اوقات میں ایک خاص مدت تک بس کھانا اور پینا چھوڑ دینے سے روزہ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد آدمی آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ نہیں۔ بلکہ روزہ میں کھانے اور پینے کا علامتی ترک زیادہ وسیع ترک کا آغاز ہے۔ روزہ کے مہینہ میں ایک چیز کو چھوڑنے کی تربیت دے کر آدمی کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ بقیہ مہینوں میں وہ زیادہ وسیع پیمانہ پر تمام غیر مطلوب چیزوں کو چھوڑ دے۔

آدمی ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ اس دنیا میں مختلف قسم کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ ان سماجی تعلقات کے دوران طرح طرح کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ یہ حالات آدمی کے اندر اشتعال اور ردعمل کی نفسیات ابھارتے ہیں۔

ایسے اوقات میں آدمی کیا کرے اور کیا نہ کرے، اسی کو بتانے کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا سبق یہ ہے کہ آدمی ایسے مواقع پر سلف کنٹرول کا طریقہ اختیار کرے۔ جب کبھی اس کے دل میں دوسروں کے خلاف غصہ آئے یا دوسروں کے خلاف اشتعال پیدا ہو تو وہ ایسے جذبات کو روکے، وہ ایسے جذبات کو اپنے اندر ہی اندر دبا لے۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے مشتعل جذبات کو روکنے والا بنے نہ کہ ان کو ظاہر کر دینے والا۔

اسی طرح آدمی کے اندر طرح طرح کے جذبات ہیں۔ مثلاً حرص، طمع، حسد، گھمنڈ، فخر، خودغرضی وغیرہ۔ یہ جذبات بجائے خود برے نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہی جذبات ہیں جو آدمی کے اندر حرکت اور عمل پیدا کرتے ہیں۔ ان جذبات کو اگر جائز حدود کے اندر استعمال کیا جائے تو وہ مفید ہیں۔ اور اگر جائز حدود کی پروا کیے بغیر ان جذبات کو بے قید طور پر استعمال کیا جانے لگے تو وہ سماج کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔

روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی ان جذبات کو ان کی حد کے اندر رکھے۔ وہ اپنے ان جذبات کو ان کی واقعی حد کے اندر استعمال کرے۔ وہ اپنے ان جذبات کے استعمال کی ایک حد مقرر کرے۔ وہ حد یہ ہے کہ یہ جذبات جب تک اپنے جائز مفاد کے لیے استعمال ہوں تو ان کا استعمال ٹھیک ہے۔ اور جب وہ اپنے جائز مفاد سے گزر کر دوسروں کو نقصان پہنچانے والے بن جائیں تو وہاں آدمی اپنے ان جذبات کو روک لے۔

روزہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ پابند زندگی گزارنے کی مشق ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس دنیا میں با اصول زندگی گزارے۔ وہ بے قید اور بے اصول زندگی گزارنے سے پرہیز کرے۔ رمضان کے مہینہ میں تربیتی روزہ رکھنا ہے اور بقیہ مہینوں میں اسی تربیت کے مطابق زندگی گزارنا۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر کھانا اور پینا چھوڑے مگر وہ جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا ظاہر تو کھانا اور پینا چھوڑنا ہے۔ مگر روزہ کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی جھوٹی باتوں کو اور دوسرے برے اعمال کو چھوڑ دے۔ روزہ دراصل برائیوں کو چھوڑنے کی تربیت ہے۔ کسی روزہ دار میں اگر روزہ کا ظاہری پہلو ہو مگر اس میں روزہ کا اندرونی اور اخلاقی پہلو نہ پایا جائے تو ایسے آدمی کا روزہ اسلام میں معتبر نہیں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۱ فروری ۱۹۹۳ کو نشر کیا گیا۔

سفرِ حیات

جیومٹری کے اصولوں میں سے ایک مشہور اصول یہ ہے کہ ــــــــــ دو نقطوں کے درمیان قریب ترین فاصلہ سیدھی لکیر کا ہوتا ہے :

A straight line is the shortest distance between two points.

یہ بات روشنی کے سفر کے لیے نہایت درست ہے۔ کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ روشنی ہمیشہ خطِ مستقیم (سیدھی لکیر) کے اصول پر سفر کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس اصول کو انسانی زندگی کے سفر کے لیے استعمال کرنے لگے تو اس کا سفر صرف بھٹکاؤ کے ہم معنی بن کر رہ جائے گا۔

اگر آپ اپنے گھر سے نکلیں اور یہ چاہیں کہ آخری منزل تک بالکل خطِ مستقیم پر سفر کریں تو ایسا کرنے کی صورت میں کہیں آپ کسی کھڈ میں جا گریں گے۔ کہیں کسی پہاڑ سے ٹکرا جائیں گے۔ کہیں دریا کی موجیں آپ کے سفر کو موت کا سفر بنا دیں گی۔ اس لیے کوئی بھی آنکھ والا آدمی ایسا نہیں کرتا کہ وہ خطِ مستقیم کے اصول پر اپنا سفر جاری کر دے۔ ہر آنکھ والا آدمی مقاماتِ سفر کی رعایت سے اپنے سفر کا رخ متعین کرتا ہے۔ وہ جیومٹری کے اصول کے تحت کبھی اپنے سفر کا راستہ نہیں بناتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ساری دنیا میں مفروضہ اعداءِ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے سفرِ حیات کے لیے اٹھتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے راستے میں دریا اور پہاڑ کی مانند کچھ قومیں حائل ہیں۔ وہ فوراً ان قوموں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے ہیں۔

یہ طریقہ جو موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ گویا خطِ مستقیم میں سفر کرنے کی کوشش ہے۔ مگر ایسی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی سرگرمیاں صرف موت کی سرگرمیاں ہیں۔ وہ ہرگز زندگی کی سرگرمیاں نہیں۔

زندگی کا سفر جیومٹری کے اصول پر طے نہیں ہوتا۔ وہ حالات کی موافقت اور ناموافقت کو دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ سفرِ حیات کا حقیقت پسندانہ منصوبہ وہی ہے اور وہی منصوبہ اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی حالات کی پوری رعایت شامل ہو۔

قدرت کی تعلیم

ٹیک (teak) ایک عمارتی لکڑی ہے۔ ٹیک کا سب سے بڑا پیداواری ملک برما ہے۔ اس کے بعد ہندستان، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور سری لنکا میں ٹیک کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہندستان میں تقریباً دو ہزار سال سے اس کا استعمال کیا جارہا ہے۔

ٹیک کی سب سے اہم صفت، ایک ماہر کے الفاظ میں، اس کی غیر معمولی طویل عمر (extraordinary durability) ہے۔ ہزار سال پرانی عمارتوں میں بھی ٹیک کی لکڑی کے بیم اچھی حالت میں پائے گئے ہیں۔ قدیم زمانہ میں کشتی اور پل وغیرہ اکثر اسی لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔

ٹیک کی لکڑی کے دیرپا ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ، عام لکڑیوں کی طرح، اس میں دیمک نہیں لگتا۔ دیمک لکڑی کا دشمن ہے، دیمک لگنے کے بعد کوئی لکڑی دیر تک صحیح حالت میں باقی نہیں رہتی۔ مگر ٹیک کے لیے دیمک کا خطرہ نہیں، اس لیے اس کی دیرپائی کو کوئی چیلنج کرنے والا بھی نہیں۔

ٹیک کی وہ کون سی صفت ہے جس کی بنا پر وہ دیمک کے خطرہ سے محفوظ رہتی ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ ٹیک کی لکڑی میں ایک قسم کا کڑوا ذائقہ ہوتا ہے۔ یہ ذائقہ دیمک کو پسند نہیں۔ لکڑی ہی دیمک کی خوراک ہے۔ مگر ٹیک کی لکڑی استثنائی طور پر دیمک کے ذائقہ کے مطابق نہیں، اس لیے دیمک اس کو اپنی خوراک بھی نہیں بناتا۔

اس مثال سے قدرت کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ قدرت نے یہ چاہا کہ وہ ٹیک کو دیمک سے بچائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ٹیک کو شور وغل اور احتجاج کا طریقہ نہیں سکھایا۔ قدرت نے سادہ طور پر یہ کیا کہ خود ٹیک کے اندر ایک ایسی صفت پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں دیمک اپنے آپ اس سے دور رہو جائے۔

اس دنیا میں جس طرح لکڑی کا دشمن دیمک ہے۔ اسی طرح یہاں انسانوں میں بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اب انسان ان سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ اس کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی صفت پیدا کر لے کہ اس کا دشمن اپنے آپ ہی اس سے دور رہے۔ وہ اس کے خلاف کارروائی کرنے سے خود بخود رک جائے۔

ایک رپورٹ

مسیحی چرچ نے عالمی سطح پر ایک مذہبی جائزہ لیا ہے۔ اس کا خلاصہ انگریزی میگزین کرسچینٹی ٹوڈے نے شائع کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ۱۹۳۴ سے اب تک اسلام میں ۵۰۰ فی صد کی رفتار سے اضافہ ہوا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں مسیحیت میں صرف ۴۷ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک مذہب کے ماننے والوں کی تعداد اس وقت ساری دنیا میں ایک بلین ہے۔ ہندوازم کو ماننے والوں کی تعداد ۵۰۰ ملین ہے۔ بدھزم کو ماننے والوں کی تعداد ۲۴۵ ملین ہے اور یہودیت کو ماننے والوں کی تعداد ۱۵ ملین :

Christianity Today magazine (March 1992) reported that since 1934, Islam has grown by 500 per cent and Christianity by 47 per cent. Both religions have about a billion followers, followed by Hinduism with 500 million followers, Buddhism with 245 million followers and Judaism with about 15 million followers.

اس جائزہ کے مطابق ، ۶۰ سال پہلے ، اسلام کے ماننے والوں کے مقابلہ میں مسیحیت کو ماننے والوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ مگر آج دونوں مذہب کو ماننے والوں کی تعداد تقریباً یکساں ہو چکی ہے۔ یہ رفتار اگر اسی طرح جاری رہتی ہے تو اکیسویں صدی کی آمد تک اہل اسلام کی تعداد یقینی طور پر تمام مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد سے زیادہ ہو جائے گی۔

تاہم صرف تعداد کا اضافہ خوش ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس بڑھتی ہوئی تعداد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ تعلیم میں پیچھے ہیں۔ علی گڑھ (ہندستان) میں مسلم کالج سو برس پہلے قائم ہوا جو بعد کو مسلم یونی ورسٹی بن گیا۔ مسلمان فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسلم یونی ورسٹی صرف ایک ادارہ نہیں ، وہ ایک عظیم تحریک ہے۔ مگر ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ علی گڑھ ضلع کے دیہاتوں میں آج بھی صرف دو فی صد مسلمان ایسے ہیں جن کو تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے (اسٹیٹسمین ۱۲ اپریل ۱۹۹۲)
کتنا زیادہ کام ہو چکا۔ اس کے باوجود کتنا زیادہ کام کرنا ابھی باقی ہے۔

ذکر وفکر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے (ولذکر اللّٰہ اکبر)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک گھڑی کا سوچنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے
(تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ)

ذکر وفکر سے متعلق جو آیتیں اور حدیثیں ہیں، ان کا ایک مطلب خالص روحانی ہے۔ یعنی اللہ کی صفتوں کو یاد کرنا اور ان سے ان جذبات وکیفیات کا دل میں پیدا ہونا جن کو قرآن میں خشوع، تضرع، اخبات، انابت وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کیفیت دین کا اصل مطلوب ہے اور یہی خود عبادت کا بھی خلاصہ ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے ایک اور بہت اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ علم کی فوقیت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی عمل (physical activity) کے مقابلہ میں ذہنی عمل (mental activity) کی اہمیت زیادہ ہے۔ جسم کی حرکت سے آدمی جو کام کرتا ہے، اس سے بہت زیادہ قیمت اس کام کی ہے جو وہ دماغ کی حرکت کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ ایک گھڑی کا دماغی کام ایک سال کے جسمانی کام کے برابر ہے۔

ایک مزدور بھی محنت کرتا ہے اور ایک انجینیر بھی۔ مگر مزدور کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے، اس سے بہت زیادہ معاوضہ وہ ہے جو انجینیر کو ملتا ہے۔ اسی مثال سے جسم اور ذہن کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جسمانی محنت اگر ہتھوڑا چلاتی ہے تو دماغی محنت مشین چلاتی ہے۔ جسمانی محنت پاؤں سے سفر کرتی ہے تو دماغی محنت کار اور ہوائی جہاز کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ جسمانی محنت ظاہر کو جانتی ہے تو دماغی محنت حقیقت کا پتہ کر لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر تلوار سے لڑتی ہے تو دماغی محنت لڑائی کیے بغیر جنگ جیت لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر آدمی کو دکھائی دینے والی دنیا تک پہنچاتی ہے تو دماغی محنت کے ذریعہ آدمی غیب تک اور خدا کی چھپی ہوئی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔

ناگزیر مسئلہ

اینی برانٹ (Anne Bronte) ایک خاتون ادیب ہیں۔ وہ انگلینڈ میں ۱۸۲۰ میں پیدا ہوئیں اور ۱۸۴۹ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی کا سبق ملتا ہے۔ ان کا ایک قول یہ ہے کہ اس غیر معیاری دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ہمیشہ ایک مگر موجود رہتا ہے :

There is always a 'but' in this imperfect world.

یہ بلاشبہ ایک حکیمانہ قول ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس لیے یہاں معیار کی حالت کو پانا ممکن نہیں۔ یہاں مختلف قسم کی محدودیتیں ہیں۔ یہاں ہر انسان کو قول و فعل کی آزادی حاصل ہے۔ یہاں بار بار مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہاں کسی کے لیے بھی ہموار زندگی کا حصول ممکن نہیں۔ یہاں آدمی کو ہمیشہ ایک "مگر" سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی کارروائیوں میں اس حقیقت کو سامنے رکھے۔ ورنہ وہ آخر کار ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

آپ آزاد ہیں کہ اپنی گاڑی سڑک پر پوری تیز رفتاری کے ساتھ دوڑائیں۔ مگر آپ کو اس پر قدرت نہیں کہ دوسری سمت سے آنے والی گاڑیوں کو روک کر سڑک کو صرف اپنے لیے خالی کر لیں۔ آپ ایک ناپسندیدہ جلوس کو روکنے کے لیے اس سے الجھاؤ کر سکتے ہیں مگر آپ کے بس میں یہ نہیں کہ اس کے بعد مسلح پولیس کو مداخلت کرنے سے باز رکھیں۔ آپ اپنے ایک قومی اشو کے لیے جلسہ جلوس کا ہنگامہ کھڑا کر سکتے ہیں مگر آپ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ آپ فریق ثانی کے اندر مخالفانہ ردعمل پیدا ہونے کو روک دیں۔ آپ اپنی حق تلفی کے نام پر احتجاج اور مطالبات کا طوفان برپا کر سکتے ہیں مگر آپ دنیا کے اس قانون کو نہیں بدل سکتے کہ آدمی کو اتنا ہی ملے جتنی استعداد اس نے اپنے اندر پیدا کی ہو۔

اس دنیا میں ہر طرف ایک "مگر" کی رکاوٹ کھڑی ہوئی ہے۔ اس رکاوٹ کو جانئے اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنائیے۔ اگر آپ نے اس کو نظر انداز کر کے اپنا عمل شروع کر دیا تو آخر کار تباہی کے سوا کوئی اور چیز آپ کے حصہ میں آنے والی نہیں۔

ذہن کی تعمیر

اقوام متحدہ کے اقتصادی اور ثقافتی ادارہ کے دستور میں جو باتیں درج ہیں، ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے ——— جنگوں کی ابتدا چونکہ ذہن سے ہوتی ہیں اس لیے یہ دراصل لوگوں کے ذہن ہیں جہاں قیام امن کا مورچہ بنایا جائے :

Since wars began in the minds of men, it is in the minds of men that the defence of peace must be constructed. (UNESCO constitution)

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ سڑک پر دو آدمیوں کا جھگڑا ہو یا میدانِ جنگ میں دو قوموں کا ٹکراؤ، اس قسم کی تمام چیزیں ہمیشہ ذہن میں شروع ہوتی ہیں۔ کچھ آدمیوں کے ذہن میں غصہ، اشتعال، انتقام اور نفرت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی خیالات بھڑک کر جب عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو اسی کا نام جھگڑا یا جنگ ہے، اس لیے اگر ذہن کی سطح پر امن قائم کیا جا سکے تو عمل کی سطح پر بھی امن قائم ہو جائے گا۔

آدمی کے ذہن میں منفی خیالات ہمیشہ ردعمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ کسی آدمی نے سخت بات کہہ دی تو آپ کو غصہ آ گیا۔ کسی سے ناخوش گوار تجربہ ہوا تو آپ مشتعل ہو گئے۔ کسی نے آپ کے وقار کو مجروح کیا تو آپ کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہی سب چیزیں جو ابتداءً ذہن کے اندر پیدا ہوتی ہیں، وہی باہر آ کر جنگ اور فساد برپا کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

ایسی حالت میں انفرادی لڑائی اور قومی جنگ دونوں کو روکنے کا واحد موثر طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کی تربیت کی جائے۔ لوگوں کے اندر وہ مزاج بنایا جائے جس کو مذہب میں صبر کہا جاتا ہے۔

یہ مقصد اس طرح حاصل ہوگا جب کہ لوگوں کی منفی سوچ کو ختم کیا جائے اور ان کے اندر مثبت سوچ پیدا کی جائے۔ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ اشتعال کی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔ وہ ناخوش گوار چیزوں میں الجھنے کے بجائے ان سے اعراض کریں۔ وہ نفرت کے جواب میں محبت کرنا سیکھیں۔ وہ ٹھنڈی سوچ کے تحت فیصلہ کریں نہ کہ جذباتی ابال کے تحت۔

ذہن کی اصلاح عمل کی اصلاح ہے اور ذہن کی تعمیر زندگی کی تعمیر۔

خواب منتشر ہوگیا

سرسید نے ۳ فروری ۱۸۸۴ کو لاہور میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہم نے علی گڑھ میں جو تعلیمی ادارہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ مسلم یونی ورسٹی) قائم کیا ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے۔ میں ہندو اور مسلمان دونوں کو برابر کا درجہ دیتا ہوں۔ میں ہندوؤں کو اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھ کے سمجھتا ہوں (لیکچروں کا مجموعہ، صفحہ ۱۹۸)

سوامی ویویکانند نے ۱۰ جون ۱۸۹۸ کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ ہندوازم کا خلاصہ وحدت (oneness) ہے، اور اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسانی اخوت اور انسانی برابری کا ایسا پریکٹیکل نمونہ قائم کیا جیسا نمونہ انسانی تاریخ میں دوسرا کوئی موجود نہیں۔ دونوں کو انڈیا کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ انڈیا میں ایک اچھے مستقبل کی تعمیر ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے ہوگی (لیٹرس آف سوامی وویکانند، صفحہ ۸۰ - ۳۷۹)

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا۔ اب موقع تھا کہ دونوں گروہ مل کر نئے ہندستان کی تعمیر کریں۔ دونوں فرقوں کے دو اعلیٰ رہنماؤں (اور اسی طرح دوسرے لیڈروں) نے بھرپور طور پر لوگوں کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے باوجود یہ مشورہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تجویز کی ایک قیمت ہے۔ اگر آپ یہ مطلوبہ قیمت ادا کریں تو تجویز واقعہ بنے گی۔ اور اگر قیمت ادا نہ کی جائے تو تجویز صرف الفاظ کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گی، وہ عملی واقعہ کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔

یہ قیمت، ایک لفظ میں، صبر ہے۔ مختلف انسان جب باہم مل کر رہیں تو لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے ناخوش گواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ اب قیمت یہ ہے کہ اس شکایت یا اس ناگواری کو برداشت کر لیا جائے۔ بدقسمتی سے دونوں فرقوں میں سے کسی نے بھی یہ قیمت ادا نہ کی۔ اس لیے سرسید اور ویویکانند جیسے لوگوں کے الفاظ ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ وہ ملک کی سماجی زندگی کی تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے۔

تعلیم و تربیت

اگست ۱۹۴۵ میں جاپان مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اس نے سیاسی آزادی بھی کھو دی اور معاشی استقلال بھی۔ اس کے بعد جاپان نے یہ کیا کہ سیاسی آزادی کے مسئلہ کو چھیڑے بغیر معاشی استقلال کے لیے جدوجہد شروع کر دی، اس طریق کار کے ذریعہ جاپان نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ آج وہ سپر اقتصادی طاقت شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۰ تک جاپان دنیا کو ۵ کھرب ڈالر قرض کے طور پر دے چکا تھا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۹۵ تک جاپان کے عالمی قرضہ کی مقدار ۱۰ کھرب ڈالر ہو چکی ہوگی۔ جاپان ۱۹۴۵ میں امریکہ کا سیاسی محکوم تھا، آج جاپان نے خود امریکہ کو اپنا اقتصادی مقروض بنا لیا ہے۔

پاکستان کے ایک کالم نویس مسٹر ابوذر غفاری مئی ۱۹۹۲ میں کابل گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک جاپانی صحافی سے ہوئی، انھوں نے جاپانی صحافی سے پوچھا کہ جاپان کی اس حیران کن ترقی کا راز کیا ہے۔ کس طرح ایسا ہوا کہ جاپان نے ایک ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

جاپانی صحافی نے جواب دیا کہ جاپان کی اعلیٰ ترقی کا راز جاپانی قوم کے اعلیٰ کردار میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس قدرتی وسائل نہیں۔ اس لیے ہم اپنے بچوں ہی کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جاپان کا ایک ایک گھر گویا جاپانی بچہ کی تربیت گاہ ہے۔ جاپان کے لوگ اپنے بہترین وسائل اپنے بچہ کی تعلیم پر صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ جاپانی قوم اس وقت مکمل طور پر ایک تعلیم یافتہ قوم ہے۔ ہمارے یہاں جہالت کا کوئی وجود نہیں۔ جاپان میں اتنے زیادہ سائنسی تعلیم یافتہ لوگ ہیں کہ آپ جاپان کو ایک سائنسی قوم کہہ سکتے ہیں۔

اس تعلیم و تربیت نے جاپان کے لوگوں میں اعلیٰ ترین قومی کیرکٹر پیدا کر دیا ہے، مثلاً جاپانی قوم انتہائی محب وطن قوم ہے۔ اگر قوم کا ایک روپیہ کا نقصان ہو رہا ہو تو ایک جاپانی اپنی قوم کو ایک روپیہ کے نقصان سے بچانے کے لیے اپنا سو روپیہ کا نقصان کر وا لینے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھے گا۔ (نوائے وقت، لاہور، ۱۲ جولائی ۱۹۹۲)

جاپان نے حریف سے ٹکراؤ کو چھوڑا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے یہاں اعلیٰ سائنسی معاشرہ وجود میں لا سکے۔ یہی دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد راستہ ہے۔

تین قسم

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک، ربانی عالم۔ دوسرے، وہ جو نجات کے راستہ کا طالب ہو۔ تیسرے، وہ ناکارہ اور پست لوگ جو ہر زور سے بولنے والے کے پیرو بن جائیں (الناس ثلاثة - عالمٌ ربانيٌّ. ومتعلم على سبيلِ نجاةٍ. وهمجٌ رَعاعٌ اتباعُ كلِّ ناعق) لسان العرب ۱/۴۰۴

عالم ربانی وہ ہے جو اپنے رب کو پا گیا ہو اور اس کی زندگی میں وہ اوصاف پیدا ہو گئے ہوں جو رب العالمین کی معرفت سے ایک آدمی کے اندر پیدا ہونے چاہئیں۔

دوسرا شخص وہ ہے جو سچا متعلم ہو۔ سچا متعلم بے فائدہ باتوں میں اپنا دماغ نہیں الجھاتا۔ وہ نجات اور فلاح کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور اس تلاش میں اپنی پوری توجہ لگا دیتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے لوگ صحیح انسانی راستہ پر ہیں۔ وہ اپنے راستہ سے بھٹکے نہیں۔ وہ وہی سوچتے ہیں جو انھیں سوچنا چاہیے، اور وہی کر رہے ہیں جو انھیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو حقیقت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ایک بات اور دوسری بات کا فرق نہیں جانتے۔ وہ سچے کلام اور جھوٹے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک اہمیت کی بات یہ نہیں ہوتی کہ کون شخص حق کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے بجائے ان کے یہاں ساری اہمیت اس کی ہوتی ہے کہ کون زیادہ زور سے چیختا ہے۔ کون زیادہ شاندار کلام کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کون زیادہ بڑے بڑے الفاظ بولنے کا کرتب دکھا رہا ہے۔

انسان کی یہ تینوں قسمیں پہلے بھی پائی جاتی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مزید شدت سے وہ پائی جا رہی ہیں خاص طور پر تیسری قسم کے انسان کی مثال موجودہ زمانہ میں عام ہو گئی ہے۔ اس کا ایک خاص سبب پریس ہے۔ پریس کے دور نے اس قسم کے لوگوں کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ پست اور ناکارہ ہونے کے باوجود غوغائی عمل کر کے شہرت حاصل کر لیں۔ اور پھر عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

حضرت علیؓ کا قول موجودہ حالات پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔

ذہنی تربیت

اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیت کا دور کہا جاتا ہے۔ جاہلیت سے مراد جہالت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بے خبری ہے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب کے لوگ بے خبری کے دور ں تھے، اسلام نے ان کو باخبری کے دور میں پہنچا دیا۔ اسلام سے پہلے وہ بے شعوری کی حالت ں زندگی گزار رہے تھے۔ اسلام نے ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ شعور زندگی گزار سکیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ لڑنے بھڑنے کو کمال سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر لڑتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ صحیح اور غلط، اپنے اور غیر کی تفریق کے بغیر نھوں نے لڑنے کو بذاتِ خود اپنا مقصود بنا لیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ ھی ہم خود اپنے بھائی بنو بکر پر حملہ کر دیتے ہیں جبکہ لڑنے کے لیے کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا:

و احیاناً علیٰ بکرٍ أخینا اذا ما لم نجد إلّا اخانا

اسلام نے ان کی ذہنی اور فکری تربیت کر کے ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ وہ یک اور دوسرے میں فرق کریں۔ وہ حق کے پرستاروں اور حق سے بغاوت کرنے الوں کے درمیان تمیز کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا کہ وہ مکرین پر سخت اور آپس میں نرم ہیں (اشداء علی الکفار رحماء بینھم) الفتح ۲۹

قرآن کی اس آیت کی تشریح شاہ عبد القادر صاحب نے مختصر طور پر اس طرح کی ہے

جو تندی اور نرمی اپنی خو ہو، وہ سب جگہ برابر چلے۔ اور جو ایمان سے نور کر آئے، وہ تندی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کس طرح آدمی کے ذہن کی تربیت کرتا ہے ۔ر اس کے مزاج کو منفی رخ سے مثبت رخ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسلام آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ ہ صحیح اور غلط کے فرق کو سمجھے۔ وہ یہ جانے کہ کہاں بولنا ہے اور کہاں چپ رہنا ہے۔ کہاں لڑنا ہے ر کہاں برداشت کرنا ہے۔ کہاں اقدام کرنا ہے اور کہاں یہ کوشش کرنا ہے کہ اقدام کی نوبت نہ آئے۔

بامقصد تخلیق

یہ دنیا کیوں بنی۔ انسان کیوں یہاں پیدا ہوتا ہے۔ کس لیے وہ ایک خاص مدت کے بعد مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے —— یہ سب سے زیادہ اہم سوالات ہیں جن پر ہر انسان کو سوچنا چاہیے۔ ان سوالات کا صحیح جواب معلوم کرنا بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ہزاروں برس سے انسان ان سوالوں کے بارہ میں سوچ رہا ہے۔ مختلف لوگوں نے ان کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ تاہم بڑی تقسیم میں ان کو دو قسم میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جوابات جن کے مطابق، یہ سارا ہنگامہ عبث (المومنون ۱۱۵) اور بے مقصد ہے۔ اور دوسرا جواب وہ ہے جو یہ خبر دیتا ہے کہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور اس کا ایک انجام سامنے آنے والا ہے۔

پہلا جواب شاعروں، فلسفیوں اور دنیوی عالموں نے دیا ہے۔ دوسرا جواب ان ہستیوں کا دیا ہوا ہے جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے اور جس کا مستند متن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پایا جاتا ہے۔

ان دونوں قسم کے جوابوں کے تقابل میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ مگر ایک بات بالکل واضح ہے۔ وہ یہ ہے پہلا جواب زندگی اور کائنات کے ڈھانچہ میں مطابق نہیں بیٹھتا۔ جب کہ دوسرا جواب زندگی اور کائنات کے نقشہ میں پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی اندرونی تضاد نہیں پایا جاتا۔

یہ دنیا جس کے اندر انسان پیدا ہوتا ہے وہ انتہائی بامعنی ہے۔ یہاں کوئی چیز بے معنی اور الل ٹپ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح انسان کا وجود بھی پوری طرح ایک بامعنی وجود ہے۔ اب یہ ناقابل قیاس ہے کہ ایک بامعنی انسان ایک انتہائی بامعنی کائنات میں پیدا کیا جائے مگر اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ واقعہ اور توجیہہ کے درمیان یہ تضاد خود یہ ثابت کرتا ہے کہ واقعہ کی یہ توجیہہ درست نہیں۔

جہاں معنویت ہو وہاں مقصدیت بھی ضرور ہوگی۔ معنویت کبھی مقصد کے بغیر پائی نہیں جا سکتی۔ کائنات کا یہ پہلو پیغمبر کے جواب کی کھلی ہوئی تصدیق ہے۔

زلزلہ کی خبر

۲۱ جون ۱۹۹۰ کو ایران کے شمال مغربی علاقہ میں نہایت شدید بھونچال آیا۔ اس کی وجہ سے اس علاقہ کے ۸۰ ہزار سے زیادہ آدمی مر گئے اور ۲۰۰ ہزار سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے۔ اس خبر کو پڑھ کر ایک صاحب نے کہا: یہ ایرانیوں کے اوپر خدا کا عذاب ہے۔

یہ ایک لغو بات ہے۔ اس دنیا میں جو حادثہ بھی پیش آتا ہے وہ اس لیے پیش آتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کے خوف سے کانپ اٹھیں، نہ یہ کہ وہ اس کو لے کر دوسروں کے خلاف تبصرے کرنا شروع کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زلزلہ کا تعلق نہ ایران سے ہے اور نہ خدائی عذاب سے۔ وہ ایک زمینی واقعہ ہے، اور وہ اس لیے ہے کہ لوگ اس سے نصیحت قبول کریں۔ ایران کے لوگ بھی، اور ایران کے باہر کے لوگ بھی۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۳ جون ۱۹۹۰) میں عالمی ایجنسیوں کے حوالے سے جو خبر دی گئی، اس میں بتایا گیا تھا کہ اس علاقہ میں ایک بھی مکان نہیں جو بھونچال کے بعد اپنی جگہ کھڑا ہوا ہو:

There is not a single house in the area that has been left standing.

یہی واقعہ ہر شدید زلزلہ کے بعد پیش آتا ہے۔ زلزلہ دراصل قیامت سے پہلے قیامت کی یاددہانی ہے۔ وہ اس واقعہ کا چھوٹی سطح پر اظہار ہے جو قیامت کے دن زیادہ بڑی سطح پر پیش آئے گا۔

خدا نے اس دنیا کو عارضی امتحان کے لیے بنایا ہے۔ جب اس کی مدت ختم ہو گی تو خدا زمین کے اوپر شدید زلزلہ برپا کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں انسان کی تمام تعمیرات ڈھ جائیں گی۔ انسان کا سارا تمدن کھنڈر ہو جائے گا۔ انسانی اقتدار کے تمام قلعے کامل طور پر منہدم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد خدا اپنی قدرت سے ایک نئی دنیا بنائے گا جہاں ہر ایک کو اس کے حقیقی عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔

زلزلہ کی خبر پڑھنے والا وہ ہے جس نے زلزلہ میں خود اپنی خبر پڑھی ہو۔ جو شخص زلزلہ کو دوسروں کا واقعہ سمجھے، اس نے ابھی تک زلزلہ کی خبر کو نہیں پڑھا۔

دوسرا لفظ

تاتاری قبائل چنگیز خاں کی رہنمائی میں ۶۱۶ھ میں مسلم دنیا پر حملہ آور ہوئے۔ پہلے انھوں نے عراق اور خراسان کو تباہ کیا۔ اس کے بعد وہ مزید بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کے زمانہ میں ۶۵۶ھ میں وہ بغداد میں داخل ہوئے اور انتہائی وحشیانہ طور پر عباسی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

مورخ عزالدین ابن الاثیر ۵۵۵ھ میں عراق میں پیدا ہوئے۔ ۶۲۰ھ میں عراق (موصل) ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ ابن اثیر نے مذکورہ تاتاری دور کے بڑے حصہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس طرح وہ اس دور کے عینی گواہ ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں ۶۱۷ھ کے واقعات کے تحت تاتاری فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تاتاریوں کے عالم اسلام پر حملہ آور ہونے کا سبب یہ تھا کہ خراسان کے مسلم حکمراں خوارزم شاہ نے تاتاریوں کی ایک تجارتی جماعت کو قتل کروا دیا تھا۔ اس سے غصہ ہو کر انھوں نے حملہ کر دیا۔

پھر لکھتے ہیں کہ اسلامی ممالک کی طرف تاتاریوں کے خروج کا اس کے علاوہ اور سبب بھی بتایا جاتا ہے جس کو یہاں لکھا نہیں جا سکتا، پس جو ہوا سو ہوا، میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ تم اچھا گمان کر لو اور سبب نہ پوچھو (وقیل فی سبب خروجھم الی بلاد الاسلام غیر ذلک مما لا یذکر فی بطون الدفاتر)

فکان ما کان مما لست اذکرہ   فظن خیرا ولا تسأل عن الخبرِ

(الکامل فی التاریخ ۱۲/۳۶۲)

ابن اثیر نے ۶۱۷ھ کے واقعات کے تحت دوسرے سبب کو چھپا دیا تھا۔ کیوں کہ اس کا تعلق بغداد کے خلیفہ ناصر لدین اللہ سے تھا اور وہ اس وقت زندہ تھا تاہم ابن اثیر کو مزید عمر ملی۔ یہاں تک کہ ۶۲۲ھ میں ناصر لدین اللہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جب ابن اثیر نے ۶۲۲ھ کے تحت اپنی تاریخ کے صفحات لکھے تو اس میں انھوں نے وہ بات درج کر دی جس کا ذکر انھوں نے اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔ ابن اثیر کے وہ بعد کے الفاظ یہ ہیں :

خلیفہ الناصر لدین اللہ نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر پائی اور ۴۶ سال سے زیادہ حکومت کی۔ اپنی عمر کے آخری تین سال وہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا، اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی اور دوسری آنکھ کی بصارت بہت کم ہو گئی تھی، اسی حال میں رمضان ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے ۲۸ سال بعد تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کر دیا۔ ابن اثیر اس کی بعض نامحمود عادتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

فکان غرام الخلیفۃ بھذہ الاشیاء من اعظم الامور۔ وان کان سبب ماینسبہ العجم الیہ صحیحاً من أنہ ھو الذی اطمع التتر فی البلاد وراسلھم فی ذلک۔ فھو الطامۃ الکبری التی یصغر عندھا کل ذنب عظیم

(الکامل فی التاریخ ۱۲/۴۴۰)

پس ان چیزوں کی طرف خلیفہ کی رغبت بہت سنگین بات تھی۔ اور اگر وہ سبب صحیح ہو جو عجمی لوگ ناصر لدین اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ وہی تھا جس نے تاتاریوں کو مسلم علاقہ پر حملہ کے لیے ابھارا اور اس کے بارہ میں ان کے پاس پیغام بھیجا تو وہ اتنی بڑی مصیبت تھی کہ اس کے آگے ہر بڑا گناہ ہیچ ہے۔

ابن اثیر نے اپنی کتاب میں "دوسرا لفظ" لکھ کر اپنے "پہلے لفظ" کی تصحیح کر دی۔ لیکن اس دنیا میں اور بھی بہت سے "ابن اثیر" ہیں جو غلط طور پر "پہلا لفظ" لکھ دیتے ہیں۔ مگر اس کے بعد انھیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کی تصحیح کرتے ہوئے "دوسرا لفظ" تحریر کریں۔ ایسے لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ وہ اپنے قلم سے اگر دوسرا لفظ نہ لکھیں تب بھی ان کا دوسرا لفظ ضرور لکھا جانے والا ہے۔ مگر ایسی صورت میں یہ دوسرا لفظ لکھنے والا خدا کا فرشتہ ہوگا۔

جو شخص اپنا "دوسرا لفظ" خود لکھے، وہ پکڑ سے بچ گیا۔ لیکن جس آدمی کا "دوسرا لفظ" فرشتے لکھیں اس کے لیے خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

لفظ کا فرق

الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری (۲۵۶-۱۹۴ھ) کی کتاب صحیح البخاری حدیث کی مشہور ترین کتاب ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتابیں دو ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔ اور صحیح بخاری ان دونوں میں زیادہ صحیح ہے (اتفق العلماء علی أن أصح الکتب بعد القرآن الصحیحان: البخاری ومسلم وکتاب البخاری أصحہما) فتح الباری ۱/۵-۶

امام البخاری نے چھ سو ہزار (چھ لاکھ) حدیثوں کے ذخیرہ میں سے تقریباً ۷۰۰۰ حدیثیں منتخب کیں اور ان سے یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہر حدیث کو لینے سے پہلے استخارہ کیا اور دو رکعت نماز پڑھی (صفحہ ۶) حتی کہ خواب میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور انھیں خصوصی طور پر اپنے مجموعہ احادیث کی صحت کے بارہ میں بشارت حاصل ہوئی۔ ایک شاعر نے کہا کہ امام بخاری نے جن حدیثوں کو اپنی کتاب میں جمع کیا ہے، گویا کہ انھوں نے ان احادیث کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

کأنّ البخاری فی جمعہ تلقی من المصطفیٰ ما اکتسب

ان ساری خصوصیات کے باوجود صحیح بخاری غلطیوں سے پاک نہیں، چنانچہ علماء حدیث نے صحیح بخاری میں متعدد نہایت واضح قسم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

مثال کے طور پر صحیح بخاری کی کتاب الجنائز کا ایک باب ہے: إحداد المرأة علی غیر زوجها۔ یعنی عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور شخص کی موت پر سوگ منانا۔ اس باب کی دوسری حدیث یہ ہے:

عن زینبَ ابنۃِ ابی سلمۃَ قالت۔ لما جاءَ نعیُ ابی سفیانَ مِن الشام دعت امُّ حبیبۃَ رضی اللہ عنہا بصُفرۃٍ فی الیومِ الثالث فمسحتْ عارِضَیہا وذِراعَیہا وقالت۔ انی کنتُ عن ھذا

زینب بنت ابی سلمہ کہتی ہیں کہ جب ابوسفیان کی موت کی خبر شام سے آئی تو ام حبیبہؓ نے تیسرے دن ایک زرد خوشبو منگوائی۔ پھر اس کو اپنے دونوں رخساروں اور دونوں بازوؤں پر ملا اور کہا۔ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی مگر میں

لغنيتُ لولا أنى سمعتُ النبى صلى الله عليه وسلم يقول : لا يحلُّ لامرأةٍ تؤمنُ بالله واليوم الآخر أن تُحِدَّ على ميتٍ فوق ثلاث إلا على زوج ، فإنها تُحِدُّ عليه أربعةَ أشهرٍ وعشراً۔

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی عورت جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مُردہ شخص پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، سوا اپنے شوہر کے، کیوں کہ اس پر وہ چار مہینہ اور دس دن تک سوگ منائے گی۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب کا انتقال شام میں ہوا۔ مگر یہ بیان واقعہ کے مطابق نہیں۔ کیوں کہ متفقہ روایات کے مطابق، حضرت ابوسفیان کا انتقال مدینہ میں ۳۱ ھ میں ہوا۔ جو واقعہ مدینہ میں پیش آیا، اس واقعہ کو اس روایت میں شام سے منسوب کیا گیا ہے (فتح الباری ۶/۲ ۱۷۵ ـ ۱۷۶)

اس فروگزاشت پر ردعمل کا ایک غیر سنجیدہ طریقہ ہے، اور دوسرا سنجیدہ طریقہ۔ غیر سنجیدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو شوشہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اور سنجیدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

جو آدمی اس فروگزاشت کو شوشہ بنائے وہ اس کی بنیاد پر پوری صحیح بخاری کو مشتبہ قرار دے سکتا ہے۔ وہ امام بخاری کے علم کا مذاق اڑائے گا۔ وہ ان کے احتیاط کی روایتوں کو فرضی قصے قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ جب بخاری کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ ابوسفیان کا انتقال شام میں ہوا یا مدینہ میں تو ان کی مرتب کی ہوئی کتاب پر کیوں کر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس سنجیدہ آدمی اس کو ایک انسانی سہو قرار دے کر کہے گا کہ اس سے اصل کتاب پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امام بخاری اس حدیث کو جس ترجمۂ باب کے تحت لائے ہیں، اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس سے ان کی منشا یہ بتانا ہے کہ کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی اور شخص کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے۔ اصل مدعا مذکورہ تسامح کے باوجود ثابت ہے۔ ابوسفیانؓ کی وفات مدینہ میں ہو تب بھی اور شام میں ہو تب بھی۔

ناقص، جامع

ایک شخص نے کہا کہ محبت نام ہے : "دل سے چاہنے کا" دوسرا آدمی بولا کہ تم نے محبت کا بہت ناقص مفہوم بیان کیا۔ محبت صرف دل سے چاہنے کا نام نہیں۔ محبت کا جامع تصور یہ ہے —— دل سے چاہنا، جس سے محبت ہے اس سے ملنا، سلام ومصافحہ کرنا، اس کی تواضع کرنا، اس کی خدمت کرنا، اس کی خاطر دوسروں سے جنگ کرنا۔ اس کے نام کا ڈنکا بجانا، اس کا استقبال کرنا، وغیرہ۔

دوسرے آدمی کے نزدیک بظاہر اس کا اپنا تصورِ محبت جامع ہے اور پہلے شخص کا تصورِ محبت ناقص۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سوچ بجائے خود غلط ہے۔ محبت کے معاملہ میں جامع اور ناقص کی تقسیم نہیں۔ بلکہ حقیقی اور غیر حقیقی کی تقسیم ہے۔ آپ کو کسی آدمی سے قلبی تعلق ہو جائے تو کہا جائے گا کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ یہ محبت اگر سچی ہو تو مختلف مواقع پر اس کے تقاضوں کا ظہور ہوگا لیکن اگر قلبی محبت نہ ہو اور آدمی اوپری طور پر فہرستِ محبت کے مذکورہ افعال کرے تو وہ ظاہر داری ہوگی نہ کہ فی الواقع فہرستِ محبت کی تکمیل۔

یہی معاملہ دین کا ہے۔ "دین کا ناقص تصور" اور "دین کا جامع تصور" سراسر مبتدعانہ اصطلاحیں ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ اندازِ تعبیر قرآن اور حدیث میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اگر دین کے تصور کو بتانے کے لیے یہ کوئی صحیح تشریح ہوتی تو قرآن وحدیث میں ضرور یہ الفاظ پائے جاتے۔ مگر سارے قرآن میں کہیں بھی اس قسم کے الفاظ موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دین میں صحیح تقسیم حقیقی اور غیر حقیقی کی ہے۔ مطلوب دین داری وہ ہے جو اللہ سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ اگر آدمی کے دل میں سچا تقویٰ پیدا ہو جائے تو آدمی کا پورا سلوک اسی کے رنگ میں ڈھل جائے گا۔ دین کی حقیقت اس کے تمام قول وفعل میں ظاہر ہوتی چلی جائے گی۔

اس کے برعکس اگر آدمی کے اندر قلبی تقویٰ پیدا نہ ہو تو وہ یا تو سرکش انسان ہوگا یا منافق انسان۔ سرکش انسان کھلم کھلا حکم الٰہی سے سرتابی کرتا ہے۔ اور منافق انسان اندر سے

خالی ہوتا ہے مگر اوپری طور پر دکھاوے والے اعمال کرتا ہے۔ مگر دینی حقیقت کے بغیر دینی ظاہر داری کی کوئی قیمت نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق (لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها) اللہ کسی شخص پر صرف اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا اس کو دیا ہے (لا یکلف اللہ نفسا الا ما آتاها) دوسری جگہ فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے (فاتقوا اللہ ما استطعتم)

اس طرح کی ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی واجبات کا تعلق تمام تر حالات سے ہے۔ کسی مومن یا کسی مومن گروہ کی دینی ذمہ داری باعتبار استطاعت ہے نہ کہ باعتبار فہرست۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص کا دین ناقص نظر آئے گا، حتی کہ انبیاء کرام کا بھی۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اجتماعی احکام نافذ نہیں کیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نماز باجماعت قائم نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو والدین کے حقوق ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وغیرہ۔ اسی طرح ہر پیغمبر کا دین ناقص اور نامکمل قرار پائے گا۔ کیوں کہ کسی بھی پیغمبر کے یہاں فہرست کے اعتبار سے واجباتِ دین کے کامل نفاذ کی مثال موجود نہیں۔

دین کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ جس آدمی کے اندر اخلاص ہو وہ کامل دین پر ہے اور جس آدمی کے اندر اخلاص نہ ہو وہ ناقص دین پر۔

نیا انقلاب

برٹرینڈرسل نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک مذہب کا دور تھا۔ اس زمانہ میں انسان کوئی ترقی نہ کر سکا۔ انسان کی تمام ترقیاں حالیہ چند صدیوں میں ہوئی ہیں جب کہ مذہب کا غلبہ ختم ہو گیا اور سائنس کا دور دنیا میں شروع ہوا۔

برٹرینڈرسل کی یہ بات ایک ترمیم کے ساتھ صحیح ہے۔ قدیم زمانہ میں جو غلبہ تھا وہ حقیقی مذہب کا غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ مشرکانہ مذہب (بالفاظ دیگر شرک) کا غلبہ تھا۔ یہی شرک ہے جو قدیم زمانہ میں تمدنی ترقیوں میں رکاوٹ بنا رہا نہ کہ حقیقی معنوں میں مذہب۔ حقیقی مذہب موحدانہ مذہب ہے، جب کہ قدیم تاریخ میں مشرکانہ مذہب ہمیشہ غالب رہا ہے۔

تمدنی ترقیاں فطرت کی تسخیر کا نتیجہ ہیں۔ قدیم زمانہ میں شرک فطرت کی چیزوں کو معبود کا مقام دیئے ہوئے تھا۔ ان چیزوں کو آدمی پرستش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کو تحقیق اور تسخیر کی نظر سے کیوں کر دیکھتا۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر آخرالزماں صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے تاریخ میں پہلی بار سچے مذہب (توحید) کو غلبہ کا مقام عطا کیا۔

توحید کے غلبہ کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کی چیزیں جو اس سے پہلے پوجنے کی چیز بنی ہوئی تھیں وہ اب تسخیر کی چیز بن گئیں۔ (وسخر لکم ما فی السمٰوات والارض) پہلے اگر یہ نظریہ تھا کہ ہم چیزوں کے لیے ہیں تو اب یہ نظریہ ہو گیا کہ چیزیں ہمارے لیے ہیں نہ کہ ہم چیزوں کے لیے۔

برٹرینڈرسل نے جس انقلاب کو سائنس کی طرف منسوب کیا ہے، وہ انقلاب حقیقۃً سچے مذہب کا لایا ہوا ہے۔ اس کا بیج ساتویں صدی عیسوی میں اسلام (دین توحید) کے ذریعہ رکھا گیا نہ کہ سولھویں صدی میں یورپ کے نشاۃ ثانیہ کی صورت میں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ تو خود اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر ظہور میں آئی۔

برٹرینڈرسل جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام اور دوسرے مذہب کا مطالعہ ایک ہی مشترک عنوان مذہب (ریلیجن) کے تحت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس موضوع کا مطالعہ دو الگ الگ عنوانوں کے تحت کریں تو اس معاملہ کو سمجھنے میں انھیں دشواری پیش نہ آئے۔ محرف مذہب اور غیر محرف مذہب میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ دونوں کا مطالعہ ایک عنوان کے تحت نہیں جا سکتا۔

علم کی کسوٹی پر

بائبل میں آدم کے بعد انسانی نسل کا پورا شجرۂ نسب دیا گیا ہے۔ اس سے حساب لگا کر مسیحی علما نے زمین پر آبادکاری کی مدت متعین کی ہے۔ یہ مدت ۱۹۷۵ میں ۵۹۷۶ سال تھی۔ دوسری طرف جدید علمی طریقوں سے زمین کی عمر اور اس پر آبادکاری کی مدت کا جو اندازہ کیا گیا ہے، اس کے مطابق یہ مدت مذکورہ اندازہ سے بہت زیادہ قرار پاتی ہے۔ اس اختلاف نے جدید علما کی نظر میں بائبل کے بیان کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

اسی طرح بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ یعنی ۲۴ گھنٹہ والے چھ دنوں میں۔ یہاں بھی سائنس کی تحقیق بائبل کے بیان سے ٹکرا رہی تھی۔ کیوں کہ سائنسی مطالعہ کائنات کی تخلیق کو اربوں اور کھربوں سال کے درمیان پیش آنے والا ایک واقعہ بتا رہا تھا نہ کہ صرف ۱۴۴ گھنٹہ (چھ دن) کے اندر پیش آنے والا واقعہ۔ اس تضاد کی بنا پر جدید انسان کو بائبل علمی حیثیت سے ایک غیر معتبر کتاب نظر آنے لگی۔

علم اور مسیحیت کے درمیان اس طرح کے بہت سے ٹکراؤ پیش آئے۔ اس نے ابتداءً مسیحیت کو اور اس کے بعد تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر حقیقی ثابت کر دیا۔ اس نے مذہب کو توہماتی قیاسات کا مجموعہ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔

اس ٹکراؤ نے ابتداءً تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر معتبر بنا دیا۔ مگر موجودہ صدی کے نصف ثانی میں مزید تحقیق نے بتایا کہ یہ ٹکراؤ دراصل سائنس اور محرف مذہب کے درمیان تھا نہ کہ سائنس اور حقیقی مذہب کے درمیان۔

اس جدید تحقیق نے ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ ایک طرف دوسرے مذاہب ہیں جن کے متعلق واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے بارہ میں یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ استثنائی طور پر دوسرے مذاہب سے الگ ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں کوئی بات بھی غیر علمی نہیں۔ وہ جس طرح سچا الہام ہے، اسی طرح وہ خالص علم کی جانچ میں بھی پورا اترتا ہے۔

فرد اور سماج

جو لوگ یک زوجگی کے حامی ہیں ان کا کہنا ہے کہ دوسری بیوی جب گھر میں آئے گی تو وہ شوہر میں اور اس کے اثاثہ میں حصہ دار بن جائے گی۔ عقد ثانی سے پہلے زوجۂ اول ہی شوہر کی اور اس کے اثاثہ کی تنہا حق دار ہوتی ہے۔ شوہر کی محبت، شوہر کا وقت، شوہر کی آمدنی، شوہر کی جائداد، ہر چیز کی وہ تنہا مالک ہوتی ہے۔ مگر دوسری بیوی جب گھر میں آئے گی تو وہ ہر چیز میں حصہ بٹائے گی۔ اس طرح گویا زوجۂ ثانی کی گھر میں آمد زوجۂ اول کی حق تلفی کا سبب ہے۔

مگر یہ نقطۂ نظر درست نہیں۔ یہ ان سماجی معیاروں (social norms) کے سراسر خلاف ہے جن کو تمام دنیا میں مسلّمہ طور پر بنیادی اصول حیات کی حیثیت سے مان لیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ فرد کے حقوق سماج کے حقوق کے تابع ہیں۔ وہ سماج کے تقاضوں سے بالکل آزاد نہیں۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ تعدد ازواج ایک سماجی ضرورت ہے تو اس کے بعد اصولاً کسی عورت کو یہ حق نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنی انفرادی خوشی کے لیے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں یورپ میں وہ تحریک اٹھی جس کو فرد پسندی (individualism) کہا جاتا ہے۔ اس کے علم برداروں نے فرد کے لیے لامحدود آزادی کا مطالبہ کیا۔ مگر جلد ہی اس غیر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کے تلخ نتائج ظاہر ہوئے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اس کا ردعمل ظاہر ہوا اور وہ جوابی تحریک اٹھی جس کو اجتماع پسندی (collectivism) کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے حامیوں نے بتایا کہ فرد کو لامحدود آزادی دینا موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں ہے۔ فرد کی لامحدود آزادی نہ صرف سماج کے لیے مہلک ہے بلکہ آخری نتیجہ کے طور پر وہ خود فرد کی ترقی اور کامیابی میں رکاوٹ ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اب کوئی بھی شخص لامحدود فرد پسندی کا حامی نہیں۔ اب عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ فرد اور سماج کے حقوق کے درمیان توازن ہونا ضروری

ہے۔ اگر دونوں کی سرگرمیوں کے درمیان توازن موجود نہ رہے تو بالآخر دونوں ہی ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔

ایک شخص کو حق ہے کہ وہ سڑک پر اپنی گاڑی چلائے۔ مگر اس کو یہ حق نہیں کہ وہ دائیں اور بائیں دونوں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ اس کو بہر حال ایسا کرنا ہوگا اپنی گاڑی چلانے کے ساتھ دوسروں کی گاڑیوں کی رعایت کرے۔ ایک شخص کو بزنس کی اجازت ہے مگر سماج کے استحصال کی اجازت کسی کو نہیں دی جاسکتی۔ ایک شخص کو اپنی مطلوب چیز حاصل کرنے کا حق ہے۔ مگر جہاں دوسروں کا مطلوب متاثر ہونے لگے وہاں اس کو اپنی طلب کو حد میں رکھ کر دوسروں کو اپنی طلب پورا کرنے کا موقع دینا ہوگا۔

فرد پسندی ابتدائی طور پر ایک جائز چیز ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ فرد پسندی کو سماجی تقاضوں کے ماتحت رکھا جائے نہ کہ اس سے آزاد۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی کمائی پوری کی پوری اس کی ملکیت ہو۔ مگر سماجی ضرورتوں کی بنا پر اس کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ بطور ٹیکس ادا کرے۔

مذکورہ بنیادی قاعدہ کو سامنے رکھا جائے تو تعدد ازواج کا اصول کوئی منفرد اصول نہیں، یہ عین وہی اصول ہے جو عملاً زندگی کے تمام دوسرے شعبوں میں ہمیشہ رائج رہا ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ یہ مانا گیا ہے کہ فرد پر لازم ہے کہ وہ سماج کے مسائل میں حصہ دار بنے۔ اس اصول کے مطابق کسی مرد کی زوجۂ اول کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ سماج کے مسائل میں شرکت سے انکار کرے۔ اس قسم کے دوسرے کئی اشتراک کو وہ پہلے ہی سے قبول کیے ہوئے ہے۔ پھر ایک اور اشتراک سے انکار کرنے کا اسے کیا حق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سماج کا فرد ہونا ہی کسی مرد یا عورت پر یہ ذمہ داری ڈال دیتا ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو اس حد تک نہ لے جائیں کہ وہ اجتماعیت کے تقاضوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ دوسری بیوی پر راضی ہونا مخصوص حالات میں، پہلی بیوی کے لیے ایک سماجی مسئلہ میں اشتراک کے ہم معنی ہے۔ اور پہلی بیوی کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس اشتراک کو دل کی آمادگی کے ساتھ قبول کر لے۔

تعدد ازواج کا مسئلہ ایک قانون کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ قانون جو وضع کیے جاتے ہیں وہ کس اصول کے تحت وضع کیے جاتے ہیں۔

قانون ایک اعتبار سے، فرد اور سماج کے حقوق متعین کرنے کا نام ہے۔ قانون عین اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے فرد کی ان سرگرمیوں کی حد بندی کرتا ہے جو سماج کے دوسرے افراد کے لیے مضر ہیں یا مضر ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے تو قانون ایسے فرد کے لیے ایسی سزا مقرر کرتا ہے جس سے سماج کی دادرسی ہو سکے۔

قانون کے اس تصور کے مطابق، تعدد ازواج کا اصول قانون کی منشا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ قانون کی روح یہ ہے کہ نہ صرف ایک فرد کو بلکہ پورے سماج کو زندگی کے مواقع حاصل ہوں۔ اس کے مطابق، جب سماج میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اور مردوں کی تعداد کم، تو یہ عین سماجی تقاضا بن جاتا ہے کہ اس مسئلہ کو شریفانہ طریقہ پر حل کیا جائے۔ اور اس مسئلہ کا شریفانہ حل، بلاشبہہ، وہی ہے جس کو تعدد ازواج کہا جاتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ سماج کی خاطر اس ذمہ داری کو قبول کریں جس طرح وہ دوسری ذمہ داریوں کو سماج کی خاطر قبول کیے ہوئے ہیں۔

حق کی حیثیت یہی ہے۔ دعوت حق لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کرنا چاہتی ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے سطحی مفکرین نے دعوت کو بھی چھیننے کا ایک معاملہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے دعوت کی تعبیر سیاست کے انداز میں کی۔ انھوں نے دعوت کا مطلب یہ بتایا کہ اقتدار پر قبضہ کر کے اسلامی قانون کو زمین پر نافذ کیا جائے۔ دعوت اسلامی کی یہ تعبیر مجرمانہ حد تک غلط ہے۔ اس کے نتیجہ میں داعی اور مدعو کے درمیان غیر ضروری سیاسی نزاع قائم ہوگئی۔ وہ ربانی مہم جو دراصل دینے کی مہم تھی، وہ بالکل غلط طور پر چھیننے کی مہم بن کر رہ گئی ہے۔

عربوں کی ایک مجلس میں مسلمانوں کے کردار پر گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ موجودہ مسلمانوں میں کردار کی بہت کمی ہوگئی ہے، اس لئے ان کے درمیان کوئی بڑی مہم کامیاب نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ کردار، کردار کہنے سے کردار پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح درخت، درخت کہنے سے درخت نہیں اگتا۔ درخت بیج بونے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی انسانی کردار کا معاملہ بھی ہے۔ انسانی کردار کا ایک بیج ہے، اور وہ بیج مقصد ہے۔ مقصد کا شعور ہی آدمی کے اندر وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے جس کو کردار کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ مقصد جتنا زیادہ بڑا ہوگا، کردار بھی اتنا ہی بڑا بنے گا۔ موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے مقصد کا احساس کھو دیا ہے، اس لئے وہ کردار بھی کھوئے ہوئے ہیں:

بقدر ما يكون الهدف عظيما فسوف تكون الاخلاق عظيمة. ان اكبر مشكلة في المسلمين المعاصرين انهم قد فقدوا الهدف العظيم لهذا انهم قد فقدوا الاخلاق العظيمة

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ آجکل مسلمانوں کے جس اجتماع میں جائیے یا جس مجلس میں بیٹھئے، ہر جگہ "اعداء اسلام" کے بارہ میں باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ طرز فکر سطحی بھی ہے اور خلاف اسلام بھی۔ اگر موجودہ صورت حال کو خالص عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کی اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ اور اگر اس کو دینی اعتبار سے جانچا جائے تو یہ خدا کی طرف سے انتباہ ہے تاکہ مسلمان جاگیں اور اپنی دینی کوتاہیوں کو دور کریں۔ مگر ان چیزوں کو اعداء اسلام کے خانہ میں ڈالنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ صورت حال سے مسلمانوں کے اندر

نہ تعمیر خویش کا جذبہ ابھرا اور نہ دینی احتساب کا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر مکمل طور پر شیطان کا وسوسہ ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ مسلمان جھوٹی شکایتوں میں کھوئے رہیں اور اپنی اصلاح کی طرف سے غافل ہو جائیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ جماعت۔ حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال جیسے اعمال بھی ہیں جو کہ سراسر اجتماعی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ اسلام میں دعا اور عبادت سے لے کر جہاد و قتال تک ہر عمل ذاتی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق کسی عمل کی قیمت عامل کی نیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے عمل کو اندرونی نیت کے معیار پر جانچا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر عمل، اپنے آخری تجزیہ میں، ذاتی اور شخصی عمل ہے۔ کسی عمل کا اجتماعی پہلو اس کا اضافی پہلو ہے نہ کہ اس کا حقیقی پہلو۔

ایک صاحب نے پر جوش تقریر کی۔ ان کی عربی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اعدا اسلام صرف طاقت سے ڈرتے ہیں، اور طاقت ہی کے ذریعہ ان کو شر انگیزی سے روکا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم طاقت فراہم کریں۔ ان کے نزدیک یہی دعوت اسلامی کا سب سے بڑا نکتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دعوت اس کا نام ہے کہ امت کو طاقت ور بننے کی طرف متوجہ کیا جائے (الدعوة هي توجيه الامة الى القوة)۔ اس تقریر کو سن کر مجھے نظیر اکبر آبادی کا شعر یاد آگیا:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ایک شخص بھوکا ہو تو اس کو چاند سورج بھی روٹی کی صورت میں دکھائی دیں گے۔ یہی حال موجودہ مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ مسلمانوں پر "دشمن" کا تصور اتنا چھا گیا ہے کہ ان کو ہر طرف بس دشمن کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کو اپنے اسی ذہنی نقشہ میں ڈھال لیا ہے۔ قرآن و سنت میں وہ "دعوت" کا لفظ دیکھتے ہیں تو فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ اس کا مطلب جنگی طاقت بننے کی دعوت ہے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اختلاف موجودہ دنیا کا ایک ناگزیر ظاہرہ ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گا۔ ہمارا اصل کام حالتِ اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، کیوں کہ وہ ممکن نہیں۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنائیں کہ وہ اختلاف کو پر امن دائرہ میں حل کرنے کی کوشش

کریں۔ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے برداشت کو کھو دیا ہے۔ اختلاف پیدا ہوتے ہی فوراً وہ جارحیت پر اتر آتے ہیں۔

میں نے کہا کہ روس اور امریکہ کے درمیان اختلاف تھا۔ دونوں کے پاس انتہائی طاقتور ہتھیار موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ سختی کے ساتھ اس پر قائم ہیں کہ ہر اختلاف کو میز پر طے کرنے کی کوشش کریں۔ خلیج میں عراق اور کویت کے درمیان اختلاف تھا۔ عراق کے پاس اتفاق سے کچھ طاقت آگئی۔ اس نے فوراً کویت کے خلاف فوجی اقدام کر دیا۔ دوسری طرف اسی معاملہ میں امریکہ کو عراق سے شدید ترین اختلاف ہے۔ وہ اپنی فوجیں لئے ہوئے خلیج میں کھڑا ہوا ہے۔ مگر کئی مہینے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس نے عراق پر فوجی حملہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کے اسی مزاج نے انھیں موجودہ دنیا میں برباد کر رکھا ہے۔

اخوانی طرز فکر کے کچھ عربوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو کے دوران مصر کے لیڈر سید قطب کا ذکر آیا۔ اخوانی حلقہ سید قطب کی بے حد تعظیم کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے سید قطب کو پڑھا ہے۔ میں نے ان کے یہاں علم اور گہرائی نہیں پائی۔ یہ دراصل جمال عبد الناصر تھے جنھوں نے ان کو بلند کر دیا۔ ناصر نے ان کو قطب سے شہید قطب بنا دیا۔ ناصر نے اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا تو وہ ایک عام آدمی بن کر رہ جاتے۔ مگر جب ناصر نے ان کو قتل کر دیا تو انھوں نے ان کو ہیرو بنا دیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دے کر بھٹو کو ہیرو بنا دیا:

قد قرأت لسيد قطب۔ فما وجدت عنده علما وعمقا۔ انما هو جمال عبد الناصر الذی رفعه، فصنعه من قطب الى الشهيد قطب۔ لو ترکه لمات کشخص عادی ولکن لما قتله جعله بطلا، کما ان ضياء الحق جعل بوتو بطلا بمثل هذا العمل

کچھ عربوں سے میری ذاتی زندگی کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ میری زندگی کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ دنیوی معاملہ میں میں نے جو کچھ چاہا، عملاً میرے ساتھ اس کے خلاف معاملہ کیا گیا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میری مثال اردو شاعر فانی بدایونی کے اس شعر کی سی ہے:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول　　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

طمعی کان علی استعداد لقبول نعيم العالمين، انه لکرم منک ان وهبتنی قلبا حزينا

یہاں سیکڑوں لوگ جمع تھے اور سب دین کے نام پر یہاں آئے تھے۔ مگر میں نے کسی نشست میں لوگوں کی زبان سے موت اور آخرت کی بات نہیں سنی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ لوگوں کو اس حقیقت کبریٰ کا علم ہی نہیں۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ عربی شاعر نے کہا تھا : ستبدی لك الايام ما كنت جاهلا (زمانہ تم کو عنقریب وہ چیز بتادے گا جس سے تم بے خبر تھے) شاعر نے یہ بات دنیوی معنی میں کہی تھی۔ مگر یہی بات زیادہ شدت کے ساتھ موت اور آخرت کے بارہ میں صحیح ہے۔ جب موت آئے گی اور جب قیامت برپا ہوگی تو لوگ اچانک ان باتوں کو اپنے سامنے دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائیں گے جن کی آج انھیں خبر دی جا رہی ہے۔ مگر وہ بے پروائی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کے خیال کے مطابق ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ وہ کچھ اور نوجوانوں کے ساتھ ایک خفیہ تحریک چلا رہے تھے تاکہ حکومت کا تختہ الٹ سکیں۔ کئی سال کی کوششوں کے بعد جب انھیں کامیابی نہیں ملی تو انھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ خودکشی کر لیں۔ عین اسی زمانہ میں انھیں انگریزی الرسالہ اور عربی کتابیں مل گئیں۔ ان کا مطالعہ کرتے ہی ان کا ذہن بدل گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اب مجھ کو نئی زندگی حاصل ہو چکی ہے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کے مشن کے بارہ میں کہا :

ان هذه الدنيا مثل الصحراء ولا يوجد بها اى شئ. وهذه الرسالة هي مثل الشجرة. فلا يوجد اى شئ غيرها. فيجب ان نقوم لهذه الرسالة بكل قوة.

ایک عرب جو اخوانی فکر کے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ امراء المسلمین سے سیاسی نزاع کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ حالاں کہ امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر محدث نے عباسی حکومت سے نزاع کی۔ میں نے کہا کہ آپ کا حوالہ درست نہیں۔ امام احمد نے کبھی بھی عباسی حکومت سے سیاسی نزاع نہیں کی۔ یعنی انھوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ وہ عباسی خلافت کو توڑ کر نیا سیاسی نظام بنائیں۔ ان کا اختلاف صرف ایک مخصوص اعتقادی مسئلہ میں تھا۔ اس کے آگے ان کا کوئی سیاسی مطالبہ نہیں تھا۔

یہ اسی قسم کا ایک واقعہ تھا جو ہندستان میں پیش آیا۔ ہندستان کی سپریم کورٹ نے ایک مسلم

مطلقہ عورت کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ وہ اپنے سابقہ شوہر سے ماہانہ نفقہ حاصل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ فیصلہ ملکی قانون کے تحت دیا گیا تھا۔ مگر وہ شریعت کے خلاف تھا۔ علما نے اس کے خلاف خالص غیر سیاسی انداز میں ایک مہم چلائی۔ یہاں تک کہ حکومت نے نیا ایکٹ بنا کر مسلم مطلقہ عورتوں کو اس ملکی قانون سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔ اسی پر امام حنبل کے معاملہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان پر بے اختیار یہ فقرہ آگیا ـــــ آہ، وہ لوگ جو جہنم کے قابل بھی نہیں، مگر وہ امیدوار ہیں کہ ان کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔ انھیں جنت کے باغوں میں داخل کیا جائے گا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ کو ایک واقعہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے کچھ عرب نوجوانوں سے کہا کہ قرآن کا ایک اسلوب یہ ہے کہ ایک آیت میں بظاہر ایک متعین بات کہی جاتی ہے۔ مگر وہ دراصل ایک کلیہ کا جزئی انطباق ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا (البقرہ ۱۰۶) ظاہر الفاظ کے اعتبار سے یہاں صرف نسخ آیت کا ذکر ہے۔ مگر وسیع تر معنوں میں وہ اللہ تعالیٰ کے ایک عمومی قانون کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں جب بھی کسی صورت حال کو بدلا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کسی نئی بہتر صورت کو لایا جائے۔ اس اعتبار سے قرآن کی مذکورہ آیت کی تفسیر کی جائے تو وہ اس طرح ہوگی:

ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اذا اراد ان یغیر الاحوال فما یغیرہا الا ویأتی بما ھو احسن منہ۔ ھذا ھو الاسلوب الالٰہی۔ وکذالك فعل فی القرآن فقال (ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا)

ایک مجلس میں کچھ واقف کار عربوں نے میری ذات کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ جو اسلامی مشن میں چلا رہا ہوں، اگر میں اس کو دریافت نہ کرتا تو میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کو سن کر پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ میں فطری طور پر ایک کمال پسند (perfectionist) آدمی ہوں۔ کمال سے کم (less than perfect) پر راضی ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔ جب میں سن شعور کو پہنچا تو میں نے اپنے آپ کو دو چیزوں کے درمیان پایا۔ ایک مادی دنیا۔ دوسرے تقلیدی مذہب، موجودہ دنیا

کی ہر چیز کمال سے کم ہے۔ کمال (perfect) کا حصول صرف آخرت میں ممکن ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو دنیا پر راضی نہ کرسکا۔ تقلیدی مذہب انسانی ملاوٹوں کا مذہب ہے۔ سچا مذہب فکری اعتبار سے کامل ہوتا ہے۔ مگر انسانی ملاوٹ نے تقلیدی مذہب کو کمال سے کم بنا دیا ہے۔ چنانچہ میں اس پر بھی راضی نہ ہوسکا۔ اس کے بعد اللہ کی توفیق سے میں نے اس دین کو دریافت کیا جو ابتداءً پیغمبر پر اترا تھا اور پوری طرح کمال کی صفت رکھتا تھا۔ اس دریافت نے میرے لئے زندگی کو ممکن بنا دیا۔

۳۰ ستمبر کی شام کو لیبیا کا ایک زراعتی فارم (المزرعۃ) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ طرابلس شہر سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فارم کے پرسکون ماحول میں چند گھنٹے گزارے۔

لیبیا کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ مگر یہاں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں پانی کی وہ فراوانی نہیں ہے جو ہندستان میں ہے۔ یہاں کی زمین میں ہر قسم کی عمدہ فصل اگانے کی صلاحیت ہے۔ بشرطیکہ پانی وافر مقدار میں ملنے لگے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ لیبیا میں کچھ زراعتی بیماریاں پھیل گئی ہیں۔ یہ خاص طرح کے کیڑے ہیں جو ہوا میں سفر کرکے اِدھر سے اُدھر پہنچتے رہتے ہیں۔ وہ درخت کی لکڑی کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کو کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ درخت سوکھ جاتا ہے۔ میں نے یہاں کئی درخت دیکھے جو جزئی یا کلی طور پر سوکھ گئے تھے۔

ایک مغربی ماہر نے ان کیڑوں کو ختم کرنے کا منصوبہ دیا ہے۔ مگر اس پر عملدرآمد کے لئے ایک سو ملین ڈالر کی ضرورت ہوگی۔

تاہم بعض درختوں پر ان کیڑوں کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً فارم کے اندر کھجور کے چھوٹے بڑے درخت تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر سرسبز و شاداب تھے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ اخلاقی اور دینی بیماریاں صرف ان لوگوں کو نقصان پہنچاتی ہیں جو ان سے متاثر ہونے کا مزاج رکھتے ہوں۔ جن کے اندر تاثر کا مزاج نہ ہو وہ اخلاقی بیماریوں کے ہجوم میں بھی اس سے محفوظ رہیں گے۔

ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جو لوگ اسلام کی تشریح سیاسی انقلاب کی اصطلاحوں میں کرتے ہیں، انھوں نے بہت بڑی جسارت کی ہے۔ انھوں نے بطور خود اللہ کے منصوبہ کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کے منصوبہ کے مطابق، یہ دنیا پوری کی پوری دار الامتحان ہے۔ ایک شخص گھر میں ہو یا بازار میں، تنہا ہو یا دوسروں کے ساتھ ہو۔ وہ عام انسان کی حیثیت میں ہو یا وہ

ملک کا حکمراں بن جائے، ہر جگہ وہ حالت امتحان میں ہے۔ مگر مذکورہ سیاسی تفسیر کے مطابق، حکومت مطلوب حالت قرار پاتی ہے اور غیر حکمرانی کی حالت غیر مطلوب حالت۔

اسکول کے ایک طالب علم کا امتحان ہو تو اس کو کئی پرچے دئے جاتے ہیں جن کا تعلق مختلف موضوعات سے ہوتا ہے۔ مثلاً زبان، تاریخ، سماجیات، سائنس وغیرہ۔ ان میں سے ہر پرچہ بذات خود مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو جو احوال ملے ہوں، وہی احوال اس کے لئے مطلوب احوال ہیں اور انھیں احوال میں اس کو اپنا امتحان دینا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تعبیر آدمی کے اندر سے محرک عمل چھین لیتی ہے (ھذا التفسیر یسلب من الانسان الدافع للعمل)، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص قرآن میں انفاق کا حکم دیکھتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو۔ اب اگر ایک شخص یہ سمجھے کہ کم یا زیادہ جو کچھ میرے پاس ہے، اس میں سے مجھے خرچ کرنا ہے تو حکم کو پڑھتے ہی اس کے اندر انفاق کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو موٹر کار کا عطیہ دو، تو عام انسان کے اندر انفاق کی نفسیات نہیں ابھرے گی۔ کیوں کہ وہ اس معنی میں انفاق کے حکم پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

یہی حال سیاسی تفسیر کا ہے۔ یہ تفسیر آدمی کے اندر عمل کے بجائے انتظار اور توقف کی نفسیات پیدا کرتی ہے۔ اس کے مطابق، اصل عمل کا آخری آغاز اس وقت ہوگا جب کہ حکومت پر قبضہ ہو جائے۔ اس لئے وہ حکام سے ٹکراؤ کی نفسیات تو ابھارتی ہے مگر ذاتی عمل کی نفسیات نہیں ابھارتی۔ ھذا التفسیر یُنبت فی الانسان نفسیۃ محاسبۃ الحکام لا نفسیۃ محاسبۃ الذات۔

ہندستان اور پاکستان کے لوگ یہاں کافی تعداد میں ہیں۔ انھوں نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ کو طرابلس کے ایک ہال میں سیرت النبی کا جلسہ کیا۔ اس موقع پر مجھے خطاب کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ میں نے جلسہ سے خطاب کیا۔ اس جلسہ میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی شریک ہوئے۔ سفیر ہند مسٹر گلیانی بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام وقتی نہیں تھا۔ اس کا تعلق (relevance) عصر حاضر کے لئے بھی پوری طرح موجود ہے۔ عصر او رمغرب کے

درمیان تقریر ہوئی ۔ مغرب کی نماز کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوئی۔ یہ دوسری نشست صرف مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

زیادہ تر سوال ہندستان کے مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں کیا گیا۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہندستان کا معاملہ وہی ہے جو ساری دنیا کا معاملہ ہے۔ خواہ ہندستان ہو یا لیبیا یا پاکستان یا سعودی عرب یا یورپ اور امریکہ ، ہر جگہ کامیاب زندگی گزارنے کا راز صرف ایک ہے ۔ اور وہ برداشت اور ٹالرنس ہے۔ کسی بھی ملک میں اگر آپ کامیاب ہیں تو اس لئے کامیاب ہیں کہ وہاں آپ برداشت کرکے رہتے ہیں۔ اور جہاں آپ بظاہر ناکام ہیں وہاں اسی لئے ناکام ہیں کہ وہاں آپ نے برداشت کو کھو دیا ہے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۰ کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۷۲۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر بہت کم مسافر تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر جہاز کے چاروں طرف دیکھا تو سیٹوں پر اتنے کم آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوا کہ گویا جہاز خالی حالت میں اڑ رہا ہے۔ میں نے جہاز کے عملہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیٹیں بالقصد خالی رکھی گئی ہیں۔ کویت اور عراق میں کام کرنے والے لاکھوں پاکستانی جو کویت پر حملہ کے بعد بھاگ کر اردن آگئے تھے، ان کو روزانہ عمان سے پاکستان لے جایا جا رہا ہے۔ ان پناہ گزینوں کی خاطر یہ سیٹیں خالی رکھی گئی ہیں۔ مزید یہ کہ عمان میں جہاز کا اترنا خصوصی معاملہ کے طور پر ہے۔ کیوں کہ عام قاعدہ کے مطابق یہ جہاز عمان میں نہیں اترتا۔

میں نے سوچا کہ ان پاکستانیوں کی وہ کیا خصوصیت ہے جس نے ان کے اندر یہ قیمت پیدا کر دی کہ ان کے لئے خالی جہاز بھیجے جائیں۔ ذہن نے کہا کہ اس کی وجہ ان پاکستانیوں کی مظلومیت ہے ۔ کبھی دولت اور اقتدار سے آدمی کے اندر قیمت پیدا ہوتی ہے۔ کبھی آدمی کا عاجز اور مظلوم ہونا اس کے اندر وہی قیمت پیدا کر دیتا ہے جو عام حالات میں قوت و طاقت کے ذریعہ کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔

یہ سوچ کر دل بھر آیا۔ میں نے کہا کہ خدایا ، میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے ۔ میرے پاس طاقت والی چیزوں میں سے کوئی چیز موجود نہیں۔ میرے پاس صرف عجز ہے۔ تو میرے عجز کو قبول فرما۔ ایک عاجز کے لئے وہ فیصلہ فرما دے جو عام حالات میں صرف طاقتور کا حق سمجھا جاتا ہے۔

جہاز میں پاکستانی اخبارات (نوائے وقت، جنگ، جسارت، دی نیشن) پڑھ رہا تھا۔ اس دوران یہ آیت یاد آئی: یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون (القلم ۴۲)

میں نے کہا کہ اس آیت میں "سجدہ" کا لفظ علامتی طور پر آیا ہے۔ اصل میں یہ محرومی کا ایک وسیع تجربہ ہے جو آدمی کے اوپر قیامت میں گزرے گا۔ مالک کائنات اپنے تمام جلال و کمال کے ساتھ انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ اس وقت آدمی خدا کو دیکھنا چاہے گا مگر وہ اس کو نہ دیکھ سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں وہ خدا کو دیکھنے کے لئے اندھا بنا رہا۔ وہ خدا کی حمد کرنا چاہے گا مگر وہ اس کی حمد نہ کر سکے گا، کیوں کہ دنیا میں خدا کی حمد کرنے سے اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ وہ خدا کی باتوں کو سننا چاہے گا مگر وہ اس کو نہ سن سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں خدا کی باتوں کو سننے کے لئے اس نے اپنے کان بند کر لئے تھے۔ وہ چاہے گا کہ اپنے رب کی عظمت کے اعتراف میں اس کے آگے جھک جائے مگر وہ اس کے آگے نہ جھک سکے گا، کیوں کہ دنیا میں وہ اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

روزنامہ جنگ (۳ اکتوبر ۱۹۹۰) کے صفحۂ اول پر وزیر اعظم پاکستان غلام مصطفیٰ جتوئی کی ایک تقریر درج تھی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ لوگوں کو کوئی چیز "احتساب سے نہیں بچا سکتی"۔ اور یہ کہ "۲۴ اکتوبر ان کے لئے یوم حساب ثابت ہوگا"۔ اسی خبر کا عنوان روزنامہ جسارت (۳ اکتوبر) میں یہ تھا: کوئی سازش بدعنوانوں کو احتساب سے نہیں بچا سکتی۔

میں نے سوچا کہ پاکستان کا ۲۴ اکتوبر (الکشن) وہ یوم حساب ہے جو انسان صرف اپنی محدود طاقتوں کے ذریعہ برپا کر سکتا ہے۔ ایسے یوم حساب سے بچ نکلنا بہت آسان ہے۔ جیسا کہ سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے احتساب کے باوجود پیپلز پارٹی دوبارہ زندہ رہی۔ مگر انسان پر ایک اور یوم حساب آنے والا ہے۔ اس سے کوئی شخص بھی بچ نہ سکے گا۔ حتیٰ کہ صدر اور گورنر اور وزیر اعظم بھی نہیں۔

چوں کہ پاکستان میں الکشن قریب ہے، اس لئے ہر لیڈر بے تکان بول رہا ہے۔ تمام اخبارات لیڈروں کے بیانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر ایک اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط ثابت کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج ہر آدمی کے پاس الفاظ ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ کسی کے پاس الفاظ نہیں ہوں گے۔ اس وقت صرف وہ شخص بول سکے گا جو دنیا میں خدا کے خوف سے چپ ہو گیا تھا۔ اس دن صرف اس شخص کو چلنے کی سعادت حاصل ہوگی جس کے قدم خدا کی عظمت کے احساس

سے موجودہ دنیا میں رک گئے تھے۔

جسارت کے صفحہ اول کی ایک خبر کی سرخی یہ تھی : نواز شریف نے ملکی سیاست کو لسانی اور گروہی سیاست کی نذر کر دیا ہے ـــــ جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ کی قرارداد ؛ نواز شریف صاحب اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر ہیں ، اور جماعت اسلامی اس اتحاد میں پوری طرح شامل ہے ۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف اخبار میں اس قسم کے بیان چھپ رہے ہیں۔ اس خبر کو میں نے پڑھا تو میری زبان پر یہ الفاظ آ گئے : وہ اتحاد بھی کیسا عجیب اتحاد ہوگا جو ملک کو گروہی سیاست کے خانوں میں بانٹ دے ۔

شام کو جہاز دمشق پہنچا۔ جہاز سے اتر کر کچھ وقت دمشق کے ہوائی اڈہ پر گزارا ۔ مغرب کی نماز بھی جماعت کے ساتھ دمشق کے ہوائی اڈہ پر پڑھی۔

دمشق کا نام سب سے پہلے میں نے غالباً دس سال کی عمر میں سنا جب کہ مولانا فیض الرحمان اصلاحی (وفات ۱۸ فروری ۱۹۷۲) کے ذریعہ میں نے شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۲۱۳ء) کی فارسی کتاب بوستاں پڑھی ۔ یہ منظوم کتاب اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے ۔ اس کی ایک حکایت اس شعر سے شروع ہوتی ہے :

چناں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس نظم میں دمشق کے ایک قحط کا ذکر ہے جس میں عشق کرنے والے اپنا عشق بھول گئے تھے ۔ شیخ سعدی نے قحط کی تصویر کشی کرتے ہوئے جو اشعار لکھے ہیں ، ان میں سے ایک شعر یہ ہے :

نہ بر کوہ سبزہ نہ در باغ شخ   ملخ بوستاں خوردو مردم ملخ

(نہ پہاڑ پر ہریالی باقی رہی اور نہ درخت پر شاخ ، ٹڈیاں باغ کو کھا گئیں اور لوگوں نے ٹڈیوں کو)

دمشق ایک ایسا شہر ہے جو اسلامی قافلہ کے سفر کے تیسرے مرحلہ کی یاد دلاتا ہے ۔ جیسا کہ معلوم ہے ، امیر معاویہؓ نے دمشق کو اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا ۔ یہاں سے اسلام کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوا ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا ۔ اس وقت مکہ اسلامی دعوت کا مرکز تھا ۶۲۲ء میں ہجرت ہوئی اور مدینہ اسلام کا مرکز قرار پایا ۔ بنو امیہ کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو انھوں نے ۶۶۱ء میں دمشق کو اسلام کے مرکز کی حیثیت دے دی ۔ ۷۵۰ء میں بنو عباس اسلامی اقتدار پر قابض

ہو گئے اور انھوں نے بعض سیاسی اسباب کے تحت بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنانا پسند کیا۔ جو ۱۲۵۸ء تک باقی رہا۔

اس کے بعد کئی نسبتاً چھوٹے اسلامی مراکز بنے۔ عبدالرحمٰن اموی ۷۵۶ء میں اسپین میں داخل ہوا اور یہاں اس شاندار عہد کا آغاز کیا جس کو "مسلم اسپین" کہا جاتا ہے۔ یہ دور ۱۴۹۲ء میں آخری طور پر ختم ہوا۔ اس درمیان میں مختلف چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے دو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک، عثمانی خلافت جس کا مرکز استنبول تھا۔ یہ ۱۳۰۰ء کے بعد شروع ہوئی اور چھ صدیوں تک شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی۔ ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک کے الغاء خلافت کے اعلان سے رسمی طور پر اس کا خاتمہ ہو گیا دوسری، مغل سلطنت ہے جو بابر کے فتح دہلی ۱۵۲۶ء سے باقاعدہ طور پر قائم ہوئی اور ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر پر ختم ہو گئی۔

شام ایک عرب ملک ہے، جس طرح سعودی عرب اور کویت عرب ملک ہیں۔ مگر سعودی عرب اور کویت پٹرول کے خزانوں سے مالا مال ہیں، جب کہ شام کے پاس اس قسم کی کوئی قدرتی دولت نہیں۔ دوسری طرف حدیث کی پیشین گوئیوں کے مطابق، حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول شام کے شہر دمشق میں ہوگا جو کہ بلاشبہہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تقسیم کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس نے امریکہ کو بہترین جغرافیہ دیا اور بنگلہ دیش کو اس کے برعکس جغرافیہ۔ کسی کو معتدل موسم سے نوازا اور کسی کے حصہ میں سخت موسم لکھ دیا۔ بعض ملکوں کے نیچے دولت کے خزانے رکھ دئے مگر نزول مسیح جیسے غیر معمولی واقعہ کے ظہور کے لئے ایک ایسے علاقہ کو منتخب کیا جو مادی دولت میں دوسرے خوش نصیب ملکوں سے پیچھے تھا۔ موجودہ دنیا میں ہمارے لئے صرف یہی ممکن ہے کہ ہم اس "تقسیم" پر راضی ہو جائیں۔ اس ربانی تقسیم میں کیا کیا مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو جاننے کے لئے قیامت کا انتظار کرنا چاہئے۔

خلیج کے موجودہ بحران کے نتیجہ میں بالکل نئے قسم کے حالات سامنے آئے ہیں۔ مثلاً شام اسرائیل کا سخت دشمن تھا، کیوں کہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں اسرائیل نے شام کا ایک علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ چوں کہ امریکہ اسرائیل کا ساتھی ہے، اس لئے شام کو امریکہ سے بھی سخت دشمنی تھی۔ مگر کویت کی صورت حال

پیش آنے کے بعد اس نے امریکہ سے تعلق قائم کرلیا اور اپنی فوجیں سعودی عرب بھیج دیں جہاں وہ امریکہ کے ماتحت عمل کریں گی۔ مسٹر جی ایچ جانسین (G.H. Jansen) نے اس واپسی کو یوٹرن (U-turn) کا نام دیا ہے۔

دمشق کے ہوائی اڈہ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خلیج کے بحران پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کویت تو اس سے پہلے عراق کا ایک حصہ تھا۔ اور بصرہ کے ماتحت تھا۔ ایسی حالت میں اگر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کرلیا ہے تو اس کے لئے یورپ اور امریکہ کی فوج بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صاحب حق کو اس کا حق ملنے کے ہم معنی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں کہ کویت اس سے پہلے عراق کا حصہ تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کویت عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا جس طرح خود عراق عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ البتہ کویت چوں کہ بہت چھوٹا ملک تھا اور اس وقت اس کی آبادی بہت کم تھی، اس لئے عثمانیوں نے اس کو بصرہ کے گورنر کے ماتحت کر رکھا تھا۔

تاہم اس سے قطع نظر، بجائے خود یہ ایک غلط اصول ہے کہ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ ماضی کی بنیاد پر کیا جائے۔ اگر یہ کوئی صحیح اصول ہو تو پھر فلسطین پر یہودیوں کے قبضہ کو بھی جائز قرار دینا چاہئے، کیوں کہ ایک زمانہ میں فلسطین بھی یہودی سلطنت کا حصہ تھا۔ مزید یہ کہ یہودیوں کو فلسطین کا علاقہ خود خدا کی طرف سے بطور انعام دیا گیا تھا۔ بین اقوامی دنیا میں اگر اس اصول کو چلایا جائے تو ساری دنیا کا جغرافیہ از سر نو بنانا پڑے گا۔ کیا صدام حسین کے حامی اپنے نظریہ کے اس وسیع انطباق کے لئے تیار ہیں۔

عام حالات میں یہ جہاز دمشق سے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ مگر آج وہ کویت سے آئے ہوئے لوگوں کو لینے کے لئے عمان ایئرپورٹ پر اترا۔ یہاں ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرا رہا۔ تمام سیٹیں بھر گئیں۔ آنے والے لوگ جب جہاز کے اندر داخل ہوئے تو میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ ان کے چہرہ پر خوشی کے آثار تھے۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ اب وہ بحرانی دور سے باہر آچکے ہیں اور چند گھنٹے کے بعد وہ اپنے وطن میں پہنچ جائیں گے۔

آدمی پر مشکلیں پیش آتی ہیں۔ جب وہ مشکلوں کے اندر گھرا ہوا ہو تو وہ سخت مایوسی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مگر جب حالات بدلتے ہیں تو اچانک وہ اطمینان کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ وہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ اگر یہ بھولنے کا مادہ آدمی کے اندر نہ ہو تو اس کے لئے زندگی گزارنا سخت مشکل ہوجائے۔

۱۴ اکتوبر کو صبح ساڑھے چار بجے کراچی پہنچا۔ یہاں ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر دو دن قیام رہا۔ میرا قیام جناب طارق رحمن صاحب (گلشن اقبال) کے یہاں تھا۔

پاکستان کے سفر کا پروگرام ابتداءً ۱۹ فروری کے لئے طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق انڈین ایئر لائنز سے ریزرویشن بھی کرایا جا چکا تھا۔ مگر ۱۴ فروری کو کراچی سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ کراچی میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ فساد اور کرفیو کی وجہ سے اجتماع کا پروگرام چلانا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ ۱۹ فروری کو سفر کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

اس قسم کا التواء اس سے پہلے کشمیر کے سلسلہ میں بھی پیش آیا تھا۔ کشمیر (سرینگر) کا ایک پروگرام ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کے لئے طے ہوا تھا۔ اس کا اعلان ہو چکا تھا اور اس کا رزرویشن بھی کرایا جا چکا تھا۔ مگر آخر وقت میں ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ کشمیر میں حالات بگڑ گئے ہیں اور اجتماع کا انتظام ممکن نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان توڑ پھوڑ کی جو سیاست جگہ جگہ چلا رہے ہیں۔ اس سے انھوں نے پایا تو کچھ نہیں، البتہ یہ نقصان ہوا کہ ناقابل تلافی حد تک دعوتی اور تعمیری کام کے مواقع ختم ہو گئے۔

پاکستان کے مذکورہ پروگرام کی وجہ سے مجھے دوسرے کئی پروگرام چھوڑنے پڑے تھے۔ ۲۲ فروری ۱۹۹۰ کو لکھنؤ میں سیرت کا جلسہ تھا۔ اس کا ٹکٹ آ چکا تھا۔ مگر مجھے معذرت کرنی پڑی کہ میں ۲۲ فروری کو وہاں کا سفر نہ کر سکوں گا۔ وغیرہ

کراچی کا مذکورہ پروگرام فاران کلب نے بنایا تھا۔ ۱۹ فروری سے ۲۶ فروری تک کا پورا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ مگر آغاز سفر سے چند دن پہلے کراچی کے ٹیلیفون پر سفر کو منسوخ کرنا پڑا۔

اس طرح پاکستان کے سفر کا باقاعدہ پروگرام بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ آخر میں میں نے طے کیا کہ موجودہ سفر کے تحت ٹرانزٹ کے طور پر ایک دو دن کے لئے کراچی میں قیام کروں۔ چنانچہ دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کر لیا گیا تاکہ واپسی کے موقع پر کراچی میں قیام کیا جا سکے۔

باہر کے سفروں میں پہلا مرحلہ ویزا کا ہوتا ہے۔ نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ سے ویزا بن کر آیا تو اس پر لکھا ہوا تھا پولیس رپورٹنگ سے مستثنیٰ (Exempted from police reporting) ویزا کی فیس بھی انھوں نے ازراہ عنایت لوٹا دی تھی اور "فری" ویزا جاری کر دیا تھا۔

یہ واقعہ دیکھ کر دل نے کہا کہ کاش یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے دن بھی کیا جائے۔

آخرت میں مجھ سے کہہ دیا جائے کہ عمل کی قیمت دینے سے تم کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ نیز تم کو اس سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے کہ تم کو فرشتوں کی جانچ کے مرحلہ سے گزرنا پڑے۔ اور اللہ کے لئے یقیناً ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

۴ اکتوبر کو ظہر کی نماز گلشن اقبال (بلاک نمبر ۲) کی جامع مسجد میں پڑھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی صورت میں ہے۔ اس کے اندر اور باہر بالکل فطرت کا ماحول ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں ایک روحانی مرکز میں ایک روحانی عمل ادا کر رہا ہوں۔

جب میں مسجد کے اندر بیٹھا ہوا تھا، مجھے خیال آیا کہ اگر مسلمان ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دیں جن کو وہ اسلام کے نام پر غیر ضروری طور پر جاری کئے ہوئے ہیں، اور اسلام کی نمائندگی کے لئے صرف اس قسم کی مسجدیں دنیا میں باقی رہیں تو دنیا کی آدھی آبادی صرف ان مسجدوں کو دیکھ کر اسلام قبول کر لے۔ دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں کے مقابلہ میں مسجد کا ماحول نہایت فطری اور سادہ ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی بے فائدہ سیاسی اور مادی اور قومی ہنگامہ آرائیوں نے اسلام کے اس فطری حسن پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر مسلمان صرف اتنی قربانی کریں کہ وہ کچھ نہ کریں تو اسلام اپنے آپ دنیا کو اپنی طرف کھینچے گا اور لوگ جوق در جوق دین فطرت کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے۔

ایک پاکستانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس سال ہائی اسکول پاس کیا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ہندو لڑکے تعلیم کے میدان میں مسلمان لڑکوں سے آگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، یہ بات صحیح ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے ایک استاد نے ایک مرتبہ یہی بات ہم لوگوں سے کہی۔ انھوں نے اس کا راز یہ بتایا کہ ہندو لڑکوں میں مل کر پڑھنے (combined study) کا رواج ہے۔ مل کر پڑھنے سے ہر ایک کو دوسرے کی معلومات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، ایک طالب علم ذاتی طور پر پڑھے تو اس کو ایک درجہ فائدہ ملے گا۔ مگر جب کئی طالب مل کر مطالعہ کریں تو ہر ایک کو کئی گنا زیادہ فائدہ ملنے لگتا ہے۔

کراچی کے روزنامہ جنگ (۳ اکتوبر) میں "جنگ الکشن سیل" کی طرف سے ایک تجزیہ چھپا تھا۔ اس میں ۱۹۸۸ میں ہونے والے الکشن کی ان ۴۳ نشستوں کا ذکر تھا جو اسلامی جمہوری اتحاد اور دوسری جماعتوں اور آزاد امیدواروں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو مل گئیں۔ ان جماعتوں میں ووٹ بٹ جانے کے باعث پیپلز پارٹی جیت گئی۔

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ یہ پوری سچائی نہیں۔ مضمون نگار نے نام بنام تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ یہی واقعہ خود پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اس کے اپنے دائرہ میں بھی کئی جگہ امیدواروں کی کثرت کی بنا پر اس کے ووٹ بٹ گئے اور وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلہ میں ہار گئی۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ اس نے باقاعدہ تفصیلات جمع کیں تو حیرت انگیز طور پر ان نشستوں کی تعداد بھی ۴۴ ہی تھی جو پیپلز پارٹی نے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر کھو دیں۔ یعنی اپنے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر اسلامی جمہوری اتحاد نے بھی ۴۴ نشستیں کھوئیں۔ اور اسی طرح پیپلز پارٹی نے بھی ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر ۴۴ نشستیں کھو دیں۔

اختلافی معاملات میں لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے موافق آدھی بات کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے مخالف آدھی بات کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ طریقہ نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کریں وہ ہمیشہ حقیقت کی دریافت میں ناکام رہتے ہیں۔

۵ اکتوبر کی صبح کو گلشن اقبال میں ایک نشست ہوئی۔ اس میں کراچی کے کچھ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ ابتداءً میں نے دعوت اسلامی کے جدید امکانات پر گفتگو کی۔ نیز بتایا کہ ان دعوتی امکانات کو استعمال کرنے کے لئے "صبر" کی صفت درکار ہے۔ یعنی ناخوشگوار باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ دعوت کے عمل پر لگانا۔ گفتگو کے آخر میں سوال وجواب ہوا۔ یہ نشست تقریباً ۳ گھنٹہ جاری رہی۔

مہاجر تحریک کے قائد الطاف حسین صاحب یہاں کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔ میں نے سنا تھا کہ ان کے جلسہ میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ اس لئے میں ان کو سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وی سی آر پر ان کا ایک پروگرام دیکھا۔ وہ نومبر ۱۹۸۹ میں لاہور گئے تھے۔ یہ ویڈیو کیسٹ اسی سفر سے تعلق رکھتا تھا۔

الطاف حسین صاحب نہایت پرجوش انداز میں بولتے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو زبان کے ساتھ ان کا پورا جسم بھی مسلسل حرکت میں رہتا ہے "ہاجر پاکستان میں مہاجر بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ پاکستانی بن کر رہنے آیا تھا۔ مگر جب ہم نوکری کے لئے گئے تو ہم سے پوچھا گیا کہ تمہارا باپ کہاں پیدا ہوا تھا، تمہارا دادا کہاں پیدا ہوا تھا، اس امتیاز نے ہم کو مہاجر بنا دیا۔" "ہم اپنے وطن میں بے وطنی کا طعنہ سنتے ہیں۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں تو ہم کو کلاشنکوفوں سے بھون دیا جاتا ہے۔" "ہمارے خلاف بالقصد فسادات

کرائے جاتے ہیں تاکہ مہاجر اور غیر مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو۔ یہ فسادات ایک منظم سازش کے تحت ہو رہے ہیں۔ مہاجرین کی بستی علی گڑھ پر حملہ کیا گیا اور چھ گھنٹہ تک ہم گولیوں سے بھونے جاتے رہے۔ مگر کوئی ہمارے لئے بولنے والا نہیں۔ اس چیز نے مہاجر تحریک پیدا کی"۔

الطاف حسین صاحب کی تقریر کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس نے انھیں لیڈر بنایا ہے۔ یہ دراصل مہاجرین کا احساس مظلومی ہے۔ وہ مظلوم مہاجرین کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس نے ان کو مہاجرین کا لیڈر بنا دیا ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال ہندستان میں بھی ہے۔ جو شخص مسلمانوں کے احساس مظلومی کی ترجمانی کرتا ہے وہ ان کے درمیان فوراً مقبول ہو جاتا ہے۔ مگر سچا لیڈر وہ ہے جو لوگوں کے احساس یافت کو جگا کر ان کا قائد بنے۔

سفر کے دوران میں نے ایک پائلٹ سے پوچھا کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہوائی جہاز کو ہم نہیں اڑاتے۔ یہ دراصل نیچر کا قانون ہے جو ہوائی جہاز کو اڑاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہوائی جہاز کی مخصوص وضع، اس کا پنکھا، انجن کے ذریعہ تیزی سے پیچھے کی طرف ہوا نکالنا، اور رن وے پر اس کو تیزی سے دوڑانا، اس قسم کی کچھ چیزیں جب آپ ایک مشین میں جمع کریں تو وہ اپنے آپ اوپر اٹھنے لگتی ہے۔ یہ نیچر کا قانون ہے، اور اسی قانون کو استعمال کر کے ہم ہوائی جہاز کو اڑاتے ہیں۔

امکانات فطرت کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ٹکنولوجی ہے۔ پانی کو سو ڈگری تک حرارت پہنچائیں تو اس کے مالیکیول ٹوٹنے لگتے ہیں جس کا دوسرا نام ابلنا ہے۔ مقناطیسی فیلڈ اور موشن کو یکجا کریں تو الیکٹران دوڑنے لگتے ہیں جس سے بجلی تیار ہوتی ہے۔ اسی طرح مقناطیسی فیلڈ اور کرنٹ کو یکجا کریں تو موشن پیدا ہو جاتا ہے جس سے تمام مشینیں چلتی ہیں۔ اسی طرح کچھ خاص چیزوں کو یکجا کریں تو مشین اوپر اٹھنے لگتی ہے جس سے ہوابازی کی صنعت وجود میں آئی ہے۔

اس دنیا میں امکاناتِ فطرت کو استعمال کرنے ہی کا نام کامیابی ہے۔ اسی سے تمام ٹکنولوجی ظہور میں آئی ہے۔ اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کوئی حقیقی کامیابی اس وقت ملتی ہے جب کہ زندگی کے امکانات کو سمجھا جائے اور اس کو حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا ماحول تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ طلبہ

تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پاکستان میں یہ برائی سب سے پہلے جماعت اسلامی نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے زمانہ میں شروع کی۔ انھوں نے طلبہ کو منظم کرکے انھیں اپنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ جب دوسری جماعتوں نے دیکھا کہ جماعت اسلامی طلبہ کو سیاسی طاقت کے طور پر استعمال کر رہی ہے تو وہ بھی یہی کرنے لگے۔ کسی قوم کے نوجوانوں کو تعلیم سے ہٹا کر سیاست میں لگانا بلاشبہ اس قوم کے ساتھ دشمنی ہے، اور دشمنی کی یہ قسم ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

ایک صاحب جو یہاں کی اصطلاح میں "مہاجر" ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم نے زبردست تحریک چلا کر پاکستان بنوایا۔ ہم سمجھتے تھے کہ پاکستان بنتے ہی برصغیر کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر پاکستان کو بنے ہوئے آدھی صدی بیت گئی اور مسائل کا حل ہونا تو درکنار، ان میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

میں نے کہا کہ یہ سادہ سی بات نہیں بلکہ بہت گمبھیر بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ برصغیر ہند کے ہندو مسلمانوں کے لئے مدعو کے درجہ میں تھے۔ مسلمانوں کو انھیں دین حق کا پیغام دینا تھا۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھ کر ان سے ٹکراؤ شروع کر دیا۔ انھوں نے علیٰحدگی اور تقسیم کا نعرہ لگایا۔ آخر کار مقاطعہ اور مہاجرت کی وہ صورت سامنے آئی جس کا نام پاکستان ہے۔

اس طرح کا عمل اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ مدعو قوموں کو دعوت دی جائے اور یک طرفہ صبر کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچایا جائے۔ اتمام حجت سے پہلے اگر مقاطعہ اور مہاجرت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ اللہ کے نزدیک سراسر غلط ہوگا۔

پاکستانی مسلمانوں کو میرا مشورہ ہے کہ ہندستان کے معاملہ میں وہ اپنے عداوتی ذہن کو بدلیں۔ ہندستان کی طرف سے اگر کوئی زیادتی کی بات ہوتی ہے تو اس کو نظر انداز کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر اس کے خیر خواہ بنیں۔ پاکستان کے مسلمان اگر ایسا کر سکیں تو یہاں سے وہ اپنی ایک نئی تاریخ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۹ کی صبح کو میں دوبارہ دہلی واپس پہنچا۔

۱ غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مذہب فرقہ پرستی نہیں سکھاتا۔ اس سمپوزیم کی دعوت میں مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی گئی۔ اس خلاصہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں یا اور دوسرے تمام جھگڑوں کو ختم کرنے کی تدبیر اعراض ہے۔ گھر سے لے کر باہر تک کے تمام جھگڑوں کا واحد حل یہی ہے۔

۲ دوردرشن (نئی دہلی) نے نیشنل پروگرام کے تحت ۱۳ دسمبر کی شام کو اور ۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو صدر اسلامی مرکز کے دو خطابات نشر کئے۔ ان دونوں خطابوں میں خصوصیت سے امن اور انسانیت پر زور دیا گیا تھا۔

۳ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس انٹرویو میں بتایا گیا تھا کہ اسلام ہر حال میں امن کا پیغام دیتا ہے۔ سماج میں امن کا ماحول قائم کرنا اسلام کا اہم ترین تقاضا ہے۔

۴ اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، شانتی لال موتھا اور صدر اسلامی مرکز کے تعاون سے ایک شانتی یاترا نکالی گئی۔ یہ شانتی یاترا ۱۵ دسمبر کو پونہ سے شروع ہو کر ۲۱ دسمبر ۱۹۹۲ کو ناگپور میں ختم ہوئی۔ اس کا مقصد امن اور انسانیت کا پرچار کرنا تھا۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت ملاحظہ کریں۔

۵ انگریزی ہفتہ وار ایشیا ویک کے نمائندہ مسٹر روی نے ۲۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ ایشیا ویک ہانگ کانگ سے نکلتا ہے۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والے حالات سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈیا میں ہمارے لئے جو آپشن ہے وہ سیکولرزم اور ہندوازم کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ اصل آپشن سیکولرزم اور انارکی کے درمیان ہے۔ اگر سیکولرزم کو چھوڑ دیا گیا تو اس کے بعد ملک میں جو چیز آئے گی وہ انارکی ہوگی نہ کہ فی الواقع ہندوازم یا ہندو راشٹریہ۔

۶ پی ٹی آئی کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو بیشتر انگریزی اور ہندی روزناموں میں شائع ہوا۔ اس کا ایک حصہ دوردرشن نے بھی بتایا۔

اس انٹرویو کا موضوع زیادہ تر موجودہ حالات اور مسلمان تھا۔

۷ ہندی روزنامہ جن ستّا کے نمائندہ مسٹر رام بہادر رائے نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو جن ستا کے شمارہ ۳ جنوری ۱۹۹۳ میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ زیادہ تر سوالات وجواب کا تعلق موجودہ حالات سے تھا۔

۸ ۴ جنوری ۱۹۹۳ کو آل انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک مذاکرہ ہوا۔ اس کا عنوان تھا :

Tackling the Ayodhya crisis

اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کا موضوع اجودھیا مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس مذاکرہ میں شرکت کی اور وہاں بتایا کہ اسلام کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ اس کی تفصیلی رپورٹ اخبارات میں آچکی ہے۔ مثلاً قومی آواز (۵ جنوری ۱۹۹۳) میں۔

۹ سندھیا جین نمائندہ سنڈے میل، نے ۱۳ جنوری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق نئے ہندستان میں مسلمانوں کی پوزیشن سے تھا۔

۱۰ ودیشا (مدھیہ پردیش) کے ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ودیشا کا سفر کیا۔ ۱۲ جنوری ۱۹۹۳ کو وہاں دو پروگرام ہوئے۔ ایک عمومی اجتماع۔ اس میں ۹۵ فیصد تعداد ہندو تعلیم یافتہ حضرات کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ خطاب کا موضوع تھا : بہتر سماج کی تعمیر۔

۱۱ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں : میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ الرسالہ بھی پڑھتا ہوں۔ ان کو پڑھنے کے بعد میں نے صحیح طور پر اسلام کو سمجھا۔ اور فکری طور پر اس کی طرف مائل ہوا۔ اس سے پہلے میں نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مگر اللہ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ ہدایت دینا منظور تھا۔ اب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا ہوں (سید محمد برکت الرحمٰن، کھڑگ پور، بنگال)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۳، شمارہ ۱۹۷

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)
Single Copy Rs 6; Annual Subscription Rs 72/ $25 (Air-mail)

عقل کا امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ فرعون کے دربار میں ایک صاحب (رجل مومن) تھے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ آخر ایک موقع پر جب فرعون نے کہا کہ اس کا ارادہ ہے کہ وہ موسیٰ کو قتل کر دے، اس وقت وہ خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے فرعون اور تمام اہل دربار کے سامنے حضرت موسیٰ کی حمایت میں تقریر کی۔ یہ تقریر قرآن کی سورہ نمبر ۴۰ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

قرآن میں اس رجل مومن کی تقریر کو نقل کرتے ہوئے ایک مقام پر یہ الفاظ ہیں : وقال الذی آمن یا قوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد (اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا کہ اے میری قوم، تم لوگ میری پیروی کرو، میں تمہاری رہنمائی سیدھے راستہ کی طرف کر رہا ہوں) المومن ۳۸

دوسری طرف قرآن میں فرعون کی تقریر کے ذیل میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں : قال فرعون ما اُریکم الا ما اریٰ وما اھدیکم الا سبیل الرشاد (فرعون نے کہا کہ میں تم کو اپنی سوچی سمجھی رائے بتا رہا ہوں اور میں تمہاری رہنمائی ٹھیک سیدھے راستہ کی طرف کر رہا ہوں) المومن ۲۹

فرعون کی حیثیت رجل کافر کی تھی مگر اس نے بھی وہی بات کہی جو رجل مومن نے کہی۔ دونوں نے کہا کہ میں تم کو سبیل الرشاد (راہ راست) کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں حق کا مبلغ جو الفاظ بولتا ہے وہی الفاظ باطل کے مبلغ بھی بولتے ہیں۔ دونوں صداقت کے حوالے سے اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ حق کا مبلغ اگر دلائل حق کے حوالے سے اپنی بات کہتا ہے تو باطل کے مبلغ بھی بظاہر دلائل حق ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔

مگر ایک کی دلیل حقیقی دلیل ہے اور دوسرے کی دلیل بناوٹی دلیل۔ یہاں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان تمیز کرے۔ وہ شوشہ اور حقیقت کے فرق کو سمجھے۔ وہ مغالطہ اور دلیل کو الگ کر کے دیکھے۔ وہ الفاظ سے گزر کر معانی کو پہچانے۔ جو شخص خدا کی دی ہوئی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو شخص خدا کی دی ہوئی عقل کو استعمال نہ کر سکے وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے گا۔

ہدایت کا قانون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے ۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے ، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ۔ اور اللہ سننے والا ، جاننے والا ہے ۔ اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے ، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے ۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مددگار شیطان ہیں ، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں (البقرہ ۲۵۷)

ہدایت کا راستہ مکمل طور پر واضح ہو جانے کے بعد کیوں شیطان کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ کسی شخص کو روشنی سے تاریکی کی طرف اور ہدایت سے گمراہی کی طرف لے جائے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت خواہ کتنی ہی زیادہ واضح ہو جائے ۔ اس عالم امتحان میں بہر حال یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ کلام ہدایت کی غلط تاویل کر کے اس کا الٹا مفہوم نکالا جا سکے ۔

ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم سے میری ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام کا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے ۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں اتنے زیادہ تضادات ہیں کہ میرے جیسا آدمی تو کبھی اس کو سچا مذہب نہیں مان سکتا ۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے ۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے قرآن میں ایک طرف لکھا ہوا کہ لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی نہیں) دوسری طرف بخاری میں یہ حدیث ہے کہ آپ کے پیغمبر نے کہا کہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں ۔ یہاں تک کہ وہ کہہ دیں کہ لا الٰہ الا اللہ) آیت میں عمومی قانون کا ذکر ہے اور حدیث میں استثناء کا ۔ مگر دونوں حکموں کو یکساں قرار دینے کی وجہ سے ان میں تضاد نظر آنے لگا ۔

جو شخص کلام الٰہی کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھے ، جو واقعی طور پر کلام کے منشا کو جاننا چاہے ، اس کو اللہ کی نصرت حاصل ہوگی اور وہ کلام کے اصلی مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا ۔ اس کے برعکس جو شخص غیر سنجیدہ ہو ، جو بگڑے ہوئے ذہن کے ساتھ کلام کو پڑھے ، اس کا ساتھی شیطان بن جائے گا ۔ وہ کلام کا الٹا مفہوم اس کے ذہن میں ڈالے گا ۔ وہ غلط تاویل کی راہ میں اس کو بھٹکاتا چلا جائے گا ۔

اہل جنّت

قرآن (الحج ۲۲-۲۴) میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ اور وہاں ان کی پوشاک ریشم ہوگی۔ اور ان کو پاکیزہ قول کی ہدایت بخشی گئی تھی۔ اور ان کو خدائے حمید کا راستہ دکھایا گیا تھا (وھدوا الی الطیب من القول وھدوا الی صراط الحمید)

آیت کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی جنت کن لوگوں کو دی جائے گی۔ یہ ان لوگوں کو دی جائے گی جن کو دنیا میں قول طیب کی توفیق ملی تھی اور جن کو اس خدا کے راستہ کی ہدایت دی گئی تھی جس کی صفت الحمید ہے، جو تمام اعلیٰ خوبیوں کا مجموعہ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ کون سا امتحان ہے جس میں آدمی کو پورا اترنا ہے، اور وہ کیا صفت ہے جس کا ثبوت دینے کے بعد اس کو یہ اعزاز ملے گا کہ اس کے اوپر ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں۔ یہ امتحان دو لفظ میں یہ ہے —— حق کو پہچان کر اس کا اعتراف کرنا، اور ناموافق حالات کے باوجود اپنے آپ کو حق کے راستہ پر ڈالنا۔

جس دنیا میں ہر طرف پُرفریب الفاظ کا جال بچھا ہوا ہو۔ جہاں حق سے پھرے ہوئے لوگ غلبہ حاصل کیے ہوئے ہوں۔ ایسے ماحول میں ایمان کی صداقت کو پہچاننا بلاشبہہ سخت مشکل کام ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ ایمان کے اس راستہ پر عملاً اپنے آپ کو ڈال دیا جائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اقوال کے پُرشور ہنگاموں میں قول طیب کو پانے کی توفیق ملی۔ جنھوں نے راستوں کے ہجوم میں صراط حمید کو دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ جو لوگ دنیا میں اس عظیم لیاقت کا ثبوت دیں وہ انسانیت کے سب سے زیادہ قیمتی لوگ ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ انھیں جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے۔ ان کے ساتھ وہ خصوصی معاملہ کیا جائے جو شاہی مہمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

کلمۂ حکمت

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ الحسن بن علی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے، تم اللہ سے ڈرو اور اس سے ڈرو جو اللہ سے نہیں ڈرتا (یا بُنَیَّ، خَفِ اللّٰہَ وَ خَفْ مَنْ لَا یَخَافُ اللّٰہَ)

یہ ایک بے حد جامع نصیحت ہے۔ جو آدمی اللہ کی پکڑ سے ڈرے، وہ زبان سے لے کر عمل تک ہر قسم کی برائی سے اپنے آپ کو بچائے گا۔ اسی طرح جو آدمی اللہ سے بے خوف لوگوں کے بارہ میں محتاط رہے، وہ ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔

اللہ کا ڈر آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ وہ ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ کیوں کہ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کوئی غلط بات کہی یا کوئی غلط کام کیا تو وہ اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔

اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اوپر اس کا خالق اور مالک ہے۔ ایسا آدمی ہر آن اپنے آپ کو زیر نگرانی سمجھنے لگتا ہے، اور جو آدمی ہر لمحہ اپنے آپ کو زیر نگرانی سمجھے وہ کبھی غلط گوئی یا غلط کاری میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

اللہ کا ڈر تمام برائیوں کے خلاف طاقتور ترین چیک ہے۔ وہ اس بات کا ضامن ہے کہ آدمی صحیح رخ پر سوچے اور صحیح انداز میں فیصلہ کرے۔ وہ اپنی ذاتی مرضی کے بجائے خدا کی مرضی کو اپنا رہنما بنالے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کا ڈر دانائی کا سرا ہے (رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ)

اس کے برعکس وہ انسان ہے جس کا سینہ اللہ کے ڈر سے خالی ہو۔ جو اس سے غافل ہو کہ اس کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب دینے کے لیے حاضر ہونا ہے۔ جس کو نہ خدا کے غضب کی پروا ہو اور نہ جہنم کے عذاب کا اندیشہ، ایسا آدمی یقینی طور پر بے فکر ہو جائے گا۔ وہ کسی اصول کا پابند نہ ہوگا بلکہ اپنی خواہش کو اپنا رہنما بنالے گا۔ اپنے مفاد یا اپنی انا کے لیے ظالمانہ طریقہ اختیار کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہوگا۔

تخلیقی جواب

للذین استجابوا لربھم الحسنیٰ والذین لم یستجیبوا لہ لو ان لھم ما فی الارض جمیعا و مثلہ معہ لافتدوا بہ اولئک لھم سوء الحساب و ماواھم جھنم و بئس المھاد (الرعد ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار کو لبیک کہا ان کے لیے بھلائی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کی پکار کو نہ مانا، اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے برابر بھی اور بھی تو وہ سب اپنی رہائی کے لیے دے ڈالیں۔ ان لوگوں کا حساب سخت ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں انسان کے انجام کا سارا دارومدار استجابت (Response) پر ہے۔ صحیح استجابت کا ثبوت دینے والوں کے لیے انعام ہے اور بری استجابت کا ثبوت دینے والوں کے لیے سزا۔

جب حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو یہ انسانوں کے لیے سخت ترین امتحان ہوتا ہے —— اس کی روشنی میں لوگوں کے مزعومات باطل قرار پاتے ہیں۔ جن کو انھوں نے بڑا بنا رکھا تھا وہ چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ مفادات کا پورا نظام منتشر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں بری استجابت یہ ہے کہ آدمی بپھر کر حق کا مخالف بن جائے۔ اور اچھی استجابت یہ ہے کہ وہ ثابت شدہ حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ پہلے انسان کے لیے دوزخ ہے اور دوسرے انسان کے لیے جنت۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا کا بھی ہے۔ یہاں بھی سارا انحصار استجابت پر ہے۔ یہاں اس گروہ کو عزت اور ترقی حاصل ہوتی ہے جو تخلیقی استجابت (Creative response) کا ثبوت دے سکے۔ اس کے برعکس جو گروہ غیر تخلیقی ثابت ہو اس کے لیے صرف یہی مقدر ہے کہ اس کو دنیا کے کوڑے خانہ میں جگہ ملے۔ یہاں ایک صورت غیر تخلیقی جواب کی ہے۔ یعنی وہی کا وہی لوٹانا۔ کسی نے پتھر مارا تو اس کو پتھر مارنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کا جواب تخلیقی جواب ہو۔ یعنی آدمی ردعمل سے بچ کر خود اپنے اندرونی کارخانہ میں ایک جواب تخلیق کرے اور اس کو دوسرے کی طرف لوٹائے۔

فطرت پر

اریقت دماء من بطنین من قریش۔ فجمع ابو سفیان کبارھم وقال۔ ھل لکم یا معشر قریش فی الحق او ما ھو افضل منہ۔ فقال القوم۔ وھل من شیئ افضل من الحق۔ فقال ابوسفیان۔ نعم انہ العفو۔ فقام القوم وتصالحوا۔

قبیلہ قریش کے دو خاندانوں میں خون بہانے کا واقعہ ہوا۔ ابوسفیان نے ان کے بڑوں کو جمع کیا اور کہا کہ اے قریش کے لوگو، تم خون کا بدلہ لینا چاہتے ہو یا وہ جو اس سے بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا، کیا کوئی چیز ہے جو اس سے بھی بہتر ہو۔ ابوسفیان نے کہا ہاں۔ اس سے بہتر چیز معافی ہے۔ پس لوگ اٹھے اور آپس میں صلح کر لی۔

یہ واقعہ اس انسان کے مزاج کو بتاتا ہے جو اپنی فطرت پر قائم ہو۔ قدیم عرب کے لوگ اسی فطری حالت پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت نے بھرپور طور پر اسلام کو قبول کر لیا، اور جب ایک بار اسلام کو قبول کر لیا تو پھر اس سے انحراف کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

جو آدمی اپنی فطرت پر قائم ہو وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جب کوئی سیدھی اور صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتا ہے۔ وہ ان نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوتا ہے جو لوگوں کے لیے سچائی کو ماننے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

فطرت پر قائم رہنے والا آدمی ضد، انتقام، انانیت، بے اعتراضی جیسے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ایک وسیع القلب اور وسیع الظرف انسان ہوتا ہے۔ وہ دُہرے انداز سے سوچنا نہیں جانتا۔ وہ نفرت اور بدگمانی کے تحت فیصلہ نہیں کرتا بلکہ جو فیصلہ کرتا ہے خالی الذہن ہو کر کرتا ہے۔ وہ اس بیماری سے خالی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لے اور پھر کسی حال میں اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو۔ ایسے انسان کے شر سے بچنے کی واحد تدبیر اعراض ہے۔ یعنی اپنے آپ کو اس کی زد میں آنے سے بچانا۔

فطرت پر قائم رہنا خدا کے نقشہ پر قائم رہنا ہے۔ اور جو آدمی فطرت پر قائم ہو اس کو کمالِ انسانیت کی منزل تک پہنچنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔

انسان کا مسئلہ

برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰-۱۸۷۲) نے انسانی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے باہر فطرت کی جو طاقتیں ہیں ان کو سمجھنے اور قابو پانے کے معاملہ میں ہم نے دہشت ناک حد تک کامیابی حاصل کرلی ہے مگر خود اپنے اندر کی طاقتوں پر قابو پانے کا فن ہم نے ابھی تک نہیں سیکھا :

We have learnt to understand and control to a tefrifying extent the forces of nature outside us, but not those that are embodied in ourselves.

Bertrand Russell, *Individual and Social Ethics*

یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کے اندر کوئی ذاتی ارادہ نہیں۔ انسان جب فطرت کی طاقتوں پر قابو پانا چاہتا ہے تو ان کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہیں آتی۔ انسان فطرت کو سمجھ کر اس کو جو رخ دے دیتا ہے وہ عین اسی رخ پر قائم ہو جاتی ہے۔ فطرت کے قانون کو ماننے کے بعد انسان کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مکمل طور پر اس کو اپنا تابع بنا سکے۔

اس کے برعکس انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود اپنا ذاتی ارادہ رکھتا ہے۔ انسان قبول کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ رد کرنے کی طاقت بھی۔ فطرت کا معاملہ اگر یک طرفہ تھا تو انسان کا معاملہ دو طرفہ ہے۔ انسان کے اوپر کوئی اسکیم صرف اس وقت نافذ کی جاسکتی ہے جب کہ وہ خود بھی اس کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔

انسان پر قابو پانے کا معاملہ کسی خارجی فن کا معاملہ نہیں۔ یہ خود انسان کے ذاتی فیصلہ کا معاملہ ہے۔ یہ انسان کے اپنے شعوری فیصلہ کے تحت ہوگا نہ کہ کسی خارجی تکنیک کے ذریعہ سے۔

انسان اپنے ارادہ کو کیوں غلط راہوں میں استعمال کرتا ہے، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کو آزاد اور خود مختار سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اپنا مالک آپ ہوں۔ میں جو چاہوں کروں۔ یہی اصل غلطی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کیے بغیر انسان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

انسان اپنے خالق کے سامنے جواب دہ ہے۔ جواب دہی کا یہ احساس ہی سرکشی اور بے راہ روی کا اصل چیک ہے۔ اس کے سوا انسانی اصلاح کا اور کوئی طریقہ نہیں۔

غصہ نہ کرو

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو اندر ہی اندر پی جاتے ہیں (آل عمران ۱۳۴) اور جن لوگوں کے اوپر انھیں غصہ آیا ہے ان کو معاف کر دیتے ہیں (الشوریٰ ۳۷) اس بات کو حدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے :

عن حُمید بن عبد الرحمٰن عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال۔ قال رجل یارسول اللہ اوصنی، قال : لاتغضب۔ قال الرجل۔ ففکرت حین قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما قال۔ فاذا الغضب یجمع الشر کلہ

(مسند احمد)

حمید بن عبد الرحمٰن تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صحابی نے انھیں بتایا کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کرو۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر غور کیا تو میں نے جانا کہ غصہ تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔

انسان کی فطرت خیر پسند ہوتی ہے۔ یہ فطرت ہر انسان کو برائی سے روکتی ہے۔ وہ برائی کے خلاف ایک مستقل چیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان کبھی نارمل حالت میں برائی نہیں کر پاتا۔ کوئی شخص برائی صرف اس وقت کرتا ہے جب کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے جو اس کی فطری حالت کو درہم و برہم کر دے۔

یہ غیر معمولی حالت ہمیشہ انا کے بھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی آدمی کی انا جب بھڑکتی ہے تو اس وقت وہ فطرت کے قبضہ سے نکل کر غصہ کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایسے کام کر ڈالتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

انسانوں کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے کہ ان میں کچھ خیر پسند ہیں اور کچھ شر پسند۔ زیادہ صحیح تقسیم یہ ہوگی کہ مشتعل انسان اور غیر مشتعل انسان کا لفظ بولا جائے۔ مشتعل ہونے سے پہلے ہر انسان خیر پسند ہی ہوتا ہے۔ البتہ مشتعل ہونے کے بعد وہ شر پسند بن جاتا ہے۔

غصہ پر کنٹرول کرنا تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور غصہ کو بھڑکانا تمام برائیوں کا سرچشمہ۔

انسان کی بے بسی

ٹائم میگزین (۲۴ اگست ۱۹۹۲) کی کور اسٹوری صدر امریکہ جارج بش کے بارہ میں ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ پر جارج بش کی ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں صدر امریکہ اپنے ایک ہاتھ سے اپنا سر پکڑے ہوئے ہیں۔ چہرے پر فکر مندی کے آثار ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ بش ذہنی طور پر ختم نظر آتے ہیں :

> Explaining his woes with a terse answer, "the economy", Bush seemed intellectually spent.

اس شمارہ میں ایک خصوصی انٹرویو بھی شامل ہے جو ٹائم کے نمائندہ مائیکل کریمر اور ہنری مولر نے مرتب کیا تھا، اس انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ ہے :

Q. When you lie awake at night thinking about the crises that have perhaps not yet occurred in this new world order, what worries you most?

A. Unpredictability. You can't see very clearly where everything's going to come out. You see great problems, economic problems in the former Soviet Union, and you see ancient ethnic rivalries impacting over all that. I worry about the Middle East still, though I'm very pleased with the great progress that's been made. But you have some very bad actors, Saddam Hussein being one.

(*Time* August 24, 1992)

انٹرویور نے سوال کیا کہ جناب صدر، رات کے وقت جب آپ بستر پر ہوتے ہیں اور ان آنے والے بحرانوں کے بارہ میں سوچ رہے ہوتے ہیں جو شاید ابھی اس نئے عالمی نظام میں وقوع میں نہیں آئے، اس وقت کیا چیز ہے جو آپ کو زیادہ پریشان کرتی ہے۔

صدر امریکہ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ معاملات کا ناقابل پیشین گوئی ہونا۔ آدمی بہت زیادہ واضح طور پر دیکھ نہیں سکتا کہ چیزوں کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے، ہم بڑے بڑے مسائل کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے سابق سوویت یونین میں اقتصادی مسئلہ۔ اسی طرح قدیم نسلی رقابتیں جو ان سب پر چھا جاتی ہیں۔ میں اب بھی شرق اوسط کے بارہ میں متردد ہوں۔ اگرچہ جو عظیم پیش رفت ہوئی ہے اس سے میں بہت خوش ہوں۔ مگر ہم کو کچھ بہت برے کرداروں کا سامنا ہے۔ صدام حسین انھیں میں سے ایک

سب کچھ امتحان

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بتاتے ہوئے کہا گیا ہے ــــ فرعو
قوم کے سرداروں نے فرعون سے کہا۔ کیا تو موسیٰ کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا کہ وہ ز
یں فساد کریں اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم
کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ اور ہم ان کے اوپر پو
طرح قادر ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ زمین
کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخ
انجام اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ موسیٰ کی قوم نے کہا، تمہارے آنے سے پہلے بھی
ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا، قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے د
کو ہلاک کر دے اور ان کے بجائے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دے۔ پھر اللہ دیکھے
کیسا عمل کرتے ہو (الاعراف ۱۲۷ - ۱۲۹)

ان آیات پر غور کیجیے۔ بنی اسرائیل فرعون کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہے تھے۔ ان
نے وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کی شکایت کی۔ حضرت موسیٰ نے اس
جواب میں انھیں احتجاج اور مطالبات یا ٹکراؤ کا کوئی نسخہ نہیں بتایا۔ بلکہ یہ کہا کہ اللہ کی ط
رجوع ہو جاؤ اور صبر کرو۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ پھر تمہارے پیغمبر ہونے سے کیا فائدہ۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ تمہار
آنے کے بعد ہم کو حکومت اور اقتدار ملے گا۔ اور تم ہم کو بے اقتدار رکھ کر صبر کی تلقین کر
ہو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ حکومت اور اقتدار بھی صبر ہی کا ایک مرحلہ ہے۔ کیونکہ وہ اس
ہوتا ہے کہ اللہ دیکھے کہ حکومت پانے کے بعد آدمی کیسا عمل کرتا ہے۔

اس دنیا میں اصل مسئلہ با اقتدار ہونا یا بے اقتدار ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آد
جو حالات ملے اس میں اس نے کس قسم کی کارکردگی کا ثبوت دیا۔ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور آنے
دنیا بدلہ پانے کی جگہ۔ اس لیے آدمی کا نظر ہمیشہ اپنے حالات پر ہونی چاہیے نہ کہ خارجی حالات پر۔

سب سے بڑی بدبختی

الاستاذ خوزی الرفاعی (حلب، سوریا) ایک سفر کے تحت اندلس گئے۔ وہاں انھوں نے
اطہ میں الحمراء نامی محل دیکھا جو مسلم دور حکومت میں نہایت اہتمام کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اپنے سفرنامہ
، انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

اك قصة منقوشة على الجدار۔
وى ان سائحا مكسيكيا يدعى (آر ى ايكاسا)
وزوجته لزيارة الحمراء وبينما كان
لوف مستغرقا في دهشته مما يرى من
اتن، رأى سائلا اعمى يتقدم من
جته يطلب صدقة فقال لزوجته :
زلي له العطاء يا امرأة فانه ليس في
حياة اقسى من ان يكون المرء اعمى
غرناطة (الدراسات الاسلامية،
لام آباد، ۱۴۱۲ھ، صفحہ ۴۴۲)

وہاں ایک دیوار پر ایک قصہ لکھا ہوا ہے۔ کہا
جاتا ہے کہ میکسیکو کا ایک سیاح جس کا نام آری ایکاسا
تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ الحمراء کو دیکھنے کے
لیے یہاں آیا۔ اور جب کہ وہ اس کی کشش سے
غیر معمولی متاثر ہو کر اس کو دیکھنے میں محو تھا، اس
نے ایک اندھے فقیر کو دیکھا جو اس کی بیوی کے
قریب ہو کر اس سے صدقہ مانگ رہا تھا۔ سیاح
نے اپنی بیوی سے کہا کہ اے خاتون، اس کو خوب
زیادہ دے دو۔ کیوں کہ دنیا میں اس سے بڑی
بدبختی اور کوئی نہیں کہ آدمی غرناطہ میں اندھا ہو۔

مذکورہ سیاح کو یہ بات سب سے زیادہ بدبختی کی بات نظر آئی کہ ایک شخص الحمراء کے سامنے
ڑا ہو مگر وہ آنکھوں سے محروم ہونے کی بنا پر اس خوب صورت محل کو نہ دیکھ سکے۔ مگر ایک اور
بختی ہے جو اس قسم کی تمام بدبختیوں سے زیادہ سخت ہے۔ اور یہ بدبختی وہ ہے جو آخرت میں
یش آئے گی۔ اس بدبختی کا ذکر قرآن کی ایک آیت میں اس طرح کیا گیا ہے :

من كان في هذه اعمى فهو في الآخرة
اعمى واضل سبيلا (الاسراء ۷۲)

اور جو شخص اِس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی
اندھا رہے گا اور وہ بہت دور پڑا ہوگا راستہ سے۔

آخرت وہ عالم ہے جہاں اللہ رب العالمین اپنے تمام جمال و کمال کے ساتھ ظہور فرمائے گا۔ وہاں
آدمی رب کائنات کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں بدر کے چاند کو دیکھتا ہے۔ ایسی

حالت میں وہ شخص کتنا زیادہ بدبخت ہوگا جو اس ہستی کو دیکھنے سے محروم رہے جو ہر قسم کے جمال و کمال کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ امام احمد، امام مسلم اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے :

قال، اذا دخل اهل الجنةِ الجنةَ و اهل النارِ النارَ نادیٰ منادٍ : یا اهلَ الجنة إن لکم عند الله موعداً یرید ان ینجزکموه۔ فیقولون۔ وما هو۔ الم یثقل موازیننا، الم یبیض وجوهنا، ویدخلنا الجنة ویجرنا من النار۔ قال۔ فیکشف لهم الحجاب فینظرون الیه۔ فو الله ما اعطاهم الله شیئاً احب الیهم من النظر الیه ولا اقر لاعینهم۔
(تفسیر ابن کثیر ۲/۴۱۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنّت والے جنّت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے اہل جنّت، تمہارے لیے اللہ کا ایک وعدہ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کو تمہارے لیے پورا کرے۔ اہل جنّت کہیں گے کہ وہ کیا ہے۔ کیا ہمارے پلڑے بھاری نہیں کر دیے گئے۔ کیا ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا گیا اور اللہ نے ہم کو جنت میں داخل کر دیا اور ہم کو آگ سے بچالیا۔ اس کے بعد ان کے اوپر سے پردہ کھول دیا جائے گا، پھر وہ اپنے رب کو دیکھنے لگیں گے۔ پس خدا کی قسم، کوئی نعمت جو اللہ نے انھیں دی ہے وہ ان کے لیے اللہ کو دیکھنے سے زیادہ محبوب نہ ہوگی اور نہ اس سے زیادہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والی

آخرت میں دیدار الٰہی کی نعمت بلاشبہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اللہ کو دیکھنا ایک ایسا اعلیٰ و ارفع تجربہ ہے جس کے مثل کوئی دوسرا تجربہ نہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس نعمت کبریٰ سے سرفراز کیے جائیں۔ اور کتنے بدبخت ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس حال میں پہنچیں کہ وہاں انھیں یہ خبر ملے کہ دیدارِ الٰہی کی نعمت سے بہرہ مند ہونا ان کے لیے مقدر نہیں۔

آیت فتنہ

قرآن میں دو جگہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اہل باطل سے لڑو اور ان سے لڑکر فتنہ کا خاتمہ کردو (البقرہ ۱۹۲، الانفال ۳۹) فتنہ کے لفظی معنی آزمائش کے ہیں۔ قرآن میں ہے : فما آمن لموسی الا ذریۃ من قومہ علی خوف من فرعون وملئہم ان یفتنہم (یونس ۸۳) یعنی موسی کی قوم میں سے تھوڑے نوجوانوں کے سوا کوئی ان پر ایمان نہ لایا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑوں کے ڈر سے کہ وہ انھیں ستائیں گے۔

عبد اللہ بن عباس، قتادہ، الربیع، السدی وغیرہ کا قول ہے کہ اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک ہے اور اس کے ساتھ اہل ایمان کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں (قال ابن عباس وقتادة والربیع والسدّی وغیرھم، الفتنة ھناک الشرک وماتابعہ من اذی المومنین) الجامع لاحکام القرآن ۲/۳۵۴

یہاں فتنہ سے مراد، باعتبار حقیقت، وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مذہبی جبر یا مذہب کی بنا پر ایذا رسانی (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں مذہبی جبر پھیلا ہوا تھا۔ ہر ملک میں صرف حکمراں طبقہ کے مذہب کے لیے آزادی تھی، اور دوسرے مذاہب کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہ ہوتی تھی۔ یہی صورت حال عرب میں بھی مکمل طور پر قائم تھی۔ وہاں کے سرداروں کا مذہب شرک تھا۔ چنانچہ جب رسول اور اصحاب رسول نے توحید کی بات کی تو ان کو با اقتدار طبقہ کی طرف سے ہر قسم کی اذیتیں دی جانے لگیں۔

یہ صورت حال دعوت توحید کے لیے ایک مستقل رکاوٹ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا کہ اہل شرک سے لڑو اور اس وقت تک اپنی لڑائی جاری رکھو جب کہ مذہبی جبر کی صورت حال ختم ہو کر مذہبی آزادی کا دور آجائے۔ رسول اور اصحاب رسول نے جہاد کر کے اس حکم کی مکمل تعمیل فرمائی اور انسانیت کو ہمیشہ کے لیے مذہبی جبر سے نجات دلادی۔

اس حکم کی تعمیل میں جو جہاد کیا گیا اس کا ایک براہ راست پہلو تھا، اور دوسرا اس

کا بالواسطہ پہلو۔ براہ راست پہلو یہ تھا کہ عرب اور اطراف عرب میں اہل شرک کا زور توڑ کر کامل طور پر مذہبی جبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کام رسول اور اصحاب رسول کی زندگی ہی میں پوری طرح انجام پا گیا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ تاریخ میں وہ عمل (process) جاری کر دیا جائے جس کے اثر سے بالآخر ساری دنیا سے ہمیشہ کے لیے مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔ ابتدائی انقلاب کے نتیجہ میں یہ تاریخی عمل بھی پوری طاقت کے ساتھ جاری ہوا۔ وہ مکہ، مدینہ، دمشق، بغداد، اسپین ہسلی ہوتا ہوا یورپ میں اور پھر امریکہ میں داخل ہو گیا۔

یہ عمل ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں شروع ہوا۔ اور بیسویں صدی عیسوی میں مغربی دنیا میں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام دنیا کی تمام قوموں نے انسانی آزادی کے اس دستاویز پر دستخط کر دیے جس کو حقوق انسانی کا عالمی منشور کہا جاتا ہے۔

اس طرح ختم فتنہ کے لیے قتال کا جو حکم دیا گیا تھا وہ اپنی آخری صورت میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب ہمیں یہ نہیں کرنا ہے کہ کسی صورت حال کو بطور خود "فتنہ" قرار دیں اور مذکورہ قرآنی آیت کا حوالہ دے کر اس کے خلاف جنگ شروع کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سرکش قرار دیے جائیں گے نہ کہ قرآنی حکم کی تعمیل کرنے والے۔

صحیح البخاری (کتاب التفسیر) میں مذکورہ دونوں آیتوں کی تشریح میں پانچ روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں جب عبد اللہ بن زبیر اور عبد الملک بن مروان کے گورنر الحجاج کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو عبد اللہ بن عمر رض مکہ میں موجود تھے۔ مگر انھوں نے اس جنگ میں شرکت نہ کی۔ ابن زبیر کے حامیوں میں سے دو شخص ان کے پاس آئے اور کہا کہ اللہ نے فتنہ کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہم یہ جنگ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں، پھر آپ ہمارے ساتھ اس میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔

عبد اللہ بن عمر رض نے جواب دیا کہ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے قرآنی حکم کی تعمیل تو ہم زمانۂ رسالت میں کر چکے (قد فعلنا) اس زمانہ میں اہل اسلام کمزور تھے۔ چنانچہ اہل شرک ان کے

دین کی بنا پر انھیں ستاتے تھے۔ اس وقت ان کا زور توڑنے کے لیے جنگ کی گئی۔ یہاں تک کہ اہل اسلام کی کثرت ہوگئی اور اہل شرک کا وہ فتنہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے مزید فرمایا :

قاتلنا حتی لم تکن فتنة وکان	ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا۔
الدین لله وانتم تریدون	اور دین اللہ کے لیے ہوگیا۔ اور تم چاہتے
أن تقاتلوا حتی تکون فتنة	ہو کہ جنگ کرو، یہاں تک کہ پھر فتنہ آجائے
ویکون الدین لغیر الله۔	اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جو لوگ آئے تھے وہ بنو امیہ کے سیاسی بگاڑ کے خلاف ان سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے حکمرانوں میں جو بگاڑ آیا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں "فتنہ" کہا گیا ہے۔ اس لیے ان پر فرض ہے کہ وہ ان حکمرانوں سے جنگ کر کے اس کا خاتمہ کریں۔

مگر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کی جو تشریح کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق فتنہ سیاست سے نہیں ہے بلکہ فتنہ جبر سے ہے۔ اس سے مراد حکمرانوں کی سیاسی اصلاح کی خاطر ان سے جنگ نہیں ہے، بلکہ مذہبی جبر کی صورت حال کو ختم کرنے کے لیے جنگ کرنا ہے۔ یہ جنگ اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ مذہبی جبر ختم ہو کر مذہبی آزادی کا ماحول قائم ہو جائے۔

نیز صحابی رسول کی اس تشریح سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی جبر سے مراد نفاذ قانون کی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ توحید پر عقیدہ اور توحید کی تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی مسلم حکمراں قانون اسلامی کا نفاذ نہ کر رہا ہو، اور کچھ لوگ قانون اسلامی کے نفاذ کے نام پر حکمراں سے ٹکراؤ کریں۔ اور حکمراں ایسے لوگوں پر سختی کرے تو یہ وہ مذہبی جبر نہ ہوگا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بہت بامعنی ہے کہ ہم نے جنگ کر کے فتنہ کو ختم کر دیا تھا۔ مگر اب تم لوگ ایسی جنگ چھیڑ رہے ہو جس کے نتیجہ میں فتنہ کی حالت دوبارہ لوٹ آئے، یعنی تم نے مسلم حکمرانوں کی سیاسی اصلاح کے نام پر ان سے لڑائی شروع کی ہے، اور یہ تاثر دے رہے ہو کہ یہی اسلام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ حکمراں اسلام کے نام پر اٹھنے والے

ہر شخص کو اپنا حریف سمجھ کر انھیں ستائیں گے۔ اس طرح مذہبی جبر اور مذہبی ایذا رسانی کی حالت دوبارہ نئی صورت میں قائم ہو جائے گی۔

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ تبصرہ موجودہ زمانہ کے ان لوگوں پر براہ راست طور پر صادق آتا ہے جو اپنے آپ کو انقلابی اسلام کا نمائندہ بتاتے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف مسلم ملکوں میں یہ کیا کہ مسلم حکمرانوں کے بگاڑ کے خلاف سیاسی جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے یہ انقلابی مہم شروع کر دی کہ ان غیر صالح حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل ہو کر صالح قیادت کا نظام قائم کریں۔

ان انقلابی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ملکوں کے حکمراں اسلام کو اپنے سیاسی حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریک کو کچلنا شروع کر دیا۔ حتی کہ آج یہ صورت حال ہے کہ آپ امریکہ اور انگلینڈ میں تو اسلام کے نام پر تحریک چلا سکتے ہیں۔ مگر مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر تحریک چلانے کے مواقع نہیں۔ قرآن میں جس چیز کو فتنہ (مذہبی جبر) کہا گیا تھا، وہ آج سب سے زیادہ مسلم ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ تمام تر اسی قسم کے نام نہاد مسلم رہنماؤں کی غلط تحریکوں کے نتیجہ میں ہوا ہے جن پر تبصرہ کرتے ہوئے صحابی رسول نے کہا تھا کہ ہم نے لڑ کر فتنہ کو ختم کر دیا تھا اور تم اس لیے لڑ رہے ہو کہ فتنہ دوبارہ مسلم معاشرہ میں واپس آجائے۔

ترقی کا راز

گلاب کا درخت فطرت کا ایک مظہر ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک علامت ہے جو ہر دیکھنے والے کو بتا رہا ہے کہ دنیا میں ہم کو کس طرح زندگی گزارنا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں کہ گلاب کے درخت میں بیک وقت پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی۔ ہر عقل مند آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ پھول کو لے لیتا ہے اور کانٹے کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں خوش گوار پہلو ہیں اور اسی کے ساتھ ناخوش گوار پہلو بھی۔ یہاں بھی دانش مندانہ طریقہ یہ ہے کہ خوش گوار پہلو کو لیا جائے اور ناخوش گوار پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہمارے پرائم منسٹر نے ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر میں کہا کہ ہم کو ایک قسم کے مورٹیوریم کی ضرورت ہے۔ یعنی چند سال کے لیے ہم لوگ طے کر لیں کہ ہم اختلافی باتوں کو بازو میں رکھ دیں گے اور اتفاقی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ موجودہ حالات میں اس قسم کا مورے ٹوریم ملک کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

تاہم یہ صرف چند سال کی بات نہیں بلکہ پوری زندگی کی بات ہے۔ کوئی فرد یا کوئی قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب کہ وہ اس حکمت کو اختیار کرلے کہ انھیں مسائل سے اعراض کرنا ہے اور مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔

آپ اپنی سواری لے کر سڑک پر نکلتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سڑک پر آپ کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ آپ دوسروں سے ٹکراتے نہیں۔ بلکہ دوسروں سے بچتے ہوئے اپنا سفر طے کرتے ہیں۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں ہے۔ یہ دنیا بہت سے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ اب اس دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہر ایک، دوسرے کا لحاظ کرے۔ ہر ایک دوسرے کو راستہ دیتے ہوئے اپنا راستہ اختیار کرے۔ دوسروں کی رعایت کرنا اپنے لیے کامیاب سفر حاصل کرنے کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

۲۰ الرسالہ اپریل ۱۹۹۳

ہندستان میں مختلف مذہب اور کلچر کے لوگ رہتے ہیں۔ ان تمام کو بدل کر ایک مذہب اور ایک کلچر بنانا ممکن نہیں۔ اگر اس قسم کی وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو وحدانیت تو پیدا نہیں ہوگی۔ البتہ وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش میں ملک برباد ہو جائے گا۔ اس لیے ہم کو وحدانیتِ کلچر کے بجائے تعددِ کلچر کے اصول کو اختیار کرنا ہے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی کامیابی کا طریقہ بھی۔

آج ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ رواداری (ٹالرنس) ہے۔ رواداری کا مطلب ہے اپنے طریقہ پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے طریقہ کا احترام کرنا۔ اسی رواداری پر صدیوں سے ملک کا انتظام چلا آرہا ہے۔ اسی پر وہ آئندہ بھی چل سکتا ہے۔ خواہ ایک فرقہ کے لوگ ہوں یا مختلف فرقہ کے لوگ، رواداری ہر حال میں ضروری ہے۔ حتیٰ کہ ایک خاندان کے دس افراد اگر ایک ساتھ رہتے ہوں تو وہ بھی کامیاب گھر اسی وقت بنا سکتے ہیں جبکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں۔

دو سال پہلے میں شولاپور گیا۔ وہاں ایک جلسہ میں ایک ہندو بھائی کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے اور میری ماں ویجیٹیرین تھی۔ مگر دونوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میری ماں روزانہ صبح کو اٹھ کر پہلے میرے باپ کے لیے کھانا بناتی۔ اور اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتی۔ اس کے بعد وہ نہا کر اپنے لیے ویجیٹیرین کھانا بناتی۔ اسی طرح وہ دونوں پوری زندگی میں عمل کرتے رہے۔ انھوں نے نہایت پُرمسرت زندگی گزاری۔

یہی قومی تعمیر کا واحد طریقہ ہے۔ قومی زندگی میں ہم کو یہی کرنا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو گوارا کریں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ انسانی احترام کے اصول پر معاملہ کریں۔ جس طرح وہ اپنے لیے یہ حق سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنے مذہب اور کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہو، اسی طرح وہ دوسروں کو بھی یہ حق دیں کہ وہ اپنے پسندیدہ مذہب اور اپنے پسندیدہ کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں۔ اس قسم کے فرق کو رواداری کے خانہ میں ڈالنا ہے، اس کو اختلاف کا مسئلہ نہیں بنانا ہے۔ یہی قومی تعمیر کا واحد کامیاب طریقہ ہے۔

مثلاً ایک فرقہ کے لوگ شہر کی سڑک پر اپنا جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں کچھ پُرجوش لوگ

ایسے نعرے بھی لگا دیتے ہیں جو دوسرے فرقہ کے لیے ناگوار ہوں۔ اب دوسرے فرقہ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کو وقار کا مسئلہ بنالے اور جلوس کو روکنے یا اس کی روٹ بدلوانے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ جلوس کے مسئلہ کا حل جلوس کو نظر انداز کرنا ہے نہ کہ اس سے ٹکرانا۔ اگر جلوس کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ چند منٹ میں اپنے آپ ختم ہو جائے گا مگر جب روک ٹوک اور مزاحمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ جو چیز ابتداءً صرف جلوس کی حیثیت رکھتی تھی وہ فساد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے انتخاب (چوائس) جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے، بلکہ جلوس اور فساد میں ہے۔ جلوس کو اگر روکا جائے تو اس کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوگی وہ بے جلوس صورت حال نہیں ہے، بلکہ دو فرقوں کے درمیان فساد ہے جس میں جان و مال کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک طرف مسائل ہوتے ہیں اور دوسری طرف مواقع۔ یہ قدرت کا قانون ہے اور اس دنیا میں کبھی اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو استعمال کیا جائے۔ مسائل کو نظر انداز کرنا گویا اپنے لیے عمل کا وقفہ حاصل کرنا ہے۔ اور مسائل سے الجھنا ملے ہوئے وقت کو ضائع کر دینا۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ کو آکاش وانی ناگپور سے نشر کی گئی۔

مطالعۂ قرآن

قرآن کی سورہ العنکبوت مکی دور میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس زمانہ میں اسلام کے مخالفین اہل اسلام پر بہت ظلم کر رہے تھے۔ روزانہ کی سختیوں نے وہاں زندگی کو ایک مصیبت بنا دیا تھا۔ اس وقت اہل اسلام سے کہا گیا کہ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ تم مکہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاؤ اور وہاں خدا کی عبادت کرو۔ چنانچہ مسلمانوں نے اولاً حبش کی طرف ہجرت کی اور اس کے بعد مدینہ کی طرف۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں یہ ہیں :

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو بے شک میری زمین وسیع ہے ، پس تم میری ہی عبادت کرو۔ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کو ہم جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا جنھوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا ، جاننے والا ہے (العنکبوت ۵۶ - ۶۰)

ان آیات میں "صبر" کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ صبر کے لغوی معنی ہیں جمنا۔ جمنے کا مطلب اگر دشمن سے ٹکراؤ پر جمنا ہو تو مکہ کے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے لڑنا چاہیے تھا۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ وہ خدا اور رسول کی رہنمائی کے مطابق ، مکہ کو چھوڑ کر باہر کے علاقوں میں چلے گئے تاکہ جس عبادت کے مواقع ان کو مکہ میں نہیں مل رہے ہیں اس کو باہر جاکر حاصل کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا مطلب عبادت پر جمنا ہے نہ کہ دشمن سے ٹکراؤ پر جمنا۔ اگر صبر سے مراد یہ ہو کہ دشمن سے مقابلہ کرنے میں جمے رہو تو مکہ کے مسلمانوں سے کہا جاتا کہ تم لوگوں کے خلاف مکہ میں اگر ظلم کیا جا رہا ہے تو تم ظلم کرنے والوں سے لڑ جاؤ۔ کسی حال میں بھی تم مکہ کو نہ چھوڑو ، خواہ اس مقابلہ آرائی میں تم کو وہیں مر جانا پڑے۔ گویا یہاں عدم قتال پر صبر کرنا مراد ہے نہ کہ قتال پر صبر کرنا۔

اخلاقی سلوک

دنیا میں جب لوگ مل جل کر رہتے ہیں تو بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کا سابقہ دوسرے سے پڑتا ہے۔ گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ ایسے مواقع پر دوسروں کے ساتھ شرافت اور انصاف کا معاملہ کرنا اچھا اخلاق ہے، اور پستی اور بے انصافی کے ساتھ معاملہ کرنا برا اخلاق۔

اچھے اخلاق کی سب سے پہلی پہچان یہ ہے کہ آپ اپنے دل سے دوسروں کے خیر خواہ ہوں۔ آپ ہمیشہ دوسروں کا بھلا چاہیں۔ دوسروں کے لیے آپ کے دل میں محبت ہو، نفرت نہ ہو۔ دوسروں کی ترقی کو دیکھ کر آپ کے اندر جلن نہ پیدا ہو اور دوسروں کو برے حال میں دیکھ کر آپ انھیں حقیر نہ سمجھیں۔ دوسروں کے بارے میں آپ کوئی بات سنیں تو آپ اس کو اچھے معنی میں لیں، اس کی وجہ سے آپ دوسروں کے بارے میں بدگمان نہ ہو جائیں۔

دوسروں کا خیر خواہ بننے کی پہچان کیا ہے۔ اس کی سادہ پہچان یہ ہے کہ دوسروں کے لیے آپ وہی پسند کرنے لگیں جو آپ خود اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ آپ کو یہ پسند ہے کہ دوسرے لوگ آپ کا اعتراف کریں تو آپ بھی اسی طرح دوسروں کا اعتراف کریں۔ آپ کو پسند ہے کہ کوئی آپ کو بے عزت نہ کرے تو آپ بھی اسی طرح دوسروں کو کبھی بے عزت نہ کریں۔ آپ کو پسند ہے کہ کوئی آپ کا مال بے جا طور پر نہ لے تو آپ بھی دوسروں کا مال بے جا طور پر لینے سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائیں۔

دنیا میں آدمی کا سابقہ جب دوسروں سے پیش آتا ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ کبھی دوسروں کے ساتھ اس کو شکایت ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر خوش اخلاقی کے رویہ پر قائم رہنے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے اندر اعراض کرنے اور بھلا دینے کی عادت ہو۔

دوسروں کی زبان سے آپ کے لیے کڑوا بول نکلے مگر آپ دوسروں کو اپنا کڑوا بول نہ سنائیں۔ دوسروں سے آپ کو کوئی چوٹ لگ جائے تو آپ ایسا نہ کریں کہ آپ بھی اس کے خلاف انتقامی جذبہ لے کر بیٹھ جائیں۔ دوسرا آپ کو نظر انداز کر رہا ہو، اس وقت بھی آپ ایسا نہ کریں کہ اپنے آپ کو اس سے کاٹ لیں۔ اس دنیا میں اچھے اخلاق پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی برے اخلاق والوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرے۔ اور برائی کے جواب میں بھی اچھائی کا نمونہ پیش کرے۔

اچھے اور برے اخلاق کا بہت زیادہ تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ کڑوا بول بداخلاقی کی علامت ہے اور میٹھا بول خوش اخلاقی کی علامت۔ زبان سے نکلے ہوئے کچھ الفاظ ایک شخص کو آپ کا دشمن بنا سکتے ہیں۔ اور اسی زبان سے نکلے ہوئے کچھ اور الفاظ کا اثر یہ ہو سکتا ہے کہ ان کو سننے والا آپ کا قریبی دوست بن جائے۔

اخلاق کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ آپ کے اندر دوسروں کے لیے فیاضی اور اعلیٰ ظرفی کے جذبات ہوں۔ دوسروں کی سخت بات کو برداشت کر کے آپ ان کے ساتھ نرم بات بولیں۔ دوسرے سے آپ کو نقصان پہنچے تب بھی آپ اس کو نفع پہنچائیں۔ دوسرے سے آپ کو کچھ نہ ملنے والا ہو تب بھی آپ اس کو دینے کی کوشش کریں۔ دوسرا آپ کو اشتعال دلائے تب بھی آپ مشتعل ہوئے بغیر اس کے ساتھ شرافت کا معاملہ کریں۔

اخلاق اس بہتر سلوک کا نام ہے جس میں شرافت، خیر خواہی اور اعلیٰ ظرفی کی اسپرٹ پائی جائے۔ با اخلاق انسان وہ ہے جس کی زندگی میں سورج کی روشنی اور پھول کی مہک جیسی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

اچھا سماج بنانے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اچھا اخلاق ہے۔ جس سماج کے افراد اچھے اخلاق والے ہوں، جو ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق اور انسانیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزاریں، وہ سماج یقیناً بہتر سماج ہو گا۔

بہتر اخلاقی سماج ہی کا دوسرا نام بہتر انسانی سماج ہے۔ سماج کو اونچا اٹھانا ہے تو اخلاق کو اونچا اٹھائیے۔ سماج کو درست کرنا ہے تو اس کے افراد کو اخلاقی اعتبار سے درست کیجئے۔ یہی بہتر سماج بنانے کا واحد یقینی راستہ ہے۔ اس کے سوا اُس کا اور کوئی راستہ نہیں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۴ فروری ۱۹۹۲ کو نشر کیا گیا۔

جنت کا انعام

صحیح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی صلی اللہ علیہ وسلم خدیجۃ وفضلھا کے تحت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

أتى جبريل النبيَّ صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسولَ الله، هٰذه خديجة قد أتتْ معها إناءٌ فيه إدامٌ أو طعامٌ أو شراب - فإذا هي أتتْك فاقرأْ عليها السلام من ربّها ومنّي وبشّرها ببيتٍ في الجنة من قَصَب لا صَخَبَ فيه ولا نَصَب -

جبریل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ خدیجہ آرہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک برتن ہے۔ اس میں کھانے اور پینے کا سامان ہے۔ جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو ان کو ان کے رب کی طرف سے سلام کہہ دیں اور میری طرف سے بھی۔ اور ان کو خوش خبری دے دیں کہ جنت میں ان کے لیے ایک گھر ہوگا جس میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف۔

یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ اس سلسلہ میں ابن حجر العسقلانی نے الطبرانی کی ایک روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کہ آپ مکہ کے قریب غار حراء میں تھے (في رواية سعيد بن كثير عند الطبراني، إن ذلك كان وهو بحراء) فتح الباری ۷/۱۶۲

یہ غالباً مکی دور کے اس زمانہ کی بات ہے جب کہ اہل مکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر نماز اور عبادت کے لیے مکہ کے باہر پہاڑوں کی طرف جانا پڑتا تھا۔ غالباً اسی زمانہ میں آپ عبادت کے لیے حرا نامی غار میں بھی گئے جو مکہ سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ نے آپ کے لیے کھانا تیار کرکے اس کو غار حرا میں پہنچایا۔

مذکورہ واقعہ بعثت نبوی کے ابتدائی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت مکہ میں آپ ایک بے یار و مددگار شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس وقت کے حالات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اس طرح مسلّم شخصیت نہ تھی جیسا کہ وہ آج نظر آتی ہے۔ اس وقت سارا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس وقت آپ کی شخصیت ایک متنازعہ شخصیت تھی۔ لوگ آپ کو شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ وہ آپ کے دعوے نبوت پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس نزاعی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ لوگ آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے اوپر آوازے کستے۔ آپ لوگوں کے طنز کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ لوگوں کی طرف سے مسلسل آپ کو ایذا پہنچانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس طرح آپ کی زندگی گویا شور وغل اور تکلیف ومصیبت کے درمیان تھی۔ یہ دونوں تلخ تجربے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آرہے تھے اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ کو بھی۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں حضرت جبریلؑ کی طرف سے مذکورہ بشارت نازل کی گئی۔ اور ان کی توجہ کو حال کے بجائے مستقبل کی طرف موڑ دیا گیا۔

مکی دور کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیکسی اور عدم قبولیت کا جو ماحول تھا، اس سے حضرت خدیجہ نے کوئی اثر نہیں لیا۔ ان ناموافق حالات سے اوپر اٹھ کر انھوں نے آپ کے پیغمبر ہونے کی حیثیت کو پہچانا۔ اور دل وجان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ وہ صرف آپ کی زندگی کی ساتھی نہیں بنیں بلکہ وہ آپ کے مشن میں بھی آپ کی ساتھی بن گئیں۔

حضرت خدیجہ کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے جنت کا وہ محل لکھ دیا گیا جو ہر قسم کے شور سے بھی خالی ہو اور ہر قسم کی تکلیف سے بھی۔ یہ بشارت براہ راست طور پر حضرت خدیجہ کے لیے ہے، اور بالواسطہ پر ہر اس شخص کے لیے جو اس نوعیت کے ایمان کا ثبوت دے جس کا ثبوت حضرت خدیجہ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

ایک تضاد

مارچ ۱۹۸۴ میں میں ایک عرب ملک میں تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ہندستان کی ایک جماعت کے ذمہ دار بھی وہاں موجود تھے۔ ہندستان سے وہ عربی زبان میں ایک رپورٹ تیار کرکے لے گئے تھے جس میں ان کی جماعت کے وہ کارنامے تحریر کیے گئے تھے جو اس نے تقسیم ہند کے بعد سے اب تک انجام دیے ہیں۔ اس رپورٹ کی ایک کاپی انھوں نے ازراہ عنایت مجھ کو بھی عطا فرمائی۔

اگلے دن ایک شیخ کے یہاں شام کا کھانا تھا۔ یہاں صرف میں اور مذکورہ بزرگ دو آدمی تھے جو ہندستان سے تعلق رکھتے تھے۔ بقیہ تمام کے تمام شیوخ عرب تھے۔ کھانے سے پہلے ایک بڑے کمرہ میں غیر رسمی نشست تھی۔ اس مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ بزرگ نے فرمایا : ہندستان میں تو مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہاں ان کو مسجد میں بھی سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

اس مجلس میں میری نشست ان کے قریب ہی تھی۔ میں نے ان کے کان میں کہا کہ حضرت، آپ یہ کس ملک کی بات کر رہے ہیں۔ کیا یہ اسی ہندستان کا قصہ ہے جس سے نکل کر میں یہاں آیا ہوں۔ انھوں نے کہا : کیا آپ کو صفدر جنگ کی مسجد کا حال معلوم نہیں۔ اس مسجد کے اندر نماز پر حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے۔ میں نے کہا استغفر اللہ۔ پھر آپ کو یوں کہنا چاہیے کہ ہندستان کی تین لاکھ مسجدوں میں ہمیں اذان اور نماز کی کھلی اجازت ہے۔ البتہ صفدر جنگ کی مسجد جو آثار قدیمہ کے تحت ہے، وہاں آثار قدیمہ کے قانون کے مطابق تالا لگا دیا گیا ہے۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ کس طرح ایک عجیب وغریب تضاد میں مبتلا ہے۔ ہندستان کی مسلم جماعتوں اور یہاں کے مسلم اداروں کا حال یہ ہے کہ جب وہ "ہندستان میں ہمارا کام" کے موضوع پر لکھیں گے یا بولیں گے تو ان کے پاس عظیم کارناموں کی لمبی فہرست ہوگی۔ ان کی رپورٹ پڑھ کر ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ اس ملک میں وہ ہمالیہ پہاڑ کے برابر بڑے بڑے کام انجام دے رہے ہیں۔

مگر انھیں جماعتوں اور اداروں کے ذمہ دار جب "ہندستان میں مسلمان" کے موضوع پر لکھیں گے یا بولیں گے تو ان کی کہانی بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اب ان کے بیان کو پڑھ کر یا سن کر ایسا محسوس ہوگا جیسے اس ملک میں مسلمان صرف قتل و غارت گری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ترقی تو درکنار، یہاں ان کو زندہ رہنے کے مواقع بھی حاصل نہیں۔

یہ کیسا عجیب تضاد ہے۔ لوگوں کو جب خود اپنا کارنامہ بیان کرنا ہو تو اسی ہندستان میں ان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیں اور پُر فخر طور پر اس کی شاندار رپورٹ تیار کر کے اسے ساری دنیا میں پھیلائیں۔ مگر جب ان کو ہندستان میں مسلم قوم کی حالت بیان کرنا ہو تو اچانک یہی ملک مسلمانوں کے لیے محرومی اور بربادی کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کو تو اس ملک میں جینے تک کا موقع حاصل نہیں۔ مگر خود ان مسلم رہنماؤں کو ناقابل قیاس حد تک یہ مواقع حاصل ہیں کہ وہ یہاں بڑے بڑے پُر فخر کارنامے انجام دے سکیں۔

کسی ملک میں بیک وقت یہ دونوں حالتیں پائی نہیں جاسکتیں۔ اگر ملک میں بسنے والے مسلمان تعصب اور ظلم کا شکار ہوں، ان کو ہر اعتبار سے برباد کیا جا رہا ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اسی ملک کے رہنما خود اپنے کارناموں کے عالی شان گنبد تعمیر کر سکیں۔ اور اگر رہنماؤں کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ شاندار طور پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیں تو ایسی حالت میں اسی ملک کے اندر ان کی قوم برباد اور خستہ حال نہیں ہوسکتی۔

مسائل انسانی سماج کا خاصہ ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ اور ہر سماج میں موجود رہیں گے۔ اس فطری حقیقت کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو ہندستان میں مسلمانوں کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جو انفرادی یا ملی سطح پر انھیں درکار ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا جائے۔

ایک شرعی اصول

اسلام کے قواعد طہارت کے مطابق، جانور کا گوبر اور پیشاب نجس ہے (کل رجیع

بول فھو نجس) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد لابن رشد القرطبی، ۱/۸۰-۸۱

حیوانی گوبر کا شمار نجاست غلیظہ میں کیا گیا ہے۔ آدمی کے کپڑے میں اگر ایک درہم کے قدر لید یا گوبر لگ جائے اور آدمی اسی حالت میں نماز پڑھ لے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی نماز کو دہرائے لیکن اگر عذر کی صورت پیدا ہو جائے تو یہی نجاست پاک کے حکم میں داخل ہو جاتی ہے:

ان فقہاءنا الائمۃ الاولین قد افتوا بطہیر ارواث المواشی بالنسبۃ لاھل القریٰ والبوادی لعموم البلویٰ حیث یعسر التحرز عنہا۔ ای انہا یعفیٰ عن نجاستہا تیسیراً علیہم ودفعاً للحرج عنہم، نظراً للصعوبۃ صیانۃ آبارھم المکشوفۃ وغدرانہم من ھٰذہ الارواث۔

دور اول کے ائمہ فقہاء نے دیہاتوں اور صحراؤں میں رہنے والوں کے لیے عموم بلویٰ کی بنا پر مویشیوں کی لید کے پاک ہونے کا فتویٰ دیا ہے جب کہ اس سے بچنا دشوار ہوتا ہے۔ یعنی ان کی نجاست سے درگزر کیا جائے گا تاکہ ان لوگوں کے لیے آسانی ہو اور ان پر تنگی نہ رہے، اس بات کے پیش نظر کہ ان کے لیے یہ سخت مشکل ہے کہ وہ اپنے کھلے کنوؤں اور تالابوں کو ان کی لید سے بچائیں۔

(دکتور غریب الجمال، التامین، صفحہ ۲۴۷)

اس مثال سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ یہ اصول، شریعت کی اصطلاح میں، یسر یا رفع حرج ہے۔ قرآن (الحج ۷۸) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (وما جعل علیکم فی الدین من حرج) اسی طرح روزہ کے حکم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے لیے سختی نہیں چاہتا یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر)

اسی بنا پر علماء اسلام کے درمیان اس مسئلہ پر کامل اتفاق ہے۔ فقہاء نے اس کو شریعت کے ایک اہم اصول کے طور پر اختیار کیا ہے۔ علماء کے چند اقوال یہ ہیں:

الضرورات تبیح المحظورات۔	ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہیں۔
ما حُرّم لذاته یباح للضرورة۔	جو چیز فی نفسہ حرام ہے وہ ضرورت پر جائز ہو جاتی ہے۔
ما حُرّم لسد الذریعة یباح للحاجة۔	جو چیز سد ذریعہ کے طور پر حرام ہو وہ حاجت کے لیے جائز ہو جاتی ہے۔
اذا ضاق الامر اتّسع۔	جب معاملہ تنگ ہو جائے تو کشادگی ہو جاتی ہے۔
المشقة تجلب التیسیر۔	مشقت آسانی لے آتی ہے۔

شریعت کے مذکورہ اصول کا تعلق صرف طہارت اور نجاست کے معاملات سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ جب بھی کسی معاملہ میں عموم بلویٰ کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کے بعد گنجائش اور رعایت کی یہ سہولت کسی قباحت کے بغیر حاصل ہو جائے گی۔

اس کی ایک مثال بینکنگ کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانہ کے تجارتی اور اقتصادی معاملات میں بینکنگ کا دخل اس سے بھی زیادہ ہو گیا ہے جتنا دیہات کے کسانوں کے لیے گوبر کا معاملہ۔ ایسی حالت میں یہ بات شرعی مزاج کے خلاف ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر بینکنگ کے معاملہ میں وہ پابندیاں عائد کی جائیں جو دور عباسیہ کے مسلمانوں کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں۔

شریعت نے اگر اہل قُری کے لیے حسب ضرورت سہولتیں تجویز کی ہیں تو ناممکن ہے کہ وہی شریعت اہل مُدن کے لیے ضرورت کے باوجود سختیاں عائد کرنے کا اصول اختیار کرے۔ مزید یہ کہ شرعی احکام کا تعلق جس طرح جزئیات سے ہے اسی طرح کلیات سے بھی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ شریعت جزئی امور میں رعایت دے اور کلی امور میں وہ رعایت دینے سے انکار کر دے۔

تنقید کا اصول

ایک صاحب نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپ صحابۂ کرام، علماء عظام سب پر تنقید کرتے ہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل لغو بات ہے۔ صحابہ اور علماء کے درمیان کا مانہیں ہے بلکہ فل اسٹاپ ہے۔ علماء پر تنقید کا ہر شخص کو حق ہے، مگر صحابہ پر تنقید کا کسی کو حق نہیں۔

اصحاب رسول کا معاملہ ایک خصوصی معاملہ ہے۔ ان کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ لاتتخذوھم من بعدی غرضا (میرے بعد ان کو نشانہ نہ بناؤ) اس لئے صحابہ مطلق طور پر تنقید سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے سلسلہ میں صرف یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں اگر دو صحابی کے درمیان ایسا اختلاف پا جائے جس میں تطبیق نہ دی جا سکتی ہو تو دونوں میں سے ایک کا انتخاب کیا جائے گا۔ یعنی ایسے مسئلہ میں ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے گا نہ کہ تنقید کا طریقہ۔

مگر صحابہ کے بعد جہاں تک دوسرے علماء اور رہنماؤں کا تعلق ہے تو ان کے بارہ میں امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ بھی آدمی اور ہم بھی آدمی (ھم رجال ونحن رجال) یہی صحیح اسلامی مسلک ہے اور یہی میرا مسلک ہے۔ میں صحابہ کرام کو تنقید سے مستثنیٰ سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی صحابہ کرام پر تنقید نہیں کی اور نہ بقید ہوش وحواس ایسا کر سکتا ہوں۔ مگر صحابہ کے بعد دوسری اسلامی شخصیتوں پر علمی تنقید کی جا سکتی ہے۔ اور ایسی تنقید ہر دور میں علماء امت کے درمیان جاری رہی ہے۔ غیر صحابہ پر تنقید کے معاملہ میں کبھی کسی نے نکیر نہیں کی۔

تاہم غیر صحابہ پر تنقید کے سلسلہ میں بھی ایک فرق کو ملحوظ رکھنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ تنقید ہو نہ کہ تعییب۔ یعنی علمی اختلاف رائے ہو نہ کہ ذاتی الزام تراشی۔ مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸) کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے نکاح نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کے نکاح نہ کرنے کو میں ایک ذاتی مسئلہ قرار دوں گا اور اس کی بنیاد پر ان کے اوپر کوئی تنقید نہیں کروں گا۔ مگر ان کی کتابیں میرے نزدیک مقدس نہیں۔ ان میں اگر کوئی بات غیر صحیح نظر آئے تو اس پر علمی حدود میں تنقید کی جا سکتی ہے۔

مزید وضاحت کے لئے میں نے اپنی الماری سے ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل

دین المسیح نکالی۔ یہ ضخیم کتاب ابن تیمیہ نے ایک عیسائی عالم کے جواب میں لکھی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحیح کتاب ہے۔ مگر اس کی بہت سی باتیں مناظرانہ انداز کی ہیں۔ خالص شرعی معیار پر وہ درست نہیں۔

مثال کے طور پر کتاب کے جز ۴ میں انھوں نے اس بات کی مختلف دلیلیں دی ہیں کہ دین مسیح کے مقابلہ میں دین محمدی زیادہ کامل ہے۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا دین پہنچایا جب کہ دوسرے پیغمبروں نے پورا دین نہیں پہنچایا:

فضمن اللہ لہ العصمۃ اذا بلغ رسالاتہ فلہٰذا ارشد الناس الی جمیع الحق والقی الی الناس مالم یکن غیرہ من الانبیاء القاءہ خوفا ان یقتلوہ کما یذکرون عن المسیح وغیرہ (صفحہ ۱۴)

اللہ نے تبلیغ رسالت کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ضمانت لے لی تھی۔ اس لئے آپ نے لوگوں کو پورا حق بتایا۔ آپ نے لوگوں کو وہ باتیں پہنچائیں جو آپ کے سوا دوسرے نبیوں کے لئے ممکن نہ ہو سکیں کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ لوگ ان کو قتل کر دیں گے جیسا کہ مسیح اور دوسرے نبیوں کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ بات بذات خود صحیح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دین کامل ہے۔ مگر اس کی مذکورہ توجیہہ ہرگز صحیح نہیں۔ یہ قرآن کی تصریحات سے ٹکراتی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ اللہ نے اپنے تمام پیغمبروں کی پوری مدد فرمائی۔ کسی پیغمبر کو اللہ نے اس طرح بے حفاظت نہیں چھوڑا کہ وہ لوگوں کی تعدی کے خوف سے خدا کی وحی کو کامل طور پر لوگوں تک نہ پہنچائے۔

جہاں تک موجودہ انجیل کا تعلق ہے، اس میں اس سلسلہ میں متضاد باتیں پائی جاتی ہیں مثلاً ایک طرف اس میں ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ جو باتیں میں نے اپنے باپ سے سنیں وہ سب تم کو بتا دیں (یوحنا ۱۵ : ۱۵) دوسری طرف انجیل میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ساری باتیں نہیں بتا رہا ہوں۔ تاہم اس کا سبب، انجیل کے بیان کے مطابق قتل کا خوف نہیں بلکہ مخاطبین کا عدم تحمل ہے۔ اس سلسلہ میں انجیل کے الفاظ یہ ہیں ـــــ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے:

I have yet many things to say unto you, but ye cannot bear them now.
(St. John 16:12)

اگر بالفرض حضرت مسیح نے یہ کہا ہو کہ میں تم کو پوری بات نہیں بتا رہا ہوں تو اس کا سبب خود انجیل کے بیان کے مطابق ، یہ نہیں تھا کہ حضرت مسیح اس معاملہ میں اپنی ذات کے بارہ میں خوف رکھتے تھے ۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ آنجناب کے نزدیک آپ کے مخاطبین اس کی استعداد نہیں رکھتے تھے کہ وہ پوری بات کا تحمل کر سکیں۔

یہ ایک عام شرعی اصول ہے جس پر خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے ۔ مثلاً مکہ میں آپ پر شراب اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی بابت احکام نہیں اترے ۔ کیوں کہ اس وقت لوگوں کے اندر اس کو قبول کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کسی بھی درجہ میں کوئی ممنوع چیز نہیں ۔ جو چیز ممنوع ہے وہ اسلوب تنقید ہے نہ کہ خود تنقید ۔ تنقید کا مطلب دلائل کے ذریعہ اختلاف رائے ہے ۔ اس معنی میں تنقید بلاشبہہ مطلوب ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کو سب وشتم کرے یا بلا دلیل کسی کی مذمت کرنے لگے تو ایسا فعل یقیناً غیر شرعی ہوگا ۔ اندیشہ ہے کہ ایسا آدمی اللہ کے یہاں سخت پکڑ میں آجائے۔

مزید یہ کہ تنقید زندگی کی علامت ہے ۔ زندہ قومیں تنقید کا استقبال کرتی ہیں ۔ جو لوگ حق کے طالب ہوں وہ کبھی تنقید کو برا نہیں مانیں گے ۔ البتہ جو لوگ شخصیتوں کے پرستار بن جائیں وہ ضرور تنقید کو سن کر بپھر اٹھیں گے ، کیوں کہ تنقید کی زد ہمیشہ شخصیتوں پر پڑتی ہے نہ کہ حق وصداقت پر۔

خطابات کا خلاصہ

۱۔ قرآن فہمی کی کلید کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف باتیں بتائی جاتی ہیں۔ مثلاً عربی دانی، شان نزول کی روایات، ربط و نظم، ناسخ اور منسوخ کا علم، انقلابی طرز فکر۔ اس قسم کی چیزیں قرآن فہمی میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ مگر وہ قرآن فہمی کی کلید نہیں ہیں۔ قرآن فہمی کی کلید کوئی ایسی ہی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذکر خود قرآن میں موجود ہو۔ قرآن کے مطابق، قرآن فہمی کی کلید صرف ایک ہے، اور وہ تقویٰ ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ھدًی للمتقین۔ تقویٰ آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے اور سنجیدگی ہی کسی کلام کو سمجھنے کی واحد کلید ہے۔

۲۔ تربیت کیا ہے۔ تربیت معروف قسم کے تربیتی کورس کا نام نہیں اور نہ متصوفانہ مشقوں سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ تربیت کا تمام تر تعلق ذہنی بیداری سے ہے جس کو قرآن میں تدبر اور تفکر کہا گیا ہے۔ آدمی کے اندر تدبر اور تفکر جتنا زیادہ بڑھے گا اتنا ہی اس کا ذہنی ارتقاء ہوگا اور اسی نسبت سے اس کی روح میں معرفت اور تعلق باللہ کی صفات پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ تربیت کا ذریعہ فکری بیداری ہے نہ کہ عضویاتی مشقیں۔

۳۔ جنت کس کے لئے ہے اور جہنم کس کے لئے۔ قرآن کے مطابق، جنت پاک روح کے لئے ہے اور جہنم آلودہ روح کے لئے۔ آدمی ہر آن انھیں دونوں چیزوں کے درمیان ہے۔ زندگی کا ہر موقع آدمی کو دو امکان کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ ایک رویہ سے وہ اپنی روح کو پاک کرکے جنتی بن جاتا ہے اور دوسرا رویہ اختیار کرکے وہ اپنی روح کو گندا کرتا ہے اور اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے۔

۴۔ قولِ لا الٰہ الا اللہ کیا ہے جو آدمی کو جنت میں لے جاتا ہے۔ قول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اوپری طور پر صرف زبان سے ادا کیا جائے۔ دوسرا وہ جو قلب کی گہرائی سے نکلے۔ اول الذکر کو تلفظ کلمہ اور ثانی الذکر معرفت کلمہ کہہ سکتے ہیں۔ تلفظ کلمہ کی دین میں کوئی حقیقت نہیں۔ مگر معرفت کلمہ انتہائی قیمتی ہے۔ وہ آدمی کی پوری زندگی کو بدل کر اُس کو اِس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کا انتخاب جنت میں بسانے کے لئے کیا جائے۔

۵۔ دعوت الی اللہ کیا ہے۔ دعوت الی اللہ وہ تبلیغی جدوجہد ہے جو غیر مسلموں میں دین کے

تعارف کے لئے کی جاتی ہے۔ ختم نبوت کے بعد یہی امت محمدی کا خارجی مشن ہے۔ اسی فریضہ کی اد پر امت محمدی کا امت محمدی ہونا متحقق ہوتا ہے۔ امت محمدی اگر اس کام کے لئے نہ اٹھے تو اس کی اصل حیثیت ہی مشتبہہ ہو کر رہ جائے گی۔

۶۔ جہاد فی سبیل اللہ کب کیا جاتا ہے۔ اس کی مختلف ابتدائی شرائط میں سے ایک لازمی شرط تیاری (اعداد) ہے۔ تیاری کا معیار، قرآن کے مطابق اعداد تا حد ارہاب ہے۔ یعنی اتنی تیاری فریق مخالف اس سے ہیبت زدہ ہو جائے۔ اس قسم کی تیاری کئے بغیر جہاد کا اقدام کرنا جہا نہیں فساد ہے۔ کیوں کہ ایسا جہاد اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف تباہی میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

۷۔ دعا کیا ہے۔ دعا یہ نہیں ہے کہ آپ کچھ الفاظ یاد کر لیں اور ان کو اپنی زبان سے دہرا رہیں۔ دعا عاجز مطلق کا قادر مطلق کو پکارنا ہے۔ دعا اس وقت دعا بنتی ہے جب کہ بندہ اپ مسئلہ کو خدا کا مسئلہ بنا دے۔ جب خود خدا کی خدائی کا یہ تقاضا بن جائے کہ وہ اپنے بندہ کی پکار پر دوڑ پڑے۔

۸۔ اللہ کی راہ میں رونا کیا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لئے رونا وہ معتبر ہے جو تنہائیوں میں پیش آئے۔ جب آدمی اکیلا ہو۔ وہ اپنے رب کی عظمتوں کو یاد کرے خوف و محبت کے جذبہ کے تحت اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑیں۔ مجمع میں رونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

۹۔ شکر کیا ہے۔ شکر ملے ہوئے کی قدر دانی کرنے کا نام ہے۔ جب آدمی ملی ہوئی چیز کی قدر پہچانتا ہے اس کے بعد ہی اس کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ ابلتا ہے۔ جس آدمی کی نظر نہ ملے ہوئے پر لگی ہوئی ہوں وہ ملے ہوئے کی قدر نہیں پہچانے گا۔ اس لئے شکر کا جذبہ بھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوگا۔

۱۰ ذکر کیا ہے۔ ذکر کسی قسم کے رٹے ہوئے کلمات کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ ذکر اصل یاد کا نام ہے۔ جس کی یاد آدمی کے دل میں آئے اسی کی نسبت سے جذبات اس کے اندر ہوں گے۔ خدا سب سے بڑی ہستی ہے۔ وہی دینے والا ہے اور وہی چھیننے والا۔ اس لئے جب آدمی خدا کو یاد کرتا ہے تو وہ خدا کی عظمت و جلال میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کا سینہ ایک قسم

روحانی بھونچال کا تجربہ کرتا ہے۔ یہی وہ یاد الٰہی ہے جس کو ذکر کہا گیا ہے۔

۱۱ خدا پرستی کا معیار کیا ہے۔ خدا پرست ہونے کا معیار یہ ہے کہ آدمی کا جب یہ حال ہو جائے کہ تنقید اس کو بری نہ لگے اور تعریف پر اس کو خوشی نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا پرست بن گیا۔ خدا پرست ہونا دراصل خدا کو اس کی صفات کمال کے ساتھ پالینے کا نام ہے۔ اور جو آدمی خدا کو اس کی صفات کمال کے ساتھ پالے اس کے لئے تنقید بھی بے معنی ہو جاتی ہے اور تعریف بھی بے معنی۔

۱۲ علمی طریق فکر کیا ہے۔ علمی طریق فکر کا خلاصہ اس عربی مثل میں ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں) جب بھی آپ کو کسی بات کی حقیقت جاننا ہو تو اس کا ضد دریافت کیجئے اور دونوں کا تقابل کیجئے، اس کے بعد اصل حقیقت اپنے آپ واضح ہو جائے گی۔

۱۳ اکابر پرستی کی پہچان کیا ہے۔ اکابر پر تنقید سن کر جب آپ کو غصہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ اکابر پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔

۱۴ قسط پر قائم رہنے والا کون ہے۔ قسط پر قائم رہنے والا وہ ہے جو اپنے آپ کو بھی اسی ترازو پر تولے جس ترازو پر وہ دوسروں کو تول رہا ہے۔ جس آدمی کے پاس اپنے لئے دوسرا باٹ ہو اور غیروں کے لئے دوسرا باٹ، وہ عادل نہیں ہے بلکہ ظالم ہے۔

سوال وجواب

ایک صاحب نے کہا کہ آپ تمام اکابر ملت پر تنقید کرتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک ان اکابر میں کوئی بھی نہیں جو واقعۃً صحیح اور درست ہو۔

میں نے کہا کہ یہ میرے اوپر الزام ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ میں تمام اکابر ملت پر تنقید کرتا ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے کچھ رہنماؤں نے جدید مسائل کے حل کے لئے جو تدبیر اختیار کی، میں اس تدبیر کار پر تنقید کرتا ہوں۔ اور تدبیر کار پر تنقید کرنا سرے سے کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ تدبیر کار کے معاملہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے صحابہ نے اختلاف کیا۔ اس کے بعد امت کی پوری تاریخ میں ہمیشہ اس قسم کے اختلافات کئے جاتے

اسلامی تصور اور غیر اسلامی تصور کے درمیان ہے۔ اور میں نے اسلامی نقطۂ نظر کو صحیح تر ثابت کرنے کے لئے تین معلوم خواتین کی مثال دی ہے۔

عورت کے بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عورت کا مقام عمل (workplace) بنیادی طور پر اس کا گھر ہے۔ مگر اہل مغرب کا کہنا ہے کہ عورت گھر کے اندر رہ کر کوئی بڑا کام نہیں کر سکتی۔ اس لئے سماجی عمل میں شریک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو باہر لایا جائے۔ میں نے اس کتاب میں مغربی نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ نظری دلائل کے علاوہ اس سلسلہ میں میں نے تین خواتین کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ ایک، اسلامی دور کی خاتون حضرت اسماء۔ دوسرے، تاریخ کی ایک خاتون نور جہاں۔ تیسرے، ذاتی تجربہ کے دائرہ کی ایک خاتون زیب النساء۔ ان تین حقیقی مثالوں کا حوالہ دے کر میں نے بتایا ہے کہ ایک عورت گھر کے اندر رہ کر بھی بڑے بڑے اجتماعی کام کر سکتی ہے۔

اس پوری بحث میں جو نکتۂ اثبات ہے وہ یہ نہیں ہے کہ میری ماں صحابیہ کے برابر ہیں۔ بلکہ نکتۂ اثبات یہ ہے کہ مغرب کا نقطۂ نظر بے بنیاد اور اسلام کا نقطۂ نظر عین درست ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ اعتراض سراسر بے معنی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ جب بھی کسی چیز کی مثال دینا ہو تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ مگر علم الادب کا یہ مستقل اصول ہے کہ کسی کلام میں جب کوئی مثال لائی جائے تو وہاں مثال کا صرف مطلوبہ پہلو منطبق ہوگا۔ بقیہ تمام پہلو اپنے آپ حذف ہو جائیں گے۔

اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں ضعف کو بتانے کے لئے مکھی (الحج ۷۳) کی مثال دی گئی ہے۔ مکھی میں ضعف کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیتیں ہیں۔ مثلاً مکھی ہمیشہ گندگی کے اوپر بیٹھتی ہے۔ مگر قرآن کی مذکورہ آیت میں مکھی کا صرف ضعف کا پہلو منطبق کیا جائے گا، اس کا گندگی کا پہلو اپنے آپ حذف ہو جائے گا۔ اسی طرح خاتون اسلام میں جن عورتوں کی مثال دی گئی ہے ان کا صرف وہ پہلو وہاں مراد ہوگا جو زیر بحث نکتہ سے متعلق ہے۔ ان کے بقیہ پہلو وہاں حذف قرار پائیں گے۔

ایک کشمیری مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر ہم کہاں تک صبر کریں۔ ہندستان نے ہم کو اپنے دستور کی دفعہ ۳۷۰ دی تھی۔ اس کو بھی اس نے عملاً ہم

سے چھین لیا۔

میں نے کہا کہ آپ صحابہ والا ذہن پیدا کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہندستان نے آپ سے تین سو ستر کو چھین کر آپ کو تین کروڑ ستر دے دیا ہے۔ ایران کے بادشاہ یزدگرد نے صحابی کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ دیا۔ صحابی اس پر غصہ نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ کہا کہ شاہ ایران نے تو اپنا ملک ہی ہمارے حوالے کر دیا۔ انھوں نے ایک تحقیری معاملہ سے اپنے لئے حوصلہ کی خوراک حاصل کر لی۔

۳۷۰ نے آپ کو محدود رقبہ میں سمیٹ دیا تھا۔ اب موجودہ حالت آپ کو وسیع تر رقبہ میں کھینچ لائی ہے۔ اس نے آپ کو چھوٹی ریاست کے دائرہ سے نکال کر ایک بڑے ملک کے دائرہ میں پہنچا دیا ہے۔ اس نے آپ کے مواقع کار کو داخلی حدوں سے نکال کر خارجی وسعتوں تک پھیلا دیا ہے۔ پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ آپ صحابی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس بظاہر منفی واقعہ سے مثبت سبق لیجئے اور اس کو اپنی وسیع تر کامیابی کے لئے استعمال کیجئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الرسالہ میں ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ صبر کی حد کیا ہے۔

میں نے کہا کہ صبر کی حد یہ ہے کہ صبر کرنا ناممکن ہو جائے۔ صبر کے تمام تقاضوں کے ساتھ اس کا تجربہ کیجئے اور جب تجربہ ناکام ہو جائے تو اس کے بعد حسب حالات صبر کے بجائے دوسرے طریقہ کو آزمایا جائے۔ ہندستان کے مسلمانوں نے ابھی تک صبر کا تجربہ ہی نہیں کیا، اس لئے یہاں ابھی تک صبر کی حد بھی نہیں آئی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے امام حسین پر تنقید کی ہے۔ اس کے لیے آپ کے پاس کیا جواز ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے امام حسین پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ امام حسین کا اقدام ایک اجتہادی خطا تھا، اور یہی تمام علماء امت کا موقف ہے۔ آپ "راہ عمل" میں اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اگر وہ کمیونی کیشن کا زمانہ ہوتا تو کربلا کے معاملہ کی نوبت ہی نہیں آتی۔ امام حسین اس خبر کی بنیاد پر مکہ سے روانہ ہوئے تھے کہ کوفہ کے لوگوں نے آپ کی خلافت کی بیعت کر لی ہے۔ مگر جب کوفہ کے پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر صحیح نہ تھی اور بیعت کرنے والے تمام لوگ اپنی بیعت سے پھر چکے ہیں تو آپ نے دوبارہ مکہ واپسی کا فیصلہ کیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ زمانہ اگر

"ٹیلیفون" کا زمانہ ہوتا تو یہ اطلاع آپ کو مکہ ہی میں مل جاتی اور آپ اپنا سفر ملتوی کر دیتے۔ کوفہ کا اموی گورنر جس نے امام حسین کو مکہ واپسی کی اجازت نہیں دی، اگر یہ ٹیلیفون کا دور ہوتا اور وہ دمشق سے فوری رابطہ قائم کرکے یزید کی ہدایت معلوم کرتا تو یقینی طور پر یزید اس سے کہتا کہ ان کو مکہ واپس جانے دو، ان سے تعرض نہ کرو۔

۱۶ جنوری کو محبوب نگر کے کریسنٹ پبلک اسکول میں اجتماع ہوا۔ اس میں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ میں نے کچھ آیتوں کی روشنی میں دعوت کی اہمیت واضح کی۔ پھر بتایا کہ موجودہ حالات میں ہم دعوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ علم کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک الہامی علم (revealed knowledge) اور دوسرے ثابت شدہ علم (established knowledge) الہامی علم کی بنیاد پیغمبرانہ وحی ہے۔ اور ثابت شدہ علم کی بنیاد انسانی ریسرچ ہے۔ آدمی کو انھیں دو میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بولنا چاہئے۔ حبیب بھائی نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دو کے علاوہ کسی اور بنیاد پر جو مسئلہ اٹھایا جائے وہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ فتنہ ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں آپ نے بالکل درست فرمایا۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ آجکل کے لوگ اکابر کے اوپر تنقید کو سن کر فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خدا پر تنقید کی جائے تو وہ غصہ نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ خدا کے دین پر نہیں ہیں بلکہ اکابر کے دین پر ہیں۔ اکابر کا تقدس مشتبہ ہو تو وہ ڈرتے ہیں کہ وہ اپنی دینی زمین سے محروم ہو رہے ہیں۔ چونکہ وہ خدا کے دین پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لئے خدا پر تنقید کے بعد بھی انھیں یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ وہ بے زمین نہیں ہوئے ہیں۔

جناب عزیز احمد خاں صاحب حیدر آباد کی معروف شخصیت ہیں۔ وہ ڈاکٹر بھی ہیں اور ایڈوکیٹ بھی۔ انھوں نے عورتوں کی ان بیماریوں پر ریسرچ کی ہے جن کو عام طور پر جادو اور آسیب کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان بیماریوں میں بظاہر کچھ پراسراریت اور عجوبہ پن ہوتا ہے، اس لئے لوگ ان کو جادو اور آسیب کا نام دیدیتے ہیں۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں۔ اس قسم کی بیماریاں وہمی باتوں یا رحمی خرابیوں

ی بناپر پیدا ہوتی ہیں اور وہ پوری طرح قابل علاج ہیں۔ میں نے خود کئی پیچیدہ کیس میں ہومیوپیتھک
طریق علاج کو آزمایا ہے اور الحمد للہ کامیابی حاصل کی ہے۔ لوگوں کو ان بیماریوں کا دماغی اور
نفسیاتی علاج کرانا چاہئے۔ مذکورہ موضوع پر جناب عزیز احمد خاں صاحب کا ایک مضمون ماہنامہ بیسویں
صدی، اگست ۱۹۹۲ میں چھپا ہے۔

راقم الحروف کا خیال بھی ذاتی طور پر یہی ہے۔ اس قسم کی تمام باتیں خود اپنے دماغی اختلال کا
نتیجہ ہوتی ہیں نہ کہ کسی خارجی عمل کا نتیجہ۔ جن یا شیطان کا وجود بلاشبہہ برحق ہے۔ مگر شیطان کو انسان کے اوپر
کوئی قدرت حاصل نہیں۔ شیطان صرف بہکانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی معاملہ
بہکانے سے زیادہ ہو تو اس کو شیطان یا جن کے بجائے کسی اور چیز کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

حیدر آباد کے ایک بزرگ نے اپنی تازہ کتاب دی۔ اس کا نام "افکار جدید اور مذہب" ہے۔
اس کے مقدمہ میں بتایا گیا ہے کہ سرسید سے متاثر ان کے ایک ساتھی مولوی چراغ علی (۱۸۹۵-
۱۸۴۴) نے ایک کتاب لکھنا شروع کیا تھا جس کا نام العلوم الجدیدۃ والاسلام تھا۔ یہ کتاب تہذیب
الاخلاق میں چھپنا شروع ہوئی۔ ابھی صرف تمہیدی حصہ لکھا تھا کہ مولوی چراغ علی کی وفات ہوگئی۔ سرسید
نے ان کی وفات پر تہذیب الاخلاق میں لکھا:

"افسوس کہ وہ مضمون لاحل سوال کا جواب جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا
ناتمام رہ گیا۔ اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

سرسید کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ مولوی چراغ علی نے اس معاملہ کی پہلی اینٹ رکھ دی ہے۔ اب
دوسرے اہل ملت آگے بڑھیں اور اس کام کی تکمیل کریں۔ مذکورہ الفاظ اچھا مرثیہ ہو سکتے ہیں مگر وہ اچھی
رہنمائی نہیں۔

مولانا محمد رضوان القاسمی حیدر آباد کی ایک معروف دینی شخصیت ہیں۔ ملاقات کے دوران
ان سے مفید گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اپنے سہ ماہی جریدہ صفا کا ایک خصوصی شمارہ "فقہ اسلامی:
اصول، خدمات اور تقاضے" کا ایک نسخہ دیا۔ ۴۵۶ صفحات کی یہ فقہی دستاویز دار العلوم سبیل السلام
کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

اس کے مختلف حصے دیکھے۔ ایک مقالہ "مصالح مرسلہ" کے موضوع پر تھا۔ مقالہ نگار نے

اس میں لکھا تھا: مصالح مرسلہ کے بارہ میں اہل سنت کے چاروں دبستان فقہ کا نقطۂ نظر کیا ہے، اس کی ابتدا ازمانی ترتیب کے اعتبار سے فقہ حنفی سے ہونی چاہئے تھی۔ لیکن یہ گنہ گار اس کا آغاز فقہ مالکی سے کر رہا ہے۔ کیوں کہ مالکیہ ہی نے استصلاح یا مصالح مرسلہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ انھوں نے ہی اس کے اصول وقواعد منضبط کئے ہیں۔ اس موضوع پر غور وبحث کا دروازہ کھولا ہے۔ اور غالباً دوسرے مکاتب فقہ کی نسبت اس سے زیادہ کام بھی لیا . . . اس لئے اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ مصالح مرسلہ جیسی اصل کے انضباط کے لئے مالکیہ تمام فقہاء کی تحسین وامتنان کے حقدار ہیں جس کے ذریعہ نئے مسائل کے حل میں مدد لی جاتی رہی ہے۔" صفحہ ۴۷-۲۴۵

مضمون نگار کا یہ اعتراف قابل قدر ہے۔ تاہم اس کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ خیال آیا کہ اس کی کیا وجہ ہے لوگ ماضی کے ایک عالم کی امتیازی خدمت کا اعتراف تو بہ آسانی کر لیتے ہیں۔ مگر وہ ہم عصر عالم کی امتیازی خدمت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اول الذکر اعتراف میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی اور ثانی الذکر اعتراف میں معمولی چیز بھی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا عالم ایک مسلّمہ شخصیت کی حیثیت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ جب کہ معاصر عالم کے حق میں ابھی اس قسم کا تاریخی وزن موجود نہیں ہوتا۔ ماضی کے عالم کو ماننے کے لئے تاریخ کا دباؤ ہی کافی ہے، جب کہ معاصر عالم کو ماننے کے لئے ذاتی معرفت کا سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اور ذاتی معرفت بلاشبہ اس دنیا کی سب سے زیادہ کم یاب متاع ہے۔

حبیب بھائی نے بتایا کہ ایک بار وہ حیدر آباد کے زو میں گئے۔ وہاں انھوں نے ایک شیر کو دیکھا کہ وہ اپنے پنجرہ کے اندر اگی ہوئی گھاس کھا رہا تھا۔ انھوں نے زو کے آدمی سے پوچھا کہ شیر تو ایک گوشت خور جانور ہے۔ وہ گھاس کیوں کھا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے پیٹ کا علاج کر رہا ہے۔ کبھی کبھی شیر کا ہاضمہ بگڑ جاتا ہے یا اس کو قبض ہو جاتا ہے، اس وقت وہ گھاس لے کر اس کا علاج کرتا ہے۔ مصطفیٰ صدیقی صاحب نے بتایا کہ میں نے بھی بلی کو کبھی کبھی گھاس کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر عبد الرشید صاحب نے کہا کہ طبی اصول سے یہ بالکل قابل فہم ہے۔ کیوں کہ نباتات میں دوا کا فائدہ (medicinal value) موجود ہے۔ اکثر دوائیں نباتات ہی کے ذریعہ بنائی جاتی ہیں۔ قدرت نے ان جانوروں کو گوشت خور بنایا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی فطرت میں یہ شعور رکھ دیا ہے

کہ وہ ہاضمہ کی خرابی کے وقت نباتات لے کر اپنا علاج کرلیں۔

شیر اور بلی وغیرہ میں یہ عادت براہ راست خدائی تعلیم کی بنا پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "گوشت خوری" اگر فطری ہے تو "سبزی خوری" بھی عین فطری ہے۔ ہائی پروفائل کا انداز اگر مطلوب ہے تو لوپروفائل کا انداز بھی عین اسی طرح مطلوب ہے۔ مزید یہ کہ جس وقت لوپروفائل مطلوب ہو اس وقت ہائی پروفائل اختیار کرنا فطرت کی منشا کے خلاف ہے اور یقینی طور پر الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔

حیدر آباد سے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۸۴۰ کے ذریعہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ کی شام کو روانگی ہوئی۔ جہاز میں انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (جنوری ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان میں مچھلی کے شکار (Indian fishing) اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا دنیا کا ساتواں سب سے بڑا مچھلی کے شکار کا ملک (fishing nation) سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت انڈیا میں ۱۷۹ کی تعداد میں گہرے سمندر میں مچھلی کا شکار کرنے والے جہاز ہیں۔ ۲۳ ہزار میکنائزڈ بوٹ ہیں۔ اور ایک لاکھ ۲۵ ہزار دیسی ساخت کی کشتیاں ہیں۔ یہ سب مل کر بھی سمندر سے ایک ملین سے کم (0.21 million) ٹن مچھلی نکالتے ہیں۔ ابھی اس میدان میں بہت زیادہ حاصل کرنا باقی ہے۔ ہندستانی سمندروں کے نیچے سمندری خوراک (sea-food) کی قیمتی دولت بہت بڑی مقدار میں موجود ہے۔ اس کو استعمال کرکے انڈیا کو مچھلی کا بہت بڑا برآمدی ملک بنایا جا سکتا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم ملک کے وسیع غیر استعمال شدہ ذخائر کو استعمال کریں:

We must tap the country's vast unexploited resources (p.92).

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ صرف ہندستانی سمندر کی بات نہیں، ہم میں سے ہر ایک کی بات ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے وسیع امکانات کے اعتبار سے غیر استعمال شدہ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ابھی اپنے امکانات کو مزید استعمال کرنا ہے۔

جہاز کے اندر مطالعہ کے لئے کئی اخبارات تھے۔ نیوز ٹائم (۲۰ جنوری ۱۹۹۲) میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی مسٹر اظہر الدین کا ایک مضمون تھا۔ انھوں نے ملبورن (آسٹریلیا) کے حالیہ کرکٹ میچ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں ہندستانی ٹیم نے بہت بری کارکردگی (worst performance) دکھائی۔ مگر سچا کھلاڑی وہ ہے جو حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھے۔ چنانچہ انھوں نے کمزوری کا اعتراف

کرتے ہوئے آئندہ کے لئے امید کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا یقین ہے کہ ہر برے لمحہ کے ساتھ اچھا لمحہ بھی ضرور آتا ہے:

I believe that for every bad moment, there is a good one on the way.

یہی زندگی کا صحیح ترین اصول ہے۔ جو لوگ اس اصول کو اپنائیں وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ وہ ہر شام کے بعد اپنے لئے ایک نئی صبح کو پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

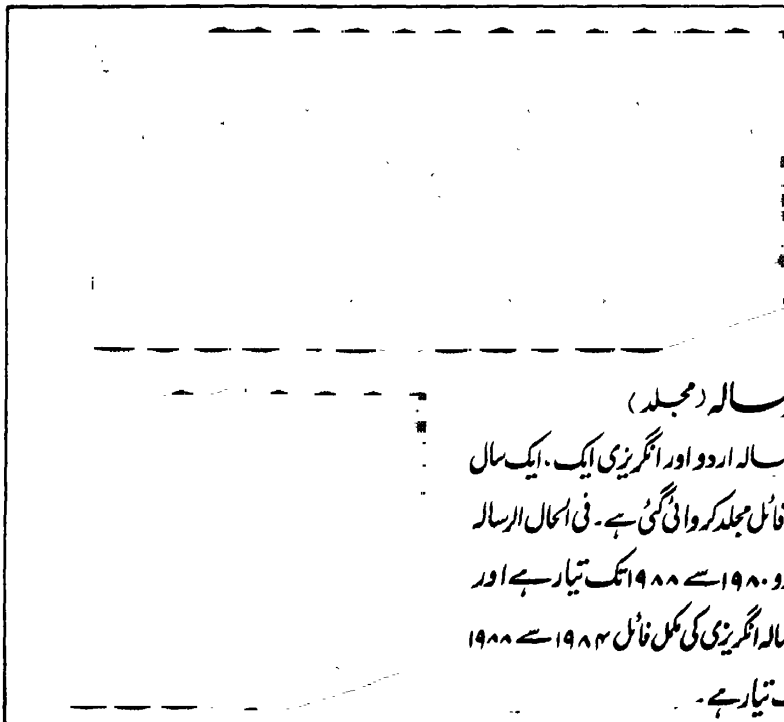
انڈین ایرلائنز کا فلائٹ میگزین سو اگت (جنوری ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون سنگاپور کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سنگاپور کا رقبہ صرف ۲۳۸ مربع میل ہے۔ اور اس کی آبادی تقریباً تین ملین ہے۔ مگر ترقی کے اعتبار سے وہ بہت سے بڑے بڑے ملکوں سے بھی آگے ہے۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۹۰ کے درمیان ۲۰ سال کے عرصہ میں سنگاپور نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔

مجھے وہ رپورٹ یاد آئی جو میں نے پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۲۵ دسمبر ۱۹۹۱) میں پڑھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر نواز شریف نے ایک سفر کے دوران سنگاپور کا "معلوماتی دورہ" کیا۔ دوران پرواز انھوں نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بطور خاص سنگاپور آنے کا فیصلہ اس لئے کیا کہ تیسری دنیا کے اس ملک کی ترقی کی حکمت عملی کو جان سکیں۔ انھوں نے کہا کہ سنگاپور کی فی کس سالانہ آمدنی ۱۳ ہزار ڈالر ہے۔ جب کہ پاکستان میں فی کس سالانہ آمدنی ۳۵۰ ڈالر ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے سنگاپور کے حوالہ سے پاکستان کی پس ماندگی پر رونا آتا ہے۔ سنگاپور میں نہ قدرتی وسائل ہیں اور نہ زرعی پیداوار۔ لیکن اس ملک نے محض ٹرانزٹ پورٹ کی حیثیت سے اتنی ترقی کی کہ اب وہ دنیا کا ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔ اور ہم دن بدن پیچھے جا رہے ہیں جب کہ پاکستان بہترین قدرتی وسائل اور ہنرمند افراد کی قوت سے مالا مال ہے۔

سنگاپور کو ایک چھوٹی سی دنیا ملی۔ اس پر قانع ہو کر اس نے ممکن دائرہ میں اپنی ترقی کی جدوجہد شروع کر دی۔ یہی اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد راز ہے۔ جو لوگ ملے ہوئے پر اپنی کوششوں کو مرتکز کرتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ نہ ملے ہوئے کو حاصل کرنے کی طرف دوڑتے ہیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۲ کی شام کو میں دہلی واپس آگیا۔ واپسی کے بعد حیدرآباد اور محبوب نگر سے متعدد خطوط موصول ہوئے۔ محبوب نگر سے جناب محمد عبد القادر صاحب کا ایک خط ملا۔ وہ سادہ اور مختصر طور پر حسب ذیل تھا:

"محبوب نگر کا پروگرام بہت سارے احباب کی جانب سے بے حد پسند کیا گیا۔ اور خواہش کی جارہی ہے کہ اس طرح کے پروگرام سال میں کم از کم ایک دفعہ ضرور ہونے چاہئے۔ الرسالہ کی ایجنسی کی مہم جاری ہے۔ کسی عالم دین کو میں نے یہ پہلا خط لکھا ہے۔ اگر کچھ غلطی ہوئی ہو تو درگذر فرمائیں"۔



الرسالہ (مجلد)

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک۔ ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔

۱ آئی وٹنس (Eyewitness) ہندستان ٹائمس کے تحت ویڈیو کیسٹ میگزین بناتے ہیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۹۳ کو اس کی ٹیم اسلامی مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ویڈیو ٹیپ پر لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد اور اجودھیا کے مسائل سے تھا۔

۲ بمبئی کے مسٹر مدھو مہتا (ہندستانی اندولن) کی دعوت پر ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کو بمبئی کا سفر ہوا۔ ۵ فروری کو واپسی ہوئی۔ وہاں مختلف اجتماعات ہوئے جن میں بمبئی کے ممتاز ہندو اشخاص جمع ہوئے۔ یہ لوگ مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ۴ فروری کو خلافت ہاؤس میں عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

۳ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۴ فروری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں تھی۔ اس میں روزہ کے اخلاقی فوائد بتائے گئے۔

۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۱ فروری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ اخلاقیات کے موضوع پر تھی۔ اس میں اچھے اخلاق اور برے اخلاق کو سادہ طور پر بیان کیا گیا۔

۵ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے بھوپال سے اطلاع دی ہے کہ جناب سلمان صاحب نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک میٹنگ سیفیہ کالج میں کی۔ اس میں مشورہ سے طے کیا گیا کہ کالجوں کے نوجوانوں پر مشتمل پیس میکرس نام کی ایک تنظیم بنائی جائے۔ یہ ایک مفید اقدام ہے۔ اسی قسم کا تجربہ ہر جگہ کیا جانا چاہئے۔

۶ ۷ فروری ۱۹۹۳ کو آغا خاں ہال (نئی دہلی) میں نیشنل سدبھاونا کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع سوشل ہارمنی تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی نقطہ نظر پیش کیا۔

۷ نیوز ٹریک (نئی دہلی) کی ٹیم ۱۳ فروری ۱۹۹۳ کی شام کو اسلامی مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نیوز ٹریک کے مارچ ۱۹۹۳ء کے ویڈیو میں شامل کیا جائے گا۔ سوالات کا تعلق ملکی اور اجودھیا کے مسائل سے تھا۔

۸ مسٹر مدھو مہتا اور شریف بمبئی کی دعوت پر ۱۵ فروری ۱۹۹۲ کو بمبئی کا سفر ہوا۔ ۲۰ فروری کو واپسی ہوئی۔ اس دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی اجتماعات میں خطاب کا موقع ملا۔ بمبئی سے مدراس کا سفر ہوا۔ وہاں کانچی کے شنکراچاریہ سے ملاقات کی۔ اس میں اجودھیا کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس کی خواہش خود شنکراچاریہ نے کی تھی۔

۹ ڈاکٹر این ایم شیخ (کلیان) لکھتے ہیں کہ اس پر فتن دور میں الرسالہ کا وجود ہندستانی مسلمانوں کے لئے نعمت اور امید کی کرن ہے۔ فی الحال میرے نام الرسالہ کی ۱۰ کاپیاں بطور ایجنسی ہر ماہ روانہ کریں "۔ یہی درست طریقہ ہے۔ جو لوگ بھی الرسالہ کے پیغام سے اتفاق کرتے ہیں ان سب کو یہ کرنا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لیں اور اپنے حلقہ میں اس کو پھیلا کر شعوری بیداری کا کام کریں۔

۱۰ یو این آئی (اردو نیوز سروس) نے روزانہ تمام اخباروں کو الرسالہ کے اقوال بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ مثلاً "آج کا قول" کے عنوان کے تحت انھوں نے ایک قول یہ روانہ کیا: جو مسئلہ اپنی غلطی مان کر ختم ہو سکتا ہے، اس کے لئے دوسروں کی غلطی منوانے کی کوشش کرنا وقت کا ایسا ضیاع ہے جس کا ارتکاب کوئی نادان ہی کر سکتا ہے۔

۱۱ برندابن (متھرا) کے گیتا آشرم کی طرف سے ۱۳ - ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کو ایک سمواد پریاس منعقد کیا گیا۔ اس میں ملک کے مختلف حصوں سے تقریباً ۵۰ ہندو دانشور شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شرکت کی اور وہاں اسلام کی روشنی میں نئے ہندستان کی تعمیر پر چند تقریریں کیں۔

۱۲ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے نمائندے نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر موجودہ حالات سے تھا۔ یہ انٹرویو پانچ جنیہ کے شمارہ جنوری ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔

۱۳ ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندہ مسز سونارا ولہ نے ۲۸ جنوری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع یونیفارم سول کوڈ تھا۔ بتایا گیا کہ یونیفارم سول کوڈ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔

۱۴ مدھیہ پردیش میں مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے جبلپور کا سفر کیا۔ وہاں آل انڈیا کانفرنس آن نیشنل انٹگریشن میں تقریر کی۔ اور مختلف ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں۔ واپسی میں بھوپال میں قیام رہا اور وہاں بھی تقریر اور ملاقاتوں کے پروگرام میں شرکت ہوئی۔ جبلپور اور بھوپال کے یہ پروگرام جنوری ۱۹۹۳ کے آخری ہفتہ میں ہوئے۔

۱۵ ۲۷ جنوری ۱۹۹۳ کو فکی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اسلام کیا ہے اور اسلام کیا نہیں ہے، کے موضوع پر خطاب کیا۔

۱۶۔ پروفیسر عبد الکریم صاحب (سائنس اینڈ کامرس کالج، ہبلی) نے اپنے خط مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ کے ذریعہ مطلع کیا ہے کہ ان کے یہاں غیر مسلم اہل علم پر افٹ آف ریولیوشن (پیغمبر انقلاب) کو بہت پسند کر رہے ہیں۔ ایک ہندو جرنلسٹ نے طے کیا ہے کہ وہ اس کتاب کا ترجمہ کناڑا زبان میں کریں۔ وہ لکھتے ہیں:

Your book Muhammad: The Prophet of Revolution has evoked a great deal of interest among non-Muslim scholars. A working journalist, Shri Ghalagi, working for the Kannada paper 'Vishwavani & Prapancha' has expressed his desire to translate the work in Kannada.

۱۷ صدر اسلامی مرکز نے کچھ لوگوں کے ساتھ شرنگیری کا سفر کیا۔ وہاں ۱۶ فروری ۱۹۹۳ کو شنکراچاریہ سے ملاقات کی۔ شانتی مشن میں انھوں نے اپنا پورا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ اس سفر کی تفصیلی رپورٹ انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کی جائے گی۔

۱۸ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں: میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ الرسالہ بھی پڑھتا ہوں۔ ان کو پڑھنے کے بعد میں نے صحیح طور پر اسلام کو سمجھا۔ اور فکری طور پر اس کی طرف مائل ہوا۔ اس سے پہلے میں نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مگر اللہ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ ہدایت دینا منظور تھا۔ اب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا ہوں (سید محمد برکت الرحمٰن، کھرگ پور، بنگال)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۹۲ ، شمارہ ۱۹۸

Cover photograph:
SULTAN OMAR ALI SAIFUDDIN MOSQUE
Brunei Darussalam

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)

مسجد اور مسلمان

اس وقت میں اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ پوری زمین صاف کر کے وہاں ایک عارضی مندر بنا دیا گیا جس پر روزانہ پوجا اور درشن کیا جارہا ہے۔

۶ دسمبر کے اس واقعہ کے بعد اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اس لیے اب ہمیں نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا ہے۔ ہمارا ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا۔ کیوں کہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے بابری مسجد کے سوال پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ خاص طور پر آخری چھ سال کے دوران وہ جان و مال کی زبردست قربانی دے کر اس مہم کو چلاتے رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بابری مسجد کو بچانا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ ایسی حالت میں سابقہ انداز کی احتجاجی تحریک جاری رکھنا سراسر نادانی ہوگی۔ ایسی تحریک کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ کیوں کہ اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا ہے۔ جس عمل کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ عمل اسلام کے مطابق نہیں۔

۶ دسمبر سے پہلے ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بابری مسجد کو کس طرح بچائیں۔ ۶ دسمبر کے بعد اب یہ مسئلہ ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح بچایا جائے اور اجودھیا کی قسم کے واقعہ کو کسی اور مقام پر دہرانے کو کس طرح روکا جائے۔ شریعت کی روشنی میں پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد اس کے حل کے لیے میں نے تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے جو کہ اس طرح ہے :

مسلمان بابری مسجد کے بارہ میں اپنے ایجی ٹیشن کو ختم کر دیں۔

ہندو اپنی مندر۔ مسجد تحریک کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔

گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ کے ایکٹ (۱۹۹۱) کو دستورِ ہند کا جزء بنا دے۔

جیسا کہ واضح ہے، اجودھیا کے مسئلہ میں تین فریق ہیں۔ مسلمان، ہندو اور حکومت۔ مذکورہ فارمولے میں ان تینوں کو لیا گیا ہے۔ تینوں سے ایسی مانگ کی گئی ہے جو پوری طرح ان کے لیے قابل عمل ہے۔ اگر تینوں فریق، اس فارمولے کو مان لیں تو اس کے بعد انشاء اللہ انڈیا کی تاریخ

میں ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ ملک امن قائم ہو گا۔ خوف اور تشدد کی فضا ختم ہو جائے گی جو دیش کی ترقی کے راستہ میں مت رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ مسجد اور مسلمان کا فرق ہے۔ یہ دونوں چ ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ان میں نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ مسجد کا حکم شر میں کیا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مسجد سے متعلق مسلمانوں کے رویہ کے بارہ میں شرعی حکم کیا ایک مسئلہ کا تعلق مسجد کی اپنی حیثیت سے ہے۔ دوسرے مسئلہ کا تعلق مسجد کے بارہ میں مسلما کی ذمہ داری سے۔

یہ دونوں باتیں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ شریعت کے ا سے جو مسجد کی پوزیشن ہے وہی اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری بھی ہے۔ یا مسلمانوں ذمہ داری ہے وہی خود مسجد کی اپنی پوزیشن بھی ہے۔

فرق کے اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعث ہوئی تو کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں جو آیت اتری وہ یہ نہیں کہ طہر الکعبۃ من الاصنام (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو) بلکہ یہ کہا گیا کہ وثیابک فطہر (ا کپڑے کو پاک کر۔ یعنی اخلاق کو درست کرو) مکی دور میں اسی قسم کی آیتیں اترتی رہیں۔

ان آیتوں کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے ان کا تعلق صرف اس مسئلہ سے تھا کہ جیسے حالات میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے۔

اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے اب بابری مسجد کے معاملہ میں غور کیجئے۔ جہاں تک نفس کا تعلق ہے، اس کے بارہ میں متفقہ طور پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ جس جگہ جائز طور پر ایک مسجد بن جائے وہ جگہ ہمیشہ کے لیے مسجد کی جگہ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں رہتا

دوسرا پہلو یہ کہ کسی مسجد کے ساتھ اگر اس قسم کے واقعات پیش آئیں جیسے واقعات اجود میں پیش آئے ہیں تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے۔ ایسے معاملہ میں ایک صو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کی طرح مسلمان یہ کہہ کر اس سے اگ

ہو جائیں کہ مسجد خدا کی چیز ہے، وہی جس طرح چاہے گا اس کی حفاظت کرے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان خاموش نہ رہیں بلکہ وہ مسجد کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو ان کے اس عمل کی بھی ایک حد ہوگی۔ ایک حد تک جانے کے بعد انھیں دوبارہ اس معاملہ میں چپ ہوجانا پڑے گا۔ یہ حد قرآن کی اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ: لا یکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعھا (البقرہ ۲۸۶) اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ یعنی کسی مومن فرد یا کسی مومن گروہ کے بس میں جتنا کچھ ہو، صرف اتنے ہی کے لیے وہ مکلف ہے۔ اپنے بس سے باہر کی ذمہ داری کسی مسلم فرد یا کسی مسلم گروہ کے اوپر نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کا حکم بتانے کے لیے تو یہ کہنا صحیح ہے کہ مسجد جس جگہ جائز طور پر بنا دی جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہو جاتی ہے۔ مگر مسجد کے تئیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جب سوال یہ ہو کہ کسی مسجد کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے تو وہاں مذکورہ مسئلہ بیان کرنا اصل سوال کا صحیح جواب نہ ہوگا۔ اس دوسری صورت میں مسلمانوں کی اپنی حالت ان کے لیے شرعی حکم کا فیصلہ کرے گی نہ کہ نظری اعتبار سے مسجد کی شرعی حیثیت۔

اس شرعی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بابری مسجد اور مسلمان کے مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب اس معاملہ میں مسلمانوں کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر ان کے اوپر بابری مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری تھی تو اس ذمہ داری کو وہ قربانی کی حد تک جا کر ادا کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بابری مسجد کو بچانا چاہا مگر وہ اس کو نہ بچا سکے۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری کی آخری حد آچکی ہے۔ اب وہ شریعت کی رو سے بالکل حق بجانب ہیں کہ اس معاملہ سے اپنے آپ کو الگ کر کے اس کو مستقبل کے حالات کے حوالے کر دیں۔

۶ دسمبر کے حادثہ کے بعد اس معاملہ میں نوعی اور بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اب مسئلہ بابری مسجد کے تحفظ کا نہیں ہے۔ اب اصل مسئلہ خود مسلمانانِ ہند کے تحفظ کا ہے۔ اب اگر مسلمان اپنی اس احتجاجی تحریک کو مزید جاری رکھیں جو اس اشو پر وہ ۶ دسمبر سے پہلے چلا رہے

تھے تو یقینی طور پر اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلے گا کہ مذکورہ مقام پر دوبارہ بابری مسجد بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس عملاً جو نتیجہ نکلے گا وہ یہ کہ مسلمان پورے ملک میں فسادات کی زد میں آجائیں گے۔ وہ بے شمار ایسی مشکلوں میں گھر جائیں گے کہ اس ملک میں عزت کے ساتھ رہنا ہی ان کے لیے دشوار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۶ دسمبر کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں اب مسلمانوں کے لیے جو انتخاب ہے وہ بابری مسجد بنانے یا بابری مسجد نہ بنانے کے درمیان نہیں ہے، بلکہ بابری مسجد اور ملت کی تباہی کے درمیان ہے۔ یعنی مسلمان اگر دوبارہ اسی مقام پر بابری مسجد تعمیر کرنے کی مہم چلائیں تو اس کے نتیجہ میں یہ نہیں ہونے والا ہے کہ بابری مسجد اپنے اصل مقام پر بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس جو ہوگا وہ یہ کہ انڈیا کے مسلمان ناقابلِ بیان تباہی میں پھنس کر رہ جائیں۔

یہاں میں آپ کو ایک اور شرعی حکم یاد دلاتا ہوں جو بہت زیادہ اس مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس حکم کو قرآن کی زبان میں اضطرار کہا جاتا ہے۔ مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا اسلام میں مطلق حرام ہے۔ لیکن ایک شخص اگر مضطر ہو جائے۔ یعنی وہ ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جائے کہ اس کے پاس کھانے کے لیے صرف خنزیر کا گوشت ہو۔ اس کے لیے دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا موقع ہو۔ یا تو وہ خنزیر کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے یا پھر بھوک سے مر جائے۔ ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی کو خنزیر کا گوشت کھا لینا چاہیے۔ کیوں کہ جان بوجھ کر اپنے کو ہلاک کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آج یہی نازک مسئلہ انڈیا کے پورے مسلم گروہ کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ پھر جو شریعت ایک جان کو بچانے کے لیے حرام غذا کو حلال کر دیتی ہے، وہ شریعت کیا بارہ کروڑ انسانوں کے ایک مسلم گروہ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے انھیں کوئی رعایت نہ دے گی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ بابری مسجد کو بچانا مسلمانوں کی قومی ذمہ داری تھی، تب بھی موجودہ حالت میں یہ ذمہ داری ان سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اب خود شریعت کے حکم اضطرار کے تحت

ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ سے الگ ہو جائیں تاکہ اپنے آپ کو مزید ذلت اور ہلاکت سے بچا سکیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ما خُیِّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے)

اس حدیث کو سامنے رکھ کر سوچئے تو اس وقت مسلمانوں کے لیے دو میں سے ایک چیز کے انتخاب کا موقع ہے۔ ایک یہ کہ بابری مسجد کے اشو سے خود کو الگ کر کے اس کو ملک کے ضمیر کے حوالے کر دیں۔ دوسرے یہ کہ بابری مسجد کے لیے وہ اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ دونوں صورتوں کا تقابل کیجئے تو یقینی طور پر پہلی صورت آسان اور دوسری صورت انتہائی مشکل ہے۔ ایسی حالت میں عین سنتِ رسول کا تقاضا ہے کہ مسلمان آسان صورت کو اپنا لیں اور مشکل صورت کو چھوڑ دیں۔

اس روش کو اختیار کر کے مسلمان کوئی نئی بات نہیں کریں گے۔ وہ وہی کریں گے جس پر وہ تقریباً پچاس سال سے اس ملک میں عمل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، ۱۹۴۷ میں پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مختلف طریقوں سے ان کی بے حرمتی کی گئی۔ مگر مسلمانوں نے کبھی بھی ان مسجدوں کے نام پر کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں انھوں نے اپنے کو مضطر پایا تھا۔ اب اگر وہ بابری مسجد کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیں تو یہ عین وہی ہوگا جس پر اس سے پہلے سے وہ عملاً قائم رہے ہیں۔

میں نے جو تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے وہ باعتبار حقیقت کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ اجودھیا کی مسجد کے معاملہ میں اسی اصول کو باعزت طور پر لاگو کرنا ہے جو عملاً ملک کی ہزاروں مسجدوں کے بارہ میں تمام علماء کی مرضی سے اختیار کیا جا چکا ہے۔

اس تین نکاتی فارمولے میں ایک طرف مسلمان مزید جان و مال کی ہلاکت سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فریق ثانی اس کے ذریعہ اس بات کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اجودھیا جیسے عمل کو ملک کی کسی اور مسجد کے ساتھ کبھی نہ دہرائے۔ تیسرے یہ کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اپنی

عبادت گاہوں کے لیے ایک محکم دستوری ضمانت مل جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا، اس فارمولے کا مقصد مسجد کے بارہ میں شرعی حکم کو بتانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی ذات کے اعتبار سے اس معاملہ میں ان کے لیے شریعت کا حکم کیا ہے۔

اس فارمولے کو مان کر اگر اس کی تعمیل کر دی جائے تو اس کا غیر معمولی فائدہ مسلمانوں کو اور پورے ملک کو ملے گا۔ اس کے بعد ملک میں امن قائم ہو جائے گا۔ نفرت اور تشدد کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح مسلمانوں کو اور دوسرے تمام طبقوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر میں پُر امن طور پر لگ سکیں۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر ترقی اور کامیابی کی طرف اپنا سفر شروع کر دیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب پر اپنا رحم فرمائے۔ اس ملک کے تمام لوگوں کو سچی سمجھ دے تاکہ وہ اس ملک کو ایک ترقی یافتہ ملک بنا سکیں۔

نوٹ : ایک تقریر جو ۱۵ فروری ۱۹۹۲ کو دہلی میں کی گئی۔

اجودھیا کا مسئلہ

نئی دہلی کے ادارہ مرکز برائے پالیسی ریسرچ : (Centre for Policy Research) کے ہال میں ۵ مارچ ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ملک کے ممتاز دانشور تقریباً چالیس کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کا موضوع اجودھیا اور اس کے بعد مسائل پر مذاکرہ کرنا تھا۔ اظہار خیال کی زبان انگریزی تھی۔ ذیل کی تقریر اسی موقع پر پیش کی گئی۔

آج کی اس میٹنگ کے لیے بحث کا موضوع اجودھیا اور اس کے بعد ہے۔ اس بحث کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ میں خاص طور پر اس پہلو پر کچھ باتیں عرض کروں گا کہ اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا واقعہ پیش آنے کے بعد انڈیا میں سیکولرزم کا مستقبل کیا ہے۔

کچھ لوگ اس بارہ میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ مگر میں ذاتی طور پر اس بارہ میں پُرامید ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ۶ دسمبر کے حادثہ نے اس ملک میں سیکولرزم کی اہمیت کو از سرِ نو ثابت شدہ بنایا ہے۔ وہ ملک کے سیکولر عناصر کو یہ موقع دے رہا ہے کہ وہ یہاں سیکولرزم کو مزید قوت کے ساتھ قائم کر سکیں۔

۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو واقعہ پیش آیا وہ تشدد کا واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر۔ مسجد تحریک کے علم برداروں نے محسوس کیا کہ وہ پُرامن طور پر اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ تشدد پر آمادہ ہو گئے۔

مگر تشدد کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الٹا نتیجہ دینے والا (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ تشدد کرنے والا اپنے خیال کے مطابق، اپنے حریف کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے لحاظ سے تشدد خود صاحب تشدد کی نفی ہے۔ تشدد صاحب تشدد کی نظریاتی صداقت کی تردید ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر دراصل اس دن کی علامت ہے جب کہ مندر۔ مسجد تحریک اپنے آخری منطقی انجام کو پہنچ گئی۔

اس واقعہ کے بعد سیکولرزم کی اہمیت از سرِ نو ثابت ہو گئی ہے۔ سیکولرزم کیا ہے۔ سیکولرزم کا

مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ اسٹیٹ کا نظام مشترک مادی مقاصد کی بنیاد پر چلایا جائے۔ اور غیر مشترک امور میں ریاست عدم تدخل (non-interference) کی پالیسی اختیار کرے۔

انڈیا ایک پلورل سوسائٹی ہے۔ اس لیے انڈیا کے لیے سیکولرزم ہی واحد درست آئیڈیالوجی ہے۔ اس ملک میں سیکولر آئیڈیالوجی ہی نیشنل آئیڈیالوجی بن سکتی ہے۔ دوسری جو آئیڈیالوجی اختیار کی جائے گی وہ ریجنل آئیڈیالوجی یا سیکیٹیرین آئیڈیالوجی ہوگی۔ اور ایسی کوئی آئیڈیالوجی کبھی عمومی سطح پر قابل قبول نہیں بن سکتی۔

سیکولر آئیڈیالوجی کے سوا جو آئیڈیالوجی بھی اختیار کی جائے گی وہ اپنی عین نیچر کے اعتبار سے اسی متشددانہ نوبت تک پہنچے گی جس کی ایک مثال ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو سامنے آئی ہے۔ تشدد کا مقصد موقف کی کمزوری کی تلافی ہوتا ہے۔ اصولی تائید کی کمی کو آدمی طاقت کے ذریعہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اس سے تشدد ظہور میں آتا ہے۔

۶ دسمبر نے یہ ثابت کیا ہے کہ سیکولر آئیڈیالوجی کے سوا جو آئیڈیالوجی بھی یہاں اپنائی جائے گی وہ اپنی محدود اپیل کی بنا پر آخر کار تشدد کا سہارا لے گی۔ اس طرح وہ باعتبار نتیجہ دیش کی شانتی کو بھنگ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ صرف سیکولر آئیڈیالوجی ہے جو اپنی وسیع اپیل کی بنا پر دیش میں شانتی کا سماج بنا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جنھوں نے ۶ دسمبر سے پہلے مندر۔مسجد تحریک کا ساتھ دیا تھا، وہ اس کا نتیجہ دیکھ لینے کے بعد اب اس سے برارت ظاہر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بنارس کے بیوپار منڈل اور لکھنؤ کے بیوپار منڈل نے پرزور طور پر کہا ہے کہ مذہب اور عقیدہ کے معاملہ کو سیاست سے باہر رکھنا چاہیے، حالانکہ اس سے پہلے یہ لوگ اس تحریک کے مددگار بنے ہوئے تھے۔

سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ انڈیا یا تو سیکولر انڈیا کے طور پر باقی رہے گا یا وہ سرے سے باقی ہی نہ رہے گا:

India will survive as a secular India or not at all.

یہی بات موجودہ وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے ان لفظوں میں کہی کہ ہمارا

ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اگر ہم نے سیکولرزم کا راستہ چھوڑ دیا :

The country will go to pieces if we leave the path of secularism.

یہ بات بالکل درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں صرف سیکولر آئیڈیالوجی ہی نیشنل آئیڈیالوجی بن سکتی ہے۔ دوسری ہر آئیڈیالوجی محدود آئیڈیالوجی ہوگی۔ اور کوئی محدود آئیڈیالوجی کبھی نیشنل آئیڈیالوجی کا بدل نہیں بن سکتی۔

انڈیا میں اگرچہ ۷۵ فی صد لوگ سیکولر آئیڈیالوجی میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر کے واقعہ نے جو ذہنی انتشار پیدا کیا ہے اس کے بعد تمام لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں گویا کہ وہ کسی بند گلی میں آکر پھنس گئے ہیں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

میرا تین نکاتی فارمولا قوم کو اسی بند گلی سے نکالنے کی ایک کوشش ہے۔ تین نکاتی فارمولا خود کوئی منزل نہیں ہے البتہ وہ موجودہ بند گلی سے نکلنے کی طرف ایک واضح اور متعین آغاز ہے۔ اس فارمولے کو مان لینے کے بعد پھر سے ہمارے لیے وہ راستہ کھل جاتا ہے جس کی روشنی میں ہم دوبارہ تعمیر و ترقی کی طرف اپنا سفر جاری کر سکیں۔ یہ فارمولا مختصر طور پر یہ ہے :

- مسلمان بابری مسجد کے بارہ میں اپنا ایجی ٹیشن مکمل طور پر ختم کر دیں۔
- ہندو اپنے مندر۔ مسجد اندولن کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔
- گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ ایکٹ ۱۹۹۱ کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔

یہ تین نکاتی فارمولا اعتراف حقیقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اب ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے انتخاب اِس اسٹرکچر اور اُس اسٹرکچر میں نہیں رہ گیا ہے، بلکہ اسٹرکچر اور تباہی میں رہ گیا ہے۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہی تاریخ میں تبدیلی کا ذہن ترک کر دیں اور اس معاملہ میں ہمیشہ کے لیے حالت موجودہ (status quo) کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔

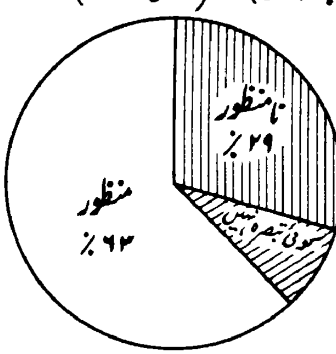
عبادت گاہوں کا تحفظ ایکٹ ۱۹۹۱ عین اسی اصول پر بنایا گیا تھا۔ فارمولا یہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ اس ایکٹ کے مدعا کو دستور ہند میں بنیادی شہری حقوق کی حیثیت سے شامل کر دے تاکہ وہ اس معاملہ میں طرفین کے لیے زیادہ پائدار قانونی ضمانت بن جائے۔

مذکورہ تین نکاتی فارمولے پر بمبئی کے انگریزی روزنامہ مڈ ڈے نے مارگ (MARG) نامی ایجنسی سے ایک سروے کرایا۔ اس سروے کی مفصل رپورٹ مڈ ڈے (۲ فروری ۱۹۹۳) اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ روزنامہ انقلاب (۲ فروری ۱۹۹۳) میں شائع شدہ رپورٹ کے کچھ حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

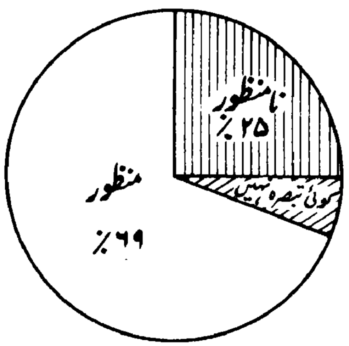
"مولانا وحید الدین خاں نے گزشتہ ہفتہ مسئلہ اجودھیا کو حل کرنے اور ملک میں فرقہ وارانہ تناؤ کو کم کرنے کے سلسلہ میں جو سہ نکاتی منصوبہ پیش کیا ہے اسے بمبئی میں رہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی اکثریت قابل قبول سمجھتی ہے۔ سنڈے انقلاب کے لیے یہ سروے مارگ نامی ایجنسی نے کیا ہے جو عوامی موڈ کا صحیح اندازہ لگانے میں خاصی مشہور ہے۔ اس رائے شماری پروگرام کے تحت ۵۱۷ ہندو مردوں اور عورتوں سے انٹرویو لیا گیا۔ ان میں سے ۶۹ فیصد نے اس منصوبہ کو منظور اور ۲۵ فیصد نے نامنظور کیا۔

۱۷۰ مسلم خواتین اور مردوں میں سے ۶۲ فیصد نے منصوبہ کے حق میں اور ۲۹ فیصد نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیے۔ جو لوگ واضح طور پر مولانا وحید الدین خاں کے منصوبہ کے حق میں نہیں ہیں انھوں نے بھی یہ پوچھے جانے پر کہ کیا یہ فارمولا آپسی بات چیت کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے "ہاں" میں جواب دیا۔ اس طرح انٹرویو کیے جانے والے افراد میں سے صرف ۵ فی صد ایسے تھے جنھوں نے مولانا کی تجویز کو سرے سے نامنظور کر دیا۔"

(انقلاب (بمبئی) ۷ فروری ۱۹۹۳)



مسلمان : ۱۰۰ فیصد



ہندو : ۱۰۰ فیصد

اس کے علاوہ مختلف مقامات سے ہمیں اطلاعات مل رہی ہیں کہ لوگ بڑی تعداد میں اس فارمولے سے اتفاق کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک خط یہ ہے : یہ اصل خط ہندی میں ہے۔ یہاں اس کو اردو رسم خط میں نقل کیا جاتا ہے :

"بعد سلام کے آپ کی نئی زمین سمواد داتا سے بات چیت "نئی زمین" ۲۱ فروری سے ۲۷ فروری ۱۹۹۲ اخبار میں پڑھی۔ آپ کے تین سوتری فارمولا کے بارے میں جانکاری ملی۔ میں اس کا سمرتھن کرتا ہوں۔ یہاں ناگدا میں میں نے ناگدا کی جنتا سے موکھک سروے کیا۔ الگ بھگ سبھی لوگوں نے سمرتھن کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تین سوتری فارمولے پر ہستا کچھر ابھیان دیش بھر میں کرائیں۔ جس سے لوگوں کی رائے کا پتہ چلے۔ اگر آپ ہستا کچھر ابھیان شروع کر چکے ہیں تو ہمیں بھی جانکاری دیویں کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ آج دیش بھر میں جو سماپردائک اُنماد پھیل رہا ہے اس میں آپ کا فارمولا جیون رکشک گھول کا کام کرے گا" (۲۶-۲-۱۹۹۲)

شجاع الدین اگوان - پترکار - ۱۰۱ جنم جے مارگ - ناگدا ۴۵۶۳۳۵

مسٹر کلدیپ نائر کا ایک مضمون ناگپور کے انگریزی روزنامہ ہیتاوادا (The Hitavada) کے شمارہ ۱۷ مارچ ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے، یہ مضمون اجودھیا کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ پچھلے دو مہینوں میں میں پورے ملک میں گھوما ہوں، اور میں اس تاثر کے ساتھ واپس آیا ہوں کہ مسلمان اس کے لیے راضی ہو جائیں گے کہ وہ بابری مسجد سے اپنا دعویٰ واپس لے لیں، بشرطیکہ اس کے بعد کسی اور مذہبی عمارت کے لیے مزید مانگ نہ کی جائے :

I have gone round the country in the last two months and I have come back with the impression that the Muslims may be willing to withdraw their claim on the Babri Masjid provided there are no further demands on other religous buildings. (p.8).

اجودھیا اور اس کے بعد

اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ آج پوری ملت اسلامیہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس مسجد کے ڈھانچہ میں پتھروں کی جتنی تعداد ہوگی، اس سے بھی زیادہ تعداد میں مسلمان ملک کے مختلف حصوں میں اب تک مارے جا چکے ہیں۔ اور ہلاکت اور رسوائی کا یہ سلسلہ بظاہر لامتناہی طور پر جاری ہے۔

یہ مسجد بابر کے گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں تعمیر کی تھی۔ بعد کو اس کے سلسلہ میں کچھ نزاع پیدا ہوئی۔ تاہم ابتداءً اس کی حیثیت ایک معمولی مقامی مسئلہ کی تھی۔ آزادی کے بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ کی رات کو کچھ مقامی ہندوؤں نے مسجد کے اندر تین مورتیاں رکھ دیں۔ لیکن اب بھی اس نے خطرناک مسئلہ کی صورت اختیار نہیں کی۔ کیوں کہ عدالت کے حکم سے جلد ہی مسجد کے دروازہ پر تالا لگا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد یکم فروری ۱۹۸۶ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ انتظامی ذمہ داروں نے مسجد کا تالا کھول دیا اور مقامی ہندوؤں کو مورتیوں کے درشن اور پوجا کے لیے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں سے مسئلہ نے نیا رخ اختیار کر لیا۔

اب کچھ مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کے نام پر دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔ دوسری طرف کچھ ہندو لیڈروں نے رام مندر کا اشو لے کر شدید تر انداز میں اپنا اندولن جاری کر دیا۔ دونوں طرف سے یہ تحریکیں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو یہ حادثہ پیش آیا کہ ہندو انتہا پسند بڑی تعداد میں اجودھیا میں جمع ہوئے۔ اور انھوں نے بابری مسجد کو ڈھا کر مکمل طور پر اسے ختم کر دیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر بنا دیا۔

اس واقعہ کے بعد پورے ملک کا ضمیر چیخ اٹھا ہے۔ ملک کے تمام باشعور لوگوں نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ بابری مسجد کو اس طرح ڈھانا دستور، قانون، عدالتی فیصلہ، مذہبی اور اخلاقی روایات، نیز خود رام مندر تحریک کے لیڈروں کے اپنے اعلانات کے خلاف تھا۔ اس لیے وہ سادہ طور پر ایک عمارت کو ڈھانے کا واقعہ نہ رہا، بلکہ وہ پوری ایک تاریخ کو ڈھانے کا واقعہ بن گیا۔

یہی وجہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینیر لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے ۶ دسمبر کے واقعہ کو ایک قومی المیہ (national tragedy) قرار دیا ہے۔ مسٹر جے ایس یادو (ہندستان ٹائمس ۲ جنوری ۱۹۹۳) کے الفاظ میں، اب خود ملک کا وجود و بقا داؤ پر لگا ہوا ہے:

The very survival of our nation is at stake.

غیر گاندھیائی طریقہ

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۱ میں انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی (civil disobedience) کی تحریک چلائی۔ ان کا اعلان تھا کہ یہ تحریک مکمل طور پر اہنسا کے اصول پر چلے گی۔ اس کے دوران کسی کے خلاف کسی بھی قسم کا تشدد نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ۵ فروری کو کانگریس کمیٹی کے لوگوں نے چورا چوری میں وہاں کے تھانہ کو آگ لگادی۔ اس میں کچھ کانسٹبل جل کر مر گئے۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس واقعہ کو ہمالیائی غلطی (Himalayan blunder) بتایا اور فوراً تحریک کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں سخت تر انداز میں تشدد کا واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس تحریک کے لیڈروں نے اپنی مندر۔مسجد تحریک کے خاتمہ کا اعلان نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان کے انتہا پسند عناصر بلا روک یہ کہہ رہے ہیں کہ: اجودھیا تو جھانکی ہے، متھرا کاشی باقی ہے۔

یہ بلاشبہ قوم کے باپو مہاتما گاندھی کے مسلمہ طریقہ کے خلاف ہے۔ اور یہ غیر گاندھیائی طریقہ دیش کو کامل تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ اجودھیا کی غلطی کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ اب اس قسم کی بولی بولنا مکمل طور پر بند کیا جائے۔ اور یہ عہد کیا جائے کہ اس قسم کا عمل اب کہیں اور کبھی ہرگز نہیں دہرایا جائے گا۔

متھرا کی مسجد

متھرا میں ایک بڑی مسجد ہے۔ اس کو اورنگ زیب نے ۱۶۶۹ء میں بنوایا تھا۔ عام طور پر یہ پروپگنڈا کیا گیا ہے کہ یہ مسجد شری کرشن کے جنم استھان پر بنائی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو توڑ کر وہاں شری کرشن کا مندر تعمیر کیا جائے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے میں خود ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کو دہلی سے متھرا گیا۔ وہاں میں نے کئی

ہندو دوستوں کے ساتھ اس کو مکمل طور پر دیکھا۔ متھرا کے کچھ واقف کار ہندوؤں اور مسلمانوں سے اس کے بارہ میں گفت گو بھی کی۔

میں نے دیکھا کہ وہاں ایک طرف ایک خوب صورت مسجد ہے۔ اگرچہ اس کا راستہ زیادہ اچھا نہیں۔ دوسری طرف مندر کا وسیع اور عظیم کامپلکس ہے جس کو شری کرشن کا جنم استھان کہا جاتا ہے۔ اجودھیا کے تجربہ کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ شری کرشن کا جنم استھان غالباً کسی متنازعہ زمین پر مسجد کے اندرونی حصہ میں واقع ہے۔ اور اسی لیے اس کی مانگ کی جارہی ہے۔ مگر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

ہم لوگ مندر کے مختلف حصوں کو دیکھتے ہوئے ایک خاص کمرہ میں پہنچے۔ یہاں ایک سجائے ہوئے چبوترہ پر شری کرشن کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی دوسری متعلق چیزیں آس پاس موجود تھیں۔ بتایا گیا کہ یہی وہ خاص مقام ہے جہاں شری کرشن نے جنم لیا تھا۔ یہ جگہ پوری طرح مندر کے احاطہ میں تھی۔ چنانچہ اس کو دیکھ کر ایک ہندو بھائی نے کہا : متھرا کو اجودھیا کی کیٹگری میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیوں کہ کرشن کا جنم استھان تو مندر کے اندر ہے، وہ مسجد میں شامل نہیں۔

کوئی بھی شخص متھرا جا کر اس واقعہ کو دیکھ سکتا ہے۔ جب شری کرشن کے جنم کی جگہ عملاً مندر کے احاطہ میں ہے تو اس کے لیے مسجد کی مانگ کیوں کی جاتی ہے جو اس سے باہر الگ زمین پر واقع ہے۔ اگر اجودھیا کی مسجد کے خلاف تحریک کا جواز یہ تھا کہ وہ شری رام کے جنم کی جگہ پر بنی ہے تو متھرا کی مسجد کی مانگ کا جواز کیا ہوگا جو واضح طور پر شری کرشن کے جنم استھان سے باہر بنائی گئی ہے۔

مزید یہ کہ متھرا کے مسئلہ میں مبینہ طور پر مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقریباً چالیس سال پہلے ایک راضی نامہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر نزاع ہوئی۔ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ آخر کار ۱۹۶۸ میں متھرا کے کئی بزرگوں کی کوشش سے، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، دونوں فریقوں کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کے مطابق، مسلمانوں نے مسجد کے پاس کی موقوفہ زمین کا بڑا حصہ ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔ اس زمین پر شری کرشن مندر کا بہت بڑا کامپلکس تعمیر کیا جا چکا ہے۔ ایسی حالت میں ایک طے شدہ معاملہ کو دوبارہ اٹھانے کے لیے اس کے دعوے داروں کے پاس کیا جواز ہے۔

ایک رپورٹ

اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں کئی معلوماتی رپورٹیں چھپ چکی ہیں۔ انھیں میں سے ایک رپورٹ مدراس کے انگریزی میگزین فرنٹ لائن (Frontline) کی ہے۔ یہ اس کے شمارہ ۲۹ جنوری ۱۹۹۲ کی کور اسٹوری ہے جس کا عنوان ہے کیسری انتہاپسند (Saffron Extremism) میگزین کے رپورٹر وِنکٹیش راماکرشنن (Venkitesh Ramakrishan) نے متھرا جاکر وہاں جو براہ راست معلومات حاصل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں کرشن جنم استھان ٹرسٹ اور عیدگاہ مسجد ٹرسٹ کے درمیان عرصہ سے مقدمات جاری تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۸ میں دونوں فریقوں نے باہمی رضامندی سے ایک تحریری معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی تکمیل میں کئی مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہاتھ تھا۔ مثلاً دیودھر شاستری وغیرہ۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششیں بھی اس میں شامل رہی ہیں۔

اس معاہدہ کے مطابق، دونوں کی زمینی حدبندی کردی گئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ مسجد اور مندر دونوں آس پاس قائم رہیں گے۔ رپورٹر نے اس سلسلہ میں مختلف مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں، رپورٹ کے مطابق، ہندوؤں کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ یہاں کوئی نزاع نہیں۔ عام ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ہر بات طے ہو چکی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی، ہر ایک کو اجازت ہے کہ وہ یہاں آئے اور اپنی عبادت کرے۔ ہم کیوں لوگوں کو الگ کرنے کرنے کی کوشش کریں اور نئے مسائل پیدا کریں۔ بابو لال شلپی، جو کہ کرشن جنم بھومی کی تعمیرات میں شریک رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ وہ عیدگاہ مسجد کو ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہر بات ۱۹۶۸ میں طے ہوگئی تھی۔ گربھ گریہہ ہم کو مل چکا ہے۔ عیدگاہ مسجد کو ہٹانے کی یہ تمام باتیں صرف سیاست ہیں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں :

And a majority of Hindus believe that there is no dispute. "Everything has been settled. Everybody, Hindus, Christians, Sikhs and Muslims, is permitted entry and the right to worship. Why should we try to segregate and create new problems?" is thegeneral response. Babulal Shilpi, who has been involved in the construction of the various shrines at Krishna janamabhoomi, said he did not see the need to displace the idgah (masjid). "Everything was settled in 1968. We have got the garbha griha (santum sanctorum). All this talk about displacing the idgah (masjid) is politics. I have no concern for that (p.17).

بنارس کی مسجد

اب بنارس (کاشی) کے معاملہ کو لیجئے۔ مندر ۔مسجد تحریک کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ وہاں گیان واپی کے نام سے جو مسجد ہے، اس کو اورنگ زیب نے ایک مندر کو توڑ کر بنایا تھا۔ اس لیے اب ہم اس کو ختم کریں گے اور اس کی جگہ پر دوبارہ ایک مندر کی تعمیر کریں گے۔ اپنے اس منصوبہ کو وہ لوگ "تاریخ کی تصحیح" کا نام دیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ بنارس کی مذکورہ مسجد کے بارہ میں یہ دعوی صحیح ہے یا غلط، تاریخ کی تصحیح کا یہ نظریہ آج عالمی سطح پر رد کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظریہ درحقیقت مذہبی تعذیب (religious persecution) کے اس دور کو نئے نام کے ساتھ واپس لانا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں صرف دور وحشت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فنائزم ہے نہ کہ فی الواقع تاریخ کی تصحیح۔

ناگپور کے ایک بودھ دانشور ڈاکٹر ویمل کیرتی (Dr. Vimal Kirti) نے بجا طور پر کہا ہے کہ جو ہندو صاحبان آج تاریخ کی تصحیح کی بات کرتے ہیں، کیا وہ اپنے اس نظریہ کو تاریخ میں اور پیچھے تک لے جائیں گے۔ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ خود ان کے ساتھ بھی وہی کیا جائے جو وہ دوسروں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ہندو صاحبان جس چیز کا الزام اورنگ زیب کو دے رہے ہیں، وہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر خود انھوں نے بھی انڈیا کے بودھوں کے ساتھ کیا تھا۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ چھٹی صدی عیسوی اور ساتویں صدی عیسوی میں بھارت کے برہمنوں نے اس وقت کے راجاؤں کی مدد سے بدھوں کے خلاف سخت تعذیبی اقدامات کیے۔ انھوں نے بہت سے بودھ عبادت خانے توڑ ڈالے اور ان کی جگہ ہندو مندر بنا دیا :

From time to time Hindus, especially Saivites, took aggressive action against Buddhism. At least two Saivite kings - the Huna invader Mihirakula (early 6th century) and the Bengal King Sasanka (early 7th century) - are reported to have been active persecutors, destroying monasteries and killing monks (8/914).

عبادت خانوں کو توڑنے کے واقعات اس گزرے ہوئے زمانہ میں پیش آئے جب کہ

یا میں مذہبی تعذیب (religious persecution) کا عام رواج تھا۔ اب وہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی بات کرنا ایک سنگین قسم کی خلافِ زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ اس تحریک کے علم برداروں کو جاننا چاہیے کہ یہاں زمانی عامل (age-factor) ان کی راہ میں حائل ہے۔ جو لوگ ایسا کام کرنے کے لیے اٹھیں، ان کو زمانہ ہمیشہ رد کر دیتا ہے۔ دنیا ان کو رجعت پسند قرار دے کر انھیں پیچھے کی صف میں دھکیل دیتی ہے۔

اس انجام سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ باہر کی دنیا میں صفائی پیش کرنے والے وفود بھیجے جائیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ ایسا کام ہی نہ کیا جائے جو زمانہ کے مسلّمہ معیار کے خلاف ہو۔ جو زمانہ کی نظر میں اپنے آپ کو حقیر بنا دینے والا ہو۔

قدیم زمانہ میں مذکورہ قسم کے واقعات ہر جگہ پیش آئے ہیں۔ اس لیے اگر تصحیح تاریخ کے اس اصول کو اختیار کیا جائے تو وہ کسی ایک گروہ پر نہیں رکے گا بلکہ وہ ہر گروہ تک جا پہنچے گا۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوگی وہ تاریخ کی تصحیح نہیں ہوگی بلکہ صرف تاریخ کی تخریب ہوگی۔ یہ ماضی کو لینے کے نام پر حال کو کھو دینا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے علم برداروں کے لیے یہاں انتخاب دوبارہ مسجد اور تصحیح تاریخ میں نہیں ہے، بلکہ مسجد اور مکمل تباہی میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عالمی طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ اس طرح کے نزاعی معاملات میں ماضی کے بند ابواب کو نہ کھولا جائے۔ بلکہ حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے مثبت طور پر قومی تعمیر کا کام جاری رکھا جائے۔

فرنٹ لائن کا جائزہ

ہفت روزہ فرنٹ لائن کے رپورٹر وینکٹیش راما کرشنن نے بنارس جا کر اس معاملہ کی تحقیق کی ہے۔ فرنٹ لائن کے شمارہ (۲۹ جنوری ۱۹۹۲) میں اس کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اجودھیا کی طرح متھرا اور بنارس میں بھی جھگڑے کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ صرف افسانہ پر مبنی ہے:

As at Ayodhya, the “disputes” at Mathura and Varanasi have their basis in myths (p.12).

انھوں نے لکھا ہے کہ ہندتو کے علم بردار یہ کہتے ہیں کہ گیان واپی مسجد جو کہ کاشی وشوناتھ مندر کے پاس ہے، اس کو ایک مندر کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔ مگر اس دعوے کے حق میں ان کے پاس کوئی واضح ثبوت (clear proof) موجود نہیں۔ حتی کہ اس سلسلہ میں مہنت لوگوں کے بیانات بھی یکساں نہیں۔ مختلف مہنت مختلف بات کہتے ہیں۔ مثلاً پنڈت رام شنکر ترپاٹھی کہتے ہیں کہ اصل مندر رضیہ بیگم کی مسجد کی جگہ تھا۔ جو کہ گیان واپی مسجد سے دو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پنڈت کیلاش پتی تیواری گیان واپی مسجد ہی کو قدیم مندر کا اصل مقام بتاتے ہیں، مگر ان کے پاس اس کا کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں۔ کچھ اور مہنت یہ کہتے ہیں کہ اصل وشوناتھ مندر وشیشور گنج میں تھا۔ یہ مقام بھی گیان واپی مسجد سے دو کیلومیٹر دور ہے۔ اور بھی کئی رائیں ہیں۔ مگر تاریخی دستاویزات (historical records) کسی کے پاس بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گیان واپی مسجد کی جگہ ایک وشوناتھ مندر تھا۔ اورنگ زیب نے اس کو ڈھا کر ۱۶۶۹ میں یہاں ایک مسجد تعمیر کی لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بنارس کے سنتوں اور پنڈتوں سے اس مغل بادشاہ کے اچھے تعلقات تھے۔ ایسی حالت میں اس نے مندر کو کیوں ڈھایا (صفحہ ۱۴)

مزید یہ کہ موجودہ وشوناتھ مندر کو اندور کی مہارانی اہلیا بائی ہولکر نے ۱۷۷۷ میں بنوایا تھا۔ اس وقت ایک تجویز یہ تھی کہ گیان واپی مسجد کو ڈھا دیا جائے۔ مہارانی نے بنارس کے پنڈتوں سے رائے لی۔ لوک پتی ترپاٹھی کے بیان کے مطابق، پنڈتوں نے اس کی مخالفت کی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک کسی دوسرے فرقہ کی عبادت گاہ کو ڈھا کر وہاں مندر نہیں بنایا جاسکتا۔ چنانچہ یہ تجویز ختم ہوگئی:

The temple was rebuilt by the Maharani of Indore, Ahalya Bai Holkar, in 1777. Then there was a suggestion to demolish the Gyanvapi Mosque, and the Maharani consulted the pandits of Varanasi. According to Lokpati Tripathi, Congress (I) leader, the pandits were against this, for, according to them, a mandir could not be built by demolishing another community's place of worship. this put an end to the move. (14).

اقتصادی نقصان

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو لوگ بابری مسجد کو ڈھا رہے تھے، وہ اپنے خیال کے مطابق، پتھر کے ایک قدیم ڈھانچہ کو ڈھا رہے تھے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے انھوں نے ملک کے پورے اقتصادی ڈھانچہ

کو ڈھا دیا۔ اس سلسلہ میں مختلف رپورٹیں اخباروں میں آتی رہی ہیں۔ مثلاً ۶ دسمبر کے بعد دیش میں جو گڑبڑ ہوئی، اس کی وجہ سے صرف دسمبر ۱۹۹۲ اور جنوری ۱۹۹۳ میں گورنمنٹ کے کسٹم اور اکسائز ڈیوٹی کی وصولیابی میں ۲۵۰۰ کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی۔ فسادات کے نتیجہ میں اکثر بڑے بڑے شہروں میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر جو نقصان ہوا، اس کی مقدار اربوں روپیہ تک جاتی ہے۔ باہر کے انوسٹ منٹ میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی۔ حتیٰ کہ متعدد بیرونی تجارتی ادارے اپنا کاروبار بند کر کے ہندستان سے واپس چلے گئے۔

ٹائمس آف انڈیا (۸ فروری ۱۹۹۳) نے اس سلسلہ میں ایک جامع سروے شائع کیا ہے جس کو اگلے صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق، ملک بھر کا تجارتی طبقہ مندر۔مسجد سیاست سے گھبرا اٹھا ہے۔ کیوں کہ اس کا اقتصادی نقصان ناقابل برداشت حد تک زیادہ ہے۔ صرف بمبئی کے فسادات میں جو نقصان ہوا، اس کا اندازہ تقریباً دو ہزار کروڑ ہے۔ احمد آباد اور سورت میں یہ نقصان تین ہزار کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا۔ یہ مقدار بھی براہ راست نقصان کی ہے۔ بالواسطہ نقصان اس اندازہ میں شامل نہیں۔

جے پور میں فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں دو ہزار کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ راج کوٹ میونسپل کارپوریشن میں ہر روز پانچ لاکھ روپیہ چنگی کی رقم آتی تھی۔ مگر دسمبر میں وہ ۵۰ ہزار روپیہ روزانہ تک گر گئی۔ لکھنؤ کے تاجروں کو اس دوران پانچ سو کروڑ روپیہ کا نقصان پہنچا۔ اترپردیش کے تاجروں کا خیال ہے کہ ریاست کی اقتصادیات دس سال پیچھے چلی گئی ہے۔ وغیرہ۔

ہندو۔ ہندو مسئلہ

اس سلسلہ میں کاشی بیوپار منڈل کا فیصلہ قابل ذکر ہے جو بتاتا ہے کہ اجودھیا کے تجربہ کو بنارس میں دہرانا اپنے اندر ایک سنگین خطرہ لیے ہوئے ہے۔ یہ ہندو مسلم مسئلہ میں مزید اضافہ کر کے اس کو ہندو ہندو مسئلہ بنا دینے کے ہم معنی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ہندوؤں کا تاجر طبقہ مبینہ طور پر اس کے خلاف ہو گیا ہے۔

اس سلسلہ میں مسٹر ویویک بھارتی (Vivek Bharati) کا مضمون (شائع شدہ ٹائمس آف انڈیا ۶ جنوری ۱۹۹۳) اس تحریک کے علم برداروں کے لیے ایک چیتاونی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا

دوسطری عنوان انھوں نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے :

Lessons Of Varanasi
Pitting Economy Against Hindutva

اس مضمون کا ایک حصہ صفحہ کے نیچے درج کیا جارہا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں نے اب جان لیا ہے کہ اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک ایک تخریبی تحریک تھی۔ اس کا ایک مظاہرہ بنارس میں سامنے آیا ہے۔ بنارس میں تقریباً پانچ لاکھ تاجروں کی طاقت ور کمیونیٹی ہے۔ ان کی تنظیم کا نام کاشی بیوپار منڈل ہے۔ اس تنظیم کے ہندو تاجروں نے اس سے پہلے بی جے پی کو کافی مالی تعاون دیا تھا۔

لیکن ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد جب انھیں معلوم ہوا کہ بابری مسجد کے فاتح بنارس کی گیان واپی مسجد کا رخ کرنے والے ہیں تو کاشی بیوپار منڈل فوراً اس کے خلاف حرکت میں آگیا۔ اس نے بنارس کے پانچ لاکھ تاجروں کے نام پُرزور اپیل جاری کی جس میں کہا گیا تھا کہ بنارس کے تمام تاجر مندر اور مسجد کی

As the communal violence unleashed by the Ayodhya tragedy hit the headlines, the numerous instances from all over the country of people from both the communities joining hands to resist the destructive onslaught of communalism were relegated to the background. One such spontaneous mass action preaching peace and sanity in the historic city of Varanasi is particularly noteworthy. Sensing that the "conquerors" of Babri Masjid have a similar design for the Gyanvapi mosque at Varanasi, the city's traders' association, the Kashi Vyapar Mandal, issued a strong appeal to the five-lakh strong trader community comprising both Hindus and Muslims to stay away from the politics of Mandirs and Masjids and followed it up by organizing peace marches. Ironically, the Hindu members of the Vyapar Mandal have supported the BJP in the past and even mobilised donations for the kar sevaks who ran amok at Ayodhya. The issue is not whether these erstwhile supporters of the BJP have suddenly turned secular but that they have found it necessary to maintain peaceful co-existence. If Varanasi goes the Ayodhya way, the traders would be the worst hit as lawlessness and killings would drive away thousands of tourists who flock to this temple city and also kill a flourishing business in carpets and sarees which caters to both the home and export markets. Since both Muslims and Hindus are equally dependent on this commerce, it is plain that economic interests have prevailed over political or communal prejudices. This should send a clear signal that a powerful economic agenda has to be a major plank in the fight against communalism. Over the last two decades India has lost the race of development and its status in the world. A large number of countries which were poorer than us have passed us by and it is not India but China which is emerging as the new economic giant. It is time to spread the message of Varanasi that communalism can only disrupt and destroy and prevent us from seizing the last chance we have of recharging our economic system and retrieving our national pride. It is time to spread the message of Kautilya that "of the three ends of human life, material gain is, verily, the most important." On material gain depends the realization of dharma and pleasure. (*The Times of India*, January 6, 1993)

سیاست سے الگ رہیں۔ اسی کے ساتھ کاشی بیوپار منڈل نے شہر میں شانتی مارچ بھی کیے۔

اس کی وجہ تجارتی نقصان کا اندیشہ ہے۔ بنارس کے تاجروں نے محسوس کیا کہ ان کی تجارت قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اجودھیا جیسی تحریک بنارس میں داخل نہ ہو۔ اگر یہ تحریک بنارس پہنچتی ہے تو اس کے بعد جو لاقانونیت اور دنگا ہوگا اس میں سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ کا ہوگا۔ ایسی حالت میں کاروبار ٹھپ ہوگا اور ان سیاحوں کی آمد رک جائے گی جو ہزاروں کی تعداد میں مسلسل بنارس آتے ہیں اور جن کی وجہ سے بنارس میں قالینوں اور ساڑیوں کا نفع بخش بزنس چل رہا ہے۔ یہی اقتصادی مسئلہ متھرا میں بھی پیش آیا ہے (ملاحظہ ہو فرنٹ لائن، ۲۹ جنوری ۱۹۹۲)

بنارس کے اس تجربہ کو آج پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ دیش کے لوگوں کو بتایا جائے کہ اس قسم کی تحریکیں چلانا گویا نان اشو کو اشو بنانا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں انڈیا ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہو گیا ہے۔ اور دنیا میں اس نے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ بہت سے ملک جو ہم سے زیادہ غریب تھے، وہ ہم سے آگے بڑھ گئے۔ مثلاً چین، کوریا اور سنگاپور۔ ضرورت ہے کہ دیش کی تعمیر کے لیے مذہب کے بجائے اقتصادیات کو اشو بنایا جائے۔

مسئلہ کی سنگینی

اس مسئلہ کی سنگینی، نتائج کے اعتبار سے اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف انڈیا میں بلکہ ساری دنیا میں اس پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ یہاں میں بطور نمونہ ایک انگریزی میگزین ایشیا ویک کا حوالہ دوں گا۔ یہ ہانگ کانگ سے نکلتا ہے اور ٹائم گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔

ایشیا ویک نے اپنے شمارہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ کے ایڈیٹوریل کا عنوان یہ بنایا ہے —— ایک خطرناک گھاٹی (A dangerous pass) اس میں اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایشیا کو اجودھیا کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے:

Asia may have to pay heavy price for Ayodhya

ایشیا ویک نے موجودہ تحریک کو ہندو فسطائیت (Hindu fascism) قرار دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ تحریک اگر اپنی منطقی حد (logical extreme) تک پہنچ گئی تو انڈیا کو اس کی ہولناک قیمت (terrible price) چکانی پڑے گی جس کا تحمل انڈیا نہ کر سکے گا جہاں ۰۰ ۵ ملین

آدمی افلاس کا شکار ہیں۔ اور ۰ ۰ فی صد آدمی اب بھی بے پڑھے لکھے ہیں۔

ایسی حالت میں انتہائی طور پر ضروری ہے کہ مندر۔ مسجد کی اس نزاع کو بلا تاخیر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اسی میں ہندو کا بھی فائدہ ہے، اسی میں مسلمان کا بھی فائدہ۔ اور اسی کے ذریعہ دیش کو ترقی کی طرف لے جایا جا سکتا ہے۔

مانع اسباب

انسانی جسم میں خون سخت پریشر کے ساتھ دوڑتا ہے۔ اس لیے اگر جسم میں کوئی زخم آجائے تو خون فوراً بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک خطرہ کی صورت حال ہے۔ مگر جسم کے اندر ایک فطری نظام (Natural mechanism) کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ جب زخم کی وجہ سے خون نکلنا شروع ہوتا ہے تو فوراً ہی جسم کے اندر کئی مانع اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو خون کے بہاؤ کو روک دیتے ہیں۔ مثلاً رگوں کا سکڑنا، خون میں کلاٹ بننا (blood clotting) وغیرہ۔ اس فطری نظام کو ہیمو اسٹاسس (hemostasis) کہا جاتا ہے۔ (IV/1015)

یہ ایک آفاقی قانون ہے جو حادثہ کی ہر صورت حال میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی تخریب کی کارروائی وقوع میں آتی ہے تو عین اسی وقت کچھ مانع طاقتیں (deterrent forces) پیدا ہو جاتی ہیں جو اس تخریبی عمل کو روکنے کے لیے اس کے خلاف سرگرم ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی سماج میں کوئی تخریبی عمل صرف کچھ دیر جاری رہتا ہے اور پھر اپنے آپ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ یہ فطری عمل اجودھیا کے معاملہ میں بھی پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ انتہا پسند لیڈر چاہیں یا نہ چاہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ مانع طاقتیں اس حد تک ظاہر ہو چکی ہیں کہ اب انھوں نے اس طرح کے حادثہ کے دوبارہ ظہور کے امکان کو سرے سے ختم کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ انتہا پسند لیڈر اپنی تحریک کے خاتمہ کا اعلان کر دیں تو یہ عین ان کے حق میں ہوگا۔ اس کے بعد وہ ایک ایسے عمل کا کریڈٹ پالیں گے جس کے لیے وہ مشکل ہی سے مستحق قرار دیے جا سکتے ہیں۔

اخبار اسٹیٹسمین کے سابق ایڈیٹر مسٹر جے این تان پوریا کی اس رائے سے مجھے اتفاق ہے

Having suffered enormous losses in the wave of communal violence after the Ayodhya episode, businessmen and traders all over the country are perturbed about the growing communal divide and lawlessness.

A *Times of India* survey of the business community in major urban centres reveals that it desperately yearns for peaceful resolution of divisive conflicts and is fairly united in its opposition to politics of communalism and the increasing proclivity of political parties to mix religion with politics.

The near-unanimous condemnation by businessmen of the political forces and practices which have disrupted normal life in the country is understandable considering the hefty losses inflicted by riots in production and distribution of goods and destruction of property.

Losses in Bombay alone are estimated at about Rs. 2,000 crores caused by the disruption in trade and production and destruction of property and goods. In Ahmedabad and Surat, these are expected to be in the region of Rs 3,000 crores. However, since the entire industrial belt stretching from Bombay to Surat and Ahmedabad has strong bonds of interdependence across the country, these estimates represent only part of the loss inflicted by communal violence.

SAURASHTRA CALM: The Saurashtra region for instance, barring a few stray incidents remained calm and quiet. Yet rioting in Bombay and Ahmedabad disrupted both trade and manufacturing. As a director of the Rajkot engineering association, Mr. Vajubhai Mavani said: 'with Bombay shut, it was just impossible to send goods there. And with Ahmedabad in a state of disarray, there was no way of getting either raw materials or sending goods.'

A measure of the loss is provided by the Rajkot municipal corporation's income from octroi which in normal times averaged Rs. 5 lakh's a day. In the week after the Ayodhya episode it dipped to a measly Rs 75,000 per day. According to one estimate Gujarat as a whole may have suffered unprecedented losses worth nearly Rs. 12,000 crores spread across most sectors of trade and manufacturing like textiles, engineering, and industrial raw materials.

The impact of Bombay and Gujarat spread right across the Malwa region of Madhya Pradesh which has major industrial estates at Indore, Pithampur, Dewas and Ujjain. Trade and transport operations were also hit hard affecting truckers and merchants and manufacturers dealing in textiles, bullion and engineering goods.

Karnataka could not remain unaffected either. According to the President of the Federation of Karnataka chamber of commerce and industry, the state lost over Rs 100 cores as the entire mercantile activity was affected for a couple of weeks because of problems arising from riots in Bombay. Trucks remained off the roads, goods either kept piling up in factories or were stuck in Bombay and raw materials were in short supply. The leather industry, garment manufacturers and chemicals and automobile traders were the worst hit.

The communal violence in Jaipur inflicted losses worth about Rs. 200 crores, claims Mr. K.L. Jain, general secretary of the Rajasthan chamber of commerce and industry. Apart from he small-scale sector and the export-oriented gems and jewellery industry, riots had a severe impact on small shopkeepers, tea-stall owners and kiosks selling pan and cigarettes.

Lucknow is another state capital where local businessmen suffered losses exceedi Rs. 500 crores. What worries them even more is a sense of uncertainty about the futu as they apprehend another round of violence if the prevailing communal tension in t city and adjoining areas like Ayodhya and Kanpur is allowed to persist. Mr AK Aggarw executive director of Indian industries association says.' 'If the situation is allowed remain like this the state's economy will be hit hard.' According to Mr Banwari L Kanchchal, general secretary, Lucknow Vyapar Mandal, the economy of the state h already been pushed back by about 10 years.

FEAR OF VIOLENCE: The fears of future violence have motivated businessm to speak up against politics of communalism. Mr Sandeep Bansal, president of Lucknow Yuva Vyapar Mandal and an active member of the BJP says that all political parti should desist from taking those steps which militate against interests of trade and busine and that communal co-existence is necessary for the all-round development of the sta

This view is articulated more sharply in Bangalore where all the businessmen a traders who spoke to *The Times of India* are vehemently opposed to the politics communalism. Mr Abdus Subhan, a shopkeeper in Russel market bemoaned th politicians were exploiting issues like Ayodhya for their selfish ends and this kind politicking must stop.

POLITICAL ISSUE: Likewise most traders in Bhopal do not see Ayodhya as religious issue. Mr. Ajay Kumar, who runs a general store says 'It is clear that th is nothing but politics. Who cares about religion. Politicians are only interested in Ayodh because it means votes on either side.

Businessmen and traders across the country are fairly united in advocating th religious issues must be kept out of politics and all cases of disputes should be resolv peacefully and within the parameters laid down by the Constitution. The president Karanataka Small Industries Association, Mr D.N. Gangadhar argues that religion is purely individualistic subject and politicians should not meddle with it and the secularis means that religion and politics are kept apart. Mr. Bimal Poddar, branch manager Caprihans India in Ahmedabad, blames all political parties for making a mess of t Ayodhya issue, which he contends should be settled in a constitutional manner.

CENTRE'S FAILURE: Most traders and businessmen are also critical of t government's failure in checking communal riots and the breakdown of the law and ord machinery. Mr Satish Chandra Patel, a small engineering goods' seller in Indore sa good governance means that the politician-police-criminal nexus should be broken.

It is not just the prospect of losses that makes businessmen wary of communalis but the fact that it is unsustainable as in most manufacturing and trading activities bo Hindus and Muslims form a complex web of interdependence which is critical to t very survival of business.

In the gems and jewellery industry of Jaipur for instance, while a majority of trade are Hindus, the cutting, polishing and packaging work is done mostly by Muslin Likewise the powerloom sector in Gujarat is dependent on workmen from both t communities. The same situation obtains in most other places from Bombay to Bhoj and Indore to Lucknow. As the BJP activist in Lucknow, Mr Sandeep Bansal puts 'The people of the two communities are so dependent on each other that their co-existen is necessary for the prosperity of trade and industry.'

(The Times of India, February 8, 1993)

جو انھوں نے روزنامہ پانیر (۲۰ جنوری ۱۹۹۲) میں شائع کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بی جے پی اپنے سیاسی مقصد کو ہندتو کے لفظ سے ظاہر کرتی ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس نے تمام تر فرقہ وارانہ جذبات (communal feeling) کو ابھارنے پر انحصار کیا ہے۔ مگر فرقہ وارانہ جذبات کی ایک حد ہے۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ بی جے پی کے لیے وہ آخری حد اب آگئی۔ وہ ہندتو جس کو یہ انتہا پسند لیڈر پیش کرتے ہیں وہ ۶ دسمبر کو اپنی خطرناک حدوں پر پہنچ چکا ہے، اب وہ مزید قابل استعمال نہیں :

Hindutva as interpreted by the hardliners reached its dangerous limits on December 6 and is no longer exploitable. (N.J. Nanporia)

تمام سنجیدہ لوگوں کی اس خواہش میں میں شریک ہوں کہ اس معاملہ کو اب باضابطہ طور پر ختم ہو جانا چاہیے۔ ذاتی طور پر میں اس مسئلہ کے ساتھ ۱۹۸۶ سے برابر وابستہ رہا ہوں۔ اب کافی غور و خوض اور طرفین سے تبادلۂ خیال کے بعد اس کا ایک حل سامنے آیا ہے۔ یہ حل تین نکات پر مشتمل ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہی اس مسئلہ کے حل کی واحد ممکن تدبیر ہے۔ اور وہ یقیناً تمام متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

تین نکاتی فارمولا

اجودھیا یا مندر۔ مسجد کے قضیہ میں تین فریق ہیں —— ہندو، مسلمان اور گورنمنٹ۔ تینوں فریق اگر مندرجہ ذیل اصول پر اپنی اپنی ذمہ داری ادا کریں تو انشاء اللہ یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔

۱۔ ہندوؤں نے مندر اور مسجد کے نام پر جو اندولن چلایا، اس کو اب وہ اجودھیا ہی میں اسٹاپ کر دیں۔ کسی حال میں بھی وہ اس کو اجودھیا سے آگے نہ لے جائیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک تحریری اعلان نامہ (declaration) جاری ہو جس میں چاروں شنکراچاریہ، اور مندر۔ مسجد تحریک میں شامل تمام ہندو جماعتوں (بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس، بجرنگ دل) کے ذمہ دار افراد اپنا دستخط کریں۔ اس میں واضح لفظوں میں یہ اقرار کیا گیا ہو کہ ہندو صاحبان اجودھیا کی بابری مسجد کے بعد اب کسی اور مسجد کے لیے اس قسم کا سوال کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ بھارت کی بقیہ تمام مسجدیں، خواہ کسی شخص کے نزدیک ان کی جو بھی تاریخی

نوعیت ہو، وہ ہمیشہ کے لیے مقدس مسجد کی حیثیت سے باقی رہیں گی۔ ہندو صاحبان کی طرف سے آئندہ ان میں کسی بھی تبدیلی کی مانگ نہیں کی جائے گی۔

۲۔ مسلمان اب اجودھیا کے اشو پر بالکل چپ ہو جائیں۔ بابری مسجد کی حفاظت اگر ان کی ذمہ داری تھی تو اس ذمہ داری کو وہ قربانی کی حد تک جاکر ادا کر چکے ہیں۔ اب اس معاملہ میں وہ معذور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے مسلمان شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیں کہ اب وہ عملاً اس مسئلہ سے مکمل طور پر الگ ہو جائیں گے۔ اب تک انھوں نے خود اس مسئلہ کو اٹھا رکھا تھا۔ اب وہ اس کو چھوڑ کر اس مسئلہ کو ملک کے ضمیر کے حوالے کر دیں گے۔

۳۔ حکومت ہند نے ۱۹۹۱ میں عبادت گاہوں کا قانون (Places of Worship Act 1991) منظور کیا ہے۔ جو عبادت گاہوں کے تحفظ سے متعلق ہے۔ اس میں یہ قانونی ضمانت دی گئی ہے کہ تمام عبادت گاہوں کو (باستثنا بابری مسجد) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی حالت پر باقی رکھا جائے گا۔ یہ صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ اب حکومت اتنا اور کرے کہ وہ عبادت گاہوں کے تحفظ کے اس ایکٹ کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔ دستور کا حصہ بننے کے بعد بقیہ عبادت گاہوں کے تحفظ کی زیادہ پائدار ضمانت حاصل ہو جائے گی۔

آخری بات

مذکورہ تین نکاتی فارمولے میں ہر فریق کی رعایت ہے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ ہر ایک کے لیے قابل قبول حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو مان لینے کے بعد ایک طرف موجودہ حالات میں اعتدال آئے گا۔ اور دوسری طرف اس سے جو پُر امن فضا پیدا ہو گی وہ بے روک ٹوک ملک کی ترقی کی ضمانت بن جائے گی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اور اس کے بعد ملکی اور بین اقوامی سطح پر جو حالات پیش آئے ہیں وہ بیحد قابل غور ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ اب یہ حتمی فیصلہ کر لیا جائے کہ اجودھیا کے تجربہ کو اب کہیں اور نہیں دہرانا ہے۔ موجودہ حالات میں کسی مسجد کو توڑ کر وہاں مندر تعمیر کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ ۶ دسمبر نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ دستور، قانون، اخلاقی روایات، سب کو بیک وقت ڈھا دیا جائے۔ ایک عمارتی ڈھانچہ کی خاطر پورے ملک کے

ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ ڈالا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسجد۔مندر تحریک کے انتہا پسند لیڈروں کے لیے جو انتخاب (Choice) ہے وہ مسجد اور مندر کے درمیان نہیں ہے، بلکہ مسجد اور بربادی کے درمیان ہے۔انڈیا میں سابق امریکی سفیر جے کے گال بریتھ نے انڈیا کو ایک فنکشننگ انارکی بتایا تھا۔ اگر موجودہ قسم کی مندر۔مسجد تحریک جاری رہی تو یقینی طور پر آئندہ آنے والا مبصر اس ملک کو ننگی انارکی (naked anarchy) کہنے پر مجبور ہوگا۔

بھارت کی آج کی نسل کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنی اگلی نسل کو کون سا بھارت دینے جارہی ہے۔ایک ترقی یافتہ بھارت یا ایک ایسا تباہ شدہ بھارت جو کسی کے لیے سرے سے رہنے کے قابل ہی نہ ہو، نہ ہندو کے لیے اور نہ مسلمان کے لیے اور نہ کسی اور کے لیے۔

یہ دنیا تبدیلی اور انقلاب کی دنیا ہے

اس دنیا میں بار بار نیا فیصلہ لینا پڑتا ہے

نئے حالات میں جو لوگ نیا فیصلہ نہ لے سکیں

وہ کامیابی کے ساتھ زندگی کا سفر طے نہیں کر سکتے

اجودھیا کا سبق

اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو کچھ پیش آیا، اس کا سامنا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کو ٹریجڈی کے طور پر نہ لیا جائے بلکہ سبق کے طور پر لیا جائے۔ اگر ہم اجودھیا کو اس ذہن کے تحت لیں تبھی یہ ممکن ہے کہ ہم دوبارہ اجودھیا کو کسی نئی ٹریجڈی میں تبدیل ہونے سے بچا سکیں۔

۱۔ بابری مسجد کا مسئلہ اتنا گمبھیر کیوں بنا۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا نام بابری مسجد تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، بابر کے نام کے ساتھ اس ملک کی ایک خاص تاریخ وابستہ ہے۔ چنانچہ اجودھیا کے اسٹرکچر کو جب بابری مسجد کے نام سے پکارا گیا تو ہندو اور مسلمان دونوں کو وہ ایک مخصوص تاریخ یاد دلانے کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ مسلمان نے بابری مسجد کو اپنی فتح کی علامت کے طور پر دیکھا۔ اور ہندو نے بابری مسجد کو دیکھا تو وہ اس کو اپنی ہار کی علامت کے روپ میں نظر آئی۔

اس طرح دونوں دو الگ الگ نفسیات کے تحت بابری مسجد کے اوپر جم گئے۔ ہندو کو نظر آیا کہ نئے انڈیا میں اگر اپنی سیاسی شکست کی علامت کو مٹانا ہے تو بابری مسجد کو ڈھا دینا پڑے گا۔ اس کے برعکس مسلمان نے محسوس کیا کہ اسے ہر حال میں بابری مسجد کو بچانا ہے تاکہ اس کے فاتحانہ ماضی کا نشان بدستور باقی رہے۔ اسی دوطرفہ ٹکراؤ کا وہ آخری نتیجہ تھا جو ۶ دسمبر کو پیش آیا۔

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کسی عبادت گاہ کو سادہ طور پر صرف عبادت گاہ یا مسجد کہنا چاہیے۔ اس کو "بابری مسجد" جیسا نام دینے سے مکمل طور پر پرہیز کرنا چاہیے۔

۲۔ بابری مسجد ۱۵۲۸ء میں تعمیر ہوئی۔ مگر وہ باقاعدہ مسئلہ ۱۹۸۶ میں بنی جب کہ انتظامیہ نے اس کے بند تالے کو کھول دیا۔ یہ تالا اتفاقاً نہیں کھلا۔ اس کا براہ راست سبب وہ ایجی ٹیشنل تحریک تھی جو عام طور پر شاہ بانو تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے پُرشور مطالبہ کے نتیجہ میں جب حکومت نے یہ طے کیا کہ وہ مسلم پرسنل لا کے متعلق ایک نیا ایکٹ بنائے۔ اسی وقت اس نے ہندو لیڈروں کے مطالبہ کی بنا پر، یہ بھی طے کیا کہ بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ مسلم اور ہندو دونوں کو مطمئن کیا جا سکے۔

اس میں یہ سبق ہے کہ کسی پلورل سوسائٹی میں اس کا ایک گروپ اگر اپنے لیے ایک امتیازی

حق کی مانگ کرتا ہے تو اس کو جاننا چاہیے کہ دوسرا گروپ بھی اسی کے مساوی کوئی چیز اپنے لیے لینا چاہے گا۔ اس طرح عملاً یہ ہوگا کہ اس کے لیے ایک نئی محرومی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا جو اس کی یافت کی مکمل نفی کر دے گا۔

۳۔ جیسا کہ معلوم ہے، بابری مسجد کا تالا کھلنے کے بعد بھی ابتداءً یہ مسئلہ تمام تر صرف ایک مقامی مسئلہ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ٹاؤن کا مسئلہ تھا۔ مگر اس کے نام پر جب دونوں طرف سے پورے ملک میں ایجی ٹیشن چلایا گیا تو وہ مقامی حد سے نکل کر ایک آل انڈیا مسئلہ بن گیا۔ حتی کہ وہ یہاں تک بڑھا کہ وہ ایک عالمی مسئلہ بن گیا۔ اس نے دونوں فرقوں کے لیے وقار کے مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح غیر متناسب طور پر بڑھانے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ موجودہ الم ناک وسعت تک پہنچ گیا۔ ورنہ مسئلہ بننے کے بعد بھی وہ ایک گم نام مسئلہ رہتا جیسا کہ اس سے پہلے کئی سو سال تک وہ گم نام مسئلہ بنا ہوا تھا۔

اس میں یہ سبق ہے کہ سماجی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کو حل کرنے کی کوشش ہمیشہ اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ابتدائی دائرہ میں محدود رہے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے آگے بڑھنے نہ پائے۔

۴۔ آخری بات یہ کہ اس معاملہ میں اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں میں کہوں گا کہ جو لوگ یہ مانگ کر رہے ہیں کہ بابری مسجد دوبارہ وہیں بناؤ وہ ایک ختم شدہ معاملہ کو دوبارہ نئی شدت کے ساتھ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تاریخ کو الٹی سمت میں چلانا ہے۔ اور تاریخ کو الٹی سمت میں چلانا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔

اسی نزاکت کے پیش نظر میں نے اس معاملہ میں اپنا سہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) مسلمان اب بابری مسجد کے لیے اپنا ایجی ٹیشن مکمل طور پر ختم کر دیں (۲) ہندو اپنی مندر۔ مسجد تحریک کو ہمیشہ کے لیے اجودھیا میں اسٹاپ کر دیں، اس کے بعد وہ کسی بھی دوسری مسجد کا باب ہرگز نہ کھولیں (۳) حکومت یہ کرے کہ عبادت گاہوں کا تحفظ کے قانون ۱۹۹۱ کو دستور میں شامل کر کے اس کو بنیادی حقوق کا جزء بنا دے۔

یہ فارمولا دونوں فرقوں کے لیے باعزت سمجھوتہ کی ایک بنیاد ہے۔

زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ناخوش گوار حقیقت کو ماننا پڑتا ہے۔ کیوں کہ علمی اعتبار
ے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔ فارمولے کا پہلا نکتہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ کیونکہ بابری مسجد
ے معاملہ میں اب مسلمانوں کے لیے جو چوائس ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ اسی جگہ
بنائیں۔ حقیقی چوائس یہ ہے کہ بابری مسجد کو اسی جگہ بنانے کی کوشش میں ہزاروں نیا مسئلہ اپنے
لیے کھڑا کرلیں۔

فارمولے کا دوسرا نکتہ اس مقصد کے لیے ہے کہ اس قسم کی بھیانک غلطی کو اب کسی اور مسجد
ے معاملہ میں نہ دہرایا جائے۔ یہ نکتہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ۶ دسمبر کے بعد ہر پیش آنے والے
قعات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہندو صاحبان کے لیے جو چیز ممکن ہے وہ مسجد کی جگہ مندر بنانا نہیں
ے۔ بلکہ مسجد کی جگہ مندر بنانے کے جوش میں پورے ملک کو تباہ و برباد کر دینا ہے۔

تیسرا نکتہ قانونی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے مسجد اور عبادت گاہ کے معاملہ کو
، طرح مستحکم کر دیا جائے کہ اب کوئی فریق دوبارہ اس قسم کی غلطی نہ کر سکے۔ اور اس کی عملی صورت
ہے کہ اس بات کی مستحکم قانونی ضمانت فراہم کر دی جائے کہ ۱۹۴۷ میں جو مسجد یا عبادت گاہ جس
، میں تھی، اسی حال میں اس کو برقرار رکھا جائے گا۔

چونکہ اس معاملہ میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندو سائڈ کی طرف سے ایک جارحانہ اقدام کیا گیا ہے
ر بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو کسی جواز کے بغیر توڑ دیا گیا ہے، اس لیے اب سب سے پہلے
ہ و سائڈ کو یہ کرنا ہے کہ ان کی طرف سے ایک تحریری ڈیکلریشن جاری ہو۔ اس میں فارمولے کے
ن اجزا کو صدق دل سے تسلیم کرنے کا متفقہ اعلان کیا گیا ہو۔

اس ڈیکلریشن پر چاروں شنکراچاریہ دستخط کریں۔ تمام ان سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیوں کے
ہ دار اس پر دستخط کریں جو اجودھیا کے اشو میں شامل رہی ہیں۔ ملک کے مشہور اور معتمد افراد
تصدیقی دستخط بھی اس میں شامل ہو۔ اسی کے ساتھ حکومت کی طرف سے اس کا ذمہ دار اس پر اپنا
نظ ثبت کرے۔ اس قسم کا ایک ڈیکلریشن جاری ہونے کے بعد وہ بحران ختم ہو جائے گا جس سے
دسمبر کے بعد پوری قوم دوچار ہو گئی ہے۔

آگے کی طرف

آگے کو یاد رکھنا اور پیچھے کو بھلا دینا ——— یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہا
ہر فرد اور ہر گروپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ حادثات اکثر حالات میں
قابل واپسی نہیں ہوتے۔ جو لوگ ان حادثات کو یاد رکھیں وہ ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ اور جو لوگ
ان حادثات کو بھلا کر از سر نو زندگی شروع کرنے کی تدبیر کریں وہی اس دنیا میں کامیاب ہو۔
ہیں۔ بھلانے کا یہ اصول ایک یونی ورسل اصول ہے۔ اس میں کسی بھی فرد یا کسی بھی گروپ
کوئی استثناء نہیں۔

انڈیا کے ہندو اور مسلمان دونوں آج اسی امتحان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو
کرنا ہے کہ وہ پیچھے کی بات کو بھلا دیں اور آگے کی بات کو لے کر اپنی عملی جدوجہد شروع کر
دونوں کے لیے ترقی اور کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا ممک
راستہ ان کے لیے نہیں۔

مختصر طور پر یہ کہ انڈیا کے ہندوؤں کو بٹوارہ کو بھلا دینا ہے، اور انڈیا کے مسلمانوں
بابری مسجد کو بھلا دینا ہے۔ دونوں ہی ماضی کی یادوں کا بوجھ اپنے سر پر لیے ہوئے ہیں۔ ہندو
لیے ان یادوں کا علامتی عنوان "بٹوارہ" ہے۔ اور مسلمان کے لیے ان یادوں کا علامتی عنوا
"بابری مسجد"۔ اگر دونوں یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے ایک ترقی یافتہ مستقبل کی تعمیر کریں تو دو
کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اپنے ذہن کو ماضی کی یادوں سے نکالیں اور مستقبل کی روشنی میں سوچ
شروع کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو نہ صرف یہ کہ دونوں فرقے کی ترقی رکی رہے گی۔
وسیع تر اعتبار سے خود ملک کا مستقبل بھی تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں غیر ملک
لوگوں کا "ظلم" تو ملک کو تباہ نہ کر سکا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد ملکی لوگوں کی نادانی ضرور اسے تبا
برباد کر کے رکھ دے گی۔

برادران وطن کے ایک طبقہ کی سوچ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارہ کے ذمہ د
مسلمان ہیں۔ اس بنا پر وہ مسلمانوں کو مسلسل طور پر اپنا رقیب اور حریف بنائے ہوئے ہیں۔ ج

کا اظہار مختلف ناخوشگواریوں کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ بٹوارہ کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ اب برادران وطن کے لیے اس کے سوا کوئی متبادل صورت نہیں کہ وہ بٹوارہ کو گزری ہوئی تاریخ کے خانے میں ڈال دیں اور یہ بھول جائیں کہ کس نے بٹوارہ کرایا اور کس نے اس کی مانگ کی۔ اب مسئلہ بٹوارہ کا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بٹوارہ کا حساب چکانے میں خود ملک تباہ ہوا جا رہا ہے۔

۱۹۴۷ تک بٹوارہ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ مگر اب یہ خود ہندوؤں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ کیوں کہ بٹوارہ کی یاد ان کے اندر معتدل نفسیات پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اور جب تک معتدل نفسیات نہ آئے وہ ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرنے میں بھی ناکام رہیں گے۔

بٹوارہ بذاتِ خود کوئی ایسا حادثہ نہیں جو باہمی ترقی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بن جائے۔ تاریخ کی متعدد مثالیں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ ایک تازہ مثال جرمنی کی ہے۔ ۱۹۴۸ میں جرمنی کی تقسیم ہوئی۔ مگر یہ تقسیم مغربی جرمنی کو ترقی کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکی۔

دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ میں جرمنی کی اقتصادیات بالکل تباہ ہوگئی۔ اس کو مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی میں بانٹ کر اسے کمزور کر دیا گیا تھا۔ الائیڈ ہائی کمیشن (Allied High Commission) کی کونسل نے ۱۹۴۹ میں مغربی جرمنی کے لیے یہ حکم نافذ کیا تھا کہ اس کے یہاں کوئی نیشنل پولیس نہ ہوگی، وہ صرف میونسپلٹی کی سطح کی پولیس رکھ سکے گا۔ وغیرہ۔

مگر تقسیم اور کمزوری جرمنی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ وہ اپنی جد و جہد سے آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ یورپ کا نمبر ایک ملک بن گیا، جرمنی اس شاندار انجام تک کیسے پہنچا، کچھ لوگ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس نے دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلے میں دیر سے اپنا ترقی کا سفر شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کو سفر شروع کرنے والے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ پہلے شروع کرنے والوں سے اعلیٰ ٹکنالوجی حاصل کر سکتے ہیں :

Late starters can grow faster because they can borrow advanced technology from the early starters. (6/214)

یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ بعد کو شروع کرنے والوں میں تو انڈیا بھی ہے مگر وہ اب

تک کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکا۔ اصل یہ ہے کہ مغربی جرمنی کی تیز رفتار ترقی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نے دوسری عالمی جنگ کے نقصان اور اس کے بعد ہونے والی ملکی تقسیم کو بھلایا۔ گزرے ہوئے ماضی کو بھلا کر اس نے اپنی تمام طاقت آنے والے مستقبل کی تعمیر میں لگا دی۔

بدقسمتی سے ہندوؤں کی ایک تعداد، خاص طور پر شمالی ہند کے ہندوؤں کی اکثریت ۱۹۴۷ میں ہونے والے بٹوارہ کو بھلا نہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کا علاقہ، جو ملک کا قائدانہ علاقہ ہے، وہ زیادہ تر منفی سرگرمیوں میں پڑا رہا۔ وہ یکسوئی کے ساتھ مستقبل کی تعمیر میں اپنے آپ کو وقف نہ کر سکا۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ برادرانِ وطن اس کوتاہی کو محسوس کریں۔ وہ بٹوارہ کی نفسیات سے اپنے آپ کو خالی کر کے نئے انڈیا کی مثبت تعمیر میں لگ جائیں۔ اس کے بعد وہ دن دور نہیں جب کہ ملک تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر شروع کر دے اور عالمی نقشہ میں اپنے لیے وہ با عزت جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

اب انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کو لیجئے۔ ملک کے مختلف فرقوں میں وہ پہلے ہی ترقی کے اعتبار سے پیچھے تھے، اب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد وہ مزید مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کے لیے اس ملک میں ترقی کے مواقع موجود نہیں۔

یہ سوچ سراسر غلط ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی بھی خارجی حادثہ کسی قوم کے عروج و زوال کا فیصلہ نہیں کرتا۔ کسی قوم کے عروج و زوال میں جو چیز فیصلہ کن بنتی ہے وہ اس قوم کی داخلی طاقت ہے، نہ کہ خارجی واقعات۔ قومیں ہمیشہ اپنے داخلی عزم سے آگے بڑھتی ہیں۔ اگر عزم و ہمت موجود ہو تو کوئی بھی خارجی حادثہ قوم کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

جہاں تک مسجد کا تعلق ہے، تو مسجدوں کے ساتھ اس طرح کے حادثات بار بار پیش آئے ہیں۔ ۶۹۲ء میں حجاج بن یوسف کی فوجوں نے کعبہ کے اوپر منجنیق کے ذریعہ گولہ باری کی۔ حتی کہ تاریخ میں اس کی بابت یہ الفاظ لکھے گئے کہ مکہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ حرم پر گولہ باری کی گئی۔ اور کعبہ میں آگ لگا دی گئی۔ مقدس حجر اسود تین جگہ سے ٹوٹ گیا :

Mecca was besieged, the haram bombarded with missiles, and the Kaba set on fire, the sacred Black Stone was split in three pieces. (1/1047)

اس کے باوجود اسلام کی تاریخ نہیں رکی۔ اور کعبہ کی مقدس مسجد پر گولہ باری کرنے والوں ہی نے دوبارہ اس کی تعمیر کرائی۔ ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں نے مسلم دنیا پر حملہ کیا اور سمرقند سے حلب تک سیکڑوں مسجدوں کو ڈھادیا۔ مگر اس حادثہ کے بعد بھی اسلام کی تاریخ نہیں رکی اور دوبارہ انھیں تاتاریوں نے ان تمام مسجدوں کو پھر سے تعمیر کرایا۔ خود انڈیا میں ۱۹۴۷ میں ہریانہ اور پنجاب اور راجستھان کے علاقہ میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مگر اس کے باوجود یہاں اسلام کی تاریخ نہیں رکی۔ پھر اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے کیوں ایسا ہوگا کہ اسلام کی تاریخ آگے بڑھنے سے رک جائے گی۔

اس وقت مسلمانوں کے لیے اہم بات یہ نہیں ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب بھی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں انڈیا میں موجود ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں ان کے چھوٹے اور بڑے مدرسے سارے ملک میں قائم ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے اسلامی ادارے اور اسلامی جماعتیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ۶ دسمبر کا حادثہ پیش آنے کے باوجود مسلمانوں کے لیے ترقی کے تمام مواقع بدستور یہاں موجود ہیں۔

ایسی حالت میں ان کے لیے مایوسی یا دل شکستگی کا کوئی سوال نہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ نئے عزائم کے ساتھ اپنی تعمیر کا عمل شروع کردیں، اور پھر بہت جلد وہ دیکھیں گے کہ ۶ دسمبر کو انھوں نے جتنا کھویا تھا اس سے بہت زیادہ انھوں نے ۶ دسمبر کے بعد یہاں اپنے لیے پالیا ہے۔ یہی ماضی کا پیغام ہے اور یہی مستقبل کی پکار بھی۔

ہمت کا امتحان

انڈیا میں مسجد۔مندر کا جھگڑا پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ سے چل رہا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ دونوں فرقوں کے درمیان موجودہ قسم کی سرگرمیاں اس جھگڑے کو صرف بڑھاتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد اب یہ قضیہ اس مرحلہ میں پہنچ گیا ہے کہ بی جے پی کے سینیر لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے اس کو قومی المیہ (national tragedy) قرار دیا ہے۔ مسٹر جے ایس یادو (J.S. Yadava) کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس (۲ جنوری ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

Turning adversity into an opportunity.

اس میں انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اب ہمارے سماج کے لیے سرطان بن گیا ہے۔ اور ۶ دسمبر کو بابری مسجد کا ڈھایا جانا اس عداوتی سرطان کا پہلا اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود قوم کا بقا اس وقت داؤ پر لگا ہوا ہے :

It has become cancerous and the demolition of the Bạbari Masjid is the first major eruption of the malignant tumor of Indian polity. The very survival of our nation is at stake. (p.11)

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس مسئلہ کو لامتناہی طور پر جاری رکھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اس آخری حد پر پہنچ جائے کہ ہر طرف انارکی پھیل جائے۔ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں دو برباد فرقے بن کر رہ جائیں جس طرح لبنان اور یوگوسلاویہ میں اسی طرح کے جھگڑوں کے نتیجہ میں پیش آچکا ہے۔

یا ہم ایسا کریں گے کہ مسجد اور مندر کے جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے تاکہ ملک ترقی کے راستہ پر بے روک ٹوک اپنا سفر شروع کر سکے اور بالآخر ایک طاقت ور قوم کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر نمایاں ہو۔ ہر محب وطن یقیناً یہ کہے گا کہ ہمیں اسی دوسری بات کا فیصلہ کرنا چاہیے اور جرأت مندانہ طور پر ایک ایسے حل پر راضی ہو جانا چاہیے جس میں یکساں طور پر دونوں فرقوں کا بھلا ہو۔

زندگی مسائل سے بھری ہوئی ہے۔ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو نادان آدمی اپنی نادانی سے اس کو بگاڑ لیتا ہے، اور دانش مند آدمی مسئلہ کو عبور کر کے دوبارہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

زندگی کا سفر کبھی ہمواری کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ یہاں بار بار اونچ نیچ کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں ہمیشہ احوال و ظروف بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس دنیا میں بار بار نیا فیصلہ لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو لوگ بدلے ہوئے حالات میں نیا فیصلہ لے سکیں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو لوگ نیا فیصلہ لینے کی دانش مندی نہ دکھا سکیں وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دور اول میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وطن چھوڑ کر مکہ سے مدینہ جانے کا ارادہ کیا تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر جب عمرہ کے لیے آگے بڑھنے کے بجائے آپ نے یہ طے کیا کہ جہاں سے آئے تھے وہیں دوبارہ واپس چلے جائیں تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب خالد بن الولیدؓ نے یہ منصوبہ بنایا کہ رومیوں سے لڑائی جاری رکھنے کے بجائے اپنی فوجوں کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں بار بار اس طرح کے نئے فیصلے لیے گئے ہیں۔ یہی نئے فیصلے تھے جن کی وجہ سے اسلام کی تاریخ مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ اگر اہل اسلام میں نیا فیصلہ لینے کی طاقت نہ ہوتی تو اسلام کی تاریخ بند گلی میں پھنس کر رہ جاتی، وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی۔

آج عالمی سطح پر مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نیا فیصلہ لینے کی صلاحیت کھو دی ہے۔ ان کے تمام لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف راستہ کی رکاوٹوں سے ٹکرانا جانتے ہیں، وہ رکاوٹوں سے ہٹ کر اپنے لیے نیا راستہ بنانا نہیں جانتے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار یہ صورت پیش آئی کہ مسلم رہنماؤں کو کوئی نیا فیصلہ لینا تھا۔ مگر ان کا حال یہ ہوا کہ ایک بار جس راستہ پر چل پڑے، بس آنکھ بند کر کے اس پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ خود بھی خندق میں گرے اور قوم کو بھی خندق میں گرا دیا۔

یہ دنیا ایک تغیر پذیر دنیا ہے۔ یہاں افراد اور قوموں کے لیے تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بغیر یہاں ترقی اور کامیابی ممکن نہیں۔

یہ دنیا ایک بدلتی ہوئی دنیا ہے۔ یہاں افراد اور قوموں کو بار بار تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ تخلیقی صلاحیت ہی اس تغیر پذیر دنیا میں ترقی کا واحد راز ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بغیر یہاں کسی کے لیے بھی ترقی اور کامیابی کو پانا ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بولنا شروع کرتا ہے۔ پھر حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ آدمی آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر حالات کہتے ہیں کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ۔ آدمی ایک مانگ لے کر اٹھتا ہے۔ پھر حالات پکارتے ہیں کہ اپنی زبان بند کر لو۔ آدمی حالات کا ایک اندازہ کر کے اپنا منصوبہ بناتا ہے۔ پھر حالات کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، اور ضرورت ہوتی ہے کہ نیا نقشہ اور نیا منصوبہ بنایا جائے۔

اس دنیا کا یہ قانون افراد کے لیے بھی ہے اور قوموں کے لیے بھی۔ یہاں صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو پیش آمدہ مواقع پر نیا فیصلہ لے سکیں۔ جو لوگ حالات کے مطابق نیا فیصلہ لینے سے محروم رہیں وہ یقیناً کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے بھی محروم رہیں گے۔

جب بھی کوئی نیا فیصلہ لیا جاتا ہے تو اس میں رسک بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ رسک زندگی کا ایک ناگزیر عنصر ہے۔ رسک لیے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی عمل نہیں کیا جا سکتا، نہ شخصی سطح پر اور نہ قومی سطح پر۔ رسک سے خالی دنیا صرف قبرستان میں مل سکتی ہے۔ جہاں تک زندگی کے میدانوں کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ رسک سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

زندگی میں جب بھی کوئی نیا موڑ آتا ہے تو وہ افراد اور قوموں کے لیے امتحان ہوتا ہے۔ یہ موڑ ہر ایک کے لیے آتا ہے، موڑ آنے پر جو لوگ وہاں مڑنے سے ہچکچائیں وہ ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ اور جو لوگ موڑ آنے کے بعد حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھ جائیں، وہی انقلابات کی اس دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔

اجودھیا کا مسئلہ جو اس وقت ملک کے اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان نزاع کا سبب بنا ہوا ہے، وہ بھی اسی قسم کا ایک موڑ ہے۔ ضرورت ہے کہ دونوں فرقے اس نازک تاریخی موقع پر نیا فیصلہ لینے کی ہمت کریں۔ کسی انقلابی فیصلہ تک پہنچنا صرف اس وقت ممکن ہوگا جبکہ دونوں حوصلہ مندی کا ثبوت دیں، دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ حتی کہ خطرہ مول لے کر معاملہ کو ختم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ زندگی ہمت کا امتحان ہے، اور اجودھیا آج دونوں فرقوں کے لیے اسی ہمت کا امتحان بن گیا ہے۔

سب سے بڑا خطرہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد پوری قوم میں نہایت شدت کے ساتھ خود احتسابی کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ عام طور پر یہ سوچا جارہا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آزادی کے تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ہمارا ملک ترقی کی طرف اپنا سفر شروع نہ کر سکا۔ ہمارے عوام و خواص آج بھی اشوز اور نان اشوز کا فرق نہیں سمجھتے۔ وہ ایک نظر انداز کرنے والے معاملہ پر بھی اسی جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس طرح ایک ایسے معاملہ پر کھڑا ہونا چاہیے جو نظر انداز کرنے کے قابل نہ ہو۔

اس نیشنل ڈیبیٹ میں جو لوگ حصہ لے رہے ہیں ان میں بظاہر دو گروپ ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وہ جس کا کہنا ہے کہ ساری قومی مصیبتوں کی جڑ بناوٹی سیکولرزم (Pseudo secularism) ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ تمام مصیبتیں بناوٹی ہندوازم (Pseudo Hinduism) کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ہی سطحی توجیہیں ہیں۔ ہماری موجودہ مصیبتوں کی اصل جڑ وہ چیز ہے جس کو میں بناوٹی انٹلکچولزم (Pseudo intellectualism) کا نام دینا پسند کروں گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر سماج میں ہمیشہ خواص کا ایک طبقہ ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کو آپ رائے بنانے والے (opinion makers) کہہ سکتے ہیں۔ یہ طبقہ پچھلے سماجوں میں بھی موجود رہتا تھا۔ مگر اب پریس اور میڈیا کے ذرائع وجود میں آنے کے بعد اس طبقہ کا رول بہت بڑھ گیا ہے۔ پچھلے سماج میں کوئی رائے بنانے والا اپنی باتوں سے جتنے لوگوں کو متاثر کر سکتا تھا، آج اس سے ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر متاثر کرنا ایک شخص کے لیے ممکن ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں، مختلف اسباب سے، ہمارے انٹلکچول کلاس نے بہت غلط کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے پوری قوم، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی سوچ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ہر سماج میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو آدمی کے اندر صحیح ذہن بنے گا۔ اور اگر ان کو غلط رخ سے دیکھا جائے تو غلط

ذہن بننے لگے گا۔ انٹلکچول کلاس کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی فکری تربیت اس طرح کرے کہ وہ پیش آنے والے واقعات کو صحیح رخ سے دیکھ سکیں۔ مگر ہمارے ملک کا انٹلکچول کلاس اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو درست طور پر نبھانے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔

اپنے ناقص علم کی بنا پر یا اپنے حقیر مفادات کی بنا پر، اس نے یہ کیا کہ نان اشو کو اشو بنایا۔ ایک واقعہ جس کا تعلق کسی اور پہلو سے تھا اس کو کسی اور پہلو سے جوڑ دیا۔ ایک معاملہ جو نظر انداز کرنے کے قابل تھا اس کو بڑھا چڑھا کے پیش کر کے اس پر لوگوں کو بھڑکا دیا۔ دس باتوں میں نو باتیں اگر اچھی تھیں تو ان نو باتوں کو بیان نہیں کیا اور ایک بری بات کا چرچا زور شور کے ساتھ ہر طرف پھیلا دیا۔ ایک چیز جو افواہ کے نوعیت کی تھی، اور ضرورت تھی کہ اس کی تحقیق کی جائے، مگر بلا تحقیق اس کو شہرت دینا شروع کر دیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی سوچ بگڑ گئی۔ اب عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نہ مسائل کا صحیح تعین کر پاتے اور نہ یہ سمجھ پاتے کہ ان مسائل کے حل کے لیے انھیں کیا کرنا چاہیے۔ پہلے وہ زیادہ تر اپنی فطرت اور کامن سنس کی رہ نمائی میں ایک قریبی فیصلہ کر لیتے تھے، مگر اب میڈیا کے دور میں وہ انٹلکچول کلاس کی باتوں کو سن کر یا پڑھ کر رائے بناتے ہیں، اس بنا پر سارا معاملہ غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہاں میں کچھ مثالیں دوں گا:

۱۔ ہندو دانشوروں کے ایک طبقہ نے پچھلے کچھ برسوں سے ہندوؤں میں نہایت شدت کے ساتھ یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ کانگریس پارٹی اپنے طویل دورِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ خوش کرنے (Appeasement) کی پالیسی چلاتی رہی ہے۔ اس پالیسی کی ایک روشن مثال (glaring example) ان کے نزدیک، شاہ بانو تحریک کے بعد بننے والے اس ایکٹ کی ہے جس کا پورا نام اس طرح ہے:

Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Act 1986)

اس ایکٹ کو راجیو گاندھی کی حکومت نے منظور کیا تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی سے جوڑنا سراسر بے اصل ہے، کیوں کہ خوش کرنا ایک ایسا کام ہے جو یک طرفہ طور پر کیا جاتا ہے۔ جب کہ یہاں واضح طور پر دو طرفہ معاملہ کیا گیا۔ راجیو گاندھی کی حکومت نے ۶ مئی ۱۹۸۶

کو یہ ایکٹ لوک سبھا میں منظور کرایا تھا، مگر جب کانگریسی حکومت نے اس "مسلم نوازی" کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ اس نے زیادہ بڑے پیمانہ پر "ہندو نوازی" کا عمل کیا۔ چنانچہ اس نے یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کے دروازے پر عدالتی فیصلہ کے تحت لگے ہوئے تالے کو کھلوا دیا۔ دونوں کا تقابل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ اگر اپیز منٹ ہوا تو ہندوؤں کے ساتھ سپر اپیز منٹ کا معاملہ کیا گیا۔

ہندو دانشوروں نے تالا کھولنے کے معاملہ کو حذف کر کے ایکٹ بنانے کے معاملہ کو خوب بڑھا چڑھا کر پھیلایا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو انھوں نے مسموم کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں اور اس طرح کی دوسری باتوں کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ ہندو لوگ دیش کی مثبت تعمیر کے بجائے مسلمانوں کے خلاف منفی سرگرمیوں میں اپنی طاقت صرف کرنے لگے۔

اب اسی نوعیت کی برعکس مثال لیجئے جب کہ انٹلکچول کلاس نے اپنا صحیح رول ادا کیا اور اس کے نتیجہ میں قوم کو زبردست ترقی کا تحفہ ملا۔ یہ دوسری مثال جاپان کی جدید تاریخ سے تعلق رکھتی ہے

ہیروشیما کو جاپان کے ایک بڑے شہر کی حیثیت حاصل ہے۔ ہیروشیما میں جنگی اہمیت کی صنعتیں قائم کی گئیں۔ ۱۸۶۸ کے بعد تقریباً ۵۰ سال تک اس کو جاپان میں سب سے بڑے ملٹری سنٹر کی حیثیت حاصل تھی۔ دوسری عالمی جنگ میں ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکہ نے ہیروشیما کے اوپر ایٹم بم گرایا اور اس کو پوری طرح تباہ کر دیا۔

اس کے بعد جاپان میں امریکہ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی۔ خاص طور پر فوج کے لوگ امریکہ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت جاپانیوں میں سے کچھ سچے قسم کے انٹلکچول اٹھے۔ انھوں نے پوری جاپانی قوم کی سوچ کو بدل دیا۔

انھوں نے جاپانیوں کو بتایا کہ اگست ۱۹۴۵ میں امریکہ نے اگر ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا تو اس سے پہلے دسمبر ۱۹۴۱ میں ہم امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے، اس طرح معاملہ برابر ہوگیا۔ اس بات نے جاپانیوں کے ذہن کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ منفی رخ پر دوڑنے کے بجائے

ست رخ پر چل پڑے۔ وہ امریکہ کی تخریب کے بے فائدہ عمل میں لگنے کے بجائے خود اپنی تعمیر کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ اس کا نتیجہ ایک عظیم ترقی کی صورت میں آج ساری دنیا کے سامنے ہے۔

ہندو دانشور اگر یہی دانشوری کرتے تو وہ ہندوؤں سے کہتے کہ حکومت نے اگر مسلمانوں کو سنل لا ایکٹ دیا ہے تو تم کو بھی اس نے ایک بہت بڑی چیز دی ہے۔ وہ یہ کہ بابری مسجد کا بند تالا کھول کر اس کے اندر تم کو درشن اور پوجا کی اجازت دے دی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انڈیا میں بھی وہی واقعہ ہوتا جو جاپان میں پیش آیا۔ مگر ہندو دانشور جاپانی دانشوروں جیسی رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ اس کا نتیجہ عظیم تباہی کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔

ہر سماج میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کی ایک اصل توجیہہ ہوتی ہے، اور ایک اصل حقیقت سے ہٹی ہوئی توجیہہ۔ عام آدمی اس فرق کو سمجھ نہیں پاتا۔ یہ خواص (انٹلکچول کلاس) کا کام ہے کہ وہ واقعہ کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کی صحیح توجیہہ لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے :

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے (النساء ۸۳)

بدقسمتی سے انڈیا میں دونوں فرقوں کے انٹلکچول کلاس نے اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا۔ دونوں ہی نے ذہن کو بگاڑنے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ ایک طرف ہندوؤں کے انٹلکچول کلاس کے لوگوں نے واقعات کو غلط انداز میں پیش کر کے ہندوؤں کی سوچ کو زہر آلود کر دیا۔ دوسری طرف مسلم انٹلکچول کلاس نے مسلمانوں کی سوچ کو الٹے رخ پر موڑ دیا۔ یہاں تک کہ دو پڑوسی فرقے جو سیکڑوں سال سے ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن کر کھڑے ہو گئے۔

قرآن میں ایک مرد کو چار عورتوں تک سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ قطعی طور پر ایک ایمرجنسی کا قانون ہے۔ مگر ہندو دانشوروں نے اس کو انتہائی خلاف واقعہ طور پر عام حکم

کی حیثیت دے دی۔ انھوں نے ہندو کو بتایا کہ دیکھو، پاکستان بنوا لینے کے بعد بھی مسلمان تمہارے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ ہر مسلمان اپنے مذہب کی تعلیم کے مطابق، چار شادی کرتا ہے اور بے تحاشا بچے پیدا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہو جائے۔ اور وہ یہاں تمہارے اوپر حکومت کرنے لگیں۔

یہی خطرہ کی نفسیات مسلم دانشوروں نے بھی مسلمانوں کے اندر بڑے پیمانہ پر پیدا کی۔ ملک کا بٹوارہ ہندو۔ مسلم منافرت کی بنا پر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد لوگ معمولی معمولی باتوں پر بھڑکنے لگے اور فساد کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ان فرقہ وارانہ فسادات کا اصل سبب صبر و اعراض نہ کرنا تھا۔ مگر مسلم دانشوروں نے اس کو غلط طور پر اس مفروضہ سے جوڑ دیا کہ ہندو انڈیا کو مسلمانوں کے لیے دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں اور ہندو لیڈر بار بار اسپین کا سفر کر رہے ہیں تاکہ وہاں سے وہ تکنیک سیکھ کر آئیں جس کو یہاں دہرا سکیں۔

یہ دونوں ہی باتیں بالکل بے بنیاد تھیں۔ ان میں سے کسی کی بھی کوئی اصل نہ تھی مسلمانوں میں چار شادی یا اضافہ آبادی کی بات سراسر افسانہ تھی۔ اسی طرح ہندوؤں کے بارہ میں یہ بات قطعی طور پر ایک افواہ تھی کہ وہ انڈیا کو دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ مگر دونوں طرف کے دانشوروں نے ان کو عوام میں اس طرح پھیلایا کہ یہ خیالات دونوں فرقوں کے اوپر کابوس بن کر چھا گئے۔

یہی بابری مسجد کے سلسلہ میں پیش آیا۔ ایک طرف ہندو دانش وروں نے دوسری ہار (second defeat) کا نظریہ ایجاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کا بٹوارہ تمہارے لیے پہلی ہار تھی۔ اب بابری مسجد کی جگہ رام مندر کا نہ بننا تمہارے لیے دوسری ہار ہوگی۔ چنانچہ ہندو بھڑک اٹھا۔ اس نے سوچا کہ پہلی ہار ہم نے انگریزوں کی موجودگی کی وجہ سے برداشت کر لی۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اب ہم کسی قیمت پر دوسری ہار کو قبول نہیں کریں گے۔

دوسری طرف مسلم دانشوروں نے "علامت" کا جھوٹا نظریہ ایجاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کا معاملہ صرف ایک مسجد کا معاملہ نہیں ہے، وہ پوری ملت کے وجود و بقا کی علامت ہے۔ اگر یہاں ہم پیچھے ہٹے تو اس کے بعد اس ملک سے ہمارا سارا خیمہ اکھڑ جائے گا۔ مگر یہ ایک لغو بات تھی۔ چنانچہ بابری مسجد کا ڈھانچہ ٹوٹ گیا اور ملت کا وجود بدستور پوری طرح باقی ہے۔

نا امیدی میں امید

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی۔ اس کے بعد ۶ جنوری ۱۹۹۲ کو دہلی کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے میری گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کا خاتمہ کرنے میں ہمارے دشمن کامیاب ہو گئے۔ اب آپ کی رائے کیا ہے۔ کیوں کہ اب تو اس معاملہ میں ہمارے لیے امید کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔

میں نے کہا کہ اس دنیا میں امید کی مقدار، نا امیدی کی مقدار سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں یقینی طور پر مجھے اب بھی امید کا پہلو دکھائی دے رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوؤں نے بابری مسجد کا ایک ایک پتھر وہاں سے ہٹا دیا اور جہاں پہلے بابری مسجد تھی وہاں اپنا ایک عارضی مندر بنا کر کھڑا کر دیا۔ اب کس پارٹی میں یا کس حکومت میں یہ طاقت ہے کہ وہ رام مندر کو وہاں سے ہٹائے اور دوبارہ وہاں بابری مسجد کی تعمیر کرے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے اب بھی امید کا پہلو موجود ہے۔

مذکورہ گفتگو کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ اکثر لوگوں کے لیے مایوسی کا سبب کیا ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ لوگ نا امیدی کے مواقع پر امید کا پہلو دیکھ نہیں پاتے۔ وہ دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا سبب سوچ کی کمزوری ہے۔ وہ عین اسی مقام پر امید کا پہلو دیکھنا چاہتے ہیں جہاں ان کے ساتھ نا امیدی کا واقعہ پیش آیا ہے۔ اور چونکہ اکثر حالات میں امید کا مقام نا امیدی کے مقام سے الگ ہوتا ہے، اس لیے لوگ یہ سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے امید کا پہلو یہاں موجود ہی نہیں۔

مذکورہ مسلمان سے جب میں نے کہا کہ اجودھیا کے واقعہ میں ہمارے لیے امید کا پہلو موجود ہے تو اس سے میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ امید کا یہ پہلو خود اجودھیا ہی میں موجود ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اجودھیا کی سطح پر اگرچہ بظاہر امید کا پہلو ختم ہو گیا ہے۔ مگر ملت کی سطح پر امید کا پہلو اب بھی پوری طرح پایا جا رہا ہے۔

سیدھا مطلب یہ تھا کہ یہ حادثہ انشاء اللہ مسلمانوں کے لیے زحمت میں رحمت ثابت ہوگا۔ یہ واقعہ ان کے ذہن کو جھنجھوڑ دے گا۔ وہ ان (beginning of the end) کی جذباتیت کو ختم کر کے انھیں حقیقت پسند بنائے گا۔ اس کے بعد ان کی سوچ میں مثبت تبدیلی آئے گی۔ وہ زیادہ حقیقت پسندانہ طور پر زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے۔

یہی صورت حال اسلام کی ابتدائی تاریخ میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت پیش آئی تھی۔ حدیبیہ کے معاملہ کو جب قرآن میں فتح مبین کہا گیا تو بعض مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ان کا ذہن اس وقت حدیبیہ کے مقام پر اٹکا ہوا تھا۔ وہ فتح کو عین حدیبیہ کے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ خود حدیبیہ کے مقام پر اس وقت فتح کا کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس لیے ان کی سمجھ میں نہ آسکا کہ حدیبیہ کا معاملہ فتح مبین کا معاملہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

دور اول میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت جس فتح مبین کی خوش خبری دی گئی تھی وہ مقام حدیبیہ سے باہر تھی۔ اسی طرح آج اجودھیا کے معاملہ میں امید کا جو پہلو ہے وہ اجودھیا سے الگ پایا جاتا ہے نہ کہ خود اجودھیا میں۔

قرآن میں یہ فطری حقیقت بتائی گئی ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس مقام پر عسر کی حالت پیدا ہوئی ہے، عین اسی مقام پر اور وہیں یسر کی حالت بھی پائی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت عسر ظاہر ہوتا ہے، اسی وقت یسر بھی کہیں نہ کہیں موجود رہتا ہے جس کو غور و فکر کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً اسلام کے ابتدائی دور میں جب مکہ میں عسر کی حالت پیدا ہوئی تو یسر کی حالت تین سو میل دور مدینہ میں ظاہر ہوئی۔ حدیبیہ میں جب عسر کا تجربہ ہوا تو یسر کے مواقع عرب کے قبائل میں اشاعت اسلام کی صورت میں سامنے آئے۔ تاتاری حملہ کے وقت جب اسلام کی سیاسی طاقت ٹوٹی تو اسلام کی دعوتی طاقت فاتح تر بن کر ظاہر ہوگئی۔ وغیرہ۔

اسی طرح اجودھیا کے عسر میں بھی یسر کا پہلو چھپا ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے۔ اور پھر دانش مندی کے ساتھ اس کو مستقبل کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جائے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے وہ کام کر دیا ہے جو سرسید بھی نہ کر سکے تھے۔ سرسید صرف کچھ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے تھے، بھارتیہ جنتا پارٹی نے عام مسلمانوں کو تعلیم کے راستہ میں ڈال دیا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۳ کی رات کو دس بجے حیدرآباد سے حبیب بھائی کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے حادثہ نے حیدرآباد کے مسلمانوں کو ہلا دیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں واضح طور پر تعمیری ذہن بن رہا ہے۔ ہر آدمی ماضی کی شکایت کرنے کے بجائے مستقبل کی تعمیر کی بات کر رہا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سوچنے لگے ہیں کہ ہمیں جھگڑے والی باتوں کو نظر انداز کر کے تعلیم اور اقتصادیات اور دوسرے ترقی کے میدانوں میں اپنی جدوجہد جاری کر دینا چاہیے۔ اس عمل کو تیز تر کرنے کے لیے حبیب بھائی اور ان کے ساتھیوں نے طے کیا ہے کہ اپنے علاقہ میں الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیں۔

اس گفتگو کے بعد میں اپنے بستر پر سو گیا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے دوبارہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی کہ میں مسز زبیر رضوی ریڈیو اسٹیشن سے بول رہی ہوں۔ ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ دہلی میں مسلم خواتین کی بیداری کا کام کریں۔ اس وقت سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں میں تعمیری ذہن پیدا کریں۔ ان کو نفرت اور شکایت والی سوچ سے بچائیں اور ان کے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ وہ جھگڑے والی باتوں سے دور رہ کر اپنے مستقبل کی تعمیر کی جدوجہد کر سکیں۔ اس کے مطابق ہم نے آج شام کو دہلی میں مسلم خواتین کا ایک اجتماع رکھا ہے۔ آپ اپنی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ خانم کو وہاں بھیجیں تاکہ وہ اس معاملہ میں ہمارا تعاون کر سکیں۔

یہ ان بہت سے تجربات میں سے صرف دو تجربہ ہے جو ۶ دسمبر کے بعد سے مسلسل سامنے آرہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۶ دسمبر کے واقعہ کو ہندستان کے مسلمانوں نے ٹریجڈی کے دن کے طور پر نہیں لیا۔ بلکہ اس کو ایک نیا فیصلہ لینے کا دن بنا دیا۔ اب انھوں نے طے کیا ہے کہ مسلم لیڈروں کی دوسروں کے خلاف شکایتی تقریروں اور غیر مسلم انتہا پسندوں کے اشتعال انگیز نعروں کو نظر انداز کر کے "اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ تعلیم کا رجحان مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

یہ بلاشبہ ایک صحت مند فیصلہ ہے۔ اور جو لوگ ایسا فیصلہ کر لیں، ان کی ترقی کسی بھی حال میں اور کسی بھی مقام پر رکنے والی نہیں۔

ایک تقریر

آج کی بحث کا موضوع ہے : ہماری ری پبلک ۶ دسمبر کے بعد (Our Republic - Post 6 December 1992) انڈیا کی تاریخ میں ۶ دسمبر کا واقعہ بلاشبہ ایک ہلا دینے والا واقعہ ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہماری ری پبلک کے ڈھانچہ میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی آنے کا امکان نہیں۔ اس کے کئی واضح اسباب ہیں۔

۱۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا واقعہ ایک کھلا ہوا تشدد کا واقعہ تھا۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ اگر کسی کو یقین ہو کہ وہ غیر متشددانہ طور پر اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے تو وہ کبھی تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ تشدد کا طریقہ اختیار کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے لیے پُرامن اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے تو ۶ دسمبر کا واقعہ اصحابِ واقعہ کے لیے اپنی نفی آپ (سلف نگیشن) کے ہم معنی تھا۔ جن لوگوں نے یہ تشدد کیا، انھوں نے ایسا کر کے خود اپنے آپ کو پیچھے دھکیل دیا ہے نہ کہ ہماری ڈیموکریٹک سیکولر ری پبلک کو۔ ۶ دسمبر کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے پیچھے جو تحریک ہے، یہ اس کے لیے خاتمہ کا آغاز۔ (blessing in disguise) کے ہم معنی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ جس مذہبی۔ سیاسی تحریک نے ۶ دسمبر کا واقعہ کیا وہ دراصل پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں چلنے والی ان تحریکوں کا بھارتی ایڈیشن ہے جس کو عام طور پر اسلامائزیشن کی تحریک کہا جاتا ہے۔ اسلامائزیشن کی یہ تحریکیں اس سے پہلے پاکستان اور مصر اور دوسرے کئی مسلم ملکوں میں زور و شور سے چلائی گئیں۔ لیکن ہر جگہ وہ ناکام رہیں۔ مسلم ملکوں کی ان تحریکوں نے وقتی طور پر سماج میں کچھ ازعاج (nuisance) تو ضرور پیدا کیا۔ مگر اس سے آگے ملک کا نقشہ بدلنے میں وہ کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں کی یہ تحریکیں دراصل خلاف زمانہ تحریکیں تھیں۔ وہ اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف تھیں۔ ٹھیک اسی طرح انڈیا کی مذہبی۔ سیاسی تحریک بھی اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ بھی زیادہ سے زیادہ سماج میں کچھ ازعاج پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے

گے وہ کوئی انقلابی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ زمانہ سے لڑکر اپنا ایک الگ سیاسی جزیرہ بنا سکے۔ مسلم فنا ٹسزم مسلم ملکوں میں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اسی طرح ہندو فنا ٹسزم بھی یہاں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

۳۔ انڈیا کی یہ مذہبی۔ سیاسی تحریک بنیادی طور پر ہندی اسپیکنگ کمیونٹی کی تحریک ہے۔ اس کا سب سے بڑا مرکز یوپی ہے جہاں ایک ہی ریاست میں پارلی منٹ کی ۸۵ سیٹیں موجود ہیں۔ اس تحریک کا خاص ایڈوانٹج یہ ہے کہ وہ ہندی اسپیکنگ ریاستوں کے ووٹروں کے تقریباً ۲۵ فیصد حصہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، مگر اس کا سب سے بڑا ایڈوانٹج ہی اس کا سب سے بڑا ڈس ایڈوانٹج بھی ہے، کیوں کہ اس کی جس صفت میں نصف انڈیا کے لیے اپیل ہے، وہی صفت بقیہ نصف میں اس کو غیر معقول بنا دیتی ہے۔ یہ انڈیا کا غیر ہندی خواں علاقہ ہے۔

ساوتھ انڈیا کے سلسلہ میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ وہ ہندی کے لسانی غلبہ کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ پھر وہ ہندی کے لسانی غلبہ کے ساتھ ہندی دانوں کے سیاسی غلبہ کو کس طرح گوارا کرے گا۔

۴۔ مذہب کا کام کیرکٹر بلڈنگ ہے، مذہب کا کام گورنمنٹ بلڈنگ نہیں۔ مذہب سے اگر کیرکٹر بنانے کا کام لیا جائے تو یہ مذہب کی تعمیل ہے۔ لیکن اگر مذہب کو گورنمنٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ مذہب پر عمل کرنا نہیں، یہ مذہب کا اکسپلائٹیشن ہے۔ اور اکسپلائٹیشن کبھی بھی بہت دیر تک کارآمد نہیں ہوتا۔

کسی بھی چیز کا غلط استعمال (misuse) کرنا برا ہے۔ اور مذہب جیسی مقدس چیز کا غلط استعمال کرنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مذہب کو اکسپلائٹیشن کا ذریعہ بناتے ہیں وہ کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتے۔

اس قسم کے مختلف اسباب ہیں جو واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ۶ دسمبر نے ہماری ری پبلک کے لیے کوئی قابل لحاظ مسئلہ پیدا نہیں کیا ہے۔ کچھ وقتی خلفشار کے بعد ہماری گاڑی دوبارہ اپنی پٹری پر آجائے گی۔ اور پھر وہ اسی طرح چلنے لگے گی جس طرح وہ اس سے پہلے چل رہی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۳ ، شمارہ ۱۹۹

AL-RISALA (Urdu) Monthly
, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel4697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn : Al-Risala)
Single Copy Rs 6: Annual Subscription Rs 70/$25 (Air-mail)

نماز ذریعۂ علاج

كانَ فتیً من الانصار یصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا یدع شیئا من الفواحش والسرقۃ الا رکبہ۔ فذُکر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: ان الصلاۃ ستنهاہ۔ فلم یلبث ان تاب وصلحت حالہ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الم اقل لکم

(الجامع لاحکام القرآن ۱۳/۳۴۸-۳۴۷)

انصار کا ایک نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ فواحش اور سرقہ کا بھی ارتکاب کرتا تھا۔ اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز عنقریب اس کو ان چیزوں سے روک دے گی۔ آخر کار اس نے توبہ کرلی اور اس کا حال درست ہوگیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔

نماز اگر واقعی شعور کے ساتھ پڑھی جائے تو وہ آدمی کے اندر حساسیت کو جگانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب آدمی کے اندر دینی حساسیت جاگ اٹھتی ہے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ اصلاح کے راستہ کو اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے بعد نماز اس کے لیے صرف ایک روایتی عمل نہیں رہتی، بلکہ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ان الصلاۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (نماز آدمی کو فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے)

مذکورہ نوجوان پہلے بے شعوری کی نماز پڑھتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن بدلا۔ وہ چونکہ عربی جانتا تھا، اس لیے قرآن کی قرأت اور نماز کی دوسری دعائیں اور اذکار اس کے ذہن پر اثر ڈالتے رہے۔ مسجد میں اہلِ ایمان سے ملاقات اور گفتگو اس کو نئی سوچ کی طرف بڑھاتی رہی۔ اس طرح کی مختلف چیزیں مسلسل اس کے اوپر اثر انداز ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ بے روح نمازی سے اوپر اٹھ کر وہ سچا نمازی بن گیا۔

ہر شکل کے ساتھ ایک اسپرٹ ہوتی ہے۔ کوئی آدمی اگر شکل کو پوری طرح اختیار کرلے تو اسپرٹ بھی دھیرے دھیرے اس کے اندر پیدا ہوجائے گی۔

کلمۂ حکمت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتاتی ہیں آپ کو جب بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت کا اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت انتخاب فرماتے تھے (ماخیّر بین امرین إلا اختار ایسرھما)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دانش مند وہ نہیں جو خیر اور شر کے فرق کو جانے۔ ہ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کون سا خیر ہے (لیس العاقل الذی یعرف خیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیۃ للعقاد، صفحہ ۵۰۵

اسی بات کو امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ دانش مند وہ نہیں ہے جس کو خیر اور شر کے درمیان تخاب کرنا ہو اور وہ ایک چیز کا انتخاب کر لے۔ دانش مند تو وہ ہے جو دو شر کے درمیان ہ جائے اور پھر دونوں میں سے جو آسان ہے اس کا انتخاب کرے (لیس العاقل ـذی یقع بین الشر والخیر فیختار۔ انما العاقل الذی یقع بین الشرین یختار ایسرھما) الامام الشافعی، تالیف عبد الحلیم الجندی، القاہرہ، صفحہ ۴۹

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ شہر میں غیر مسلموں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ مسلم الف نعرہ لگاتا ہوا مسلمانوں کے محلہ سے گزرتا ہے جو مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر دینے والا ہے۔ یہ بظاہر شر کی ایک صورت حال ہے۔ لیکن بار بار کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمان اگر اس شر کو ٹانے کے لیے اٹھیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ جلوس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے بجائے عملاً جو چیز پیش تی ہے وہ یہ کہ جلوس کا معاملہ بڑھ کر فساد کا معاملہ بن جاتا ہے۔

گویا اس مسئلہ میں مسلمانوں کے لیے واقعی انتخاب جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے۔ لکہ جلوس اور فساد میں ہے۔ اب مذکورہ اسلامی اصول کے مطابق، عقل مند وہ ہے جو جلوس کو وارہ کر لے تاکہ وہ ہلاکت خیز فساد سے بچ جائے۔

موجودہ دنیا میں تمام معاملات کا حال یہی ہے۔ یہاں اکثر اوقات کم شر اور زیادہ شر کے رمیان انتخاب کا مسئلہ رہتا ہے نہ کہ خالص شر اور خالص خیر کے درمیان۔

قرآن میں تفکر

قرآن میں کہا گیا ہے کہ ـــــ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات او
دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹ
کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ وہ کہ
اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ
کے عذاب سے بچا (آل عمران ۱۹۱ - ۱۹۰)

تمام بہترین باتیں آدمی کو غور وفکر کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایک عرب شاعر نے نہایت
صحیح کہا کہ جب آدمی کے اندر فکر اور سوچ کی کیفیت ہوتی ہے تو ہر چیز سے اس کو نصیحت حاصل
ہوتی ہے :

إذا المرء كانت له فكرة ففي كل شيء له عبرة

اس آیت کے سلسلہ میں مختلف حدیثیں منقول ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کے
مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ ان آیتوں کو پڑھیں ان کو چاہیے کہ وہ ا
پر غور کریں (فليتفكروا فيها) آپ نے فرمایا کہ اس شخص کی خرابی ہے جس نے ان آیتو
کو پڑھا مگر اس پر غور نہیں کیا (ويل لمن قرأ هٰذه الآيات ثم لم يتفكر فيها) ۴۴۱

امام الاوزاعی سے پوچھا گیا کہ ان آیات میں تفکر سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے جواب
کہ آدمی ان کو پڑھے اور وہ ان کو سمجھے (قيل للاوزاعي ما غاية التفكر فيه
قال : يقرؤهن وهو يعقلهن) ۱/۴۴۱

عامر بن عبد قیس کہتے ہیں کہ میں نے ایک سے زیادہ اصحاب رسول کو یہ کہتے ہوئے
کہ ایمان کی روشنی غور وفکر ہے (ان ضياء الايمان التفكر) حضرت عمر بن عبدا
نے کہا کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرنا سب سے اعلیٰ عبادت ہے (الفكرة في نعم الله
افضل العبادة) بشر بن الحارث الحافی نے کہا کہ اگر لوگ اللہ کی عظمت میں غور کریں تو وہ
گناہ نہ کریں (لو تفكر الناس في عظمة الله تعالى لما عصوه)

شکر خداوندی

انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کا شکر کرنے والا بنے۔ شکر گزاری پورے دین کا خلاصہ ہے۔ قرآن میں بار بار مختلف انداز میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ شکر کو سب سے بڑی حکمت بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرے گا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے (لقمان ۱)

انسان کے پاس جو کچھ ہے، سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ انسان کا جسم، اس کی ذہنی صلاحیتیں، زندگی کے تمام مواقع، ہر قسم کے وسائل و ذرائع سے بھری ہوئی دنیا، شمسی نظام اور ساری کائنات، غرض ذرہ سے لے کر ستاروں تک تمام چیزیں خدا کا عطیہ ہیں۔

ان بے شمار اعلیٰ چیزوں کو دیکھ کر ایک طرف اللہ کی عظمت کا احساس ابھرتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے سینہ میں یہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھ کو ہر ضرورت اور ہر راحت کی چیز انتہائی وافر مقدار میں فراہم کر دی، جب کہ میں ان میں سے کسی چیز کو بھی پیدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یہ احساسات آدمی کے اندرونی وجود میں طوفان بن کر امنڈتے ہیں اور پھر اعتراف کے کلمات کی صورت میں اس کی زبان سے بے تابانہ نکل پڑتے ہیں، اسی کا نام شکر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث نہایت سبق آموز ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت امام احمد اور امام الترمذی نے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص انسانوں کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرے گا (من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامت کیا ہے جو یہ بتاتی ہے کہ آدمی کے اندر شکر خداوندی کی کیفیت موجود ہے یا نہیں۔ وہ علامت شکر انسانی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر انسانوں کا شکر کرنے کا مزاج پایا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کے اندر اللہ کا شکر ادا کرنے کی صفت بھی موجود ہے۔ اور اگر یہ دکھائی دے کہ لوگ انسانی احسان کا شکر ادا کرنے کی صفت سے خالی ہو گئے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خداوندی احسان کا شکر ادا کرنے کی صفت سے بھی خالی ہیں۔

روح دین

ایک سفر کے دوران مجھے ایک ایسے ملک میں جانا پڑا جہاں پہلے بادشاہی نظام تھا۔ اب بادشاہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہاں صدر راج قائم ہے۔ قدیم شاہی محل کی تمام شان وشوکت باقی ہے۔ البتہ اب اس کو شاہی محل کے بجائے صدارتی محل کہا جاتا ہے۔

میں اور کانفرنس کے دوسرے شرکا، صدر مملکت سے ملاقات کے لیے صدارتی محل میں لے جائے گئے۔ ہم لوگ جب اس پُر ہیبت عمارت میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہر آدمی کا انداز اچانک بدل گیا ہے۔ لوگوں پر خاموشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ محل کی ہر چیز کو وہ پُر رعب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی خدا کا ایک عظیم محل ہے۔ اس میں ہر طرف خدا کی عظمت وقدرت کے جلوے نمایاں ہیں۔ اس خدائی محل کے اندر چلتے ہوئے مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر وہ کیفیت طاری ہونا چاہیے جو کسی شاہی محل کے اندر چلتے ہوئے اس کے اندر طاری ہوتی ہے۔

مگر جب میں دنیا کے راستوں میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کر کے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہاں لوگ اس طرح چل رہے ہیں گویا کہ انھیں اس عظیم حقیقت کی کوئی خبر ہی نہیں۔ لوگوں کے چہروں پر خشوع جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا جو از روئے واقعہ ان کے چہروں پر جھلکنا چاہیے۔

لوگوں کے چہروں پر مجھے احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال تواضع کے بجائے سرکشی کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بے حسی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا سنجیدہ بھی نظر نہیں آتے جتنا کوئی شخص کسی ایوان صدارت یا کسی قصر شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ انسانی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہو مگر خدائی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے آج ہی دور ہو گئے۔

زمانہ کا فرق

چمگادڑ کی عادت ہے کہ وہ عام چڑیوں کی طرح نہیں بیٹھتا۔ بلکہ بیٹھنے والی جگہ کو پیروں سے پکڑ کر لٹک جاتا ہے۔ چمگادڑ کی یہ عادت قدیم زمانہ میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ وہ شاخ یا اس قسم کی دوسری چیزوں پر لٹکتا اور پھر جب چاہتا اڑ جاتا۔

مگر اب بجلی کے زمانہ میں چمگادڑ کی یہ عادت اس کے لیے موت کا سبب بن گئی ہے۔ عام چڑیاں اب بھی بجلی کے تار پر بیٹھتی ہیں اور اڑ جاتی ہیں۔ مگر چمگادڑ بجلی کے تار پر آتا ہے تو وہ اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کا صرف ایک تار چھونا خطرناک نہیں ہے۔ خطرناک یہ ہے کہ اس کے دونوں تاروں کو بیک وقت چھوا جائے۔ عام چڑیاں صرف ایک تار پر بیٹھتی ہیں۔ ان کا تعلق دوسرے تار سے ہونے نہیں پاتا اس لیے وہ محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے برعکس چمگادڑ اپنی عادت کی وجہ سے تار کو پکڑ کر لٹکتا ہے۔ قدرتی طور پر اس کا جسم دوسرے تار کو بھی چھونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے شارٹ سرکٹنگ ہوتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔

چمگادڑ کے لیے یہ عذر ہے کہ اُس کو زمانہ کے اِس "فرق" کا پتہ نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی غلطی اکثر وہ انسان کرتا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے عقل اور شعور دیا ہے۔ وہ زمانہ کے فرق کو جاننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ چمگادڑ ہے نہ کہ عقل و ہوش والا انسان۔

موجودہ زمانہ میں جو فرق پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک فرق یہ ہے کہ آج کا زمانہ کسی انسان کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ مگر تشدد کو وہ مکمل طور پر جرم قرار دیتا ہے۔ ماضی میں یہ فرق اتنی واضح صورت میں موجود نہ تھا۔ اب جو لوگ اس فرق کو سمجھیں وہ امن کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کریں گے، وہ تشدد کے دائرہ میں داخل نہ ہوں گے اور اس طرح کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے ماضی کے ذہن کی بنا پر اس فرق کو نہ سمجھیں وہ اپنی جدوجہد میں اس کو ملحوظ نہ رکھیں گے۔ وہ امن کے دائرہ سے گزر کر تشدد کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے، اور نتیجۃً ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

انسان کی تبدیلی

دنیا کے وہ تمام لوگ جن کی طرف بڑی بڑی فتوحات کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کی فتوحات صرف سیاسی فتوحات ہیں۔ انھوں نے حکومتوں کو بدلا، مگر وہ انسان کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ کی تمام کامیاب مثالیں تبدیلیٔ حکومت کی مثالیں ہیں نہ کہ تبدیلیٔ انسان کی مثالیں۔ ہندستان میں بظاہر ایک "مہاتما" کے ذریعہ نظام کی تبدیلی عمل میں آئی۔ مگر ہندستان کی مثال بھی اس معاملہ میں کچھ مختلف نہیں۔ یہاں ۱۹۴۷ میں حکومت بدلی۔ بدیسی حکمرانوں کے بجائے دیسی حکمراں اقتدار پر قابض ہو گیے۔ مگر جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر حکومتوں کی تبدیلی حالات کی تبدیلی کے ہم معنی نہیں بنتی۔ بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے بعد جو نیا نظام بنتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ برا ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ــــــ انقلاب اس کامیاب کوشش کا نام ہے جس کے ذریعہ ایک خراب حکومت سے نجات پاکر ایک خراب تر حکومت اپنے اوپر مسلط کر لی جائے:

A revolution is a successful effort to get rid of a bad government and set up a worse.

پوری تاریخ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال واحد مثال ہے جب کہ صرف حکومت نہیں بدلی، بلکہ اسی کے ساتھ انسان بھی مکمل طور پر تبدیل ہو گیے۔

اس کا بنیادی سبب پیغمبر اور سیاسی لیڈر کے طریق کار کا فرق ہے۔ لیڈر ہمیشہ سیاسی اور معاشی مسائل کو لے کر اٹھتا ہے۔ وہ عوام کو وقت کے حکمراں کے خلاف بھڑکا کر اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبر آخرت کے مسائل کو لے کر اٹھتا ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف سوچنے کا پیغام دیتا ہے۔ لیڈر احتساب غیر کی بنیاد پر تحریک چلاتا ہے اور پیغمبر احتساب خویش کی بنیاد پر۔ انھیں دونوں لفظوں میں دونوں کے انجام کا فرق چھپا ہوا ہے۔

پیغمبر کا اسوہ اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ حکومتوں کو توڑنا کوئی کام نہیں۔ انسان کو بدلو، اس کے بعد حکومت کا نظام اپنے آپ بدل جائے گا۔

سب سے بڑی ناقدری

آدمی کے اندر ایک سوئی کے زخم کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں، اس کے باوجود آدمی اتنے بڑے ے جرم کرتا ہے کہ اگر اس کو بلڈوزر کے نیچے ڈال کر پیس دیا جائے اور ہزار سال تک پیسا جاتا رہے۔ تب ، وہ اس کی سزا کے لیے کافی نہ ہو ——— ایک آہ کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان سے نکلے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزادی دی، اور اسی کے ساتھ اس کو اچھے اور برے کی تمیز عطا فرمائی۔ ان کو اس طرح اس لیے پیدا کیا گیا تاکہ وہ خود اپنے ارادہ سے برائی کو چھوڑ دے اور اچھائی کو پکڑ لے۔ اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت سرکشی سے بچے اور فرماں برداری کے طریقہ کو اپنا طریقہ بنائے۔

یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے ترقی اور کامیابی کا عظیم الشان موقع کھولنا تھا۔ اس کا مقصد یہ اکہ اس کو وہ سب سے بڑا انعام دیا جائے جو وسیع کائنات میں کسی بھی دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ یعنی ٹی کا امکان ہوتے ہوئے خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اللہ کی ماتحتی میں دیدینا۔ یہ اللہ کے نزدیک انتہائی ریدہ عمل تھا۔ چنانچہ اللہ نے اس کے بدلہ میں انسان کے لیے ایسی ابدی جنتیں مقدر کیں جن سے زیادہ نفیس اور احت چیز تصور کے درجہ میں بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مگر انسان کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو اس واقعہ کی خبر ہی نہیں، جیسے کسی کو اس ربانی سوبہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو فرصت ہی نہیں کہ وہ اس امکان کو جانے ر اس قیمتی موقع کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ تمام لوگ آنکھیں بند کر کے جہنم کی ف بھاگے جا رہے ہیں، کسی کو جنت کے دروازے کی طرف دیکھنے کی جیسے فرصت ہی نہیں۔

یہ گویا خدا کی پکار کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ خدا کی میزبانی کو قبول نہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ بلاشبہ سب ے بڑی ناقدری ہے جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی ناقدری کا انجام سب سے بڑی ا کے سوا اور کچھ نہیں۔

آہ وہ دنیا جہاں لوگ جہنم کا لفظ بولیں مگر کوئی جہنم سے ڈرنے والا نہ ہو۔ جہاں لوگ جنت نام لیں مگر کوئی نہ ہو جو جنت کی سچی طلب سے اپنے سینہ کو آباد کیے ہوئے ہو۔ کیسی عجیب ہے یہ یا اور کیسی عجیب ہوگی اس دنیا کے بعد آنے والی آخرت۔

امن کمیٹی

دہلی کے اردو روزنامہ قومی آواز (۱۹ جنوری ۱۹۹۲) میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔اس کا عنوان ہے : مسجد، مندر سے لاوڈ اسپیکر ہٹا لینے کا کولھاپور میں متفقہ فیصلہ۔ پوری خبر اس طرح ہے :

"مسلم مذہبی رہنماؤں اور بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں نے مسجدوں سے لاوڈ اسپیکر ہٹانے کا اور مہا آرتی فوراً ختم کر دینے کا متفقہ فیصلہ کر لیا ہے۔

ضلع مجسٹریٹ کے ترجمان نے بتایا کہ ۱۶ جنوری کو ضلع کلکٹر اجیت کمار جین کی جانب سے امن کی اپیل کے جواب میں گزشتہ رات یہاں مسلم مذہبی رہنماؤں اور آمھی بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ ترجمان نے کہا کہ لاوڈ اسپیکروں کے ذریعہ نماز اور مہا آرتی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتہ سے شہر میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں شہر میں آتش زنی اور پتھراؤ کی وارداتوں کی اطلاعات مل رہی تھیں۔

ضلع کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس فیصلہ کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے شہر میں امن اور بھائی چارہ برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ (صفحہ ۱)

یہ ایک خوش کن چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ باہمی اختلاف پیش آنے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ اپنے اختلافات کو بھائی چارہ کے اصول پر حل کریں گے۔

ضرورت ہے کہ ہر شہر اور ہر بستی میں امن کمیٹی بنائی جائے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے بزرگ لوگ شامل ہوں۔ جب بھی دونوں فرقوں میں کوئی اختلافی بات پیش آئے یا کسی بات پر تناؤ کی فضا ہو تو فوراً امن کمیٹی کے لوگ بیٹھ کر مشورہ کریں۔ اور باہمی مشورہ سے معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

امن کمیٹی اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ تجربہ ہے کہ جہاں کہیں بھی امن کمیٹی بنائی گئی وہاں وہ فساد کے خلاف ایک طاقتور چیک بن گئی۔ اسی کامیاب تجربہ کو ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے، خواہ وہ چھوٹی جگہ ہو یا کوئی بڑی جگہ۔

فرق کو جانئے

رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ – ۱۹۷۷) اردو کے مشہور ادیب تھے۔ وہ مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ آل احمد سرور نے ان کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے :

ڈاکٹر ضیاء الدین نے نظام حیدر آباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا، اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجئے گا، پسند نہ آئے گا"۔ بولے "کیوں"۔ میں نے کہا : "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ، ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئے گا"۔ یہی ہوا۔ ایڈریس سن کر کہنے لگے۔ "کچھ جنچا نہیں، پھر کوشش کیجئے"۔ رشید صاحب نے نظر ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا: "مغلوں کے عہد نے ہندستان کو تین تحفے دیے۔ تاج محل، غالب اور دولت آصفیہ"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدر آباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبین پر شکن ہی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجئے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے، اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر اردو شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے، تو ایسے شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

(رشید احمد صدیقی، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۴۳)

ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) ایک سائنس داں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے اس تبصرہ میں ایک غیر سائنسی بات کہی۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ایڈریس اور قصیدہ میں فرق نہیں کیا۔ شعبۂ اردو جس مضمون کو تیار کرنے میں "ناکام" ہوا تھا، وہ مدحیہ قصیدہ تھا نہ کہ فی الواقع ایڈریس۔ اس کا تیار کردہ مضمون پورے معنوں میں ایڈریس تھا، البتہ وہ مدحیہ قصیدہ نہ تھا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرے۔ عام طور پر لوگ اس طرح فرق کر کے نہیں سوچ پاتے، اس لیے وہ اکثر رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ ایک صورتِ معاملہ پر دوسری صورتِ معاملہ کو قیاس کر لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔

ہندو مسلم ڈائیلاگ

ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۸۹۶ - ۱۹۷۸) نے اپنی کتاب مسلمانانِ ہند کی تقدیر The Destiny of Indian Muslims میں یہ نشاندہی کی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو انقلاب آیا ہے، اس کے بعد یہاں کے سماجی اور سیاسی حالات میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ اب انڈیا میں جمہوریت کا نظام ہے۔ مگر ہندستانی مسلمان ابھی تک قدیم حاکمانہ دور میں سوچ رہے ہیں۔ سوچ کا یہ پچھڑاپن ہی ان کے تمام مسائل کا بنیادی سبب ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے برٹش دور میں ان کا سابقہ ایک ایسی گورنمنٹ سے تھا جو یہاں کے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ اس کی حیثیت ایک مختارِ کل (Supreme Arbiter) کی سی تھی جو عوام کی مرضی کا لحاظ کیے بغیر کارروائی کر سکتی تھی۔ مگر اب انڈیا ایک جمہوریت ہے۔ اب یہاں کے حکمراں کو عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ یہاں کے عوام سے اپنے معاملات طے کریں نہ کہ حکمرانوں سے۔

مگر انڈیا کے مسلمان اب بھی اپنے معاملات میں حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ آج بھی اپنے مسائل کو گورنمنٹ کے پاس لے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے مسائل کو حل کر دے گی:

But Muslims still labour under the impression that solution of their problems is in the hands of the Government. To the Government alone they take their troubles and from it alone they expect a remedy (p.295).

مسلمانانِ ہند کی جدید تاریخ کے بارہ میں یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ اور بابری مسجد اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک اس کی بدترین مثال ہے۔ ۱۹۸۶ کے بعد مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے جس طرح بابری مسجد تحریک کو چلایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے اس اشو پر ہندو عوام سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا، اور حکومت کی یہ ذمہ داری سمجھی کہ وہ ان کی طرف سے کافی ہو جائے اور اس معاملہ میں مختارِ کل بن کر ان کے حق میں فیصلہ دیدے۔

مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ نے بتایا کہ یہ مفروضہ سراسر غلط تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر

میں وزیر اعظم ہند نے اعلان کیا کہ وہ بابری مسجد کو ڈھانے نہیں دیں گے۔ دسمبر میں انھوں نے پولیس فورس کی دس کمپنی (۲۰ ہزار سے زیادہ) اجودھیا کی سرحد پر پہنچادیں اور بہت سے دوسرے سرکاری انتظامات کیے۔ مگر عملاً وہی ہوا جو ہندو عوام چاہتے تھے ——— ۶ دسمبر کو کارسیوکوں نے اجودھیا میں گھس کر بابری مسجد کو ڈھادیا، انھوں نے اس کا ایک ایک پتھر وہاں سے اٹھاکر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد انھوں نے عین اسی جگہ پر ایک عارضی مندر بنا دیا۔ مزید یہ کہ انھیں اس کی بھی عدالتی اجازت مل گئی کہ وہ اس نئے مندر میں رام للا کی مورتیاں رکھ کر اس کا درشن اور پوجا شروع کردیں۔

یہ واقعہ واضح طور پر حکومت کے اوپر عوام کی برتری کا ثبوت ہے۔ وہ آخری طور پر ثابت کررہا ہے کہ اس ملک میں برتر حیثیت عوام کو حاصل ہے نہ کہ ان افراد کو جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوکر محدود مدت کے لیے وزارت بناتے ہیں۔ اب عقل و تدبر سے خالی ہی کوئی شخص یہ یقین کرسکتا ہے کہ جو مرکزی حکومت بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو توڑے جانے سے نہ بچاسکی وہ مرکزی حکومت ایسا کرسکتی ہے کہ نئے بنے ہوئے مندر کو بزور توڑے، اس میں نصب شدہ رام کی مورتیوں کو ہٹائے، اور پھر عین اسی جگہ پر دوبارہ بابری مسجد بناکر کھڑی کردے۔

مگر حیرت انگیز بات ہے کہ یہ کھلا ہوا واقعہ بھی مسلمانوں کے نااہل لیڈروں کی بے خبری کو توڑ نہ سکا۔ جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہو چکا ہے، ۵ اپریل ۱۹۹۳ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تقریباً ڈیڑھ درجن ممتاز افراد دہلی میں جمع ہوئے۔ انھوں نے اتفاق رائے سے ایک میمورنڈم تیار کیا۔ اس میمورنڈم میں یہ مانگ کی گئی تھی کہ حکومت اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو اور مورتیوں کو ہٹائے اور بابری مسجد کو اس کی سابقہ جگہ پر دوبارہ تعمیر کرے۔ اس کے بعد یہ وفد وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ سے ملا اور مذکورہ میمورنڈم کو ان کے حوالے کیا۔

یہ بلاشبہ خلاف زمانہ عمل Anachronism کی بدترین مثال ہے۔ ۶ دسمبر کے واقعہ سے مسلمانوں کو سب سے بڑا سبق یہ لینا چاہیے تھا کہ اب انھیں ہندو عوام کی طرف جانا ہے۔ اب انھیں اپنی کوششوں کا رخ ہندو جنتا کی طرف کرنا ہے نہ کہ دہلی میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کی طرف۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے نادان رہنما بدستور دہلی کا طواف کرنے میں مشغول ہیں۔

ایسی حالت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد نے یہ ناقابل فہم نادانی کیوں کی کہ انھوں نے وزیر اعظم سے مل کر یہ مطالبہ کیا کہ مندر کو توڑ کر دوبارہ وہیں مسجد بناؤ۔ اس کی واحد وجہ ان کی بے شعوری ہے۔ وہ ابھی تک پچاس سال پہلے والے ہندستان میں سوچ رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ آج انڈیا میں عوام کی حکومت ہے نہ کہ کسی مطلق العنان بادشاہ کی حکومت۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی اس روش کو بدلیں۔ وہ حکومت یا ایڈمنسٹریشن کی طرف دیکھنے کے بجائے ہندو عوام کی طرف دیکھیں۔ مسلم رہنما ہندو رہنما سے ملیں۔ مسلم عوام اور ہندو عوام میں زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ ہر سطح پر ہندو اور مسلم میل جول کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ تاکہ دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں دور ہوں۔ تاکہ باہمی تناؤ کے حالات ختم ہوں اور دونوں فرقے خوش گوار تعلقات کے ساتھ مل کر رہنے لگیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ہمارے مسائل کا حل مسلم۔ حکمراں ملاقات نہیں ہے بلکہ مسلم۔ ہندو ملاقات ہے۔ آج شدید ترین ضرورت ہے کہ کل ہند سطح کا ایک ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس میں دونوں فرقوں کے سنجیدہ اور باثر افراد جمع ہوں۔ اس کا مقصد خالص غیر سیاسی انداز میں امن کی تلاش ہو۔

اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے لوگ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات رکھیں۔ وہ کوشش کریں کہ باہمی نزاع کی صورت حال ختم ہو اور وہ مشترک بنیاد دریافت کی جائے جس کو اختیار کر کے دونوں فرقے اچھے پڑوسی کی طرح ایک ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ڈائیلاگ اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ اسلام کی تاریخ میں حدیبیہ کا واقعہ اسی قسم کا ایک کامیاب ڈائیلاگ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت (۶۲۲ء) کے بعد قدیم عرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے۔ کئی جنگیں اور جھڑپیں واقع ہوئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آخر کار پیغمبر اسلام ؐ نے ۶۲۸ء میں مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر تقریباً دو ہفتہ قیام کیا۔ یہاں آپ نے مکہ کے غیر مسلم سرداروں سے گفتگو کی۔ اور پھر ان کی اکثر شرطوں کو مانتے ہوئے

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک امن معاہدہ پر دستخط کیے جو کہ اسلام کی تاریخ میں معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ ڈائیلاگ اگر فی الواقع سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ کیا جائے تو وہ ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ انڈیا کی تاریخ آج جہاں رکی ہوئی ہے وہ ہندو-مسلم تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ ایک بار حل ہو جائے تو اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہونے کے بعد کوئی بھی دوسری چیز انڈیا کی ترقی کو روکنے والی نہیں۔

ڈائیلاگ کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ دونوں فریق ڈائیلاگ کو مناظرہ نہ بنائیں۔ وہ اپنے اپنے فرقے کے وکیل بن کر نہ بولیں بلکہ یہ سوچ کر بولیں کہ وسیع تر قومی مفاد کس چیز میں ہے، اور ملک کی مشترک بھلائی کا راستہ کیا ہے۔

دونوں فریق کو اپنے آپ سے یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ اشوز اور نان اشوز میں فرق کریں گے۔ وہ کسی معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ وہ کلیم اور کاؤنٹر کلیم کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے۔ وہ جو بھی کہیں گے رزلٹ کو سامنے رکھ کر کہیں گے۔ ان کا انداز غیر جانب داری کا ہوگا نہ کہ طرفداری کا۔ وہ منوانے کے ساتھ ماننے کے لیے بھی تیار رہیں گے۔ وہ دوسرے سے لینا بھی چاہیں گے اور دوسرے کو دینا بھی۔

ڈائیلاگ کوئی حریفانہ میٹنگ نہیں، وہ برادرانہ میٹنگ ہے۔ اس کو ہار جیت کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد معاملہ کو سلجھانا ہوتا ہے نہ کہ معاملہ کو الجھانا۔ ڈائیلاگ کے پیچھے مفاہمت کا جذبہ ہونا چاہیے نہ کہ مقابلہ کا جذبہ۔

ڈائیلاگ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی معاملہ کو ٹکراؤ کے بجائے بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اگر اس اسپرٹ کے ساتھ ڈائیلاگ شروع کیا جائے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا دروازہ تقریباً آدھی صدی سے بند پڑا ہوا ہے۔ اور یہ ڈائیلاگ اس بند دروازہ کو یقیناً کھول سکتا ہے، بشرطیکہ اس کو سچی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے۔

نئے عہد کے دروازہ پر

۱۹۴۶ میں جب انڈیا کے بٹوارہ کا فیصلہ ہوگیا تو مہاتما گاندھی نے طے کیا کہ وہ پاکستان جائیں گے۔ یہ سفر ایک مشن کے لیے تھا۔ اور یہ مشن ان کے اپنے الفاظ میں ہندو۔مسلم دشمنی (Hindu-Muslim antagonism) کو ختم کرنا تھا۔ اس وقت وہ ۷۷ سال کے ہو چکے تھے۔ انھیں کلکتہ سے نواکھلی جانا تھا جو ان کے لیے بے حد مشکل راستہ تھا۔ مگر وہ مشکلات سے بے پروا ہو کر نواکھلی گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی یادداشت میں ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو یہ الفاظ تحریر کیے:

> My present mission is the most difficult and complicated one of my life... I am prepared for any eventuality. 'Do or Die' has to be put to the test here. 'Do' here means Hindus and Mussulmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt.
>
> (Louis Fischer, *The Life of Mahatama Gandhi*, p.449)

میرا موجودہ مشن بے حد مشکل مشن ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ پیچیدہ مشن ہے۔ میں کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرے لیے ''کرو یا مرو'' کا امتحان ہے۔ کرنے کا مطلب اس وقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ امن اور دوستی کے ساتھ باہم مل کر رہیں۔ ورنہ میں اس کی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا (صفحہ ۴۴۹)

مہاتما گاندھی نے اس معاملہ کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہی واحد چیز تھی جس پر ملک کے مستقبل کا انحصار تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو یا تو باہم مل کر ترقی کرنا تھا یا دونوں کو برباد ہو جانا تھا۔ بعد کو پیش آنے والے حالات نے مہاتما گاندھی کے اس نظریہ کی مکمل تصدیق کر دی ہے۔

انڈیا میں ہندو۔مسلم مسئلہ اتنا زیادہ پیچیدہ کیوں بن گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈیا کی آبادی میں ہندو ۸۰ فی صد ہیں اور مسلمان ۱۵ فی صد۔ بقیہ فرقے صرف ایک دو فی صد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں نکسٹ ٹو مجارٹی (بعد از اکثریت) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ عام سماجی اصول ہے کہ جہاں ایک گروہ مجارٹی میں ہو اور دوسرا گروہ نکسٹ ٹو مجارٹی کا درجہ

رکھتا ہو تو وہاں ایسے دو گروہوں کے درمیان حریفانہ کش مکش کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان مستقل طور پر فرضی یا حقیقی مسائل چھڑے رہتے ہیں۔

انڈیا میں ہندو اور مسلم مسئلہ کا اصل سبب یہی نزاکت ہے۔ ہندو یہاں مجارٹی میں ہیں اور مسلمان یہاں نکسٹ ٹو مجارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں یہ مسئلہ ہر سماج میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نقصانات سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کے بارہ میں لوگوں کو باشعور بنا دیا جائے۔ باشعور آدمی اپنی تعمیری سوچ کی بنا پر ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے جن سے بے شعور آدمی اپنے آپ کو بچا نہیں پاتا۔

دوطرفہ معاملہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اکثریتی فرقہ کے جن لوگوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھانچہ کو ڈھایا تھا، وہ بطور خود سمجھ رہے تھے کہ یہ معاملہ ان کے لیے یک طرفہ معاملہ ہے۔ مگر اس کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو اقلیتی فرقہ کے کچھ ناراض افراد نے جب بمبئی میں تیرہ طاقتور بموں (High-tech bombs) کا بھیانک دھماکہ کر کے ملک کی اقتصادی راجدھانی کو ہلا دیا تو معلوم ہوا کہ یہ معاملہ دوطرفہ ہے۔ پہلا فرقہ اگر دوسرے فرقہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو دوسرا فرقہ بھی نقصان پہنچانے کے معاملہ میں پہلے فرقہ سے کم نہیں۔ چنانچہ بمبئی کے بم دھماکوں (Bomb blasts) کے بعد آر ایس ایس کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۲۸ مارچ ۱۹۹۳) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی جو رپورٹ چھاپی ہے، اس کی سرخی بامعنی طور پر یہ قائم کی گئی ہے ——— ہم کتنے محفوظ ہیں:

How safe are we?

اس حقیقت کا اعتراف دوسرے بہت سے مبصرین نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر بزرگ صحافی مسٹر کلدیپ نائر (ریڈئنس ۴-۱۰ اپریل ۱۹۹۳) نے بمبئی کے حادثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ایک چیتاونی ہے کہ اگر آبادی میں ۱۲ فی صد کی تعداد رکھنے والا گروہ تباہ کیا جا سکتا ہے تو ۸۲ فی صد کی تعداد رکھنے والے ہندو بھی نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتے:

It is a warning that if they, the 12 per cent of the population, are sought to be destroyed, the 82 per cent of the Hindus will not stay unhurt.

اس دنیا میں جمہوری طاقت اور تشدد کی طاقت کے درمیان لازمی طور پر کوئی برابری نہیں ہے۔ اکثریت اور اقلیت کے درمیان عددی تناسب کے اعتبار سے یقیناً فرق ہوتا ہے۔ مگر تخریب کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ ایک گروہ جتنی تخریب کاری کر سکتا ہے، دوسرا گروہ بھی یقینی طور پر اتنی ہی یا اس سے زیادہ تخریب کاری کر سکتا ہے۔ اس لیے اب آخری وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ پر از سر نو غور کیا جائے اور اس کا کوئی قابل عمل حل تلاش کیا جائے، اس سے پہلے کہ بربادی کی وہ حد آجائے جس کے بعد تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

اولاً ۶ دسمبر اور اس کے بعد ۱۲ مارچ کے واقعہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ دوگونہ نوعیت کا ایک مسئلہ ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے، وہ دونوں میں سے کسی کے لیے بھی یک طرفہ برتری کا مسئلہ نہیں۔

اس مسئلہ کی سنگینی یہ ہے کہ ہندو اپنی اکثریتی طاقت کی بنا پر مسلمان کے لیے ایک مستقل چیلنج ہے، مسلمان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہندو سے اس کی یہ حیثیت چھین سکے۔ دوسری طرف مسلمان اپنی تمام تر عددی کمی کے باوجود، یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ہندو کے لیے ازعاج (nuisance) پیدا کر سکے۔ اور ہندو بھی کسی حال میں مسلمان سے اس کی یہ حیثیت چھیننے پر قادر نہیں۔

اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے سامان تشویش (concern) بن گئے ہیں۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ دونوں ہی ٹھنڈے دل کے ساتھ اس معاملہ پر غور کریں اور دوطرفہ مفاد (mutual interest) کی خاطر اس کا کوئی مستقل حل نکالیں۔ ورنہ اگر یہی حالات باقی رہے تو دونوں اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی ترقی کی منزل تک پہنچنے والا نہیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ان حالات میں میری تجویز ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندہ افراد کے درمیان ایک موثر قسم کا ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ ہندو۔مسلم جھگڑے کو اس

ملک سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے نمائندہ افراد جمع ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ باہم تبادلۂ خیال کریں۔ وہ ہمدردی کے جذبہ کے تحت ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں۔ اس ڈائیلاگ میں وہ اپنے فرقہ کے محدود مفاد سے زیادہ دیش کے عمومی مفاد کو اپنے سامنے رکھیں۔ وہ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے بھائی بھائی کی مانند گفتگو کریں۔

ڈائیلاگ کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ دونوں فریق حقیقت پسندی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کا ایک ایجنڈا تیار کریں۔ اس میں مشترک نوعیت کی بالکل ضروری باتیں درج ہوں۔ یہ ایجنڈا منصفانہ بھی ہو اور فائنل بھی۔ اس ایجنڈے کی بنیاد پر دونوں کے درمیان سنجیدہ گفتگو ہو۔ اور پھر دو اور لو (Give and take) کے اصول پر تمام باہمی نزاعات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ڈائیلاگ کے لیے حالات پوری طرح سازگار ہو چکے ہیں۔ حالات کی اسی سازگاری سے حوصلہ افزا تاثر لیتے ہوئے ہندستان ٹائمس (۹ اپریل ۱۹۹۳) نے اپنے اڈیٹوریل میں اس کی موثر وکالت کی ہے۔ اس اڈیٹوریل کا عنوان ہے ــــــ تحمل کی ضرورت :

Need for restraint

اس سلسلہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ پوری طرح ڈائیلاگ کے موڈ میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جزئی طور پر اس اسپرٹ کا مظاہرہ بھی کیا ہے جو ڈائیلاگ کو کامیابی تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، بمبئی میں ہندو صاحبان کی یہ مانگ تھی کہ ہندو محلوں میں واقع مساجد میں رات کے وقت لاؤڈ اسپیکر پر اذان نہ دی جائے۔ یا جمعہ کے دن سڑک کے اوپر نماز ادا نہ کی جائے۔ یہ بات سالہا سال سے چل رہی تھی مگر کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ ۱۹۹۳ کے آغاز میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور باہمی رضامندی سے ایک متفقہ فیصلہ کر لیا گیا۔

اس معاملہ میں جہاں تک ہندو صاحبان کا تعلق ہے، اپنے مذہب کے زیر اثر ان کا

مزاج عام طور پر رواداررہا ہے۔ تاہم بھارتیہ جنتا پارٹی کے عروج کے بعد ہندوؤں کے ایک طبقہ میں کسی قدر جارحانہ مزاج پیدا ہو گیا تھا جو کامیاب ڈائیلاگ کے راستہ میں رکاوٹ تھا۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد سامنے آنے والے حالات نے انھیں اپنے رویہ پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اب ان کے اندر بھی وہ حقیقت پسندی آگئی ہے جو ڈائیلاگ کی کامیابی کے لیے ہمیشہ ضروری ہوتی ہے۔ اپریل ۱۹۹۳ کے دوسرے ہفتہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل ایکزی کیٹیو کی میٹنگ (کلکتہ) بھی اس معاملہ میں ایک حوصلہ افزا مثال ہے۔ کیوں کہ اس میٹنگ میں پارٹی کے اعلیٰ ذمہ داروں نے طے کیا ہے کہ وہ ٹکراؤ اور جارحیت کے طریقہ کو چھوڑ کر امن اور مفاہمت کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں گے۔

آخری چارۂ کار

اس ہندو۔مسلم ڈائیلاگ کو اس عزم کے ساتھ منعقد ہونا چاہیے کہ اس کو بہر حال نتیجہ خیز بنانا ہے۔ اس کو کسی بھی حال میں "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق نہیں ہونے دینا ہے، اور اگر عزم صحیح ہو تو ایسا ہونا کچھ بھی مشکل نہیں۔

اس ڈائیلاگ کا پہلا مطلوب نشانہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دونوں فرقے ایک مشترک اتفاق نامہ تک پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ہو تو بلاشبہ یہ پوری ہندستانی قوم کے لیے نہایت خوش قسمتی کی بات ہوگی، اور ہم سب کو اس کے حق میں خدا سے اسی کی دعا کرنا چاہیے۔

لیکن بالفرض اگر اس سے اس قسم کا مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو، اور ڈائیلاگ کی کارروائی بتائے کہ دو طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کا حل نکلنے والا نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں آخری چارہ کار کے طور پر میں اپنے مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے پیغمبر کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اس کے لیے تیار ہو جائیں کہ وہ یک طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کو ختم کر دیں گے تاکہ ملک میں امن و امان قائم ہو، اور اس خطہ ارض میں بسنے والے تمام لوگ معتدل حالات میں زندگی گزارنے کا موقع پا سکیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سالہ دعوتی عمل کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مگر اس ہجرت کے بعد بھی ایسا نہ ہو سکا کہ دونوں فریق کے درمیان جھگڑا ختم ہو جائے اور اہل عرب

کو پُرامن زندگی کے مواقع حاصل ہو جائیں۔ حتیٰ کہ معاملات اس نوبت کو پہنچ گئے کہ بالکل ظاہر ہو گیا کہ یہ نزاع دو طرفہ بنیاد پر ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حریف طبقہ کی تمام شرطوں کو مانتے ہوئے یک طرفہ بنیاد پر اس نزاع کا خاتمہ کر دیا۔ ختم نزاع کا یہی وہ عمل ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے وقت اعلان کیا تھا کہ قریش (فریق مخالف) آج مجھ سے جس چیز کے لیے بھی کہیں گے جس میں کہ قرابت داری پائی جاتی ہو تو وہ چیز ضرور میں انھیں دوں گا (لا تدعونی قریش الیوم الی خطة یسألوننی فیها صلة الرحم الا اعطیتهم ایاها) سیرة ابن ہشام ۳۵۸/۳

میرا مشورہ ہوگا کہ ایسی صورت میں مسلمان اس اسوۂ رسول کی اسپرٹ پر عمل کرتے ہوئے برادران وطن سے یہ کہہ دیں کہ ملک میں شانتی لانے کی خاطر ہم ہر اس شرط کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس سے انڈیا کا وقار اور اس کی اعلیٰ روایتیں باقی رہتی ہوں، جو دیش کی مجموعی ترقی کا راستہ کھولنے والا ہو۔

مسلمان بھائیوں کے اطمینان کے لیے مزید میں کہوں گا کہ اس طرح کا تصفیہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے، وہ کبھی بھی مستقل یا ابدی نہیں ہوتا۔ مسلمان اگر اس معاملہ میں یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ پر راضی ہو جائیں تو وقتی طور پر بظاہر یہ ان کے لیے کھونے کا واقعہ دکھائی دے گا۔ مگر عین ممکن ہے کہ مستقبل کے لحاظ سے وہ ان کے لیے نئی، زیادہ بڑی کامیابی کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی بن جائے۔

دو مثالیں

اس کی عملی مثالیں قریب کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ (اور اس کے حلیفوں) نے جرمنی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسی طرح امریکہ کی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ اور جنرل میکارتھر نے جاپانی قوم کے لیے ایک نیا دستور تیار کیا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جاپان آئندہ کبھی بھی اور کسی اعتبار سے بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ (10/87)

جرمنی اور جاپان کے مدبروں نے محسوس کیا کہ اب ان کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ امریکہ اور اس کے حلیفوں سے جنگ جاری رکھیں اور اس کے نتیجہ میں بدستور تباہ ہوتے رہیں۔ یا یک طرفہ طور پر وہ فریق ثانی کی شرطوں کو مان لیں۔ انھوں نے پہلے انتخاب کو چھوڑ کر دوسرے انتخاب کو لے لیا۔

یہ بظاہر یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ تھا۔ مگر اس کا نتیجہ اتنا بڑا نکلا کہ چالیس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ جرمنی ہمیشہ سے زیادہ طاقت ور ہو کر دوبارہ متحد ہو گیا۔ اسی طرح جاپان بھی پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہو کر اس حالت میں آ گیا کہ وہ خود امریکہ کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دے۔

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ کوئی ہار کا معاملہ نہیں۔ قرآن (الفتح ۱) کے مطابق، وہ عین جیت کا معاملہ ہے۔ یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ اپنے پہلے روز ہی فریق ثانی کے اوپر اخلاقی فتح ہے۔ اور اگر مزید دانش مندی کا ثبوت دیا جائے تو بعد کے مرحلہ میں مادی فتح بھی۔

یہاں ایک اضافہ بہت سبق آموز اور بہت بامعنی ہے۔ آر ایس ایس کے ہفتہ وار انگریزی میگزین آرگنائزر (دہلی) نے اپنے شمارہ ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ میں ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے۔ یہ راقم الحروف کی تجویز ہندو۔مسلم ڈائیلاگ کے بارہ میں ہے۔ تجویز کے تعارف اور تبصرہ کے بعد آخر میں اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں لکھا ہے :

Thus a Muslim leader, however well-meaning and well-intentioned in quest of peace, must search for a precedent in Hadis for talks with the non-Muslims. But then everybody knows the fate of Hudaibia agreements which proved only a convenient truce to bale them out of a difficult situation, for a total conquest of Mecca ultimately (p.14).

انڈیا آج ایک نئے عہد کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ آج اہل ملک کو، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو، ایک نیا تاریخی فیصلہ کرنا ہے۔ اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں کامیاب رہے تو دیش کامیاب ہو گا۔ اور اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں ناکام ہو گئے تو اس کے بعد دیش کے لیے تباہی اور بربادی کے سوا کوئی اور مستقبل نہیں۔

قیادت کا خلا

قومی پریس میں آج کل مسلسل ایسے مضامین اور ایسی رپورٹیں چھپ رہی ہیں جن میں ملک کے مستقبل کے بارہ میں سخت تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۲ اپریل ۱۹۹۲) میں مسٹر ایس ایس گل کا ایک آرٹیکل چھپا ہے، اس کا عنوان بمبئی کے بعد (Beyond Bombay) ہے۔ مضمون نگار نے ملک کی موجودہ ابتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

In modern times India has never before faced such a threat to its integrity and its very existence as a nation state. And we have never been so ill-equipped to face this challenge. The maladies are known, the remedies are known, but the physician is missing.

عہد حاضر میں انڈیا کو اپنے استحکام اور قومی ریاست کی حیثیت سے اپنے وجود کے لیے کبھی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور ہم اس چیلنج کا سامنے کرنے کے لیے کبھی اتنے بے مایہ نہ تھے۔ مصیبتیں معلوم ہیں، ان کا علاج بھی معلوم ہے، مگر ڈاکٹر موجود نہیں (صفحہ ۱۳)

یہ قیادت کے خلا کا مسئلہ ہے، مسلمان اس خلا کو پُر کر سکتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہ وہ کسی شاعرانہ کلام کے حوالے سے اپنے کو محتسب کائنات ثابت کریں۔ یا یہ اعلان کریں کہ ہم خیر الامم ہیں، اس لیے ہمیں ساری دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیادت صبر کی قیمت پر ملتی ہے (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا) اس وقت جو صبر درکار وہ یہ کہ مسلمان ماضی کی تلخیوں کو بھلائیں۔ برادرانِ وطن کی زیادتیوں پر مشتعل ہونا ترک کریں۔ وہ مانگنے کے بجائے دینے والے بنیں۔ وہ ملّی وقار کو اشو بنانے کے بجائے انسانی خدمت کو اشو بنائیں۔ وہ تمام نزاعات کو یک طرفہ بنیاد پر ختم کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ وہ دوسری قوموں کے حریف بننے کے بجائے ان کے خیر خواہ بن جائیں۔ وہ اپنی تصویر یہ بنائیں کہ وہ حقوق کے لیے اٹھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے لوگ ہیں۔

یہی صبر قیادت کی لازمی شرط ہے۔ مسلمان اگر اس شرط کو پورا کر دیں تو قیادت ان کی طرف اس طرح دوڑ کر آئے گی جس طرح ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔

حج اسپرٹ

۱۹۸۲ء میں میں نے حج کا فریضہ ادا کیا تھا۔ جن دنوں میں مکہ میں تھا، میری ملاقات کچھ عرب نوجوانوں سے ہوئی۔ ان نوجوانوں کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا جو کہ اسلامی انقلاب کی حامی ہے۔ اور مختلف مسلم ملکوں میں پر تشدد تحریک چلا رہی ہے۔ یہ نوجوان تعلیم یافتہ حاجیوں کے درمیان خفیہ طور پر کچھ عربی لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ مجھے بھی انھوں نے اپنا ایک سٹ دیا۔ میں نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں مسلح اسلامی انقلاب کی تبلیغ کی گئی تھی۔

اس قسم کے پروپگنڈے کا سلسلہ آج بھی مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔ غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہے۔ حرم کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا تو درکنار، جانوروں تک کو مارنا جائز نہیں۔ پھر ایسے محترم مقام پر کیوں ایسا لٹریچر پھیلایا جاتا ہے جو تشدد کے فلسفہ پر مبنی ہو، جس میں کچھ لوگوں کو دشمن اسلام کا لقب دے کر انھیں مارنے اور ہلاک کرنے پر ابھارا گیا ہو۔

قرآن میں مکہ کو بلد آمن (ابراہیم ۲۵) کہا گیا ہے، یعنی امن کا شہر۔ مکہ کی مقدس مسجد کو حرم آمن (العنکبوت ۶۷) اور بیت امن (البقرہ ۲۵) بتایا گیا ہے، یعنی امن کا گھر، امن وسلامتی کا مرکز۔ یہ امن وسلامتی حرم کی نہایت ابھری ہوئی حیثیت ہے۔ اس لیے حاجیوں کے اوپر سب سے زیادہ نمایاں اثر بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ مگر عملی صورت حال اس کے برعکس ہے۔

آج حاجیوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ساری دنیا سے ہر سال تقریباً تین ملین مسلمان حج کی ادائیگی کے لیے مکہ پہنچتے ہیں۔ مگر عین اس وقت سارے مسلم علاقوں میں پر تشدد تحریکیں جاری ہیں۔ حج کے اضافہ نے تشدد کے واقعات کو کم نہیں کیا۔ حاجیوں نے ابھی تک اپنے حج سے امن وسلامتی کا سبق نہیں لیا۔ حاجیوں کا قافلہ ہر سال اس لیے حرم کو جاتا ہے کہ وہ وہاں سے واپس آکر اس کی توسیع بنے، وہ ساری دنیا میں حرم کی خصوصیات امن کو پھیلا دے۔ مگر فیوض حرم کی یہ توسیع ابھی تک ممکن نہ ہو سکی۔

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ لوگ حج کی حقیقت کو بھول گئے ہیں۔ آج کے لوگ حج کی صورت سے واقف ہیں۔ مگر وہ حج کی اسپرٹ سے واقف نہیں۔ حج کے مقام کو جب قرآ

میں امن وسلامتی کا مقام کہا گیا ہے تو اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حج کی اسپرٹ کیا ہے۔ حج کی اسپرٹ وہ اعلیٰ روحانیت ہے جو تمام بنی آدم کو ایک ہی انسانی روپ میں دیکھنے لگے۔

حج کی اسپرٹ امن ہے، جنگ نہیں۔ حج کی اسپرٹ محبت ہے، نفرت نہیں۔ حج کی اسپرٹ نرمی ہے، تشدد نہیں۔ حج کی اسپرٹ رحمت ہے، زحمت نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ حج کی یہی خصوصیت آج مسلمانوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حج کی یہ خصوصیت کہیں بھی موجودہ مسلمانوں کی قومی پالیسی کا جز نہ بن سکی۔

لوگ حج کی ظاہری شکل کو دہرا کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حج کر لیا۔ حالانکہ حقیقی حج اس شخص کا ہے جو حج کو اس کی مثبت روح کے ساتھ ادا کرے۔ آج مکہ میں ہمیشہ سے زیادہ حاجیوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمان ساری دنیا میں اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر مسلمان سچی اسپرٹ کے ساتھ حج کر کے لوٹیں تو اچانک ساری دنیا میں امن کی فضا قائم ہو جائے۔ اس کے بعد مسلمان نہ صرف خود تشدد کرنا یا تشدد کی بات بولنا چھوڑ دیں، بلکہ وہ تمام لوگوں کے سامنے امن اور سلامتی کے مبلغ بن جائیں۔

آج ضرورت ہے کہ بیت حرم میں جانا مسلمان کے لیے بیت امن میں جانا بن جائے۔ وہاں جمع ہو کر تمام مسلمان توبہ و استغفار کریں۔ وہ ہر قسم کے تشدد کو چھوڑنے کا عہد کریں، خواہ وہ تشدد اسلام کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ حج کی عبادت سے وہ یہ عزم لے کر لوٹیں کہ وہ تشدد کے ہر طریقہ کو یک طرفہ فیصلہ کے تحت ختم کر دیں گے۔ وہ ساری دنیا کے لیے امتِ رحمت بن جائیں گے جس طرح ان کا نبی ساری دنیا کے لیے نبیِ رحمت بنا ہوا تھا۔

آج کی دنیا جنگ اور تشدد سے آخری حد تک اکتا چکی ہے۔ آج کی دنیا کو "مصلحانہ جنگ" سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی مفسدانہ جنگ سے۔ آج دنیا کو ایسے مذہب کی تلاش ہے جو اس کو تشدد کی آگ سے نکالے اور اس کو امن کی ٹھنڈک عطا کرے۔ حج ایسے ہی داعیان امن کی تربیت ہے۔ حقیقی حاجی وہ ہے جو امن کی تربیت سے فیض یاب ہو کر وہاں سے لوٹے۔ جس کے لیے حج تربیت گاہِ امن میں جانے کے ہم معنی بن جائے۔ یہی لوگ دوبارہ انسانیت کے اوپر رحمتِ خداوندی کا دروازہ کھولیں گے، وہ دروازہ جو صدیوں سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا ہے۔

غلطی کی تصحیح

میری ملاقات یو پی کے ایک ہندو نوجوان سے ہوئی۔ وہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں موجود تھے جب کہ وہاں بابری مسجد کو ڈھایا گیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر کی تعمیر کی گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا۔ انھوں نے کہا کہ بھارت کی پچھلی تاریخ میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، ان غلطیوں کو ہمیں درست کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے خیال کے مطابق ۶ دسمبر کو ایک بڑی غلطی کی تصحیح کر دی۔ اب بتائیے کہ اس تصحیح سے دیش کا کتنا کلیان ہوا۔ لوگوں کے دکھوں میں کتنی کمی واقع ہوئی۔ خود آپ نے اپنی زندگی میں ترقی کی کتنی اور سیڑھیاں طے کیں۔ وہ میرے اس سوال کے جواب میں کوئی متعین بات نہ بتا سکے۔

پھر میں نے کہا کہ میرے بھائی، اگر آپ دیش کی غلطیوں کو درست کرنا چاہتے ہیں تو یہاں اور بھی زیادہ بڑی بڑی غلطیاں موجود ہیں، ان کو درست کیجئے۔ اجودھیا کی مسجد صحیح بنی تھی یا غلط، یہ تو ایک ایسا تاریخی مسئلہ ہے جو ابھی طے نہیں ہوا۔ مگر یہاں اور بہت سی بھیانک غلطیاں ہیں جن کا غلط ہونا مسلّم ہے، پھر آپ ان کو درست کرنے میں اپنی طاقت کیوں نہیں لگاتے۔ میں نے کہا کہ ہمارا دیش ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ مگر وہ دوبارہ اقتصادی غلامی میں جکڑ گیا۔ آپ دیش کو اقتصادی غلامی سے نکالنے اور اس کو سچی آزادی میں سانس لینے کا موقع دیجئے۔ ایک وقت تھا کہ بھارت ایک مہان دیش سمجھا جاتا تھا۔ آج عالمی نقشہ میں بھارت صرف ایک پچھڑا ہوا دیش بن گیا ہے۔ آپ دوبارہ بھارت کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلائیے۔

پہلے بھارت اپنی اعلیٰ روایات کے لیے مشہور تھا۔ آج وہ تمام روایتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ آپ ان اعلیٰ روایتوں کو دیش میں دوبارہ قائم کیجئے۔ پہلے دیش کے اندر قانون کا احترام پایا جاتا تھا۔ آج یہاں ہر طرف لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اس لاقانونیت کو ختم کر کے قانون کا دور واپس لائیے۔ پہلے ہمارا دیش اپنی خوش حالی کے لیے مشہور تھا۔ آج یہاں کی آبادی غریبی کا شکار ہو رہی ہے۔ آپ اس غریبی کو مٹا کر اس کو دوبارہ خوش حال بنائیے۔ درست کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ ان غلطیوں کو درست کریں نہ کہ فرضی غلطیوں کو جس سے دیش کا کچھ بھلا ہونے والا نہیں۔

ایک سفر

پونہ میں مسیحی چرچ کے تحت ایک بہت بڑا ادارہ De Nobili College ہے۔ اس کے تحت ایک مذہبی مطالعہ کا ادارہ Institute for the Study of Religion قائم ہے۔ اس ادارہ نے ایک امریکی ادارہ کے تعاون سے پونہ میں ۲ - ۶ نومبر ۱۹۹۱ کو ایک کل مذاہب کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کی تھیم تھی: " ریلیجن اینڈ سوسائٹی" اس کانفرنس کی دعوت پر پونہ کا سفر ہوا اور اس کے بعد بمبئی وغیرہ کا سفر۔ ذیل میں اس کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲ نومبر کو گھر سے نکل کر ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تو انسانی تاریخ کا نقشہ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ موجودہ زمانہ میں سفر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ کر پختہ سڑکوں سے گزرتا ہوا اسٹیشن یا ایرپورٹ پہنچتا ہے۔ وہاں اس کے لئے ایک اور سواری موجود ہوتی ہے جو اس کو لیکر تیزی سے آگے روانہ ہوتی ہے اور اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ منزل پر دوبارہ یہی سارے انتظامات ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے آخری مطلوب مقام پر پہنچ جاتا ہے

چند ہزار سال پہلے انسانی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔ انسان نیم حیوانات کی طرح جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ شہری زندگی کا وہ دور آگیا جس کو مدنیت (Urbanization) کہا جاتا ہے۔ مسلم عہد سے پہلے یہ رفتار بہت سست تھی۔ مسلم عہد میں انسانی تہذیب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بغداد کی جس طرح تعمیر کی وہ ماضی کے شہروں سے اتنا مختلف ہے کہ شہری تاریخ میں وہ ایک چھلانگ معلوم ہوتا ہے۔

اربن پلاننگ کے پروفیسر ایگلی (Ernst Arnold Egli) نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں جنت کی زندگی اور جنت کے مکانات کا جس طرح بار بار ذکر کیا گیا ہے، اس نے مسلمانوں کے اندر عمدہ مکانات اور اعلیٰ تمدن کے بارہ میں ایک خیالی تصویر (dream image) بنائی۔ انھوں نے اس خیالی تصویر کو واقعہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجہ میں مسلم دنیا کے جدید شہر وجود میں آگئے (EB-18/1071)

مسلم تاریخ کے ان واقعات کو مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر قومی فخر کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کو مسلمانوں کے پرفخر کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کو آلاء اللہ کے طور پر بیان کیا جانا چاہئے۔

اس دنیا کی ہر ترقی اصلاً امکانات قدرت کو ظہور میں لانے کا نام ہے۔ انسان ان امکانات کو ایجاد کرنے والا نہیں، وہ صرف ان کو استعمال کرنے والا ہے۔ جب ایسا ہے تو ہم کو چاہئے کہ ان ترقیوں کو دیکھ کر ہم خدا کے گیت گائیں نہ کہ ان کو خود اپنے خانہ میں ڈال کر فخر اور ناز کرنے لگیں۔

گھر سے دہلی ایرپورٹ جاتے ہوئے راستہ میں ایک معاملہ پیش آیا۔ اس میں ایک بہت بڑا سبق تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا: لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا واحد آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی انا سے نہ ٹکرائیں۔ اگر آپ اس راز کو جان لیں تو آپ اپنے دشمنوں کے درمیان بھی دوست کی طرح رہ سکتے ہیں۔

دہلی ایرپورٹ پر ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective

ان سے دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل میں مسلمانوں کی فکری تاریخ پر ایک کتاب کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ اقبال کی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو پڑھا ہے۔ وہ ایک اچھی کتاب ہے۔ مگر میں اقبال کے بعض نظریات سے متفق نہیں۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ مثلاً اقبال کے مرد کامل (Perfect man) کے نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ وہ تاریخ کو ایک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ پرفکٹ انسان مستقبل میں پیدا ہوگا۔ یہ تصور اسلام کے عقیدۂ رسالت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ عقیدۂ رسالت کے مطابق، کامل اور پرفکٹ انسان پیغمبر کی صورت میں پیدا ہو چکا۔ اب مسئلہ پرفکٹ مین کی پیروی کرنے کا ہے نہ کہ پرفکٹ مین کا انتظار کرنے کا۔

ایرپورٹ کی کھڑکی پر اپنا بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے ایک واقعہ گزرا۔ اس کے بعد مجھے اسی قسم

کا ایک قصہ یاد آگیا جو میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔ ایک انگلش مین ایک بار کسی ایر لائن کے رزرویشن کاونٹر پر کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک موٹی عورت تیزی سے چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کے لئے تھا۔ مگر کلرک نے غلطی سے اس کو عام درجہ کا بورڈنگ پاس دے دیا تھا۔ عورت دوبارہ ہجوم کرکے کھڑکی پر پہنچی اور اپنا بورڈنگ پاس درست کراکے فاتحانہ واپس ہوئی۔

عورت سے دھکا لگنے کی بنا پر لائن میں کھڑے ہوئے انگریز کا ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا ٹکٹ زمین سے اٹھایا اور سنجیدگی کے ساتھ خاتون سے کہا کہ میڈم، فرسٹ کلاس بورڈنگ پاس کا نام نہیں۔ فرسٹ کلاس ایک طریق زندگی ہے:

Madam, first class is not a boarding pass.
It is a way of life.

دہلی سے پونہ کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۹۴۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے انگریزی اور ہندی میں مختلف چیزیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک صنعتی میگزین (Industrial Products Finder) تھا۔ یہ اس کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ تھا۔ ۲۳۲ صفحہ کے اس میگزین کے چار حصے تھے:

1. Industrial News Briefs
2. Commercial Info Exchange
3. Technical Articles
4. Product Index

یہ میگزین بزنس پریس (Business Press) کی طرف سے شائع ہوتا ہے جس کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہے۔ پورا میگزین صنعتی خبروں یا صنعتی سامانوں کے اشتہار سے بھرا ہوا تھا۔ عنوان نمبر ۲ کے تحت بہت سے لوگوں کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ ہم فلاں صنعتی شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ربط (contact) قائم کرنا چاہتے ہیں جو اس شعبہ میں ہم سے تعاون کریں یا فنی جانکاری (Technical know-how) دے سکیں۔

میں نے سوچا کہ مادی شعبوں میں لوگ دوسروں کا تعاون تلاش کر رہے ہیں۔ اور دینی شعبوں میں یہ حال ہے کہ دوسروں سے کٹ کر ہر آدمی اپنی الگ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ صنعت کار کا بنیادی مقصد کاروبار کو بڑھانا ہوتا ہے اور مذہبی رہنماؤں کا بنیادی مقصد شخصیت کو بڑھانا۔

چڑیوں کو بالائی فضا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر قدیم زمانہ سے انسان یہ خواہش کرتا رہا ہے کہ وہ فضا میں اڑے۔ قدیم اسپین میں ایک مسلمان عباس بن فرناس (م ۸۸۸ء) تھا۔ اس کے اندر نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کا شوق تھا۔ اس نے خاص طرز کی ایک بڑی سی چادر بنائی اور پھر چھتری کی مانند اس میں اپنے آپ کو باندھا اور بلندی پر چڑھ کر فضا میں چھلانگ لگائی۔ تھوڑی دور جا کر وہ زمین پر گر پڑا اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کا معاملہ قاضی سلیمان بن اسود الغافقی کی عدالت میں پیش کیا۔ قاضی نے اس کو غیر معتدل قرار دے کر حکم دیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے تجربات نہ کرے۔

احمد شریف الرفاعی کا مضمون (المدینة ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹) نظر سے گزرا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ اگر عباس بن فرناس پر روک نہ لگائی جاتی تو یقیناً ہم ہوا بازی کے طریقہ کو ہزار سال پہلے جان لیتے۔ (لقد اعدموه علمياً ... ولو تركوه لشأنه لعرفنا الطيران قبل أكثر الف سنة)

عرب مضمون نگار نے اپنا یہ مضمون "من شرفات التراث" کے عنوان کے تحت شائع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ جان سکے کہ ہوائی جہاز کا بننا طویل علمی تحقیق اور بے شمار تجربات کے بعد ممکن ہوا ہے۔ اس میں پوری انسانیت کا سفر شامل ہے۔ وقت کی حکومت اگر عباس بن فرناس کے لئے ساری سہولتوں کا ڈھیر لگا دیتی تب بھی یہ ناممکن تھا کہ جو ہوائی مشین بیسویں صدی میں بنی ، وہ اچانک نویں صدی میں بن کر تیار ہو جاتی۔

میرے ساتھ بار بار ایسا پیش آیا ہے کہ میں ٹکٹ کے باوجود سفر نہ کر سکا۔ مثلاً ایک بار میرے پاس لمبے عالمی سفر کا ٹکٹ تھا۔ کسی وجہ سے مجھے اپنے سفر کو مختصر کرنا پڑا۔ میں نے ٹکٹ کی بچی ہوئی رقم کا واوچر بنوا لیا جو اس کے بعد کئی سفروں میں کام آیا۔

آخر میں میرے پاس دہلی۔ بمبئی کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس ٹکٹ کو دوبارہ رقم کی صورت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف سفر ہی میں اس کو استعمال کرنا ممکن تھا۔ مگر بار بار ایسے حالات پیش آئے کہ میں بمبئی کا سفر نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ٹکٹ کی مدت آخری طور پر ختم ہوگئی، اور وہ استعمال کے قابل

نہ رہا۔

تھوڑی دیر کے لئے احساس ہوا کہ ایک ٹکٹ بلا وجہ ضائع ہوگیا۔ مگر جلد ہی میرے اندر ایک نیا احساس جاگ اٹھا۔ میری زبان سے نکلا " خدایا ، میں اس ٹکٹ کو دنیا کے سفر کے لئے استعمال نہ کر سکا۔ تو اپنی رحمت سے اس کو میرے لئے آخرت کا ٹکٹ بنا دے"۔ اس کے بعد نقصان کا احساس جاتا رہا اور دل میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوگیا۔

جہاز دہلی سے روانہ ہوکر منزل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ وہ رکے بغیر مسلسل اڑ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی بھی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹہ اور ۵۰ منٹ پر اناونسر نے اعلان کیا کہ اب ہم پونہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔

میں نے یہ الفاظ سنے تو مجھے محسوس ہوا جیسے اناؤنسر یہ کہہ رہا ہو کہ جہاز کے پرواز کی آخری حد آگئی۔ پھر میں نے سوچا کہ مختلف جہازوں کی مختلف حد ہوتی ہے۔ کوئی جہاز آدھ گھنٹہ اڑ کر اتر جاتا ہے کوئی ایک گھنٹہ اور کوئی دو گھنٹہ اور کوئی دس گھنٹے اڑنے کے بعد نیچے اترتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک شخص پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے۔ گویا اس کے جینے کی حد چند منٹ یا چند گھنٹے تھی۔ اسی طرح کوئی شخص چند سال گزار کر مرتا ہے۔ کوئی جوانی میں مرجاتا ہے۔ اور کوئی بوڑھا ہوکر مرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمر موت کی عمر ہے۔ آدمی کا ہر لمحہ اس کا آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت آدمی اپنی آخری حد پر کھڑا ہوا ہے۔ زندگی کا یہ معاملہ اتنا عجیب ہے کہ آدمی اگر اس کو سوچے تو پر عیش محل میں بھی اس کی زندگی بے عیش ہوکر رہ جائے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہمارا جہاز پونہ ایرپورٹ پر اترا۔ کانفرنس کے نمائندے جو میری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ تو حسب قاعدہ ایرپورٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ مگر حلقہ الرسالہ کے لوگ ایرپورٹ کے اندر مجھ سے ملنے کے لئے موجود تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ اندر کیسے آگئے۔ کیونکہ اندر آنا تو منع ہے۔ جناب عبد الصمد صاحب نے بتایا کہ گیٹ پر کھڑے ہوئے ایرپورٹ کے آدمی نے ان کو روکا۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہمارے " دھرم گرو " آرہے ہیں۔ یہ سن کر آدمی نے ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ مذہب میں آج بھی وہ طاقت ہے جو کسی دوسری چیز میں نہیں۔ بشرطیکہ مذہب کو ماننے والے اپنے آپ کو اشتعال انگیز کارروائی سے دور رکھیں۔

کانفرنس والوں نے بلیو ڈائمنڈ ہوٹل (پونہ) میں قیام کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ سب لوگوں کے ساتھ پہلے ہوٹل پہنچا۔ یہ ہوٹل شہر کے باہر ہے۔ چنانچہ ہوٹل پہنچنے کے بعد ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کرکے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرا قیام شہر میں ان لوگوں کے ساتھ ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ ملاقات کی صورت نکل سکے۔ میں نے کہا کہ کانفرنس کے منتظمین اگر اجازت دیدیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ منتظمین نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ہم سب لوگ ہوٹل سے شہر واپس آگئے۔

اس کے بعد میرا قیام پہلے مسٹر پی اے انعام دار کے مکان پر رہا۔ کانفرنس کے پروگرام کے مطابق، میٹنگوں میں شرکت کے لئے روزانہ ڈائمنڈ ہوٹل جاتا اور پھر دوبارہ انعام دار صاحب کے یہاں واپس آجاتا۔ آخر میں میرا قیام جناب عبدالصمد صاحب کے مکان پر تھا۔

پونہ اور بمبئی کے درمیان ایک تیز رفتار ٹرین چلتی ہے۔ اس کا نام "دکن کوئن" ہے۔ ٹرین کا نام پونہ کے نام پر ہے۔ مرہٹواڑہ کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر ہونے کی بنا پر پونہ کو دکن کوئن کہا جاتا تھا۔ اسی کے نام پر اس ٹرین کا مذکورہ نام رکھا گیا۔

سترھویں صدی میں مرہٹہ حکومت نے پونہ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ کچھ عرصہ کے لئے اس پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ مگر ۱۷۴۰ سے دوبارہ مرہٹوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۷ میں برٹش حکومت نے اس پر قبضہ کیا جو ۱۹۴۷ تک قائم رہا۔

برٹش دور میں پونہ میں تعلیم کا رواج کافی بڑھا۔ یہاں سب سے زیادہ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ چنانچہ جواہر لال نہرو نے ایک بار پونہ کو "انڈیا کا آکسفرڈ اور کیمبرج" کا نام دیا تھا۔ ۱۹۶۱ میں یہاں ایک ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا۔ پنشیت ڈیم کسی وجہ سے منہدم ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم پونہ کا ایک حصہ اس کی زد میں آکر بہہ گیا۔

دہلی سے پونہ ۱۶۰۰ کیلو میٹر دور ہے۔ قدیم زمانہ میں دہلی سے پونہ پہنچنے کے لئے ۱۶ دن سے بھی زیادہ وقت درکار تھا۔ مگر آج یہ سفر صرف دو گھنٹے میں طے ہوجاتا ہے۔ ۲ نومبر کو میں نے عصر کی نماز دہلی (نظام الدین) کی کالی مسجد میں ادا کی۔ مغرب کی نماز دوبارہ دہلی ایرپورٹ پر پڑھی۔ عشاء کی نماز کے وقت میں پونہ پہنچ چکا تھا۔

انسان کو دو پیروں کے ساتھ پیدا کیا تاکہ وہ چل سکے۔ پھر اس کو گھوڑا دیا

جو گویا سواری کی زندہ مشین ہے۔ اس کے بعد انسان پر اسٹیم اور پٹرول کی طاقت منکشف کی جس کے نتیجہ میں ٹرین اور کار بنے۔ اور آخر میں ہوائی جہاز جیسی تیز رفتار سواری اس کو عطا کی۔

اس تدریجی طریق کار کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کے لئے کار اور ہوائی جہاز پر بیٹھنا ممکن نہ ہوسکا۔ پیغمبر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ مگر ان کے تمام تر تقدس کے باوجود خدا نے ان کے لئے اپنے قانون تدریج کو نہیں توڑا۔ اس سے خدا کی سنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تدریج اس دنیا کے لئے خدا کا اٹل قانون ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اور کسی کے لئے بدلا نہیں جاتا۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی۔ اگر دونوں جلوس ایک دن نکلتے تو یقینی تھا کہ پونہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوجائے اور جشن کا دن غم کے دن میں تبدیل ہوجائے۔ پونہ کی سیرت کمیٹی نے مشورہ کرکے یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن موخر کرکے ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح دونوں جلوس پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ اس واقعہ پر پولیس کے لوگ اور ہندو حضرات بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانشمندی کی تعریف کی۔ اس طرح دونوں جلوس پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

سیرت کمیٹی پونہ نے اپنے فیصلہ کی اطلاع مراٹھی اخباروں میں شائع کرادی تھی۔ اس سے پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ چنانچہ کئی مقامات پر مسلمانوں نے یہی کیا کہ اپنے جلوس کی تاریخ بدل دی۔ اس طرح پورا مہاراشٹر فساد کے خطرہ سے بچ گیا۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اب نیا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ ردعمل کی پالیسی ترک کر رہے ہیں اور اس کے بجائے اعراض کے طریقہ کو اپنی پالیسی کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔

پونہ میں ایک صاحب نے کہا کہ مجھے "شتم رسول" کے مسئلہ پر آپ سے سوال کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ فرمائیے۔ اس کے بعد جب وہ بولے تو انھوں نے ایک پوری تقریر کر ڈالی۔ انھوں نے اپنے مفروضہ مخالفین کے اوپر الزام تراشی بھی کی۔ ان کی پرجوش تقریر ختم ہوئی تو میں نے نرمی کے ساتھ کہا: یہ اسلام نہیں ہے کہ آدمی تحقیر رسول کے مسئلہ کو جانے مگر وہ تحقیر مسلم کے مسئلہ سے بےخبر ہو۔

تقسیم ملک (۱۹۴۷) سے پہلے ایک بار کسی سفر کے دوران میں پونہ ریلوے اسٹیشن سے گزرا

تھا۔ اس وقت میں نے چلتی ہوئی ٹرین سے پونہ شہر کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ریلوے لائن کے کنارے مجھے کچھ بنگلے دکھائی دئے جن کے اوپر پھول دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس مشاہدہ میں پونہ مجھے ایک افسانوی شہر نظر آیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ پونہ خوب صورت مکانات کا ایک شہر ہے جو چاروں طرف پھول اور سبزہ سے ڈھکا ہوا ہے۔

مگر ۱۹۷۱ میں جب پہلی بار میں نے پونہ کا سفر کیا اور شہر کے اندرونی حصوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پونہ بھی ویسا ہی ایک شہر ہے جیسا کہ ہندستان کے دوسرے شہر۔ دوسرے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی اگر خوبصورت مکانات ہیں تو اس کے ساتھ تنگ اور بے کشش مکانات کی قطاریں بھی۔

یہی بات انسان کے بارہ میں بھی ہے۔ کسی انسان سے ابتدائی ملاقات میں وقتی طور پر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ اکثر حالات میں نہایت ناقص بلکہ خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ سنجیدگی اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقتی تجربہ کی بنا پر کبھی کلی رائے قائم نہ کی جائے۔ اسی قسم کی رائے کو شریعت میں ظن کہا گیا ہے۔ کسی شہر کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کر لی جائے تو اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ مگر انسان کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کرنا بے حد سنگین ہے۔ کیوں کہ اس میں اخلاقی پہلو شامل ہے اور وہ آدمی کو گناہ کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے (الحجرات ۱۲)

۲ نومبر کی شام کو انعام دار صاحب کے مکان پر دیر تک نشست ہوئی۔ جناب انیس چشتی صاحب اور دوسرے صاحبان آ گئے تھے۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ انیس چشتی صاحب تحریک پیام انسانیت سے وابستہ ہیں اور انھوں نے ملک کے مختلف گوشوں کا سفر کیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ملک میں کوئی شخص یا ادارہ ایسا ہے جو مخصوص طور پر غیر مسلموں میں دین پہنچانے کا کام کر رہا ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں۔

یہ بلاشبہ انتہائی سنگین صورت حال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان دوسری سرگرمیاں تو جاری ہیں مگر وہی اصل کام انجام نہیں دیا جا رہا ہے جو ہماری امت محمدی ہونے کی حیثیت کو متحقق کرتا ہے۔

انعام دار صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) نہایت ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے کئی قیمتی باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ چودہ سو سال پہلے قرآن میں اقرأ کا حکم آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔

چودہ سو سال پہلے ایک انسانی مصلح اگر عرب میں اٹھتا تو وہ صرف حال کے دائرہ میں سوچتا، جب کہ اقرأ ابدی دائرہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ حال کے اعتبار سے عرب میں یہ مسائل تھے کہ وہاں پانی نہیں۔ وہاں محفوظ راستے نہیں۔ ایک شخص جس کو صرف انسانی نظر حاصل ہو وہ اسی قسم کے قریبی مسائل میں الجھ جائے گا۔ مگر رسول نے علم کا پیغام دیا جو ابدی اہمیت کا حامل تھا۔ جو حال سے لے کر مستقبل تک انسان کے کام آنے والا تھا۔ اور جو اپنے وسیع انطباق کے اعتبار سے دوسرے تمام شعبوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کی مختلف نشستوں میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ شہر میں بھی کئی پروگرام ہوئے۔ ان سب کا تذکرہ یکجائی طور پر آئندہ کیا جائے گا۔

فیروز پونا والا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے سودی تجارت کے پرجوش مبلغ ہیں۔ انھوں نے پونہ میں بینک سے پندرہ لاکھ روپیہ سودی قرض لے کر ایک انڈسٹری لگائی۔ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انھوں نے سامان وغیرہ بیچ کر بینک کا قرض ادا کیا اور سود کے بغیر انڈسٹری چلانے کا فیصلہ کیا۔ آج وہ کامیابی کے ساتھ اپنی انڈسٹری چلا رہے ہیں۔

وہ بوہرہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بوہرہ فرقہ کے لوگ تجارت میں بہت کامیاب ہیں۔ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا ——— سادہ زندگی اور کم خرچ۔ ۴ نومبر کو مجھے انھوں نے اپنا کارخانہ دکھایا اور اپنے گھر بھی لے گئے۔ ان کی زندگی کو میں نے اس اصول کا معیاری نمونہ پایا۔ ان کا فلیٹ ۴ لاکھ روپیہ کا ہے۔ اور ان کی انڈسٹری ایک کرور روپیہ سے زیادہ کی ہے۔ مگر ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہے۔

پونہ کے قریب پیر قمر علی درویش (م ۶۳۲ ھ) کی درگاہ ہے۔ یہ درگاہ ۱۹۵۱ سے باقاعدہ رجسٹرڈ طور پر قائم ہے۔ ساتھیوں کے کہنے پر اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔

یہاں " سوچنا بورڈ " پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے: نیاز اور دوسرے پروگرام مسلم طریقہ سے کرائیں۔ یہاں صحن میں کالے رنگ کا ایک گول پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس کا وزن تقریباً ساٹھ کیلو ہے۔ طاقت ور آدمی اس کو اکیلا اٹھا سکتا ہے۔

اس پتھر کے لئے یہاں روایت ہے کہ قمر علی درویش کا نام لے کر اٹھانے سے وہ اپنے آپ

اٹھ جاتا ہے۔ طریقہ کے مطابق، گیارہ آدمی پتھر کے چاروں طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی ایک انگلی پتھر سے لگاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک لمبا سانس کھینچ کر کہتا ہے "قمر علی درویش . . ." اس کے بعد پتھر اٹھ جاتا ہے۔ اور اس وقت تک اٹھا رہتا ہے جب تک سانس نہ ٹوٹے۔

میرے سامنے کئی بار لوگوں نے اس تدبیر پر عمل کر کے پتھر کو اٹھایا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک سادہ فطری واقعہ ہے نہ کہ کوئی پر اسرار واقعہ۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کے اجلاس بلیو ڈائمنڈ ہوٹل میں ہوئے۔ ۳۰ نومبر کو کانفرنس کے شرکاء تین مختلف گروپ میں بانٹ دئے گئے۔ میرے گروپ میں ایک درجن افراد تھے جو اسلام، ہندوازم اور مسیحیت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر ایک نے مذہب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے۔ ذریعہ اظہار یہاں صرف انگریزی تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عام طور پر اپنے آبائی مذہب کے بارہ میں بے یقینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مثلاً ہندو صاحبان نے اپنے حالات بتلاتے ہوئے کہا کہ ہمارے مذہب میں انسانیت کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ بات میرے ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ مسیحی حضرات نے اپنے بارہ میں بتایا کہ مسیح کی ابنیتِ خدا کا عقیدہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وغیرہ

میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اصلاً اسلامی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔ انگریزی میں نے بعد کو پرائیویٹ طور پر پڑھی۔ مگر جو اسلام مجھے خاندانی وراثت یا مدرسہ کے ماحول میں ملا تھا۔ اس سے میرے اندر بغاوت پیدا ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود اسلام کا اور دوسرے مذاہب کا باقاعدہ طور پر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اسلام کی صداقت از سر نو میرے اوپر منکشف ہوئی۔ اب میں نے دوبارہ شعوری طور پر اسلام کو قبول کیا۔ اس طرح اسلام میرے لئے ایک ذاتی دریافت ہے نہ کہ محض قومی عقیدہ۔

میں نے کہا کہ اسلام کی فطری تعلیمات کے علاوہ اسلام کی جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ اسلام کا تاریخی پہلو تھا۔ دوسرے مذاہب کی کوئی معلوم اور مستند تاریخ نہیں۔ جب کہ اسلام مکمل طور پر اور مسلّمہ طور پر ایک تاریخی مذہب ہے۔ اسلام کو خصوصی اور امتیازی طور پر تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو

حاصل نہیں۔

۳ نومبر کی شام کی میٹنگ میں بعض لوگوں نے کہا کہ اسلام جہاد (قتال) کا مذہب ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں جنگ صرف بطور دفاع ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ پیغمبر اسلام نے پھر کیوں لڑائی لڑی۔ میں نے کہا کہ اس کا تعلق ایج فیکٹر سے ہے نہ کہ خود اسلام کی تعلیمات سے۔ قدیم زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہر مذہب کو تشدد کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ اب آزادی کا زمانہ ہے۔ اس لئے اب عام حالات میں اس قسم کی صورت پیش آنے کا موقع بھی نہیں۔

کانفرنس تین دن کے لئے تھی۔ ہر روز پہلا پروگرام عبادت سے متعلق ہوتا تھا۔ پہلے دن ہندو عبادت، دوسرے دن اسلامی عبادت، تیسرے دن کرسچین عبادت۔ ۳ نومبر کی صبح کو عبادتی رقص (prayer dance) کا مظاہرہ تھا۔ چھ آدمیوں کی پارٹی اسٹیج پر آئی۔ اس کے پانچ ممبر ساز اور نغمہ میں مصروف ہو گئے۔ ایک ممبر نے اسٹیج پر رقص کی صورت میں اس کو مجسم کرنا شروع کیا۔

میں نے اپنے قریب کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا کہ میں طبعی طور پر ان چیزوں سے انجوائے نہیں کر سکتا۔ مگر آج میں خاص طور پر واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس عبادتی پروگرام کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ طریقہ عبادت کو "اسٹیج کا شو" بنا دیتا ہے۔ ایک یا چند آدمی عبادت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بقیہ لوگ تماشائی کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔ میری سمجھ میں آیا کہ اسلام کے سوا ہر مذہب میں عبادت زیادہ تر "غیر" کا ایک فعل ہے۔ وہ "میرا" اپنا فعل نہیں۔ ان طریقوں میں ہر آدمی اپنے آپ کو عمل عبادت میں شامل نہیں کر پاتا۔ وہ گویا اپنے لئے دوسرے سے عبادت کرواتا ہے۔ مزید یہ کہ جو شخص عبادت کو "اسٹیج" کرتا ہے اس کے لئے بھی عبادت زیادہ تر ایک آرٹ ہوتا ہے نہ کہ عبادت میں ذاتی شمولیت۔

اسلام میں چوں کہ عبادت اپنی اصل فطری حالت میں محفوظ ہے، اس لئے اسلام کا طریق عبادت ہی وہ واحد طریقہ ہے جس میں ہر آدمی ذاتی طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں ہر آدمی اپنی عبادت خود کرتا ہے۔

پونہ کی اس کانفرنس کو امریکہ کے ایک مسیحی ادارہ نے اسپانسر کیا تھا۔ وہ گاڈ کانفرنس

(God conference) کے نام سے دنیا کے مختلف ملکوں میں کانفرسیں کر رہے ہیں۔ انڈیا میں یہ ان کی پہلی کانفرنس تھی۔ موجودہ زمانہ میں ہر مذہبی گروہ میں اس کی روایات کا احیاء ہو رہا ہے۔ دوسرے مذاہب میں بھی اور اسلام میں بھی۔ البتہ یہاں ایک فرق ہے۔ لوگوں سے گفتگو کے دوران میں نے پایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عمومی احیاء مذہب کی اس لہر کو زمانہ سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اس کو اپنے اپنے اکابر کے کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

اسلامی عبادت کا پروگرام ۴ نومبر کی صبح کو جناب فیروز پونہ والے نے کیا۔ اس میں انھوں نے صرف تلاوت قرآن کو لیا۔ پہلے قرآن کا ایک حصہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھا۔ اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ سنایا۔ مزید انھوں نے سورہ فاتحہ پڑھی اور اس کا انگریزی ترجمہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلامی عبادت کی تشریح کی۔ اور عبادت کی مختلف صورتوں کی تفصیل بیان کی۔ تمام حاضرین نہایت غور کے ساتھ اس کو سنتے اور دیکھتے رہے۔ بعد کو کانفرنس کے کئی شرکاء نے قرآن کے مطالعہ سے دلچسپی ظاہر کی اور قرآن کا انگریزی ترجمہ طلب کیا۔

۵ نومبر کی صبح کو مسیحی عبادت (christian prayer) کا دن تھا۔ سب سے پہلے ایک بڑے شمع دان پر کئی موم بتیاں جلائی گئیں۔ اس کے بعد اسٹیج پر ایک مسیحی مرد اور دو مسیحی خاتون آئیں۔ انھوں نے باری باری انجیل (انگریزی) کے کچھ حصے پڑھے۔ اس کے بعد ملے ہوئے کمرہ سے ایک مرد اور ایک خاتون برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ ہارمونیم اور طبلہ تھا۔ انھوں نے ہندی اور بنگالی میں بھجن گائے اور ہارمونیم اور طبلہ بجایا۔

آج بھی مجھے دوبارہ وہی احساس ہوا جو بند وعبادت کے دن ہوا تھا۔ مسیحی عبادت مجھے عبادت سے زیادہ ایک سماجی تقریب نظر آئی۔ ایک فرد کی فطرت اپنے آپ کو خدا کی پرستش میں شامل کرنا چاہتی ہے، مگر یہ مقصد ان عبادتی تقریبات کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا۔

آج صبح کی میٹنگ میں مذہبی لیڈروں کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں اصل اہمیت "اسپرٹ" کی ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں انھیں باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے جن کا تعلق روح یا اسپرٹ سے ہے۔ ظاہری نوعیت کی احکامی آیتیں قرآن میں نسبتاً کم

ہیں۔ اس میں وہ آیتیں زیادہ ہیں جن کا تعلق اسپرٹ سے تعلق رکھنے والی باتوں سے ہے۔

۴ نومبر کی صبح کی میٹنگ میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کی آفاقی تعلیمات کو بیان کیا۔ میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اسلام کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پایا کہ اسلام کی بنیاد دو بنیادی پرنسپل پر ہے ایک خدا پر ایمان۔ دوسرے انسان کے لئے مفید بننا۔ پہلے پرنسپل کے لئے میں نے قل ھو اللہ احد کی تشریح کی۔ اور دوسرے پرنسپل کے لئے میں نے واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کی تشریح بیان کی۔

ایک اور مجلس میں میں نے کہا کہ اسلام کے تمام اصول کامن سنس پر مبنی ہیں۔ کامن سنس خدا کی تخلیق ہے۔ اسی طرح قرآن بھی خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ چنانچہ دونوں میں کامل مطابقت ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے کامن سنس کو اس کی فطری حالت پر قائم رکھے تو وہ اسلام کو عین اپنے کامن سنس کے مطابق پائے گا۔

کانفرنس کے ساتھ ایک بک اسٹال لگا ہوا تھا۔ یہاں مختلف مذاہب سے متعلق انگریزی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ایک کتاب حسب ذیل تھی:

God, The Self and Nothingness by Robert E. Carter

اس کتاب کے مختلف حصے دیکھے۔ دوسرے مذاہب پر کافی تفصیلی گفتگو تھی۔ مگر اسلام کے بارہ میں صرف چند مختصر حوالے تھے۔ مصنف نے ایک جگہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر کے حوالے سے حسب ذیل تاثر نقل کیا تھا:

> For many years I have studied thoroughly the normative texts of Islam and Christianity. There appears to be no evidence in the texts for ... esoteric ecumenism (p.14).

برسوں تک میں بہت غور سے اسلام اور مسیحیت کی بنیادی کتابیں پڑھتا رہا ہوں۔ بظاہر ان کتابوں میں سرّی عالمگیریت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اس اسٹال پر انگریزی الرسالہ کا شمارہ بھی نظر آیا۔ ہم نے یہ الرسالہ انھیں فراہم نہیں کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے الرسالہ کہاں سے حاصل کیا۔

کانفرنس کی ایک ڈیلی گیٹ ایک ۳۶ سالہ جرمن خاتون Mrs. Ursula McLackland تھیں۔
ل نے ایک میٹنگ میں اپنا تجربہ بتایا جو بہت سبق آموز تھا۔ ان کے الفاظ میں، وہ تجربہ یہ تھا:

The highest value in the eyes of the German youths is to become independant. Personally I don't agree. I was educated to look forward to lead an independant life away from my family as soon as I entered university. But, to my surprise, I was lonely and miserable, missing the interaction with my family. I,therefore, came back to my family. I also joined the German Unification Church to fill the gap in my life. However, I think I am rather an exception. Those of my generation are also not happy but they do not know why that is so. They have lost the conviction, becoming skeptics. One reason of the ever-increasing tourism industry lies in the restlessness found in our generation. It is this dissatisfication with their lives that they are attracted to travelling, in search of some happiness, fulfillment in life .

جرمن نوجوانوں کی نظر میں سب سے زیادہ قابل قدر چیز آزاد ہونا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس
ہ اتفاق نہیں۔ ابتداءً میری تعلیم اسی ڈھنگ پر ہوئی کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں اپنے خاندان سے باہر
نے لئے ایک زندگی حاصل کروں۔ مگر جب میں نے ایسا کیا تو تعجب خیز طور پر میں نے پایا کہ میں تنہا
لئی ہوں اور مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ میرے خاندان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

آخر کار میں اپنے خاندان کی طرف واپس آئی۔ مزید میں یونی فیکشن چرچ سے وابستہ ہو گئی تاکہ
ا اپنی زندگی کے خلا کو پر کر سکوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں جرمنی میں ایک استثنا ہوں۔ میری نسل کے اور
لوگ ہیں وہ خوش نہیں ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے یقین کو کھو دیا ہے۔ وہ
ب میں مبتلا ہیں۔

آجکل مغربی سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یہ لوگ اپنی زندگی سے غیر
ئن ہیں، اس لئے وہ اپنے مقامات سے نکل کر ادھر ادھر جا رہے ہیں تاکہ وہ زندگی میں خوشی اور اطمینان
لاش کر سکیں۔ منشیات میں اضافہ کا سبب بھی یہی ہے۔

پونہ کانفرنس میں ڈاکٹر محمد اقبال جمیل سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں ایک
ہی طریقہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس میں پڑھنے سے زیادہ مشاہدہ پر زور ہے۔ چنانچہ اس کو تعلیم بذریعہ فطرت
(Teaching through the study of nature) کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق بچوں کو
تابوں کے ذریعہ پڑھانے کے بجائے فطرت کے مظاہر کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً علم نباتات کو

براہ راست پودوں اور درختوں کے مطالعہ کے ذریعہ۔

عرب کے صحرا میں جب ہاجرہ اور اسماعیل کو بسایا گیا اور ان کے ذریعہ صحرائی ماحول میں ایک نئی نسل بنائی گئی تو وہ گویا اس طریق تعلیم کا پہلا تجربہ تھا۔ کھلے میدان، پہاڑ، سورج، چاند، تاروں کے ماحول میں بنو اسماعیل کو بسانا دراصل ان کو فطرت کی درس گاہ میں داخل کرنا تھا۔ اس درس گاہِ فطرت میں تربیت پاکر جو اعلیٰ نسل تیار ہوئی اسی سے خیر امت کا وہ انسانی مجموعہ نکالا گیا جس کو صحابہ کرام کہا جاتا ہے۔

پونہ کے ایک مسلمان بزرگ نے بابری مسجد کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ ہماری نااہل لیڈرشپ ہے جس نے اپنی غلط پالیسیوں سے بابری مسجد کو ایک مسئلہ بنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب جب کہ معاملہ بگڑ چکا ہے، اب اس کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اب تو صرف ایک حل ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان اس محاذ سے ہٹ جائیں اور ہندوؤں کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا کام کرنے کا موقع دیں۔ ہندوؤں میں پچاس فیصد سے زیادہ لوگ اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ مگر جب ہم کسی مسئلہ کو ہندو قوم کے وقار کا مسئلہ بنا دیں تو اس طبقہ کے لئے اپنا عمل کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔

پونہ میں الرسالہ کے ایک قاری سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مشہور عربی درس گاہ کے فارغ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے انگریزی اقتباسات میں بعض اوقات اردو ترجمہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے مجھے الجھن ہوتی تھی۔ میں شکایت کرتا تھا کہ دیکھو، انھوں نے انگریزی نقل کر دی مگر اس کا ترجمہ شامل نہیں کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں خود انگریزی پڑھ ڈالوں۔ اس سے مجھے دہرا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے اب میں نے اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ انگریزی اقتباسات کو ترجمہ کی مدد کے بغیر سمجھ لیتا ہوں۔

یہ واقعہ مجھے بہت پسند آیا۔ اس مزاج کا تعلق صرف انگریزی سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی شکایت کرنے کے بجائے خود اپنی لیاقت کو بڑھائے۔ یہی تعمیری مزاج ہے۔ یہ مزاج اگر لوگوں کے اندر آجائے تو بہت سے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں۔

تقریباً دو ہفتہ کے اس سفر میں پونہ، بمبئی اور شولاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ کافی تعداد میں

لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ رہائش گاہ پہ صبح وشام لوگ جمع ہوتے رہے۔ اس طرح دوران سفر ہر روز غیر رسمی انداز میں لوگوں سے دعوتی، تربیتی اور تعمیری باتیں کہنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ہر جگہ باقاعدہ اجتماعات کا پروگرام بھی جاری رہا۔

۴ نومبر کی شام کو پونہ میں جناب انعام دار صاحب کے مکان کی کھلی چھت پر ایک اجتماع ہوا۔ شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ جمع ہوا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے انّ مع العسر یسرا کی تشریح کی۔ میں نے کہا کہ زمین کے نیچے پٹرول کے خزانے ہیں۔ یہ قیمتی خزانے جہاں موجود ہوں وہاں زمین کے اوپر کچھ خاص علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان علامتوں کو دیکھ کر ماہرین سمجھ لیتے ہیں کہ یہاں پٹرول ہے۔ چنانچہ وہاں کھدائی کی جاتی ہے اور پٹرول کے زیر زمین چشموں کو حاصل کرکے ملک کو دولت سے مالامال کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح مذکورہ آیت کے مطابق، عسر گویا یسر کی علامت ہے۔ جہاں عسر پایا جائے تو ہم کو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں اس کے قریب ہی ضرور یسر چھپا ہوا ہے۔ اور پھر یسر کو تلاش کرکے اس کا بھرپور استعمال کرنا چاہئے۔ یہی قرآن کے مطابق کامیاب عمل کا صحیح طریقہ ہے۔ یہ قرآنی اصول بیان کرنے کے بعد میں نے تفصیل سے بتایا کہ موجودہ عسر والے حالات میں کس طرح ہمارے لئے یسر موجود ہے۔

۵ نومبر کی شام کو جناب عبد الصمد صاحب کی رہائش گاہ کے سامنے کھلی زمین پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں ایک گھنٹہ کی تقریر میں میں نے بتایا کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے۔ اور اتحاد پیدا ہونے کا واحد راز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا مزاج پیدا ہو جائے۔ صحابہ کی مثال سے اس کو واضح کیا۔ اس تقریر کا ویڈیو کیسٹ بھی تیار کیا گیا۔

۶ نومبر کی صبح کو پونہ کی مکہ مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد پندرہ منٹ کے لئے تربیت کے انداز کی تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ حدیث میں ہے کہ من صَلّی الصبح فهو في ذمّة الله۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز پر اسرار طور پر آپ کی محافظ بن جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے نماز کے ذریعہ وہ اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو آدمی کے اندر تسخیری طاقت پیدا کرتے ہیں اور اس کو لوگوں کی طرف سے محفوظ کر دیتے ہیں۔

صلّوا خلف کلّ برّ وفاجر کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ برے لوگوں کو لاکر امام کی جگہ کھڑا کردو۔ اس حدیث کا خطاب حقیقۃً امام کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ مقتدیوں کی طرف ہے۔ یعنی مسجد میں کسی کو امام بنادیا گیا۔ اب ایک شخص کے اندر خیال پیدا ہوا کہ اس کے اندر تو فلاں خرابی ہے۔ تو جس شخص یا جن لوگوں کے دل میں اس طرح کا خیال آئے انھیں اپنے اس خیال کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہئے بلکہ اس کو نظر انداز کرکے امام کے پیچھے نماز پڑھتے رہنا چاہئے

۶ نومبر کی دوپہر میں لیڈی حوا بائی اسکول پونہ کے ہال میں شہر کا پڑھا لکھا طبقہ جمع ہوا۔ ان لوگوں کے سامنے خطاب کا موقع ملا۔ موضوع تھا: تعلیم اور مسلمان۔ میں نے کہا کہ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو باشعور بناتا ہے۔ اور باشعور آدمی ہی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ باتوں کی گہرائی کو سمجھے اور مختلف مواقع پر صحیح فیصلہ لے سکے۔ قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ نیز تاریخ عالم کی مثالوں سے اس کو واضح کیا۔ اس تقریر کا بھی ویڈیو کیسٹ لیا گیا۔

۶ نومبر کی سہ پہر کو انعامدار صاحب کے مکان پر خواتین کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کی تعلیم یافتہ خواتین جمع ہوئیں۔ اس موقع پر میں نے عورت کے بارہ میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کیا۔ میں نے کہا کہ عورت کا مقام عمل (workplace) گھر ہے نہ کہ باہر۔ اسلام میں عزت اور احترام کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کا درجہ یکساں ہے۔ مگر مقام عمل کے اعتبار سے دونوں میں تقسیم ہے۔ عورت کا مقام عمل بنیادی طور پر اندر ہے اور مرد کا مقام عمل بنیادی طور پر باہر۔

پھر میں نے کہا کہ عورت کا اہم ترین کام اگلی نسل کی تیاری ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کی دنیا کو آباد کرنے کے لئے مسلسل صالح انسان ملتے رہیں۔ یہ کام گھر کی تربیت گاہ میں انجام پاتا ہے۔ عورت یہ کام کرے تو اس کا درجہ مرد سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ نے ایک نئی نسل بنائی تو حج اور عمرہ میں مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان کے نقش قدم کی پیروی کریں۔ مغرب میں لیڈیز فرسٹ کے صرف الفاظ ہیں اور اسلام میں سعی بین الصفا والمروۃ کی صورت میں عملاً یہ درجہ عورت کو دیدیا گیا ہے۔

۷ نومبر کو کوئنا اکسپریس کے ذریعہ پونا سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ جناب فاروق فیصل صاحب ساتھ تھے۔ ان سے راستہ بھر دعوتی اور علمی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ اس طرح چار گھنٹہ کا یہ سفر بہت آسانی سے گزر گیا۔

ہماری ٹرین کلیان سے آگے بڑھی تو متوازی لائن پر ایک اور ٹرین آگئی۔ ہماری ٹرین کی طرح وہ

ین بھی بمبئی کے رخ پر جا رہی تھی۔ متوازی لائن پر اس ٹرین کے آنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری ٹرین پیچھے کی طرف جا رہی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا محسوس ہوا کہ مقابل کی الکٹرک ٹرین آگے جا رہی ہے اور ہماری ٹرین پیچھے کی طرف سفر کر رہی ہے۔

یہ صرف نگاہ کا دھوکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ٹرینیں ایک ہی رخ پر بمبئی کی طرف دوڑ رہی تھیں مگر مقابل کی ٹرین کی رفتار چونکہ تیز تھی اس لئے ظاہری تقابل میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹرین آگے کی طرف جا رہی ہے اور ہماری ٹرین پیچھے کی طرف۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری مشاہدہ اور حقیقی واقعہ میں بعض اوقات کتنا بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ایک چیز مشرق کی طرف جا رہی ہوتی ہے اور بظاہر دیکھنے والے کو ایسا نظر آتا ہے گویا کہ وہ چیز مغرب کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اس لئے آدمی کو محض ظاہری مشاہدہ کی بنیاد پر کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

۷ نومبر کی شام کو ۸ بجے ہماری ٹرین بمبئی وی ٹی پہنچ گئی۔ یہاں سے ساتھیوں کے ہمراہ ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب کے مکان (مجگاؤں) پہنچا۔ بمبئی میں میرا قیام انھیں کے یہاں رہا۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے حالات سن کر معلوم ہوا کہ ان کو ایک بڑا نقصان پیش آیا۔ جس کا ان کے اوپر اتنا اثر ہوا کہ ان کی صحت تباہ ہو گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ قبول کریں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ پھر ان کی اجازت سے میں نے ایک کاغذ لیا۔ اس پر یہ جملہ لکھ کر انھیں دیدیا —— آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

روزانہ صبح اور شام کو مقامی احباب رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے سوال وجواب کی صورت میں گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں میں انتہائی پر امید ہوں۔ ان کے بارہ میں قرآن کی یہ آیت صادق ہوتی نظر آتی ہے: کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں خدا کا یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ فئہ قلیلہ اکثر فئہ کثیرہ پر غالب آتا ہے۔ ایک عرصہ تک مسلمان سیاسی جوش وخروش میں اپنی قوتیں ضائع کرتے رہے۔ اب حالات کا دباؤ مسلمانوں کو صحیح رخ دے رہا ہے۔ وہ سیاست کے محاذ سے ہٹ کر تعمیر کے میدان میں

۱ پیس مشن کے پروگرام کے تحت ۱۴ فروری - ۲۰ فروری ۱۹۹۲ کو بمبئی اور پونہ کا سفر ہوا۔ اس دوران مختلف اعلیٰ شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور کئی اجتماعات میں خطاب ہوا۔ اس کی تفصیلی رپورٹ انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کی جائے گی۔

۲ اورنگ آباد کے اخبار رہبر (۱۴ فروری ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ کے تحت یہ خبر شائع ہوئی ہے: پروفیسر وگھن راجندر سانے کے بارہ میں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کی سیرت کو مرہٹی زبان میں ترجمہ کر کے مرہٹی داں عوام تک اسے پہنچانے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے سیرت کی متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کی نظر انتخاب مولانا وحید الدین خاں صاحب کی سیرت پر لکھی گئی پرافٹ آف ریولیوشن پر پڑی۔ مسٹر سانے نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو وہ حضورؐ کی زندگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس کتاب کا مکمل ترجمہ کر ڈالا۔ ایک ملاقات میں پروفیسر سانے نے کہا کہ اس کتاب کا اسلوب نہایت عمدہ، دل میں اتر جانے والا ہے۔

۳ سمواد پریاس کی طرف سے انڈین لا انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ۲۱ فروری ۱۹۹۲ کو ایک ڈائیلاگ ہوا۔ اس کا موضوع اجودھیا کا مسئلہ تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔

۴ انگریزی اخبار پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۲۴ فروری ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اجودھیا اور اس کے بعد کے مسائل سے تھا۔

۵ امریکی براڈکاسٹنگ کمپنی (Independent Broadcasting Associates. Inc.) کے نمائندہ مسٹر جولیان ہالک (Julian Crandall Hollick) یکم مارچ ۱۹۹۲ کو اسلامی مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ یہ انٹرویو ٹیپ پر ریکارڈ کیا گیا۔

۶ سنٹر فار پالیسی ریسرچ (نئی دہلی) کے تحت ۵ مارچ ۱۹۹۲ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ملک کے اعلیٰ دانشوروں نے شرکت کی۔ صدر اسلامی مرکز اس کی دعوت پر اس میں شریک ہوئے

اور وہاں اظہار خیال کیا۔ اس کا موضوع بحث تھا : ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد کیا ملک میں سیکولرزم کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔

۷ نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ۵ مارچ ۱۹۹۳ کی شام کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع ملک کے موجودہ حالات پر روشنی ڈالنا تھا۔ دہلی کے تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۸ پارلیمنٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں ۶ مارچ ۱۹۹۳ کو ایک ڈائیلاگ ہوا۔ اس کا اہتمام مسٹر جسونت سنگھ نے کیا تھا۔ اس کا موضوع تھا Our Republic - Post 6 December 1992

صدر اسلامی مرکز اس کی دعوت پر اس میں شریک ہوئے اور وہاں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۹ انگلش ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے کی ٹیم ۶ مارچ ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئی۔ اس نے تفصیل کے ساتھ صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر کے بعد کے حالات پر تھا۔

۱۰ امریکی نیوز ایجنسی اے پی کے نمائندہ نے ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا خاص سوال یہ تھا کہ کیا ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد انڈیا کے مسلمانوں کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہاں۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ پہلے مسلمان زیادہ تر جذباتی ردعمل کے تحت سوچتے تھے۔ اب وہ اس کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچتے ہیں۔

۱۱ سروسیوا سنگھ (سیواگرام) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ناگپور اور سیواگرام کا سفر کیا۔ ۱۶ - ۱۷ مارچ ۱۹۹۳ کو سیواگرام میں سروسیوا سنگھ کے دو روزہ سمینار میں شرکت کی۔ ۱۸ مارچ کو ناگپور میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ یہ تفصیلی رپورٹ انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۹ مارچ ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا : رمضان اور جمعۃ الوداع۔

۱۳ ناگپور کے انگریزی روزنامہ لوک مت ٹائمس (Lokmat Times) کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مذکورہ اخبار کے شمارہ ۱۹ مارچ ۱۹۹۲ میں صفحہ اول پر شائع ہوا ہے۔

۱۴ امریکہ کی ایک خاتون پروفیسر پاؤلا نیوبرگ (Paula R. Newberg) ۲۰ مارچ ۱۹۹۲ کو اسلامی مرکز میں آئیں۔ وہ (Carnegie Endowment for International Peace.) کے تحت انڈیا اور پاکستان کے تعلقات پر ایک کتاب تیار کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے حالات پر صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔

۱۵ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ مارچ ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس تقریر کا موضوع تھا ——— روزہ اور عید میں انسانی قدریں۔

۱۶ بمبئی کے ماہنامہ البلاغ کے نمائندہ حضرات نے یکم اپریل ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق ملی مسائل اور سہ نکاتی فارمولا سے تھا۔

۱۷ بمبئی میں ۲ اپریل ۱۹۹۲ کو ایک آل انڈیا کنونشن ہوا۔ اس کا انتظام ہندستانی اندولن کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں ان کی دو تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ بمبئی کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔

۱۸ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے تحت ۸ اپریل ۱۹۹۲ کو نئی دہلی میں اہل علم کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ٹرسٹ کی اس تجویز پر غور کیا گیا کہ "اسپریچول ریڈر" کے نام سے ایک کتاب تیار کی جائے۔ اس کو ملک کی ہر زبان میں شائع کیا جائے اور اسکول کے تمام طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ لازمی ہو۔ صدر اسلامی مرکز منتظمین کی دعوت پر اس میٹنگ میں شریک ہوئے اور اس کے سلسلہ میں اپنی رائے پیش کی۔

۱۹ ہندی اخبار دینک جاگرن کے سینیر کرسپانڈنٹ اشوتوش چترویدی نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل اور مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ تین نکاتی فارمولا کے بارہ میں بھی انھوں نے کئی سوالات کیے۔

۲۰ علماء اور دور حاضر نمبر انشاء اللہ جولائی ۱۹۹۳ میں شائع ہوگا۔

M: ASLAM
NEWS PAPER AGENTS
CO -Katra Bajwariyan
Ballimaran DELHI-6

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۲۲ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جا۔

زرِ تعاون الرسالہ

(بحری ڈاک)	(ہوائی ڈاک)	بیرونی ممالک کے لیے		ہندستان کے لیے
10 / £5	$20 / £10	ایک سال	Rs 70	ایک سال
8 / £8	$35 / £18	دو سال	Rs 135	دو سال
/ £12	$50 / £25	تین سال	Rs 200	تین سال
/ £18	$80 / £40	پانچ سال	Rs 300	پانچ سال
	$100 / £50	خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)

علماء

اور

دورِ جدید

مولانا وحید الدین خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۹۹۲ میں لکھنؤ میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا انتظام اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی نے کیا تھا۔ اس کا موضوع بحث تھا ـــــــ علما کا قائدانہ کردار۔ راقم الحروف نے منتظمین کی دعوت پر اس سیمینار میں شرکت کی۔ زیر نظر مقالہ اسی سیمینار کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ کے اجلاس میں اس کا خلاصہ پیش کیا گیا۔

اس مقالہ میں موجودہ زمانہ میں علما کے قائدانہ کردار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے تنقیدی جائزہ کے لیے شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ دو چیزوں کو بالکل ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے۔ ایک ہے لوگوں کی نیت اور ان کے ایمان واخلاص کا معاملہ۔ دوسرا ہے اس تدبیر کار کا معاملہ جو متعلقہ اشخاص نے مسائل کے مقابلہ میں اختیار کیا۔

شریعت کے مطابق، نیت یا ایمان و اخلاص کو بحث کا موضوع بنانا سراسر ناجائز ہے۔ مگر تدبیر کار کو زیر بحث لانا سراسر جائز۔ زیر نظر مقالہ میں اس تقسیم کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں نیت یا ایمان و اخلاص کو زیر بحث لائے بغیر صرف اس تدبیر کار کا جائزہ لیا گیا ہے جو ہمارے علما نے دور جدید میں اختیار کیا۔

زیر نظر جائزہ کا حاصل یہ ہے کہ علما نے جو تدبیر کار اختیار کی وہ زمانۂ حاضر کے تقاضوں کے مطابق نہ تھی۔ اس لیے ان کی کوششیں اور ان کی قربانیاں نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں۔ تاہم یہ علما کی اجتہادی خطا تھی، اور، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے مومن کا اجتہاد اگر درست ہو تو اس کے لیے دو ثواب ہے، اور اگر وہ اپنے اجتہاد میں غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک ثواب۔

یہ مقالہ بظاہر تنقید ہے مگر حقیقۃً وہ تجویز ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گزشتہ کے جائزہ کی روشنی میں آئندہ کا لائحۂ عمل متعین کیا جائے۔ تاکہ جو کام ماضی میں نہیں ہوا اس کو زیادہ صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ مستقبل میں انجام دیا جا سکے۔

وحید الدین

۲ ستمبر ۱۹۹۲

علمار کا قائدانہ کردار

موجودہ زمانہ میں علمار کا قائدانہ کردار ——— یہ وہ موضوع ہے جس کا مجھے زیر نظر مقالہ
جائزہ لینا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اسلام نے علمار کے لیے
کردار مقرر کیا ہے تاکہ ہمیں ایک معیار مل جائے جس کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے علمار کی سرگرمیوا
قدر و قیمت متعین کی جا سکے۔

علمار کا رول اسلام میں

راقم الحروف کے نزدیک، علمار کے رول کے سلسلہ میں قرآن کی رہنما آیت یہ ہے :

وما کان المومنون لِيَنفِرُوا کافۃ ۔ فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولیُنذروا قومَھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبہ ۱۲۲)

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب نکل کھڑے ہو تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ا حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا ا واپس جاکر اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراتا تاکہ وہ پرہیز کرنے والے بنتے۔

اس آیت میں تفقہ کا لفظ وضاحت طلب ہے۔ پہلے ہم فقہ یا تفقہ کی لغوی تحقیق کریں گے۔ ا
کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس آیت کے مطابق علمار کا کردار کیا ہے یا کیا ہونا چاہ

فقہ کا لفظ بعد کے زمانہ میں علم الفروع کے لیے بولا جانے لگا ہے۔ یعنی شریعت کے جزئی مہ
کو جاننا۔ مگر یہ اس لفظ کا ایک استعمالی مفہوم ہے جو نزول قرآن کے بہت بعد رائج ہوا۔ قرآن میں ف
موجودہ معروف معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کے اصل لغوی معنی میں ہے۔

راغب الاصفہانی (م ۵۰۲ ھ) نے لکھا ہے کہ فقہ یہ ہے کہ موجود علم کے ذریعہ غائب علم
پہنچا جائے۔ پس فقہ کا لفظ علم کے لفظ سے زیادہ خاص ہے (الفقہُ ھو التوصُّلُ الی علم غائ
بعلم شاھدٍ فھو اخصُّ من العلم) المفردات فی غرائب القرآن، ۳۸۴

لسان العرب (ابن منظور) میں اس کی مفصل تشریح ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ فقہ اصلاً فہم کے
میں ہے۔ (الفقہ فی الاصل الفھم) لیتفقھوا فی الدین کی تشریح اس نے لیکونوا علماء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۹۹۲ میں لکھنؤ میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا انتظام اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی نے کیا تھا۔ اس کا موضوع بحث تھا ——— علماء کا قائدانہ کردار۔ راقم الحروف نے منتظمین کی دعوت پر اس سیمینار میں شرکت کی۔ زیر نظر مقالہ اسی سیمینار کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ کے اجلاس میں اس کا خلاصہ پیش کیا گیا۔

اس مقالہ میں موجودہ زمانہ میں علماء کے قائدانہ کردار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے تنقیدی جائزہ کے لیے شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ دو چیزوں کو بالکل ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے۔ ایک ہے لوگوں کی نیت اور ان کے ایمان و اخلاص کا معاملہ۔ دوسرا ہے اس تدبیر کار کا معاملہ جو متعلق اشخاص نے مسائل کے مقابلہ میں اختیار کیا۔

شریعت کے مطابق، نیت یا ایمان و اخلاص کو بحث کا موضوع بنانا سراسر ناجائز ہے۔ مگر تدبیر کار کو زیر بحث لانا سراسر جائز۔ زیر نظر مقالہ میں اس تقسیم کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں نیت یا ایمان و اخلاص کو زیر بحث لائے بغیر صرف اس تدبیر کار کا جائزہ لیا گیا ہے جو ہمارے علماء نے دور جدید میں اختیار کیا۔

زیر نظر جائزہ کا حاصل یہ ہے کہ علماء نے جو تدبیر کار اختیار کی وہ زمانۂ حاضر کے تقاضوں کے مطابق نہ تھی۔ اس لیے ان کی کوششیں اور ان کی قربانیاں نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں۔ تاہم یہ علماء کی اجتہادی خطا تھی، اور جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے مومن کا اجتہاد اگر درست ہو تو اس کے لیے دو ثواب ہے، اور اگر وہ اپنے اجتہاد میں غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک ثواب۔

یہ مقالہ بظاہر تنقید ہے مگر حقیقۃً وہ تجویز ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گزشتہ کے جائزہ کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل متعین کیا جائے۔ تاکہ جو کام ماضی میں نہیں ہوا اس کو زیادہ صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ مستقبل میں انجام دیا جا سکے۔

وحید الدین

۲ ستمبر ۱۹۹۲

علمار کا قائدانہ کردار

موجودہ زمانہ میں علمار کا قائدانہ کردار ——— یہ وہ موضوع ہے جس کا مجھے زیر نظر مقالہ میں جائزہ لینا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اسلام نے علمار کے لیے کیا کردار مقرر کیا ہے تاکہ ہمیں ایک معیار مل جائے جس کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے علمار کی سرگرمیوں کی قدر و قیمت متعین کی جا سکے۔

علمار کا رول اسلام میں

راقم الحروف کے نزدیک، علمار کے رول کے سلسلہ میں قرآن کی رہنما آیت یہ ہے:

وما کان المومنون لِیَنفِرُوا کافۃ۔ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولیُنذروا قومَھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبہ ۱۲۲)

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب نکل کھڑے ہوں، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔

اس آیت میں تفقہ کا لفظ وضاحت طلب ہے۔ پہلے ہم فقہ یا تفقہ کی لغوی تحقیق کریں گے۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس آیت کے مطابق علمار کا کردار کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔

فقہ کا لفظ بعد کے زمانہ میں علم الفروع کے لیے بولا جانے لگا ہے۔ یعنی شریعت کے جزئی مسائل کو جاننا۔ مگر یہ اس لفظ کا ایک استعمالی مفہوم ہے جو نزول قرآن کے بہت بعد رائج ہوا۔ قرآن میں فقہ موجودہ معروف معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کے اصل لغوی معنی میں ہے۔

راغب الاصفہانی (م ۵۰۲ ھ) نے لکھا ہے کہ فقہ یہ ہے کہ موجود علم کے ذریعہ غائب علم تک پہنچا جائے۔ پس فقہ کا لفظ علم کے لفظ سے زیادہ خاص ہے (الفقہُ ھو التوصّلُ الی علم غائبٍ بعلم شاھدٍ فھو اخصُّ من العلم) المفردات فی غرائب القرآن، ۳۸۴

لسان العرب (ابن منظور) میں اس کی مفصل تشریح ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ فقہ اصلاً فہم کے معنی میں ہے۔ (الفقہ فی الاصل الفھم) لیتفقھوا فی الدین کی تشریح اس نے لیکونوا علماء بہ

کے لفظ سے کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن عباس کی بابت دعائیہ طور پر فرمایا تھا :
اللّٰھم علّمہ الدین و فقّھہ فی التاویل۔ اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے : ای فھّمہ تأویلہ ومعناہ۔ لسان العرب میں الازھری کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :

قال لی رجل من کلاب وھو یصف لی شیئاً۔ فلما فرغ من کلامہ قال أفقھتَ۔ یرید أفھمتَ۔

قبیلہ کلاب کا ایک شخص مجھ کو ایک بات بتا رہا تھا۔ جب وہ اپنی بات کہہ کر فارغ ہوا تو اس نے کہا افقھتَ۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ کیا تم نے سمجھ لیا۔

اسی طرح لسان العرب میں اس سلسلہ کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

فی حدیث سلمان۔ انہ نزل علی نَبطیّۃٍ بالعراق۔ فقال لھا۔ ھل ھنا مکانٌ نظیفٌ أصلّی فیہ۔ فقالت طھّر قلبکَ وصلِّ حیثُ شئتَ۔ فقال سلمان : فَقِھَتْ۔ أی فھمت و فطِنتْ للحقّ۔
(لسان العرب ۱۳/۵۲۲)

حدیث سلمان میں ہے۔ وہ عراق میں ایک نبطی عورت کے یہاں ٹھہرے۔ انھوں نے عورت سے کہا۔ کیا یہاں کوئی صاف جگہ ہے جہاں میں نماز پڑھوں۔ عورت نے کہا کہ اپنے دل کو پاک رکھو اور پھر جہاں چاہے نماز پڑھو۔ یہ واقعہ بتا کر سلمان نے کہا کہ فقھت۔ یعنی وہ عورت سمجھ گئی، اس نے حق کا ادراک کر لیا۔

اہل لغت کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ کا مطلب فہم اور بصیرت اور ادراک ہے۔ اس سے مراد وہ جاننا ہے جو معرفت کے درجہ تک پہنچ جائے۔ جو آدمی کو شناسائے حقیقت بنادے۔ صرف عالم ہونا فقیہہ ہونا نہیں ہے۔ فقیہہ وہ ہے جو عالم ہونے کے ساتھ عارف بھی ہو۔

دائرۂ عمل کی تقسیم

اب مذکورہ آیت کو لیجئے۔ تفسیروں کے مطالعہ سے اس آیت کا جو پس منظر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غزوۂ تبوک (۹ھ) میں مدینہ کے کچھ مسلمان نہیں جا سکے تھے۔ ان متخلفین کے بارہ میں قرآن میں سخت آیتیں اتریں۔ اس کے بعد لوگوں کا حال یہ ہوا کہ بعض سرایا پیش آئے تو اس میں مدینہ کے تمام اہل ایمان چلے گئے۔ حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم دین سیکھنے کے لیے کوئی آدمی شہر میں باقی

نہ رہا۔ اس وقت لوگوں کو عمومی خروج سے روکنے کے لیے یہ آیت اتری۔

اس آیت میں امت کو مستقل نوعیت کا ایک رہنما اصول دے دیا گیا۔ وہ یہ کہ جہاد بالسیف اور علم کے میدان کو عملی طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ امت کے ایک طبقہ کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ سیاسی جہاد کے شعبوں میں مشغول ہو۔ امت کے دوسرے طبقہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ علم کے شعبوں کو سنبھالے اور اپنے آپ کو پوری طرح اس میں وقف کرے۔ کیوں کہ وقف کیے بغیر کما حقہ اس کے تقاضے پورے نہیں کیے جا سکتے۔

مفسرین نے مزید وضاحت کی ہے کہ علم کے شعبوں میں محنت کے لیے ٹھہرنا کوئی تخلف کی بات نہیں ہے۔ یہ علم کی طاقت سے جہاد کرنا ہے جو معروف ہتھیاروں کے ذریعہ جہاد کرنے سے زیادہ اہم ہے:

فأُمروا اَن يَنفِرَ مِن كلِّ فرقةٍ منهم طائفة الى الجهاد ويَبقىٰ سائرُهُم يتفقّهون حتى لا يَنقَطِعوا عن التفقه الذى هو الجهاد الاكبر۔ إذ الجهاد بالحِجاجِ اعظم اثراً من الجهاد بالنِصال (تفسیر النسفی، مدارک التنزیل)

پس لوگوں کو حکم دیا گیا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت جہاد کے لیے نکلے اور بقیہ لوگ مدینہ میں رہ کر دین سیکھیں تاکہ وہ علم دین سے کٹ نہ جائیں جو کہ زیادہ بڑا جہاد ہے۔ کیوں کہ دلائل کے ذریعہ جہاد کی تاثیر ہتھیاروں کے ذریعہ جہاد سے بہت زیادہ ہے۔

اس اصول کا مطلب مذہب اور سیاست کی تفریق نہیں ہے۔ بلکہ خود اہل مذہب کے دو طبقوں کے دائرۂ عمل کی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

اسلام میں عورت اور مرد دونوں کا دین ایک ہے۔ دونوں یکساں طور پر دین کے مخاطب ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے دونوں کے دائرۂ کار کو ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا ہے۔ عورت کے ذمہ نسل انسانی کی تربیت ہے، اور مرد کے ذمہ عمل انسانی کا انتظام۔ اسی طرح خود مردوں میں بھی مختلف تقسیمات ہیں۔ اس میں سے ایک تقسیم یہ ہے کہ اسلام میں اہل علم اور اہل سیاست کے دائرہ کار کو، بنیادی طور پر، الگ کر دیا گیا ہے۔ اہل علم کا کام یہ ہے کہ وہ شعور انسانی کے نگراں بنیں۔ وہ ہر دور میں شعور انسانی کی تشکیل کے لیے معلّم کا کردار ادا کریں۔ تاکہ عقلیت بشری یا شاکلۂ انسانی فطرت کی راہ سے بھٹکنے نہ پائے۔

جہاں تک عملی سیاست کا تعلق ہے۔ اس کے لیے مخصوص صلاحیتیں درکار ہیں۔ ہر آدمی عملی سیاست کی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ انسانی صلاحیتوں کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ اصرار امت کو یہ اشارہ دیا کہ آپ کے بعد وہ ابوبکر صدیق رض کو امیر مقرر کرے۔ دوسری طرف آپ نے ابوذر غفاری رض، ابوہریرہ رض اور حسان بن ثابت رض کو یہ مشورہ دیا کہ تم کبھی کوئی حکومتی عہدہ قبول نہ کرنا۔ پیدائشی صلاحیتوں کے اس فرق کی بنا پر کچھ لوگ حکومتی شعبوں کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو سیاسی صلاحیت رکھنے والوں کے حوالے کر کے بقیہ لوگوں کو اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے ملت کے مختلف شعبوں میں مصروف کر دیا جائے۔ اس کے مطابق، اہل سیاست کا کام اگر تنظیم انسانی ہے تو اہل علم کا کام تعلیم انسانی۔

اہل علم اور اہل سیاست کے درمیان تقسیم کار کے معاملہ کو حدیث میں اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں، خاص طور سے کتاب الفتن کے تحت کثرت سے ایسی روایتیں آئی ہیں جن میں حکومتی بگاڑ کے ذیل میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر تم لوگ دیکھو کہ حکمراں بگڑ گئے ہیں تب بھی تم حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرنا۔ تم اپنی تلواروں کو توڑ دینا مگر ایسا نہ کرنا کہ حکمرانوں کو ظالم قرار دے کر ان سے لڑنے لگو۔

یہ دراصل مذکورہ تقسیم عمل کو آخری اور انتہائی صورت میں بھی باقی رکھنے کی تاکید ہے۔ یعنی علماء امت کو نہ صرف عام حالات میں معلم انسانی کا کردار ادا کرنا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی انھیں اسی تعمیری کام میں لگے رہنا ہے جب کہ وہ دیکھیں کہ حکمرانوں کے اندر بگاڑ آگیا ہے۔ حکومتی نظام خواہ بظاہر کتنا ہی بگڑا ہوا نظر آئے مگر علماء کو کسی بھی حال میں اپنے مفوضہ کام سے نہیں ہٹنا ہے۔

ایک حدیث

محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی کی "مشکاۃ المصابیح" میں کتاب الامارۃ والقضاء کے تحت ایک حدیث آئی ہے۔ اس کا مطالعہ اس ذیل میں بہت اہمیت رکھتا ہے:

عن یحیی بن ھاشم عن یونس بن ابی اسحاق عن ابیہ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کما تکونون کذلک یُؤَمَّرُ علیکم۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جیسے تم لوگ ہوگے ویسے ہی تمہارے اوپر حاکم بنائے جائیں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہے کونیت بشری، اور دوسری چیز ہے امارت بشری۔ کونیت بشری سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ اور ان کی پسند و ناپسند کیا ہے۔ اور امارت بشری

سے مراد ہے کسی انسانی مجموعہ کے اوپر سیاسی حاکم ہونا۔ کونیت بشری کے اعتبار سے کوئی سماج جس حالت
ں ہوگا اسی کے مطابق اس سماج کے درمیان سیاسی ڈھانچہ بنے گا۔

علماء ابدی طور پر کونیت بشری کے نگراں ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر دور میں تکوین شعور یا شاکلۂ
سانی کی تصحیح کرتے رہیں۔ اور امارت انسانی یا سیاسی ڈھانچہ کی تولیت کا کام اہل سیاست کے
والے کر دیں۔ زندگی کا نظام جب تک تقسیم عمل کے اس اصول پر چلے گا، وہ درست رہے گا۔ اور
بب یہ تقسیم عمل باقی نہ رہے تو زندگی کا نظام بھی بگڑ جائے گا۔ صحیح انسانی شاکلہ سے صحیح نظام حکومت
ہ آمد ہوتا ہے اور غلط انسانی شاکلہ سے غلط نظام حکومت۔

زندگی میں کونیت بشری کا معاملہ امارت بشری سے زیادہ اہم ہے۔ کونیت بشری کی حیثیت
نیاد کی ہے اور امارت بشری کی حیثیت اوپری ڈھانچہ کی۔ ظاہر بیں لوگوں کو اگرچہ بنیاد کے مقابلہ میں
وپری ڈھانچہ زیادہ اہم دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت بیں شخص ہمیشہ بنیاد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکام کے مقابلہ میں علماء کا درجہ زیادہ ہے اور ان کا ثواب بھی زیادہ۔

آغاز اسلام کی اس ہدایت نے امت کے لیے آئندہ سرگرمیوں کا رخ متعین کر دیا۔ دور اول
یں اصحاب رسول کی ایک جماعت جہاد کے عمل میں مشغول ہوئی۔ اسی کے ساتھ ان کی دوسری جماعت،
ثال کے طور پر عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر وغیرہ، علمی اور دعوتی شعبوں میں
اپنے آپ کو وقف کیے رہے۔

صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بھی یہی تقسیم قائم تھی۔ لوگ مختلف علمی میدان، تفسیر، حدیث،
فقہ اور ان سے تعلق رکھنے والے دوسرے علمی شعبوں میں مشغول رہے۔ تقریباً ایک ہزار سال تک
یہ صورت حال قائم رہی۔ یہ لوگ قراء، محدثین، فقہاء، علماء، دعاۃ، صوفیاء اور معلمین وغیرہ کی صورت
میں یکسوئی کے ساتھ اپنے مخصوص میدان میں سرگرم عمل رہے۔

اسی تقسیم کار کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ عظیم علمی اور دعوتی تاریخ بنی جو آج ملت اسلامی کا
انتہائی قیمتی اثاثہ ہے۔ اگر تمام کے تمام لوگ جہاد و قتال کی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتے
تو یقینی طور پر اسلام کی تاریخ میں ایک خلا پیدا ہو جاتا جو قیامت تک کبھی دوبارہ
پُر نہ ہوتا۔

اورنگ زیب عالم گیر

میراخیال ہے کہ یہ روایت سب سے پہلے قابل لحاظ درجہ میں اورنگ زیب عالم گیر(۱۷۰۷-۱۶۱۸) کے زمانہ میں ٹوٹی۔ اورنگ زیب اگرچہ شاہی خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر وہ پورے معنوں میں ایک عالم تھا۔ اس کا باپ شاہ جہاں اس کے بجائے داراشکوہ کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ اس طرح حالات اورنگ زیب کو اس طرف لے جارہے تھے کہ وہ بادشاہ کا کردار ادا کرنے کے بجائے ایک عالم کا کردار ادا کرے۔ مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے ۱۶۵۸ میں اپنے باپ شاہ جہاں کو تخت سے معزول کر کے آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اور اپنے بھائی داراشکوہ کو ۱۶۵۹ میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک وہ مغل سلطنت کا مالک بنا رہا۔

"تاج" سے محرومی کے باوجود اورنگ زیب کو بہت سے اعلیٰ وسائل حاصل تھے۔ اگر وہ بادشاہ کا رول ادا کرنے کے بجائے عالم کا رول ادا کرنے پر راضی ہوجاتا تو وہ اتنا بڑا کام کرسکتا تھا کہ آئندہ کئی صدیوں تک آنے والے علماء کے لیے وہ مشعل راہ کا کام دیتا۔

اورنگ زیب کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ میں علم جدید کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اس کے اثرات ہندستان کے سواحل تک پہنچ چکے تھے۔ مگر اورنگ زیب اس سے بے خبر رہ کر وقتی سیاست میں پڑا رہا۔ شاہ جہاں نے ہندستان میں تاج محل بنایا تھا۔ اورنگ زیب کے لیے موقع تھا کہ وہ ہندستان میں علم محل کی تعمیر کرے۔ ملک کا سیاسی ایمپائر داراشکوہ کے حوالے کر کے وہ ملک میں ایک ایجوکیشنل ایمپائر بنا سکتا تھا۔ اگر اورنگ زیب ایسا کرتا تو وہ اسلام اور ملت اسلام کو اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچاتا جو اس نے سیاست اور جنگ کے راستہ سے پہنچانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اورنگ زیب اگر "دکن" کا سفر کرنے کے بجائے "یورپ" کا سفر کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ وہ ایک خلاف زمانہ عمل میں مبتلا ہے۔ وہ شمشیر کی سیاست کے ذریعہ دنیا میں اسلام کو سربلند کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اب دنیا میں اس دور کا آغاز ہوچکا ہے جو بالآخر یہاں پہنچے گا کہ علم کی سیاست لوگوں کے لیے سربلندی کا ذریعہ بن جائے گی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اور اس زمانہ کے دوسرے علماء نہ صرف یورپ

ترقیوں سے بے خبر تھے بلکہ وہ اس سے پہلے کی ان ترقیوں سے بھی ناواقف تھے جو مسلمان اسپین کے
دورِ حکومت (۷۱۱–۱۴۹۲) میں کر چکے تھے۔

اسپین میں جب مسلم سلطنت کو زوال ہوا تو وہاں کے علماء اور سائنس داں اسپین سے نکل کر باہر
انے لگے۔ اس وقت ترکی میں طاقت ور مسلم خلافت (۱۲۰۰–۱۹۲۴) قائم تھی۔ اس زمانہ میں غالباً کچھ
مسلم سائنس داں بھاگ کر ترکی گئے۔ مگر وہاں کے دربار میں انھیں کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ مسلم اسپین
کے زوال کے بعد ۱۵۲۶ میں ہندستان میں مغل سلطنت قائم ہوئی۔ مگر مغل حکمرانوں کو یہ خیال نہیں
یا کہ وہ قدیم مسلم اسپین کے کچھ سائنس دانوں کو بلائیں اور علمی ترقی کا وہ کام ہندستان میں جاری
ریں جس کا سلسلہ اسپین میں منقطع ہو گیا تھا۔

تحقیق و ریسرچ کا یہ کام صرف حکومت کی سرپرستی کے تحت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان سائنس دانوں
؛ جب مسلم دنیا میں مواقع نہیں ملے تو وہ مغربی یورپ میں داخل ہونے لگے۔ وہاں انھیں بادشاہوں
ی طرف سے سرپرستی حاصل ہوئی۔ یہی سبب ہے جس کی بنا پر اسپین کے عمل کی تکمیل مسلم دنیا میں نہ
ہ سکی، وہ یورپ کی سرزمین پر ہوئی۔

اورنگ زیب بھی اپنی بے خبری اور سیاست سے غیر معمولی دل چسپی کی بنا پر اپنے زمانہ میں اِس
خ پر کوئی اقدام نہ کر سکا۔ آخری مرحلہ میں سائنس کی ترقی کا کریڈٹ تمام تر یورپ کے حصہ میں چلا گیا۔

جدید دور کے تمام ابتدائی اسباب اور اس کے ابتدائی مظاہر اورنگ زیب کے زمانہ میں
یدا ہو چکے تھے۔ روایتی گھڑی کے مقابلہ میں اسپرنگ دار (spring - driven) گھڑی کا ابتدائی
ڈل ۱۵۰۰ میں جرمنی میں تیار کر لیا گیا تھا۔ جغرافیہ اور بحریات میں ترقی کی بنا پر پرتگال کا
اسکو ڈی گاما، ۱۴۹۹ میں کالی کٹ کے ساحل پر اتر چکا تھا۔ اور اس طرح اس نے یورپ اور
نیا کے درمیان بحری راستہ کھول دیا تھا۔ ۱۵۱۰ میں پرتگال نے گوا پر قبضہ کر لیا تھا۔ برٹش
یسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ میں بنی اور فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۶۴ میں قائم ہوئی۔ مگر اورنگ زیب
پنی سیاسی مشغولیت کی بنا پر ان واقعات سے بے خبر رہا۔ حالانکہ یہ واقعات بتا رہے تھے کہ
ستندہ نہ صرف برصغیر ہند بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے جو مسئلہ پیدا ہونے والا ہے وہ اپنی
وعیت میں خارجی ہے نہ کہ داخلی۔ (9/392)

اورنگ زیب کی پیدائش سے بہت پہلے دوسری صدی عیسوی کے آخر میں چین میں پرنٹنگ کا ابتدائی طریقہ دریافت ہو چکا تھا۔ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۶۲۰ء میں ایمسٹرڈم میں مشہور ڈچ پریس بنالیا گیا۔ پریس اولاً لکڑی کے ہوا کرتے تھے۔ پھر لکڑی اور لوہے کے ملے جلے پریس بنے۔ یہاں تک کہ ۱۷۹۵ء میں انگلینڈ میں مٹل پریس تیار کیا گیا جو مکمل طور پر لوہے کا بنا ہوا تھا

(EB - 14/1054)

اورنگ زیب کا کمال یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کتابت کر کے قرآن تیار کرتا تھا۔ مگر اورنگ زیب کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس سے پہلے ۱۴۵۵ء میں گوٹن برگ (Gutenberg) نے بائبل کا پہلا نسخہ پریس میں چھاپ کر عیسائیت کے مشن کو دستکاری کے دور سے نکال کر مشینی دور میں داخل کر دیا ہے۔ اورنگ زیب اگر اس واقعہ کو جانتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ قرآن کو ہاتھ سے لکھنے کے بجائے اس کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ ملک میں پرنٹنگ پریس کی صنعت قائم کرے۔

انگلینڈ کی کیمبرج یونی ورسٹی ۱۲۰۹ء میں قائم ہوئی۔ پیرس یونی ورسٹی اور آکسفرڈ یونی ورسٹی اس سے بھی پہلے بارھویں صدی عیسوی میں قائم ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب کا زمانہ سترھویں صدی کا زمانہ ہے۔ اس کے کرنے کا زیادہ اہم کام یہ تھا کہ وہ ہندستان میں ہر قسم کے علوم کی ایک وسیع یونی ورسٹی بنائے۔ اسی طرح اس کو یہ کرنا تھا کہ وہ وقت کے موضوعات پر ریسرچ کے ادارے کھولے۔ وہ دہلی میں نیا بیت الحکمت کھول کر یورپ کے علوم کے ترجمے کرائے۔ وہ علما کی ایک اکیڈمی بنائے جو وقت کے علوم کو حاصل کرے اور اس پر ریسرچ کرے۔ مگر وہ اس قسم کا کوئی بھی کام نہ کر سکا۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وہ تقسیم کار پر راضی نہیں ہوا۔

انسانیت نئے عہد میں

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں، بلکہ بہت زیادہ اہم بات ہے۔ اس کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے اس کو ہمیں وسیع تر دائرہ میں دیکھنا چاہیے۔

قدیم مشرکانہ دور میں انسان مظاہر فطرت کی پرستش کرتا تھا۔ یہ چیز سائنس (علوم فطرت) کے ظہور میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ علوم فطرت کے ظہور کے لیے فطرت کی تحقیق ضروری تھی۔ اور فطرت پونکہ انسان کے لیے معبود کا درجہ رکھتی تھی اس لیے انسان فطرت کو پرستش کا موضوع بنائے ہوئے

تھا۔ یہ مزاج فطرت کو تحقیق و تسخیر کا موضوع بنانے میں مستقل رکاوٹ تھا۔

اسلام نے توحید کی بنیاد پر فکری انقلاب برپا کر کے سائنسی ترقی کا دروازہ کھولا۔ اس سلسلہ میں علوم سائنس (علوم فطرت) کی ترقی کے تین دور ہیں۔ (۱) ذہنی رکاوٹ (mental block) کو توڑنا۔ یہ کام مکہ سے بغداد (۱۲۵۸ - ۶۱۰) کے تاریخی مرحلہ میں ہوا۔ (۲) نئے فکر کی بنیاد پر فطرت کی عملی تحقیق و تجربہ کا دروازہ کھولنا۔ یہ کام مسلم اسپین کے دور (۱۴۹۲ - ۷۱۱) میں شروع ہوا۔ (۳) اس آغاز کو آخری تکمیل تک پہنچانا۔ یہ کام سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کے دور میں مغربی یورپ میں انجام دیا گیا۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو کام مسلم دنیا میں شروع ہوا اور اس نے مسلم دنیا میں اپنے دو مرحلے بھی طے کر لیے، اس کی تکمیل یورپ میں پہنچ کر کیوں ہوئی۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ غالباً یہ تھی کہ بغداد کی مسلم سلطنت اور اسپین کی مسلم سلطنت کے درمیان اول روز سے رقابت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ بغداد نے کبھی سنجیدہ طور پر اسپین کے کام کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ غالباً اسی رقابت کا یہ اثر تھا کہ ہندستان یا کسی دوسرے ملک میں بھی کسی قابل ذکر شخصیت نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں اسپین کی ترقیوں سے واقف ہو کر اسے آگے بڑھانا چاہیے۔

یہ حقیقت اگر ہم عصر مسلم حکمرانوں اور مسلم رہنماؤں پر واضح ہوتی اور وہ لوگ اس سلسلہ میں مثبت اقدام کرتے تو اسپین کے زوال کے بعد جو علماء بھاگ کر مغربی یورپ میں گئے، وہ اس کے بجائے مسلم دنیا کا رخ کرتے۔ اور پھر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب کا تسلسل یورپ میں جاری ہونے کے بجائے مسلم دنیا میں جاری ہو جاتا۔ اور جس طرح جدید سائنسی دور کا آغاز کرنے کا کریڈٹ اسلام کو حاصل ہے، اسی طرح اس دور کی تکمیل کا کریڈٹ بھی اسلام کو حاصل ہوتا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تاریخ کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہوتا جو موجودہ دور میں ہمیں نظر آتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی

علماء کے کردار کا دوسرا دور وہ ہے جس کی علامت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ - ۱۷۰۲) کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بلاشبہ کچھ مفید کام کیے۔ مثلاً قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ،

مدرسۂ رحیمیہ قائم کرنا، حدیث کے علم کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا، حجۃ اللہ البالغہ اور اس قسم کی دوسری قیمتی کتابوں کی تصنیف، وغیرہ۔

مگر اس قسم کے مختلف کام جو شاہ ولی اللہ نے انجام دیے، وہ سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحفظاتی کام ہیں نہ کہ قائدانہ کام۔ تحفظاتی خدمت بھی بلاشبہہ ایک قابل قدر خدمت ہے مگر تحفظاتی کردار اور قائدانہ کردار میں ایک بنیادی فرق ہے۔ تحفظ کا تعلق ماضی کی حفاظت سے ہے اور قیادت کا تعلق مستقبل کی تعمیر سے۔ ان کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ قائدانہ نوعیت کی ایک خدمت قرار دی جاسکتی تھی بشرطیکہ وہ اسم بامسمیٰ ہوتی۔ مگر، جیسا کہ آئندہ وضاحت کی جائے گی، شاہ صاحب کی یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے دینِ الٰہی کی صرف تقلیدی تبئین ہے، وہ دینِ الٰہی کی عقلی تبئین نہیں۔

تحفظاتی کردار ادا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ آدمی کو ماضی کے اثاثہ سے واقفیت ہو۔ مگر جس چیز کو قائدانہ کردار کہا جاتا ہے اس کی ادائگی کے لیے مستقبل کو دیکھنے والی نگاہ درکار ہے۔ کیوں کہ قائدانہ کردار ایک شخص حال میں ادا کرتا ہے اور اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں برآمد ہوتا ہے۔ اسی لیے تحفظاتی کردار ادا کرنے کے لیے مقلدانہ فکر کافی ہو جاتا ہے۔ مگر قائدانہ کردار ادا کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آدمی زمانہ شناسی کے ساتھ اعلیٰ مجتہدانہ صلاحیت کا مالک ہو۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے بارہ میں لکھا ہے کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں۔ یعنی یہ کہ اللہ جب نظام خیر میں سے کسی چیز کو چاہتا ہے تو وہ مجھ کو اپنی منشا کو پورا کرنے کے لیے آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے (رأیتُنِي فِي المنام قائمُ الزمانِ۔ أعْنِي بذلكَ أنَّ اللهَ إذا أرادَ شيئاً مِن نظامِ الخيرِ جَعَلَني كالجارِحَةِ لِإتمامِ مرادِه، فیوض الحرمین، صفحہ ۸۹)

میں سمجھتا ہوں کہ شاہ ولی اللہ کا یہ خواب صحیح تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بالفعل قائم الزمان ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں قائم الزمان بننا چاہیے۔

شاہ ولی اللہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ دورِ جدید کے سرے پر پیدا ہوئے۔ وہ اس تاریخی مقام پر تھے جہاں ان کے لیے مقدر تھا کہ وہ وقت کے دھارے کو سمجھیں اور عملِ اسلامی کی ایسی روایت قائم کریں جو ان کے بعد صدیوں تک جاری رہ کر دورِ جدید کو از سرِ نو اسلام کا دور بنا سکے۔ مگر وہ

اپنا یہ تاریخی کردار ادا کرنے میں ناکام رہے۔ وہ قائم الزمان بننے کے مقام پر تھے مگر وہ عملاً قائم الزمان نہ بن سکے۔

شاہ ولی اللہ کا زمانہ اٹھارویں صدی کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے سترھویں صدی میں یورپ میں اس نئے دور کا بیج پڑ چکا تھا جو بالآخر پوری نوع انسانی کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والا تھا۔ وہ دورِ تقلید کو دورِ سائنس میں تبدیل کر دینے والا تھا۔ پچھلے زمانہ میں (بشمول دورِ شرک) کائناتی واقعات کی تشریح اعتقادی اصطلاح میں کی جاتی تھی۔ اب تاریخ بشری میں پہلی بار ایک ایسا دور آ رہا تھا جب کہ کائناتی واقعات کی تشریح خالص اسباب مادی کی اصطلاحوں میں کی جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ شاکلۂ انسانی تبدیل ہو جائے۔ مگر شاہ ولی اللہ اپنے قریبی واقعات میں الجھ کر رہ گئے۔ وہ دور رس بنیاد پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی نہ کر سکے جو کہ در اصل قائم الزمان ہونے کا تقاضا تھا۔

قدیم زمانہ میں واقعات عالم کی تشریح اعتقادی اصطلاحوں میں کی جاتی تھی۔ یعنی جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کرنے والا خدا ہے۔ اسلام سے پہلے غلبۂ شرک کے زمانہ میں اس اعتقادی تشریح کے لیے کئی خداؤں کے حوالے دیے جاتے تھے۔ اسلام کے بعد غلبۂ توحید کا زمانہ آیا تو صرف ایک خدا کی بنیاد پر تمام واقعات عالم کی تشریح کی جانے لگی۔ موجودہ دور پوری معلوم تاریخ میں پہلا دور ہے جب کہ واقعات عالم کو اسباب مادی کی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔

سولھویں صدی عیسوی میں مظاہر فطرت کی باقاعدہ علمی تحقیق کی جانے لگی۔ گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) نے چاند اور سیاروں اور دوسرے مظاہر فطرت کا مطالعہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ فطرت ایسے محکم قوانین کے تحت عمل کرتی ہے جن کو ریاضیاتی صحت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ فطرت کی کتاب سب کی سب ریاضی کی صورت میں لکھی گئی ہے:

The book of nature is written in mathematical form (15/530)

چرچ کی مخالفت کے باوجود یہ طرز فکر بڑھتا رہا۔ سترھویں صدی میں کثیر تعداد میں یورپ میں ایسے اہل علم پیدا ہوئے جو کائناتی واقعات کی مشینی تشریح کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ مثلاً یوپ، ٹائیکو براہی، کیپلر وغیرہ۔ یہ پروگرام جس کو عام طور پر مشینی فلسفہ کہا جاتا ہے، وہ سترھویں صدی کا غالب موضوع فکر تھا:

This program, known as the mechanical philosophy, came to be the dominant theme of 17th-century science. (14/387)

اٹھارویں صدی میں سر آئزک نیوٹن نے اس فکری عمل کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ نیوٹن کی کتاب، جس کا مختصر نام پرنسپیا ہے، شاہ ولی اللہ کی وفات سے ۷۵ سال پہلے ۱۶۸۷ میں لاطینی زبان میں چھپی۔ اور ۱۷۲۹ میں انگریزی میں شائع ہوئی۔ اسپیس، ٹائم، گریویٹی اور فورس کے موضوعات پر مختلف سائنسی ذہن پہلے سے کام کر رہے تھے۔ مگر اس معاملہ میں کامیابی کا سہرا نیوٹن کے حصہ میں آیا۔ نیوٹن نے اپنی کتاب (پرنسپیا) میں یونیورسل گریویٹیشن کے قانون کو ریاضیاتی معقولیت (mathematical reasoning) کے ذریعہ آخری طور پر ثابت کر دیا (6/888)

شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ایک نئے انقلاب کے تمام آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ اس انقلاب کا فکری پہلو اسلام کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ وہ حقائق کی تقلیدی تشریح کو رد کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک صرف وہ تشریح معقول اور مسلّم حیثیت رکھتی تھی جو جدید سائنٹفک معیاروں پر کی گئی ہو۔ مگر شاہ ولی اللہ ان عالمی تبدیلیوں سے یکسر بے خبر رہے۔

شاہ ولی اللہ واقعات کو دہلی کے محدود دائرہ میں دیکھ رہے تھے اور ان کی اصلاح کی سطحی تدبیریں کر رہے تھے۔ اگر وہ سفر کرتے اور واقعات کا مطالعہ عالمی حالات کے پس منظر میں کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ اصل مسئلہ ایک عالمی طوفان کا ہے نہ کہ اس نام نہاد سلطنت کو بچانے کی لاحاصل کوشش کرنے کا جو اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کا مصداق بن چکی ہے۔

شاہ ولی اللہ جس مغل سلطنت کو زندہ کرنا چاہتے تھے وہ اتنی دیمک زدہ ہو چکی تھی کہ اس نے زندگی کی طاقت کھو دی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس سے بڑی بڑی امیدیں قائم کیے ہوئے تھے۔ التفہیمات الالٰہیۃ میں وہ شاہان وقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں بادشاہوں سے کہتا ہوں کہ اے بادشاہو، اس زمانہ میں ملأ اعلیٰ کی مرضی یہ ہے کہ تم لوگ تلواروں کو کھینچ لو، پھر ان کو نیام میں داخل نہ کرو جب تک اللہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان فرق نہ پیدا کر دے اور کافروں اور فاسقوں کے سرکش افراد اپنے کمزوروں سے نہ مل جائیں۔ وہ اپنے لیے کچھ کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اور یہی اللہ کا حکم ہے کہ تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے:

واقول للملوك ایها الملوك، المرضی عند الملأ الاعلی فی هذا الزمان ان تسلوا السیوف ثم لاتغمد وہا حتی یجعل اللّٰہ فرقانا بین المسلمین والمشرکین۔ وحتی یلحق مردۃ الکفار والفساق بضعفائھم لایستطیعون لانفسھم شیئا۔ وھوقولہ تعالیٰ : وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ (التفہیمات الالہیہ، الجزء الاول ، ۱۹۳۶، صفحہ ۱۴ - ۲۱۵)

یہ نام نہاد ملوک اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ وہ صرف پالکی میں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے تھے۔ دہلی کے وزیر امداد الملک غازی الدین نے ۱۷۵۴ میں شاہ ولی اللہ کے ہم عصر جہاں دار شاہ کے لڑکے کو تخت پر بٹھایا اور اس کا لقب عالمگیر ثانی رکھا۔ ۱۷۵۰ میں افغان سردار احمد شاہ ابدالی دہلی آیا اور اس کو شہنشاہ ہند کا خطاب عطا کیا۔ مگر جلد ہی بعد ۱۷۵۹ میں اسی وزیر نے عالم گیر ثانی کو قتل کر دیا جس نے چند سال پہلے اس کو تخت پر بٹھایا تھا۔ ایسی سلطنت کے سامنے جہاد بالسیف کی تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے مُردہ لاشوں کے سامنے رجز پڑھنا۔

شاہ ولی اللہ کا یہ کارنامہ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے گرتی ہوئی مغل سلطنت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ کابل کے احمد شاہ ابدالی کو ہندستان بلوایا۔ اس نے ۱۷۶۱ میں پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو شکست دے کر مغل سلطنت کے دشمن کو کچل دیا۔ مگر آخری نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ واقعہ شاہ ولی اللہ کے کارنامہ کے خانہ میں درج کرنے کے بجائے اس قابل نظر آئے گا کہ اس کو ان کی بے بصیرتی کے خانہ میں لکھا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں شاہ ولی اللہ کا زیادہ بڑا کارنامہ یہ ہوتا کہ وہ ابن خلدون (۱۳۳۲ - ۱۴۰۶) کے مقدمہ کے وہ صفحات پڑھتے جس میں ابن خلدون نے بجا طور پر لکھا ہے کہ کسی سلطنت کی بھی اسی طرح عمر ہوتی ہے جس طرح افراد کی عمر ہوتی ہے (ان الدولۃ لھا اعمار طبیعیۃ کما للاشخاص، ۱۷۰) اور یہ کہ جب کوئی سلطنت بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کا اٹھنا ممکن نہیں ہوتا (ان الھرم اذا نزل بالدولۃ لایرتفع، ۲۹۳)

شاہ ولی اللہ اگر اس راز کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ان کے کرنے کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس دیمک زدہ ستون کو بے فائدہ طور پر سنبھالنے کی کوشش کریں جس کے لیے گرنا خود قدرت کے قانون کے تحت مقدر ہو چکا ہے۔ بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ وہ نئے حالات کو سمجھیں اور پھر سے امت کی

نئی تاریخ بنانے کی کوشش کریں جس کے عین سرے پر وہ کھڑے ہوئے ہیں۔

نوآبادیاتی دور کے علمار

علمار کے عمل کا تیسرا دور وہ ہے جو، ہماری تقسیم کے مطابق، شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۷۶۲-۱۸۲۳) سے شروع ہوتا ہے۔ اورنگ زیب سے لے کر سید احمد بریلوی تک مسلم رہنماؤں کے ذہن پر مرہٹہ اور جاٹ اور سکھ کا مسئلہ چھایا رہا۔ وہ ان داخلی طاقتوں کے خلاف براہ راست یا بالواسطہ جہاد میں مشغول رہے۔ بظاہر انھیں اس کا کوئی شعور نہ تھا کہ اصل خطرہ باہر کی نوآبادیاتی قوموں سے ہے جو جدید قوتوں سے مسلح ہو کر نکلی ہیں اور ہندستان سمیت ساری مسلم دنیا عملاً جن کی زد میں آچکی ہے۔

یہ مغربی طاقتیں سواحل کے راستہ سے داخل ہو کر ہندستان میں اپنا نفوذ بڑھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ میں دہلی کا برائے نام بادشاہ براہ راست برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی protection میں آگیا۔ (9/936)

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اس وقت مسلم علمار کو اس کی خبر ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۶ میں شاہ عبد العزیز دہلوی نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ ہندستان دار الحرب ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ فرنگی جو دولت کے مالک ہیں، انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر دیا ہے:

و انّی اری الافرنج اصحاب ثروۃ   لقد افسدوا ما بین دھلی و کابلِ

اس کے بعد علمار کا سیاسی ٹکراؤ انگریزوں سے شروع ہوگیا۔ افریقہ میں وہاں کے علمار اور مصلحین کا ٹکراؤ فرانسیسیوں کیساتھ ہوا۔ مگر اس ٹکراؤ کے لیے اول دن سے ہی یہ مقدر تھا کہ وہ ناکام ہو۔ کیوں کہ یہ علمار اس مسئلہ کو محض اہل فساد کا پیدا کردہ مسئلہ سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ باعتبار واقعہ وہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ اہل مغرب جدید علمی اور عملی قوتوں کے مالک ہوگئے ہیں اور اسی بنا پر انھوں نے اہل مشرق کے اوپر فیصلہ کن فوقیت حاصل کرلی ہے۔ مثلاً ۱۸۵۳ میں برٹش انڈیا کمپنی نے ہندستان میں ریلوے لائن بچھانا شروع کر دیا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ میں جہاد آزادی کے لیے اٹھنے والے علمار کو اس زمانی تبدیلی کی خبر نہ ہو سکی۔

یہ ٹکراؤ عملی اور اصولی دونوں پہلوؤں سے نادرست تھا۔ عملی اعتبار سے وہ اس لیے درست نہ تھا کہ یہ لوگ ایک ایسی جنگ لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جو اہل اسلام کی یک طرفہ ہلاکت کے سوا کسی

اور انجام تک پہنچنے والی نہ تھی۔ کیونکہ علماء کے پاس صرف روایتی ہتھیار تھے۔ اور دوسری طرف اہل مغرب سائنٹفک ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ گویا اب دونوں فریقوں کے درمیان ماضی کی طرح صرف کمیاتی فرق نہ تھا، بلکہ ان کے درمیان کیفیاتی فرق پیدا ہو چکا تھا۔ اور جہاں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں جنگی ٹکراؤ چھیڑنا نہ اسلام کے مطابق ہے اور نہ عقل کے مطابق۔

اصولی اعتبار سے، علماء کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ سیاسی امور میں عملی طور پر اپنے آپ کو الجھائیں۔ ان کا عملی سیاسیات میں الجھنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ دوسرے زیادہ بنیادی کام ہونے سے رہ جائیں۔ علماء کو ہمیشہ تقسیم کار کے اصول پر قائم رہنا چاہیے۔ یعنی وہ سیاسی نزاعات کو اہل سیاست کے حوالے کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن علمی، دعوتی، اصلاحی اور تعمیری کاموں میں لگا دیں۔ علماء اسی کے اہل ہیں، اور ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

دور اول میں خلافت راشدہ کے آخری زمانہ سے لے کر بنوامیہ اور بنوعباس کے آخر زمانہ تک تقریباً چھ سو سال کی مدت ہے۔ اس پوری مدت میں مختلف صورتوں میں داخلی سیاسی لڑائیاں جاری رہیں مگر یہی نہ مدت ہے جب کہ ان تمام علوم کی تدوین عمل میں آئی جن کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ سیاسی انتشار کے باوجود یہ تعمیری کام کیوں کر ممکن ہوا۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ علماء اور اہل علم کا طبقہ ہمیشہ عملی سیاست سے لگ رہ کر علمی کاموں میں مصروف رہا۔ اس حد بندی نے اہل علم کو یہ موقع دیا کہ سیاسی بگاڑ کے باوجود وہ پنی قوتوں کو بچا کر یکسوئی کے ساتھ علوم کی ترتیب و تدوین کا عظیم کام انجام دے سکیں۔

اسی طرح اسپین (اندلس) کی مسلم سلطنت کی مدت تقریباً آٹھ سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں بھی اس پوری مدت میں سیاسی ٹکراؤ اور سیاسی بغاوت کے سلسلے جاری رہے۔ اس کے باوجود عین اسی دور بں مسلم علماء اور اہل علم نے جو علمی اور سائنسی خدمات انجام دیں وہ حیرت ناک حد تک عظیم ہیں۔ دوبارہ اس ی وجہ یہ تھی کہ علماء اور اہل علم نے اپنے آپ کو عملی سیاست کے ہنگاموں سے دور رکھا اور ہمہ تن علوم و نون کی خدمت کرنے میں مشغول رہے۔

جدید نوآبادیاتی دور میں اگرچہ بیشتر علماء کا یہ حال رہا کہ وہ اپنے اصل کام (تعمیر شعور) کو چھوڑ کر بے فائدہ قسم کے سیاسی جہاد میں مشغول ہو گئے۔ تاہم اس دور میں چند علماء ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے س حقیقت کو سمجھا کہ علماء کا کام لڑائی جھگڑوں میں اپنی قوت ضائع کرنا نہیں ہے۔ بلکہ سیاست سے الگ رہ کر

تعمیری شعبوں میں اپنی طاقت لگاتا ہے۔ مگر ایسے علمار اتنی زیادہ اقلیت میں تھے کہ وہ صورت حال کی تبدیلی میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۸۵۷ کے زمانہ میں جب علمار نے انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کا فیصلہ کیا، اس وقت دیوبند میں ایک بڑے عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھے۔ مولانا کی رائے دوسرے عالموں کے بالکل برعکس تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار، موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ چنانچہ دیوبند میں ایک مشاورتی اجتماع ہوا۔ اس میں دوسرے علمار کے ساتھ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی شریک تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں :

"اس اجتماع میں جہاد کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی، حضرت نانوتوی نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سرو سامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب نے سکوت فرمایا۔" نقش حیات، ۱۹۵۴، جلد دوم، صفحہ ۴۲

یہ تقابل بلاشبہ غلط تھا۔ بدر کے موقع پر دونوں فریقوں کے درمیان جو فرق تھا وہ صرف کمیاتی تھا۔ یعنی ایک طرف ۳۱۳ آدمی تھے اور دوسری طرف ایک ہزار آدمی۔ اس کے برعکس ۱۸۵۷ میں دونوں فریقوں کے درمیان کیفیاتی فرق پیدا ہو چکا تھا۔ یعنی ایک طرف دستی ہتھیار تھے اور دوسری طرف دور مار ہتھیار۔ ایک طرف جدید سائنسی طریقوں سے مسلح فوج تھی اور دوسری طرف روایتی طریقوں کی حامل جماعت۔ ایک طرف بری طاقت کے ساتھ بحری طاقت کا زور شامل تھا اور دوسری طرف صرف بری طاقت محدود طور پر موجود تھی۔ ایک گروہ کی پشت پر نئے عزائم سے بھرپور ایک قوم تھی اور دوسرے گروہ کی پشت پر صرف ایک زوال یافتہ قوم کے کچھ افراد تھے۔

اس وقت کے علمار، جو اس بغاوت میں قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے، انھیں اس فرق کا کوئی اندازہ نہ تھا، اگر وہ اس فرق سے پوری طرح واقف ہوتے تو وہ کہتے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے صبر ہے نہ کہ جہاد۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم صبر پر قائم رہ کر تیاری کریں، نہ کہ بے وقت حربی اقدام

کر کے اپنی تباہی میں مزید اضافہ کا سبب بن جائیں ۔

اس سلسلہ میں علمار کی بے خبری کی ایک مہلک مثال یہ ہے کہ مغربی قومیں جدید مواصلات (communication) کے دور میں داخل ہو چکی تھیں ۔ مگر معلوم ریکارڈ کے مطابق ، علمار اس زمانی تبدیلی سے مطلق بے خبر تھے ۔ یہ واقعہ ہے کہ ۱۸۵۷ کی جنگ میں جدید مواصلاتی نظام نے فیصلہ کن کردار ادا کیا جو اس سے پہلے ۱۸۵۱ میں انڈیا میں لایا جا چکا تھا ۔ مگر علمار اور ان کے تمام ساتھی اس سے اس درجہ بے خبر تھے کہ ان کے پیدا کردہ پورے لٹریچر میں اس کا ذکر تک موجود نہیں ۔

ہیرنشا ایک برٹش رائٹر ہے ۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں بہت سی واقعاتی مثالوں سے بتایا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ کچھ اور ہوتی ۔ اس کی کتاب کا نام ہے تاریخ کے اگر :

F.G.C. Hearenshaw, The Ifs of History.

اس کتاب کے ۱۹ ویں باب کا عنوان یہ ہے ——— اگر خمسینات میں برقی ٹیلی گراف نہ ہوتا (If there had been no Electric Telegraph in the fifties) اس باب کے تحت مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے :

(۱۸۵۷ کی بغاوت کے وقت) انڈیا میں برطانی فوجیوں کی تعداد صرف ۴۵ ہزار تھی ۔ جب کہ ہندستانی سپاہیوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زیادہ تھی ۔ گنگا کی وادی میں مقیم انگریزوں میں سے کسی بھی شخص کو ، خواہ وہ فوجی ہو یا غیر فوجی ، کوئی چیز بچا نہیں سکتی تھی ۔ کوئی بھی چیز ، کم از کم عارضی طور پر ، بنگال

There were in India at the time only 45000 British troops as against more than 250,000 sepoys. Nothing could have saved the lives of any of the British residents, whether military or civilian, in the whole of the Ganges valley, nothing could have prevented the extinction – at any rate temporarily, of the British dominion in Bengal and Oudh, if the mutiny had occured before the installation of the telegraph. By means of the wire (which the mutineers were not able to cut) the Governor General, Lord Canning, sent for reinforcement from England. Again by telegrams Lord Canning was able to get, and get quickly, invaluable contingents from Madras, from Bombay, London, and from Burma. Further, he was in a position to recall a powerful force under General Outram that had been sent on service into Persia. But most decisive of all was his ability to intercept, by an urgent and peremptory message sent by wire to Singapore, a completely equipped expeditionary army of 5000 men which was just on its way under Lord Elgin to deal with trouble in China. From Cape Colony, too, were brought, in response to a cabled appeal, two batteries of artillary, stores, horses and £ 60,000 in gold (pp. 156-157)

اودھ میں برطانی غلبہ کے خاتمہ کو روک نہیں سکتی تھی ، اگر ایسا ہوتا کہ ٹیلی گراف کا نظام قائم کیے جانے سے پہلے بغاوت ہو جاتی ۔ تار کے ذریعہ (جس کو باغی کاٹ نہیں سکے تھے) گورنر جنرل، لارڈ کیننگ نے انگلینڈ سے مزید فوج طلب کی ۔ اس کے علاوہ لارڈ کیننگ کے لیے ٹیلی گرام ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوا کہ وہ تیزی کے ساتھ مدراس سے ، بمبئی سے ، لندن سے ، برما سے قیمتی فوجی دستے حاصل کر سکیں ۔ مزید ٹیلی گرام ہی کے ذریعہ انھیں یہ موقع ملا کہ وہ ایران سے اس طاقت ور فوج کو واپس بلا سکیں جو جنرل اوٹرام کی قیادت میں وہاں بھیجی گئی تھی ۔ مگر ان سب سے زیادہ فیصلہ کن یہ بات تھی کہ ٹیلی گرام کے ذریعہ ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ ایک فوری اور واجب التعمیل پیغام سنگاپور بھیج کر ساز و سامان سے لیس اس پانچ ہزار آدمیوں کی مسلح فوج کو درمیان میں مداخلت کر کے بلا سکیں جو لارڈ ایلگن کی قیادت میں چین جا رہی تھی ۔ مزید ٹیلی گرام ہی کے ذریعہ کیپ کالونی سے توپ خانہ کی دو بیٹری ، اسٹور، گھوڑے اور ساٹھ ہزار پونڈ سونے کی صورت میں منگوائے گئے ۔

ایک صحیح آواز

سید رشید رضا (۱۹۳۵ ـ ۱۸۶۵) دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو کی دعوت پر ۱۹۱۲ میں ہندستان آئے تھے ۔ اس کے بعد وہ دیوبند کے دار العلوم میں گئے ۔ وہاں انھوں نے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے عربی میں ایک مفصل تقریر کی جو دار العلوم دیوبند کی روداد (۱۳۳۰ھ ، ۱۹۱۲ء) میں درج ہے ۔ اس تقریر میں انھوں نے علماء کو اشاعت اسلام کے کام کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا :

" اسلام کی اشاعت کا دوسرا حصہ بت پرستوں سے متعلق ہونا چاہیے ۔ ہندستان میں سیکڑوں قسم کے بت پرست ہیں ۔ یہاں بتوں کو پوجنے والے ، درختوں اور پتھروں کو پوجنے والے ، چاند، سورج، ستاروں اور دوسری لغویات کو پوجنے والے موجود ہیں ۔ اگر ہمارے پاس دعاۃ اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتی ۔ ہمیں عیسائیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے ۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے ۔ اور وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلہ میں اتنی کم ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرض خطر میں سمجھنا چاہیے ۔ انگریزی حکومت جو عقل و عدل کی حکومت ہے ، اس نے غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم رکھا ہے ۔ اگر کبھی

یہ موازنہ ٹوٹ جائے تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا۔ غالباً یہاں کے مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو اندلس کے مسلمانوں کا ہوا تھا۔ اس لیے ہم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو ان شبہات کو رفع کرے جو اسلام پر عاید کیے جاتے ہیں۔ یہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں ان کا دور کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر ان شبہات کا رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۶ فروری ۱۹۷۰)

یہ بلاشبہہ ایک صحیح رہنمائی تھی۔ مگر ہندستانی علماء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس رہنمائی کو لائق توجہ سمجھا ہو۔ اس طرح کی اور بھی بعض انفرادی مثالیں ہیں جب کہ کسی صاحب بصیرت شخص نے علماء کو اس طرف دلائی کہ وہ بے فائدہ سیاست کو چھوڑ کر نتیجہ خیز عمل میں اپنی قوتیں لگائیں۔ مگر ایسے اشخاص کی رائے موثر نہ بن سکی اور علماء کا قافلہ مسلسل اپنی تباہ کن سیاست کی طرف چلتا رہا۔

غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آخری صدیوں میں علماء نے تنقید کو ایک مبغوض چیز سمجھ لیا۔ علماء کے حلقہ میں تنقید اتنی غیر اہم تھی کہ وہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے تھے۔ علماء کی اکثریت صرف یہ جانتی تھی کہ ہمارے "اکابر" کا طریقہ یہی تھا۔ مذکورہ قسم کی انفرادی رائیں چونکہ اکابر کے اوپر تنقید کے ہم معنی تھیں، اس لیے پہلے ہی مرحلہ میں وہ قابل رد قرار پاگئیں۔ علماء کے لیے یہ ناقابل فہم تھا کہ وہ اکابر کے طریقہ پر نظر ثانی کریں اور اس کو غلط بتا کر اپنے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کریں۔

اس کی ایک مثال سید احمد بریلوی کی تاریخ میں ملتی ہے۔ ان کے ساتھیوں اور مریدوں میں ایک مولانا میر محبوب علی (۱۲۸۰-۱۲۰۰ھ) تھے۔ ان کو سید احمد بریلوی سے اس وقت اختلاف پیدا ہوا جب انھوں نے پنجاب کے سکھ راجہ کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ سید صاحب نے یہ فیصلہ کشف کی بنیاد پر کیا تھا۔ محبوب علی صاحب نے کہا کہ "اے میرے سید، جہاد کا مدار مشورہ پر ہے (نہ کہ کشف اور خواب پر)

اس کے بعد سید صاحب کے قافلہ کے لوگ محبوب علی صاحب کے سخت مخالف ہوگئے۔ سید احمد بریلوی نے اس کے جواب میں ان سے کہا "تمہاری اطاعت خاموشی کے ساتھ سننے کی ہونی چاہیے، ایسی خاموشی جیسی اس پہاڑ کی ہے جو میرے سامنے کھڑا ہے"۔ محبوب علی صاحب نے اس کو نہیں مانا اور سید صاحب کا ساتھ چھوڑ کر اپنے وطن کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ سید صاحب نے کہا: مَن ذھب من عندی الیٰ

وطنہ مُراجعًا فقد ذھب ایمانہ (جو شخص میرے پاس سے اپنے وطن کی طرف لوٹ جائے گا اس کا ایمان اس سے چلا جائے گا) مولانا اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان ، از مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی، صفحہ ۸۶ - ۸۷

اسلام میں اجتماعی امور کی بنیاد شوری پر رکھی گئی ہے (الشوری ۳۸) شوری صحت فیصلہ کی ضمانت ہے۔ مگر صحیح شوری کے لیے تنقید اور اختلاف رائے کا ماحول ہونا ضروری ہے۔ موجودہ زمانہ کے علمار کے درمیان چونکہ تنقید اور اختلاف رائے کا ماحول نہیں، اس لیے ان کے یہاں حقیقی شوری کا وجود بھی نہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کے علاوہ جو قوم آباد تھی، وہ شرک کو ماننے والی قوم تھی، شرعی نقطۂ نظر سے یہاں علمار کی پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ان مشرکین کے درمیان ایک ایسی تحریک اٹھائیں جس کی بنیاد تردید شرک اور اثبات توحید پر قائم ہو۔ اور یہ کام ہرگز مناظرانہ انداز میں نہ ہو بلکہ موعظت حسنہ کے انداز میں ہو۔ وہ نصح اور امانت کے جذبہ کے تحت اٹھائی گئی ہو۔ لیکن پچھلے تین سو سال میں کوئی تحریک تو درکنار کوئی ایک عالم بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کا واضح شعور رکھتا ہو اور اس کام کی اہمیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے۔

یہ کام اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد پوری کی پوری قوم اللہ کی نظر میں بے قیمت ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کام کو چھوڑ کر دوسرا جو کام بھی کیا جائے گا۔ وہ حبط اعمال کا شکار ہوتا رہے گا۔ وہ کبھی مسلمانوں کی عزت اور سرفرازی کا سبب نہیں بن سکتا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں یہ اہل شرک مسلمانوں کے لیے رعیت کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے درمیان دعوت توحید کا مصلحانہ کام نہایت آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ مگر علمار اس موقع کو استعمال نہ کر سکے۔ انھوں نے مشرک قوم کو شرک کی گمراہی سے نکالنے کے لیے کوئی حقیقی محنت انجام نہیں دی۔

انیسویں صدی کے وسط سے باقاعدہ طور پر انگریزی حکومت کا دور شروع ہوا۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان موازنہ قائم کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس کے نتیجہ میں اہل اسلام اور اہل شرک کی حیثیت برابر برابر کی ہوگئی۔ اس دوسرے دور میں بھی دعوتی کام کے مواقع پوری طرح موجود تھے۔ مگر علمار نے اب بھی ان مواقع کو استعمال نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں

نے یہ کیا کہ کچھ علمار آزادئ ہند کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور کچھ علماء تقسیم ہند کے جھنڈے کے نیچے۔ جبکہ یہ دونوں ہی تحریکیں مذکورہ دعوت توحید کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتی تھیں۔

مذکورہ دونوں تحریکیں اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ ایک طرف بھارت کی صورت میں ایک آزاد ملک ظہور میں آیا اور دوسری طرف پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کا قومی ہوم لینڈ۔ مگر دونوں ہی ملکوں میں مذکورہ دعوت کے مواقع کم سے کمتر ہو گئے۔ بھارت میں اس لیے کہ یہاں اہل شرک نے اکثریت کی بنا پر غالب حیثیت حاصل کر لی اور مسلمان مغلوبیت کی حالت میں چلے گئے۔ پاکستان میں اس لیے کہ دو قومی نظریہ کے نتیجہ میں اہل شرک کی حیثیت ایک حریف گروہ کی ہو گئی نہ کہ مدعو گروہ کی۔

یہ بلاشبہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے جو علمار کی براہ راست رہنمائی کے تحت کیا گیا ہے۔ اس کی واحد تلافی یہ ہے کہ کھلے دل سے غلطی کا اعتراف کیا جائے اور حال کے مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اب وہ کام شروع کر دیا جائے جو ماضی کے مواقع میں انجام نہ دیا جا سکا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد

علمار کی غیر ضروری سیاسی اور حربی سرگرمیاں تو مغربی قوموں کو زیر نہ کر سکیں۔ تاہم خود مغربی قوموں کی باہمی جنگ جو دوسری عالمی جنگ (۴۵ - ۱۹۳۹) کہی جاتی ہے۔ اس نے ان قوموں کو فوجی اعتبار سے اتنا کمزور کر دیا کہ ان کے لیے بیرونی ملکوں پر اپنے سیاسی قبضہ کو باقی رکھنا سخت دشوار ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے بیسویں صدی کے وسط میں ان ملکوں سے اپنا سیاسی قبضہ ہٹا لیا۔ اگرچہ ان کا تہذیبی اور اقتصادی غلبہ پھر بھی ان ملکوں پر باقی رہا۔

اس کے نتیجہ میں ایشیا اور افریقہ میں تقریباً پچاس مسلم ملک وجود میں آ گئے جو سیاسی اعتبار سے آزاد حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں علمار کو وہی کردار ادا کرنا تھا جو اسلام میں ان کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ یعنی سیاست کو اہل سیاست کے حوالے کر کے وہ اپنے آپ کو اشاعت علوم، دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تعمیر کے کام میں لگائیں۔ مگر دوبارہ انھوں نے یہ کیا کہ غیر ضروری طور پر وہ سیاست کے میدان میں کود پڑے۔

پہلے ان کی سیاست کا عنوان "آزادی" تھا۔ اب انھوں نے اپنی سیاست کا عنوان قانون اسلامی کے نفاذ کو بنایا۔ مصر، پاکستان، سوڈان، شام، الجزائر، انڈونیشیا، وغیرہ مختلف ملکوں میں علمار

نے ایسی جماعتیں بنائیں جن کا مقصد اسلامی قانون کی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس سیاست نے دوبارہ مسلم ملکوں کو میدان کارزار بنا دیا، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اگر مسلم علماء کا ٹکراؤ غیر مسلم قوموں سے تھا تو اب ان کا ٹکراؤ خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کے ساتھ پیش آگیا۔ مسلم جماعتیں ہر ملک میں اپوزیشن کا کردار ادا کرنے لگیں۔

علماء کی ان کوششوں سے ایسا تو نہیں ہوا کہ کسی مسلم ملک میں خالص شرعی انداز کی حکومت قائم ہو جائے۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑنے لگے۔ پہلے اگر غیر مسلم طاقت مسلمان کو مارتی تھی تو اب خود مسلمان ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ اس کا مزید نقصان یہ ہوا کہ ہر جگہ مسلم معاشرہ تخریبی سرگرمیوں کا اکھاڑا بن گیا۔

مسلم ملکوں کے علماء اگر یہ کرتے کہ وہ عملی سیاست سے الگ رہ کر مسلمانوں کی اصلاح کرتے۔ ان کے اندر اسلام کی روح بیدار کرتے۔ جدید معیار پر اسلامی لٹریچر تیار کرکے مسلم نسلوں کے اندر اسلام کی طلب پیدا کرتے۔ اگر وہ اس قسم کے کام کرتے تو وہ زیادہ بہتر طور پر اسلامی حکومت کے قیام میں مددگار ہو سکتے تھے۔ وہ جب مسلم معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنا دیتے تو اس کے بعد اس کے اندر سے جو نظام حکومت ابھرتا وہ یقیناً اسلامی نظام حکومت ہوتا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: کما تکونون کذالك یُؤمّرُ علیکم (مشکاۃ المصابیح ۲/۱۰۹۷)

مسلم ملکوں میں اسلامی قانون کے نفاذ میں ناکامی کا اصل سبب سیکولر حکمرانوں کا ظلم یا دشمنان اسلام کی سازشیں نہیں ہیں، جیسا کہ اسلام پسند حضرات ہمیشہ کہا کرتے ہیں۔ اس کا اصل سبب خود علم برداران اسلام کی یہ غلطی ہے کہ وہ معاشرہ کو ضروری حد تک تیار کیے بغیر اسلامی قانون کے نفاذ کی مہم لے کر کھڑے ہو گئے۔ پاکستان کا تجربہ واضح طور پر اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پاکستان میں ایک سے زیادہ بار اسلام پسندوں کو حکومت پر جزئی یا کلی قبضہ کا موقع ملا۔ مگر وہ کسی بھی درجہ میں وہاں شریعت کو نافذ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً مفتی محمد محمود کے زمانہ (۷۱ ـ ۱۹۷۰) میں صوبہ سرحد کی حکومت، جنرل محمد ضیاء الحق کے زمانہ (۸۸ ـ ۱۹۷۷) میں پورے ملک کی حکومت۔

حضرت عائشہ کی ایک روایت اس معاملہ کے اوپر نہایت صحیح تبصرہ ہے۔ صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن (باب تالیف القرآن) میں ایک طویل روایت آئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل- فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام- ولو نزل اول شيئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً- ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً

قرآن میں پہلے مفصل کی سورتیں اتریں۔ ان میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف رجوع ہو گئے تو حلال وحرام کے احکام اترے۔ اگر شروع ہی میں یہ اترتا کہ شراب چھوڑ دو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اگر شروع ہی میں یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

مسلم ملکوں کے بارہ میں علماء نے یہ فرض کر لیا کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں اس لیے وہ اسلامی قانون چاہتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک غلط اندازہ تھا۔ موجودہ مسلم نسلوں کی حیثیت ایک قومی مجموعہ کی ہے نہ کہ حقیقۃً ایک دینی گروہ کی۔ حتی کہ ان میں جو لوگ نماز، روزہ جیسے اعمال کرتے ہیں یا حج اور عمرہ ادا کرتے ہیں، ان کے بارہ میں بھی یہ اندازہ سراسر غلط ہوگا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ حکومت کا اقتدار علماء کے ہاتھ میں ہو اور وہ ان کے اوپر شریعت کے قوانین کا نفاذ کریں۔

مسلم ملکوں میں علماء کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست نے جو صورت حال پیدا کی ہے۔ اس کا خلاصہ، حضرت عائشہ کی زبان میں یہ ہے کہ علماء لوگوں کے اندر رجوع اور آمادگی پیدا کیے بغیر شراب اور زنا کے احکام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہاں کے عوام ان کو جواب دے رہے ہیں کہ ہم تو تمہارے اس قانون کو کبھی اپنے اوپر نافذ نہیں ہونے دیں گے۔

اس سے پہلے ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ کو سید احمد بریلوی اور ان کے رفقاء نے پشاور کے علاقہ میں اسلامی حکومت قائم کی تھی۔ سید صاحب کو اس میں امیر المومنین منتخب کیا گیا تھا۔ مگر بہت جلد آپس میں اختلاف ہوا۔ حتیٰ کہ مقامی مسلمانوں نے سید صاحب کے مقرر کردہ عاملوں کو قتل کر دیا۔ اس طرح یہ اسلامی حکومت بننے کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ معاشرہ کی تیاری کے بغیر اسلامی حکومت قائم کرنے کا یہ ناکام تجربہ بعد والوں کے لیے چشم کشا نہ بن سکا۔ وہ آج بھی اسی تجربہ کو دہرانے میں مصروف ہیں جو ڈیڑھ سو سال پہلے اپنا ناممکن العمل ہونا ثابت کر چکا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں تقریباً پوری مسلم دنیا میں "اسلامی انقلاب" کی تحریکیں چلائی

گئیں۔ ان تحریکوں کے قائد علماء اور اسلام پسند مفکرین تھے۔ ایران، پاکستان، مصر، سوڈان، شام، الجیریا، انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور دوسرے بہت سے مسلم علاقوں میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر یہ لوگ اپنے دور تحریک اور دور اقتدار دونوں میں صرف اسلام کو بدنام کرنے کا سبب بنے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حکومت الٰہیہ، اسلامی نظام اور نفاذ شریعت کے نام پر اس دور میں جو تحریکیں اٹھیں وہ صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والی (counter-productive) ثابت ہوئی ہیں۔

یہ ایک عبرت ناک حقیقت ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں بہت سے بڑے بڑے دماغوں نے یہ اعلان کیا کہ اسلام موجودہ زمانہ کے انسانی مسائل کا حل ہے۔ مثلاً سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰-۱۸۵۶) آرنلڈ ٹوائن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) وغیرہ۔ مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں کسی بھی قابل ذکر عالمی شخصیت کی زبان سے اس قسم کا اعتراف سنائی نہیں دیتا۔

اس کی وجہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد انقلابی رہنماؤں کی غلط نمائندگی ہے۔ اس سے پہلے عالمی مفکرین کے سامنے اسلام کے دور اول کی تاریخ تھی۔ اس سے متاثر ہو کر وہ اسلام کا شاندار تصور قائم کیے ہوئے تھے۔ مگر موجودہ زمانہ کے علماء اور رہنماؤں نے اسلام کے نام پر جو بے معنی تحریکیں اٹھائیں وہ صرف انسانیت کے مصائب میں اضافہ کا سبب بنیں۔ زمانہ حاضر کے ان نام نہاد نمائندگان اسلام کے نمونوں کو دیکھ کر لوگ اسلام سے بیزار ہو گئے۔ ان کا یہ تاثر ختم ہو گیا کہ اسلام موجودہ زمانہ میں انسانی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

پیغمبر کی مثال

عبداللہ ابن عباسؓ کی دور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روز قریش کے اکابر کعبہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے باہم مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ اپنا ایک شخص بھیج کر محمد کو بلاؤ تاکہ ان سے بات کرکے معاملات طے کیے جا سکیں۔ پیغام پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں آئے۔ گفتگو شروع ہوئی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ آپ ہماری قوم کے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔ آپ نے ہمارے آباء کو گالی دی۔ ہمارے دین پر عیب لگایا۔ ہماری عقلوں کو بیوقوف بتایا اور ہمارے اصنام کو گالیاں دیں (لقد شتمت الآباء وعبت الدین

(سفهت الاحلام وشتمت الآلهة)

اس قسم کی کچھ اور باتیں بیان کرنے کے بعد قریش کے نمائندہ نے آپ سے کہا کہ آپ شتم اور تعییب اور تسفیہ کا یہ کام چھوڑ دیں۔ اس کے عوض آپ جو کچھ چاہیں وہ سب ہم آپ کو دینے کے لیے تیار ہیں۔ حتی کہ اگر آپ بادشاہت چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں (وإن کنت تريد ملكا ملكناك علينا) البدایہ والنہایہ ۳/۵۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کی اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ اور بدستور اپنے تبلیغی کام میں لگے رہے۔ جب کہ معلوم ہے کہ بعد کو مدینہ جا کر آپ نے وہاں اسلام کی حکومت قائم کی۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ آپ نے مکہ میں حکومت کی پیش کش کو کیوں قبول نہیں کرلیا۔ جو اسلامی حکومت آپ نے پندرہ برس بعد مدینہ میں قائم کی، اس اسلامی حکومت کو آپ نے پندرہ برس پہلے ہی مکہ میں کیوں نہ قائم کرلیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت اس طرح قائم نہیں ہوتی کہ ایک اسلامی شخصیت کسی نہ کسی طرح حکومت کی کرسی پر بیٹھ جائے۔ حکومت کے قیام کا نہایت گہرا تعلق خارجی حالات سے ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے وہ معاشرہ درکار ہے جہاں لوگوں کے اندر اسلام کے حق میں آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔ جہاں وہ سیاسی اسباب جمع ہو چکے ہوں جو کسی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

مکی دور میں مکہ کے اندر اس قسم کے موافق اسباب جمع نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے آپ نے مکہ میں حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد کو مدینہ میں یہ اسباب جمع ہو گئے، اس لیے وہاں آپ نے باقاعدہ طور پر اسلام کی حکومت قائم کر دی۔

دونوں جگہوں کا فرق اس سے واضح ہے کہ مکہ میں ابولہب کی بیوی کے لیے ممکن تھا کہ وہ آپ کی مذمت میں اس قسم کے اشعار کہے اور ان کو مکہ کی آبادی میں چل پھر کر گائے کہ محمد قابل مذمت ہیں۔ ہم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا:

مُذَمَّماً عَصَينا وَأَمرَهُ أَبَينا

دوسری طرف نبوت کے تیرھویں سال جب آپ اپنے رفیق ابوبکر بن ابی قحافہؓ کے ساتھ

مدینہ پہنچے تو وہاں دونوں کا استقبال انطلقا آمنین مطاعین کے الفاظ سے کیا گیا۔ مدینہ کے بچوں نے آپ کی آمد پر یہ اشعار پڑھے کہ اے ہماری طرف بھیجے جانے والے، آپ ایک قابل اطاعت بات لے کر آئے ہیں :

أَيُّهَا المَبعوثُ فِينَا جِئتَ بِالأَمرِ المُطَاعِ

اسی نوعیت کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) کے لیے مقدر تھا کہ اس کو دوبارہ اقتدار دیا جائے جس طرح اس سے پہلے اس کو اقتدار دیا گیا تھا (المائدہ ۲۰) چنانچہ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد یوشع بن نون کی قیادت میں بنی اسرائیل نے عمالقہ کے خلاف جہاد کیا اور ان کو زیر کر کے شام و فلسطین کے علاقہ میں اپنی حکومت قائم کی جو ایک عرصہ تک باقی رہی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حکومت کا موقع تو انھیں نصف صدی پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہی میں حاصل ہو چکا تھا۔ پھر اس کو نصف صدی تک موخر کیوں کیا گیا۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر میں یہ واقعہ ہوا کہ وہاں کا حکمراں فرعون اور اس کی پوری فوجی طاقت سمندر میں غرق کر دی گئی۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ کے لیے مصر میں میدان خالی تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر کی راجدھانی ممفس واپس آکر وہاں کے خالی تخت پر قبضہ کر کے بیٹھ سکتے تھے۔ اور فرعون اور اس کے لشکر کی معجزاتی ہلاکت کے بعد ان کے حق میں ملک میں مرعوبیت کی جو فضا بنی تھی اس کے تحت یقینی تھا کہ لوگ ان کی حکومت کو تسلیم کر لیں گے۔

مگر حضرت موسیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ مصر کے خالی سیاسی میدان کو چھوڑ کر اپنی قوم کے ساتھ صحرائے سینا میں چلے گئے۔ وہاں چالیس سال (۱۴۰۰ – ۱۴۴۰ ق م) تک فاران اور شرق اردن کے درمیان بنی اسرائیل کے لوگ صحرا کی مشقتوں کو جھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے زیادہ عمر کے تمام افراد مر گئے۔ اور صرف وہ نئی نسل باقی رہی جو صحرائی ماحول میں پرورش پا کر تیار ہوئی تھی۔

اس تاخیر کا واحد راز یہ ہے کہ مصر میں بنی اسرائیل کی جو نسل تھی وہ مخصوص اسباب سے اخلاقی زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اپنے اور ہارون کے سوا کسی اور کے اوپر مجھے کوئی بھروسہ نہیں (المائدہ ۲۵) چنانچہ بنی اسرائیل کی پوری قوم کو "وادی تیہہ"

میں ڈال دیا گیا تاکہ ان کے تمام ادھیڑ اور بوڑھی عمر کے لوگ ختم ہو جائیں اور نئی نسل صحرائی حالات میں تربیت پاکر اپنے اندر قابل اعتماد سیرت پیدا کرے اور پھر اقتدار پر قبضہ کرکے اسلامی حکومت قائم کر سکے۔

مذکورہ دونوں واقعات واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ حکومت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ اس کے حق میں ضروری اجتماعی حالات فراہم ہو چکے ہوں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال یہ بتاتی ہے کہ اگر آبادی میں حقیقی سطح پر موافق فضا نہ بنی ہو تو پیغمبر بھی وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس قسم کی ضروری فضا کے بغیر حکومت قائم کرے تو قائم ہونے کے جلد ہی بعد اس کا تختہ الٹ دیا جائے گا، اور آخر کار کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

حضرت موسیٰ کی مثال بتاتی ہے کہ حکومت کے قیام کے لیے باکردار افراد کی ایک مضبوط ٹیم کا ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر ایسی ٹیم نہ ہو تو خواہ ملک میں سیاسی خلا پایا جائے اور خواہ اس سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے بیک وقت دو پیغمبر موجود ہوں تب بھی وہاں اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہیں۔

اس پیغمبرانہ نظیر کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں ساری مسلم دنیا میں "اسلامی حکومت قائم کرو" کے نام پر جو ہنگامے جاری کیے گئے، وہ صرف نادانی کی چھلانگ تھے۔ جس کا آخری نتیجہ صرف یہ ہو سکتا تھا اور یہی ہوا کہ آدمی حادثہ کا شکار ہو کر اسپتال میں پہنچ جائے اور منزل بدستور دور کی دور پڑی رہے۔

زمانی تبدیلی

موجودہ زمانہ کے علماء کی یہ غلطی ہے کہ انھوں نے مغربی قوموں کے غلبہ کو صرف سیاسی غلبہ کے ہم معنی سمجھا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ ایک طاقت ور تہذیب کا یلغار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سیاسی فتح و شکست اس معاملہ میں محض اضافی ہے۔ ان قوموں کو بالفرض سیاسی جنگ کے میدان میں شکست ہو جائے تب بھی ان کا غلبہ باقی رہے گا۔ جیسا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد پیش آیا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا پر تاتاریوں کا غلبہ محض ایک شمشیری غلبہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر دوبارہ شمشیر کے میدان میں انھیں شکست دے دی جائے تو عین اسی وقت ان کا غلبہ بھی ختم

ہو جاتا تھا۔ مگر مغربی اقوام کا غلبہ اس سے زیادہ تھا کہ اس کا فیصلہ کسی میدان جنگ میں کیا جا سکے۔

مغربی قوموں کے غلبہ و ترقی کا اصل راز یہ تھا کہ انھوں نے شاکلۂ انسانی کو تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے لائے ہوئے علمی انقلاب نے ساری دنیا کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اسی طرح سوچیں جس طرح اہل مغرب سوچتے ہیں۔ وہ چیزوں کے بارہ میں اسی طرح رائے قائم کریں جس طرح اہل مغرب رائے قائم کرتے ہیں۔

اس تبدیلی نے میدان مقابلہ کو جنگ کے بجائے فکر کے میدان میں پہنچا دیا۔ اہل مغرب سے کامیاب مقابلہ کے لیے ضروری تھا کہ انھیں فکر کے میدان میں شکست دی جائے۔ اہل مغرب پر فتح پانے کے لیے وسیع تر معنوں میں شاکلۂ انسانی کو دوبارہ بدلنے کی ضرورت تھی۔ مگر علما سیاسی جھگڑوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے نہ اس راز کو سمجھ سکے اور نہ اس کے لیے انھوں نے کوئی حقیقی عمل انجام دیا۔

کونیت بشری، امارت بشری

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، زندگی کی تشکیل میں کونیت بشری (عقلیت انسانی) کی حیثیت بنیاد کی ہے اور امارت بشری کی حیثیت ظاہری ڈھانچہ کی۔ کونیت بشری اگر درست ہو تو ظاہری سیاسی ڈھانچہ بھی لازماً درست ہوگا۔ کسی کی سازش یا تخریب اس کو صلاح سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کا زمانۂ خلافت ہے۔ اور جب کونیت بشری میں بگاڑ آجائے تو اس کے بعد کوئی صالح حکمراں بھی محض حکومت کے زور پر معاشرہ کو صالح معاشرہ نہیں بنا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں یہ دردناک منظر سامنے آیا ہے کہ عملی سیاست کے میدان میں علما کی تمام کوششیں مسلسل طور پر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، سید احمد بریلوی نے پشاور میں اسلامی حکومت قائم کی۔ مگر بہت کم مدت میں اس کا پورا ڈھانچہ ٹوٹ کر ختم ہوگیا۔ مولانا مفتی محمود کو موقع ملا کہ وہ پاکستان کے صوبہ سرحد میں اپنی چیف منسٹری کے تحت اسلام پسندوں کی وزارت بنائیں مگر میعاد پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ناکامی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ سوڈان میں ۱۹۸۸ء میں الاخوان المسلمون کو یہ موقع ملا کہ وہ جعفر النمیری کی حکومت میں موثر شرکت کر سکیں۔ مگر ان کی یہ شرکت سوڈان کے معاشرتی حالات میں کچھ بھی تبدیلی نہ لا سکی اور دوبارہ اپنی مدت کے اختتام سے پہلے ختم ہوگئی۔ پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق کو ساڑھے گیارہ سال تک کامل حکمرانی کا موقع ملا۔ ان کو ہند و پاک دونوں ملکوں کے علما کی تائید حاصل تھی۔ مگر وہ پاکستان کے حالات میں کوئی بھی اسلامی تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وغیرہ

عملی سیاست کے میدان میں علماء کی مسلسل ناکامی کا سبب یہ ہے کہ وہ منصوبۂ الٰہی کے خلاف
ل رہے ہیں۔ ان کی ان تمام سرگرمیوں پر حضرت عائشہ کی وہ روایت صادق آتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا
یا۔ وہ کونیت بشری کو درست کیے بغیر امارت بشری کا منصب سنبھالنا چاہتے ہیں۔ ایسی کوشش حضرت
ائشہ کے قول کے مطابق، پیغمبر کے زمانہ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، پھر وہ موجودہ زمانہ میں کس
رح کامیاب ہو سکتی ہے۔

راقم الحروف کا اندازہ ہے کہ علماء کو صحیح طور پر اس کا اندازہ ہی نہیں کہ موجودہ زمانہ میں کونیت بشری میں کیا تبدیلی آئی ہے اور آج کا وہ انسانی شاکلہ کیا ہے جس کو سمجھنا اور جس کی تصحیح کرنا وہ پہلا ضروری کام ہے جس میں انھیں سب سے پہلے مصروف ہونا چاہیے۔ تصحیح شاکلہ کے بغیر کوئی بھی عملی سیاست ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگلی سطروں میں اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

شاکلۂ انسانی کا مسئلہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے شاکلہ (فکری مزاج) کے تحت عمل کرتا ہے۔ اس کا شاکلہ اگر شاکلۂ ضلالت ہو تو اس سے غلط عمل صادر ہوگا۔ اور اگر اس کا شاکلہ شاکلۂ ہدایت ہو تو اس سے صحیح عمل کا صدور ہوگا (قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے دنیا کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ لوگوں کے اوپر شاکلۂ ضلالت کا غلبہ تھا۔ یہ شاکلہ مشرکانہ عقائد کے تحت بنا تھا۔ اسی شاکلۂ ضلالت کو قرآن میں فتنہ (الانفال ۳۹) کہا گیا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اپنی غیر معمولی جد و جہد سے اس شاکلۂ ضلالت کو توڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شاکلۂ ہدایت کا دور شروع ہوا جو توحید کے تصور پر مبنی تھا۔ یہ شاکلۂ ہدایت کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیا پر غالب رہا۔

اٹھارویں صدی میں یہ عہد ختم ہو کر نیا عہد شروع ہوا۔ اب تاریخ انسانی میں ایک نیا دور آیا۔ یہ دور دوبارہ شاکلۂ ضلالت پر مبنی تھا جو ملحدانہ افکار کے اوپر قائم ہوا تھا۔ اسلامی دور میں "خدا" انسانی تفکیر کا مرکز تھا۔ یہی تصور انسانی اعمال کی تشکیل کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں "نیچر" نے خدا کی جگہ لے لی۔ اب نیچر پر مبنی افکار انسانی اعمال کی تشکیل کرنے لگے۔ شاکلۂ انسانی کی اس تبدیلی نے انسانی زندگی کے تمام عملی نقشوں کو یکسر بدل دیا۔ حتیٰ کہ جو لوگ بظاہر اب بھی خدا کو مانتے تھے وہ بھی اس

عام سطحی طوفان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

جدید ذہن کو پیدا کرنے میں لمبی مدت اور سیکڑوں اشخاص کا عمل شامل ہے۔ تاہم علامتی طور پر سر آئزک نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) کو اس دور کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ نیوٹن نے شمسی نظام کا مطالعہ کیا۔ اس نے اس بات کی تحقیق کی کہ سورج، چاند اور سیارے کس طرح حرکت کرتے ہیں۔ ان فلکیاتی مظاہر کی تشریح اس نے میتھمیٹکس کے قواعد کے ذریعہ کی۔ اس نے بتایا کہ یہاں ایک قانون تجاذب (Law of gravitation) ہے جس کی پابندی میں یہ اجرام خلائے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں۔

قدیم زمانہ میں سادہ طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ سورج، چاند کی گردش اور دوسرے تمام واقعات مقدراتِ خداوندی کے تحت پیش آتے ہیں۔ قدیم انسان اس سے ناآشنا تھا کہ اپنے گرد و پیش ظہور میں آنے والے ان واقعات کو قانون فطرت (Law of nature) کی مادی اصطلاحوں میں بیان کرے۔

نیوٹن کی تحقیقات کی اشاعت نے پورے انسانی عقیدہ کو متزلزل کر دیا۔ مزید تحقیق کے بعد جب معلوم ہوا کہ زمین و آسمان کے تمام واقعات فطرت کے ایسے قوانین کے تحت ظاہر ہو رہے ہیں جن کو علم الحساب کی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے تو قدیم اعتقادیات کی بنیاد بالکل منہدم ہو گئی۔ جدید مفکرین نے اعلان کر دیا کہ واقعات اگر فطرت کے اسباب کے تحت پیش آتے ہیں تو وہ فوق الفطرت اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے :

If events are due to natural causes
they are not due to supernatural causes

نیوٹن کے بعد مفکرین کا ایک اور گروہ اٹھا جس نے انسانی ذہن کی نئی تشکیل میں موثر کردار ادا کیا۔ اس گروہ میں نمائندہ شخصیت چارلس ڈارون (۱۸۸۲-۱۸۰۲) کی ہے۔ نیوٹن نے طبیعی دنیا (physical world) کو قانون فطرت کے تحت حرکت کرتا ہوا دکھایا تھا۔ ڈارون نے بتایا کہ حیاتیاتی دنیا (biological world) بھی اسی طرح قانون فطرت کے تحت سفر کر رہی ہے۔ ابتدائی جرثومۂ حیات سے لے کر انسان تک جتنے بھی حیاتیاتی مظاہر اس دنیا میں دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب معلوم فطری قانون کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔

ڈارون کے اس نظریہ پر اس کے بعد بے شمار مزید تحقیقات ہوئیں۔ اگرچہ اس کے ابتدائی نظریہ میں بعض تعدیلات کی گئیں۔ مگر بنیادی طور پر حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ تمام جدید علماء کے نزدیک سائنسی مسلّمہ قرار پایا۔ اس کے نتیجہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ساری دنیا میں یہ ذہن بن گیا کہ انسان کی تخلیق کا خالق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسی قانونِ فطرت کا مظہر ہے جس کو عام طور پر ارتقاء (Evolution) کہا جاتا ہے۔

جدید مفکرین کا تیسرا گروہ وہ ہے جس کی نمائندگی کا مقام کارل مارکس (۱۸۸۳-۱۸۱۸) کو حاصل ہوا۔ مارکس نے انسانی تاریخ کے سفر کا ایک مادی فلسفہ پیش کیا جس کو اس نے تاریخ کی علمی تعبیر (Scientific interpretation) کا نام دیا۔ اس نے کہا کہ تاریخ میں خود اس کے اپنے اندرونی قانون کے تحت طبقاتی جدوجہد (Class struggle) جاری رہتی ہے۔ اور یہی طبقاتی جدوجہد تاریخ کے حال اور مستقبل کی صورت گری کرتی ہے۔

قدیم زمانہ کا انسان تاریخ کو تقدیر کا کرشمہ سمجھتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ایک برتر خدا ہے جو تاریخی واقعات کو کسی ایک یا دوسری صورت میں تشکیل دیتا ہے۔ مگر مارکس کے مذکورہ فلسفہ اور اس فلسفہ کی بنیاد پر پیدا ہونے والے بے شمار لٹریچر نے ساری دنیا کے انسانوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کیا۔ لوگ تاریخ کو ایک غیر خدائی واقعہ کی نظر سے دیکھنے لگے جب کہ اس سے پہلے وہ اس کو خدائی واقعہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

معیارِ قوت میں تبدیلی

اوپر جو بات کہی گئی وہ قوانین فطرت کی دریافت کے فلسفیانہ پہلو سے تعلق رکھتی تھی۔ عملی اعتبار سے اس دریافت نے مغرب کو مزید ایک بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس کے ذریعہ اہل مغرب کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ تاریخ میں پہلی بار طاقت کے معیار کو بدل دیں۔ وہ طاقت و قوت کو ایک نیا مفہوم دے دیں جس سے پچھلی قومیں آشنا نہیں ہو سکی تھیں۔

اس کے ذریعہ اہل مغرب نے قدیم روایتی دور کو نئے سائنسی دور میں داخل کر دیا۔ انھوں نے دستکاری کی صنعت کو مشینی صنعت میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے جہاز رانی کو بادبانی کشتی کے دور سے نکال کر دخانی کشتی کے دور میں پہنچا دیا۔ انھوں نے دستی ہتھیاروں سے آگے بڑھ کر دوربار

ہتھیار تیار کر لیے۔ انھوں نے برّی اور بحری سفر پر ہوائی سفر کا اضافہ کیا۔ انھوں نے حیوانی قوت سے چلنے والی سواری کو انجن کی قوت سے چلنے والی سواری میں تبدیل کر لیا۔ انھوں نے انسانی تاریخ کو محنت کے عمل کے دور سے نکال کر منصوبہ بند عمل کے دور میں پہنچا دیا۔

تاریخ کے پچھلے ادوار میں ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان زیادہ تر کمیاتی فرق (Qualitative difference) ہوا کرتا تھا۔ اب اہل مغرب نے ایسا دور تخلیق کیا جب کہ ان کے اور دوسروں کے درمیان کیفیاتی فرق (Quantitative difference) پیدا ہو گیا۔ اس تبدیلی نے اہلِ مغرب کو دوسری قوموں کے اوپر واضح اور فیصلہ کن فوقیت دے دی۔

ان فروق نے جس طرح حالات کو بدلا، اسی طرح خود انسانوں میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ اب اہلِ مغرب نئی دریافت کی نفسیات میں جی رہے تھے اور اہلِ مشرق وراثتی عقیدہ کی نفسیات میں۔ اہل مغرب اجتہادی اوصاف کے مالک تھے اور اہل مشرق تقلیدی اوصاف کے مالک۔ اہلِ مغرب کے درمیان آزادیٔ تنقید کا ماحول تھا اور اہل مشرق کے یہاں ذہنی جمود کا ماحول۔ اہل مغرب کا قافلہ رواں دریا کی مانند تھا اور اہل مشرق کی جماعت ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند۔ اہل مغرب ایک مقصد کے تحت متحرک ہوئے تھے اور اہل مشرق کے یہاں مقصد کا تصور فنا ہو چکا تھا۔ اہل مغرب کے زندہ اوصاف نے ان کو باہم متحد کر رکھا تھا اور اہل مشرق اپنے زوال یافتہ اوصاف کے نتیجہ میں ان خصوصیات سے محروم ہو چکے تھے جو افراد کو ایک دوسرے سے متحد کرتے ہیں۔ اہل مغرب اس احساس پر ابھرے تھے کہ انھوں نے ایک نئی تہذیب پیدا کی ہے جس کو انھیں سارے عالم تک پہنچانا ہے اور اہل مشرق صرف اس احساس پر زندہ تھے کہ وہ ماضی کے قدیم اثاثہ کے وارث ہیں۔ اہل مغرب اقدام کے جذبات سے بھرپور تھے جب کہ اہل مشرق کی دوڑ کی آخری حد تحفظ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

اس فرق نے دونوں جماعتوں کے افراد کے درمیان زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی فرق پیدا کر دیا تھا جو ایک تھکی ہوئی فوج اور ایک تازہ دم فوج کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ تھا کہ اپنے گروہ کے افراد کو از سرِ نو تیار کیا جائے نہ یہ کہ ان غیر تیار شدہ افراد کو جوش دلا کر انھیں فریق ثانی کے خلاف صف آرا کر دیا جائے، جیسا کہ موجودہ دور کے علماء نے کیا۔

عُسر میں یُسر

علماء کے ذہن پر سیاست وحکومت کے غیر ضروری تسلط کا سب سے زیادہ مہلک نقصان یہ ہوا کہ جدید انقلاب میں انھیں ہر طرف بس ظلم اور سازش اور مصائب نظر آئے۔ اس انقلاب کے اندر چھپے ہوئے امکانات ومواقع کو دیکھنے سے وہ کلی طور پر محروم رہے۔ اور جو لوگ مواقع کو دیکھنے سے محروم رہیں وہ یقینی طور پر ان کو استعمال کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے یہاں ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ضرور موجود رہے۔ یہاں ہر مسئلہ کے ساتھ ہی مواقع بھی ضرور پائے جائیں (فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا)

قدیم تفسیروں میں اس آیت میں مَعَ کی تفسیر مَعَ (ساتھ) کے ذریعہ کی گئی ہے۔ مثلاً مفسر ابن کثیر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ عسر کے ساتھ یسر پایا جاتا ہے (اخبر تعالیٰ أن مع العسر یوجد الیسر)

مگر موجودہ زمانہ کے علماء پر زمانی مسائل کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اپنے غیر واقعی ذہنی تاثر کے تحت آیت میں یہ تصرف کیا کہ مَعَ کو بعد کے معنی میں لے لیا۔ اور اس کے مطابق اس کی تشریح کر ڈالی۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں سورہ الانشراح کی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں :

"اس بات کو دو مرتبہ دہرایا گیا ہے تاکہ حضور کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اِس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی اچھے حالات آنے والے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی (عسر) کے ساتھ فراخی (یسر) ہو۔ کیوں کہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آرہا ہے"

اس تفسیر میں مَعَ کی ساری اہمیت ختم ہوگئی۔ حالانکہ مَعَ کا لفظ یہاں بہت بامعنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ حل کی

صورتیں بھی موجود رہتی ہیں۔ یہاں ہر ڈس ایڈوانٹج اپنے ساتھ ایڈوانٹج کو بھی ضرور لیے آتا ہے۔

مغربی تہذیب اور مغربی استعمار کا معاملہ بھی یہی تھا۔ وہ مسلم دنیا کے اوپر ایک بلا کے طور پر نازل ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں زبردست قسم کے موافق امکانات بھی ہمارے لیے موجود تھے۔ اور سب سے بڑا موافق امکان یہ تھا کہ اس نے اسلام کی دعوت کے ایسے نئے اور طاقتور امکانات کھول دیے جو پچھلی تاریخ میں کبھی حاصل نہ تھے۔ علماء اگر اس راز کو سمجھتے اور اس کو استعمال کرتے تو وہ تاریخ جدید کے المیہ کو امت کے حق میں طربیہ بنا دیتے۔ مگر مذکورہ ذہن کی وجہ سے وہ اس کو سمجھ نہ سکے۔

نئے دعوتی امکانات

موجودہ زمانہ میں جو نئے دعوتی امکانات پیدا ہوئے ہیں اس پر راقم الحروف نے کثیر تعداد میں کتابیں اور مضامین شائع کیے ہیں۔ یہاں مختصر طور پر اس کے کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ دورِ جدید کی بنیاد آزادیٔ فکر پر تھی۔ اس فکری انقلاب نے جس طرح اور بہت سی چیزیں پیدا کیں، اس نے ایک نہایت اہم چیز وہ پیدا کی جس کو مذہبی آزادی کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے تمام پچھلے زمانوں میں مذہبی تعذیب (religious persecution) کا عام رواج رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ مذہبی آزادی اور مذہبی تبلیغ کو ایک جائز انسانی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا اور اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے منشور کے تحت تمام دنیا کی قوموں نے اس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار ہمارے لیے یہ مواقع کھول دیے کہ ہم بے روک ٹوک دین حق کی تبلیغ و اشاعت کر سکیں۔

۲۔ موجودہ زمانہ آزادانہ تحقیق (free inquiry) کا زمانہ تھا۔ اس کے نتیجہ میں جس طرح دوسری چیزوں کی آزادانہ جانچ کی گئی، اسی طرح مذہب اور مذہبی کتابوں کو بھی آزادانہ طور پر جانچا گیا۔ مثال کے طور پر تنقید بائبل (biblical criticism) کے تحت بائبل کا جو تنقیدی مطالعہ کیا گیا اس سے خالص علمی سطح پر یہ ثابت ہو گیا کہ بائبل کا موجودہ متن تاریخی طور پر معتبر متن نہیں ہے۔ دوسری طرف قرآن پر اسی قسم کے مطالعہ نے یہ ثابت کیا کہ قرآن کا موجودہ متن تاریخی معیار سے آخری حد تک ایک معتبر متن ہے۔ جدید دور نے ایک طرف انسانی علم کے معیار پر دوسری کتب مقدسہ کا محرف ہونا ثابت کر دیا اور اس طرح خود انسانی علم کے معیار پر یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن مکمل طور پر ایک غیر محرف کتاب

ہے۔ تقابلی مذہب کے اس مطالعہ نے دورِ جدید میں اسلامی دعوت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا جو ابھی تک بند پڑا ہوا تھا۔

۳۔ موجودہ زمانہ میں جو مختلف نئے علوم پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کو علم الانسان (anthropology) کہا جاتا ہے۔ اس میں انسانی معاشروں کا مطالعہ خالص موضوعی انداز میں کیا گیا۔ اس مطالعہ سے یہ ثابت ہوا کہ خدا اور مذہب کا عقیدہ ہر انسانی معاشرہ میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اس تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ خدا اور مذہب کا عقیدہ ایک فطری عقیدہ ہے۔ وہ انسان کی خود اپنی طلب کا جواب ہے۔ اس دریافت نے اسلامی دعوت کو یہ حیثیت دے دی کہ وہ اسی طرح انسانی ضرورت کی فراہمی کا ایک کام ہے جس طرح خوراک کی فراہمی (food supply) کا نظام۔

۴۔ موجودہ زمانہ میں جو سائنسی حقائق دریافت ہوئے، وہ حیرت انگیز طور پر قرآن کے بیانات کی تائید کر رہے تھے۔ وہ قرآن کی اس پیشین گوئی کی تصدیق تھے کہ: عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے (فصلت ۵۳) اس اعتبار سے جدید سائنس ایک مسلم داعی کے لیے طاقتور علمی ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہے۔

۵۔ نئی ایجادات میں ایک چیز وہ ہے جس کو جدید مواصلات (modern communication) کہا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی بار تمام فاصلے آخری حد تک گھٹا دیے ہیں اور اس طرح اس کو ممکن بنایا ہے کہ ایک داعی نہایت آسانی کے ساتھ ساری دنیا کو اپنی تبلیغ کا میدان بنا سکے۔ وسائل کے اعتبار سے یہ حدیث رسول کی اس پیشین گوئی کا ظہور ہے جس میں خبر دی گئی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب کہ اسلام کی آواز تمام دنیا کے ہر گھر میں پہنچ جائے گی۔

۶۔ میں نے اپنی کتاب "عقلیاتِ اسلام" کے ابتدائیہ میں جون ۱۹۷۸ میں کہا تھا کہ "آزاد دنیا" میں دعوت کے غیر معمولی نئے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ تاہم اشتراکی دنیا کا اس میں استثناء ہے۔ کیوں کہ وہاں کامل جبر کا نظام قائم ہے۔ اس لیے وہاں اس وقت دعوت اسلامی کے کھلے مواقع موجود نہیں ہیں۔ مگر اس تحریر کے صرف ۱۳ سال بعد حالات بدل گئے۔ ۱۹۹۱ کے خاتمہ کے ساتھ اشتراکی ایمپائر کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اب اشتراکی دنیا میں بھی تبلیغ دین کے وہی مواقع کھل گئے ہیں جو اس سے پہلے صرف غیر اشتراکی دنیا میں پائے جاتے تھے۔

دور جدید سے بے خبری

اس سے پہلے میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون "دور جدید کو جاننے کی ضرورت" کے عنوان سے ہفت روزہ الجمعیۃ (۲۴ نومبر ۱۹۶۷) میں چھپا تھا۔ اس میں میں نے لکھا تھا کہ "دنیا میں فکر و عمل کا جو انقلاب آیا ہے اس نے اسلام کے لیے بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں۔ مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اگرچہ امت طویل مدت سے اس سنگین صورت حال سے دوچار ہے۔ مگر آج تک یہ سمجھنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی کہ فی الواقع جدید مسئلہ ہے کیا۔"

ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ۱۸۹۴ میں ملک کے بڑے بڑے علماء کی ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ اصلاح نصاب کے سلسلہ میں اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس موقع پر مولانا شاہ محمد حسین صاحب نے جو یادداشت پیش کی، اس کا ایک پیراگراف مطبوعہ روداد کے مطابق، یہ تھا :

(موجودہ درس نظامیہ کا ایک نقصان یہ ہے کہ) فلسفۂ جدید جو اسلامی اصول پر آج کل حملہ آور ہے، اس کے روک کی کوئی تدبیر نہیں بتائی جاتی۔ لہذا میرے نزدیک مناسب ہے کہ کوئی کتاب فلسفۂ جدید میں تالیف کی جائے اور اس کی ترکیب آسان یہ ہے کہ ایسے خالص مسلمانوں سے درخواست کی جائے جنھوں نے انگریزی فلسفہ اور انگریزی کی تعلیم اچھی پائی ہو۔ وہ مسائل فلسفہ مخالف اسلام چھانٹ کر اردو میں ترجمہ کر کے حوالہ ندوۃ العلماء کریں۔ ندوۃ العلماء اس کا جواب لکھا کر داخل درس کرے کہ ایام تعطیل و اوقات فرصت میں طلبہ اس کو بخوبی دیکھیں۔"

اس تجویز پر تقریباً سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر اب تک یہ تجویز واقعہ نہ بن سکی۔ ندوۃ العلماء نے اپنے دعوے کے مطابق، اس مدت میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ندوۃ العلماء کا نصاب آج بھی ایسی کسی کتاب سے خالی ہے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے تقسیم ہند سے دس سال پہلے ایک کتاب لکھی جو "تجدید و احیاء دین" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں وہ شاہ ولی اللہ سے لے کر شاہ اسماعیل تک کی اسلامی تحریکوں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے، انھوں نے سارے انتظامات کیے مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق

کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جارہی ہے اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے۔ اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں۔ اس کے علوم کس قسم کے ہیں۔ اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

اس قسم کا احساس مدت سے بار بار ظاہر کیا جارہا ہے۔ مگر اب تک کوئی بھی قابل ذکر عالم ایسا نہیں نکلا جو فی الواقع اس تحقیقی مقصد کے تحت مغربی دنیا کا سفر کرے یا اس خاص مقصد کے لیے مغربی لٹریچر کا گہرا اور موضوعی مطالعہ کرے۔ موجودہ زمانہ میں سفروں کے بڑھنے کی بنا پر کچھ علماء کو یہ موقع ملا کہ وہ یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جائیں۔ مگر اس جانے کا کوئی بھی تعلق مذکورہ تحقیقی مقصد سے نہیں ہے۔ یہ تمام لوگ جو بظاہر یورپ یا امریکہ جاتے ہیں وہ حقیقۃً یورپ یا امریکہ نہیں جاتے بلکہ یورپ اور امریکہ کے کچھ مسلمانوں کے پاس جاتے ہیں۔ ان جانے والوں کا مغربی دنیا سے کوئی حقیقی ربط قائم نہیں ہوتا اور نہ وہ وہاں کے اصل حالات کی تحقیق کے لیے کوئی کوشش اور جد وجہد کرتے۔

یہاں دو کتابوں کی مثال لیجئے۔ ایک سید قطب کی کتاب : امریکا التی رأیت (امریکہ جس کو میں نے دیکھا) اور دوسری کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی کے سفر مغرب کی مفصل روداد جو "دو مہینے امریکہ میں" کے نام سے چھپی ہے۔ ان دونوں کتابوں کا کوئی تعلق امریکی زندگی کے گہرے مطالعہ سے نہیں۔ مثال کے طور پر "دو مہینے امریکہ میں" کو ایک شخص پڑھتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر پاتا ہے کہ صاحب سفر کے دو مہینے امریکہ میں گزر جاتے ہیں مگر اس لمبی مدت میں اس کی کسی اصل امریکی سے ملاقات تک نہیں ہوتی۔ نہ امریکی نظریہ حیات کو سمجھنے کے لیے وہ وہاں کے کسی ادارہ کا گہرا مطالعہ کرتا۔

ان کتابوں کو پڑھ کر کوئی شخص مغرب کے بارہ میں سطحی قسم کا کچھ منفی تاثر تو ضرور لے سکتا ہے۔ مگر ان کو پڑھنے والا یہ نہیں جان سکتا کہ امریکہ کی قوت کا راز کیا ہے۔ اور اس کا وہ فکری اثاثہ کیا ہے جس کے اوپر اس کے نظریاتی ڈھانچہ کی تشکیل ہوئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے علماء مغربی افکار کو سرے سے جانتے ہی نہیں۔ ناقص معلومات کی بنا پر ہمارے علماء کے ذہن میں مغربی انسان کی اسی طرح غلط تصویر بن گئی ہے جس طرح قدیم مستشرقین کے ذہن میں اسلام کی بالکل غلط تصویر بن گئی تھی۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مغربی انسان

عقل پرست ہوتا ہے۔ وہ بے قید آزادیٔ فکر کا قائل ہے۔ ایک عالم کے الفاظ میں، مغربی انسان کا کلمہ ہے ـــــــ لاموجود الا العقل۔

مگر یہ مغربی تعقل کی نہایت غلط تعبیر ہے۔ مغربی انسان بے قید فکر کو نہیں بلکہ تحقیقی فکر کو عقل سمجھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اعتقادی مسلمات یا بدیہیات کی بنیاد پر استدلال کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں عقلی غور و فکر کا معیار یہ ہے کہ کسی بھی عقیدہ یا نظریہ کو پیشگی مسلّمہ کے طور پر نہ مانا جائے، بلکہ واقعات و حقائق کی روشنی میں پرکھ کر اس کے بارہ میں ایک رائے قائم کی جائے۔

مزید یہ کہ یہ تصورِ عقل ہمارے لیے انتہائی مفید ہے۔ کیوں کہ اسلام کی بنیاد محکم حقائق پر ہے اور دوسرے مذاہب اپنی موجودہ صورت میں مفروضات اور توہمات پر قائم ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانہ میں مذکورہ عقلی تصور کے تحت تمام مذاہب کی مقدس کتابوں کی علمی تحقیق کی جانے لگی۔ اس تحقیق میں مغربی علماء نے جس طرح دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کی علمی جانچ کی۔ اسی طرح انھوں نے قرآن کی بھی علمی جانچ کی۔

قدیم زمانہ میں موجودہ بائبل کو مسلّمہ طور پر خدا کا کلام مان لیا گیا تھا۔ اس کو علمی تحقیق کے بغیر مقدس کلام کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اب جدید معیارِ عقل کے مطابق بائبل کے متن کا جائزہ لیا گیا۔ اس کے بعد عین علم انسانی کی سطح پر یہ ثابت ہوگیا کہ موجودہ بائبل تاریخی حیثیت سے ایک غیر معتبر کتاب ہے۔ دوسری طرف اس علمی تحقیق نے قرآن کے بارہ میں ثابت کیا کہ اس کو مکمل طور پر تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔

علماء اگر مغربی فکر کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے تو اس کو اپنے لیے عین مفید سمجھ کر اس کا استقبال کرتے۔ مگر سطحی معلومات کی بنا پر وہ اس کے مخالف بن گئے اور اس کا مذاق اڑانے لگے۔

چند مثالیں

سید ابو الاعلیٰ مودودی کے نزدیک اسلام ایک مکمل سیاسی انقلاب کی تحریک ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پرجوش طور پر لکھتے ہیں:

"آج دنیا آپ کے موذن کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی

اور مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا۔ کسی قانون کو میں نہیں مانتا۔ کسی عدالت کے حدود اختیارات مجھ تک نہیں پہنچتے۔ کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے۔ کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سوا میں سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خود کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں" اسلامی سیاست، دہلی ۱۹۸۶، صفحہ ۷۶ ـ ۱۷۵

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ پر جوش الفاظ اس لیے لکھے کہ انھوں نے دیکھا کہ آج ہماری مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی ہے تو کوئی اس کی وجہ سے ہم سے لڑنے نہیں آتا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں توحید کی آواز بلند کی تو ہر طرف سے متشددانہ مخالفت شروع ہوگئی "کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سرِ بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا" (صفحہ ۱۷۷)

یہ الفاظ دورِ جدید سے بے خبری کا ثبوت ہیں۔ مصنف اگر زمانۂ حاضر سے گہری واقفیت رکھتے تو وہ جانتے کہ اس فرق کا سبب زمانی عامل (age factor) ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تعذیب (religious persecution) کا زمانہ تھا، موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ مذکورہ فرق لاالٰہ الااللہ کے سیاسی مفہوم کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ زمانی فرق کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود سید ابوالاعلیٰ مودودی جو یقینی طور پر اس "انقلابی مفہوم" کے حامل تھے، انھوں نے اور ان کی جماعت نے غیر منقسم ہندستان میں دس سال تک اپنے انقلابی مفہوم کے مطابق "اذان" دی۔ مگر یہاں کی حکومت نے کبھی اس بنا پر ان کی پکڑ دھکڑ نہ کی۔ اور نہ ان کے سروں پر اس وجہ سے آرے چلائے گئے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اگر اس زمانی فرق کو جانتے تو اس کو وہ اسلامی دعوت

کے حق میں ایک عظیم امکان سمجھتے۔ مگر اس فرق کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے وہ اس کو استعمال نہ کر سکے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی ایک کتاب "تنقیحات" ہے۔ اس میں مصنف کے وہ مضامین جمع کیے گئے ہیں جو انھوں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم پر لکھے تھے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب سراسر باطل تہذیب ہے۔ دہریت، الحاد، لامذہبیت اور مادہ پرستی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے (صفحہ ۹) اسلام کے اصول تمدن و تہذیب مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں (صفحہ ۲۵) وہ تخم خبیث جو مغرب کی نشأۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا، چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں۔ جس کے پھول خوش نما مگر خار دار ہیں۔ جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر وہ ایسی زہریلی ہوا اگل رہی جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کیے جا رہی ہیں (صفحہ ۲۸ - ۲۹)

اس قسم کے مضامین صرف جدید تہذیب سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اس بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کے علماء کے لیے یہ تہذیب صرف نفرت و حقارت کا موضوع بن گئی۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے مثبت امکانات کو دریافت کرنے سے قاصر رہے۔ اور اسی لیے وہ اس کو اپنے حق میں استعمال بھی نہ کر سکے۔

سطحی رائے

انیسویں صدی کے آغاز میں شاہ عبد العزیز دہلوی نے اعلان کیا کہ ہندستان دار الحرب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ۵۰۰ علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ مسلمانوں پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کریں۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی جہاد بالسیف کی باتیں بدستور جاری ہیں۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی ایک سفر کے دوران حمص گئے۔ اس کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں :

"حمص، جو سیف اللہ خالد بن ولید کی آرام گاہ ہے، وہاں مرکز اخوان المسلمین میں ۲۹ جولائی ۱۹۵۱ کو میری ایک ولولہ انگیز تقریر ہوئی۔ میں نے کہا کہ شام و حمص کے رہنے والو، عالم اسلام کو اب

پھر ایک سیف اللہ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ عالم اسلام کو اس کی کھوئی ہوئی تلوار مستعار دے سکتے ہیں؟" صفحہ ۲۹۰

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم رہنما کس طرح دور حاضر کی اصل حقیقت سے بے خبر رہے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ میں پیش آنے والے مسئلہ کو سادہ طور پر صرف سیاسی یا حربی مسئلہ سمجھا۔ حالاں کہ وہ دراصل دور انسانی میں تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ اپنی اس بے خبری کی بنا پر وہ اپنی جدو جہد میں اس کی رعایت نہ کر سکے اور نتیجۃً ان کی ساری قربانیاں لاحاصل ہو کر رہ گئیں۔

اہل مغرب کے کئی سو سالہ عمل نے دنیا میں ایک نیا دور پیدا کیا تھا۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے اس کو جاننا ضروری تھا۔ اس نئے دور کے دو خاص پہلو تھے۔ ایک، شاکلہ انسانی میں تبدیلی۔ دوسرے، معیار قوت کا بدل جانا۔ آئندہ صفحات میں ان دونوں پہلوؤں کی مختصر وضاحت کی جائے گی۔

علماء کی دور جدید سے بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایسا لٹریچر تیار نہ کر سکے جو جدید ذہن کو مطمئن کرنے والا ہو۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر سید قطب تک، میرے علم کے مطابق، مسلم علماء کوئی ایک کتاب بھی ایسی تیار نہ کر سکے جو آج کے مطلوبہ معیار پر پوری اترتی ہو۔ ان سب پر البرٹ ہورانی کا یہ تبصرہ صادق آتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بیشتر اسلامی تحریریں عصری فکر کی ہم سطح نہیں ہیں :

Most of the writings of Islam by Muslims "is not on the level of current thought." (Albert Hourani)

دور جدید کے علماء کا جو مطبوعہ ریکارڈ ہمارے سامنے ہے، اس کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ عقلی بیان (reasoned statement) کیا ہے۔ اس سلسلہ میں روایتی علماء کا تو ذکر ہی نہیں، کیوں کہ وہ اس معاملہ کی الف ب بھی نہیں جانتے۔ خود وہ علماء جو اپنے معتقدین کے درمیان "مجمع البحرین" سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اس سے ناواقف نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے سورۂ الحجرات کی تفسیر کے تحت "مسلمانوں کی باہمی جنگ" کے مسئلہ پر کئی صفحہ کا حاشیہ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ ظالم مسلم حکومت کے خلاف خروج کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس بارہ میں فقہاء اسلام کے درمیان سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

اس ابتدائی بیان کے فوراً بعد لکھتے ہیں : "جمہور فقہا، اور اہل الحدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہوچکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو، وہ خواہ عادل ہو یا ظالم، اور اس کی امارت خواہ کسی طور پر قائم ہوئی ہو، اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے، الّا یہ کہ وہ کفر صریح کا ارتکاب کرے ـ ـ ـ اس پر امام نووی اجماع کا دعوی کرتے ہیں" (تفہیم القرآن ۵/۷۹ ـ ۸۰)

یہ دونوں پیراگراف ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کیوں کہ جب ایک معاملہ میں جمہور فقہار کی ایک رائے ہو، حتی کہ اس پر علما، و فقہا، کا اجماع ہوچکا ہو تو اس کے بارہ میں یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ اس مسئلہ میں فقہا کے درمیان سخت اختلاف واقع ہوگیا ہے۔

"الجہاد فی الاسلام" مولانا ابو الاعلی مودودی کی معرکتہ الآرا کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے دیباچہ میں مولانا موصوف لکھتے ہیں : "دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں، ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جب پیروان اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں" (الجہاد فی الاسلام، دہلی ۱۹۸۴، صفحہ ۱۵)

اس عبارت کا آخری حصہ اس کے پہلے حصہ کی تردید ہے۔ آخری حصہ میں مصنف خود یہ بات مان رہے ہیں کہ مسلمان اپنی شمشیر خارا شگاف لے کر اقوام عالم پر ٹوٹ پڑے۔ پھر یہی تو وہ بات ہے جس کو علما، یورپ کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو بہتان کس طرح قرار دیا جائے گا۔

سید قطب کی تفسیر قرآن بہت مشہور ہے جو چھ جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر اس کے چار ہزار سے زیادہ صفحات ہیں۔ مگر پوری تفسیر غیر علمی انداز میں ہے۔ اس میں انشار کا حسن تو یقیناً ہے مگر حقیقی علمی استدلال سے وہ تقریباً خالی ہے۔

مثال کے طور پر وہ سورہ فصلت کی آیت ۴۱ ـ ۴۲ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں :

(وانہ لکتاب عزیز لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ، تنزیل من

حکیم حمید) وأنّیٰ للباطلِ انْ یدخلَ علیٰ ھٰذا الکتاب، وھو صادرٌ مِنَ اللہ الحق۔ یَصْدعُ بالحق ویتصلُ بالحق الذی تقوم علیہ السماوات والارض۔ وأنّیٰ یأتیہ الباطلُ وھو عزیزٌ محفوظ بامر اللہ۔ (فی ظلال القرآن ۵/۳۱۲۰)

یہ تفسیر محض ایک ادبی تفسیر ہے۔ اس کا علمی یا عقلی تفسیر سے کوئی تعلق نہیں۔

سورہ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور فرعون کا مکالمہ نقل فرمایا ہے۔ اس میں حضرت موسی کی دعوت کے جواب میں فرعون اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کرتا ہے اور ان کو موسی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتا ہے جو بظاہر موسی کے خطاب سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس تقریر میں فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ موسیٰ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ملک مصر سے نکال دیں (یرید ان یخرجکم من ارضکم) اس کی تشریح سید قطب نے ان الفاظ میں کی ہے:

إنھم یُصرِّحون بالنتیجۃِ الھائلۃِ التی تتقرّر من إعْلانِ تلك الحقیقۃِ۔ إنھا الخروجُ من الارض۔ إنھا ذَھابُ السُّلطان۔ إنھا إبطالُ شَرْعیۃِ الحکم۔ أو مُحاوَلۃ قلْبِ نظامِ الحکم، بالتعبیر العصری الحدیث (۳/۱۳۴۸)	وہ اس خوف ناک نتیجہ کو واضح کرتے ہیں جو اس حقیقت کے اعلان سے ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہ کہ یہ سرزمینِ مصر سے نکلنا ہے۔ یہ اقتدار کا خاتمہ ہے۔ یہ ہماری حکمرانی کو ناجائز ٹھہرانا ہے یا یہ، دورِ جدید کی تعبیر کے مطابق، نظام حکومت کو بدلنے کی کوشش ہے۔

آیت کی یہ تشریح سراسر غیر علمی اور غیر عقلی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں جب موسی اور فرعون دونوں کا کلام موجود ہے تو موسی کی دعوت کو موسیٰ کے کلام سے معلوم کیا جائے گا نہ کہ فرعون کے کلام سے۔ فرعون کی تقریر سے موسی کا مقصد اخذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے سید قطب کی تحریک کے مقصد کو جمال عبد الناصر کے بیان سے اخذ کیا جائے۔

ایک مغربی حوالہ

ملائز روتھوین (پیدائش ۱۹۴۲) ایک انگریزی جرنلسٹ ہیں۔ انھوں نے عرب ملکوں کا سفر کیا ہے اور عربی زبان سیکھی ہے۔ مسلم مصنفین کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ جدید دنیا میں اسلام

کے موضوع پر ان کی ایک ۴۰۰ صفحہ کی کتاب ہے جو پنگوئن کی طرف سے شائع کی گئی ہے :

Malise Ruthven, *Islam in the World*, New York 1984, pp.400

اس کتاب کا ساتواں باب "اسلام اور مغربی چیلنج" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے لٹریچر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مغربی کلچر اور مغربی فکر کی اعلیٰ روایات سے بے خبر رہ کر ، ان کے خیالات زیادہ تر ثانوی ذرائع پر مبنی ہیں جو سماجی مسائل کے بارہ میں مضامین اور اخبارات کو پڑھ کر ادھر اُدھر سے لے لیے گئے ہیں۔ وہ تنقید کے اس اصول کو کبھی بھی ہم عصر مسلم سماج پر چسپاں نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ اسلام کی اصولی معیاریت کا تقابل مغربی سماج کی عملی غیر معیاریت سے کرتے ہیں۔ مثل کا تقابل مثل سے نہیں کیا جاتا :

> Largely ignorant of Western high cultural and intellectual traditions his views are mostly picked up, second hand, from [illegible] articles in newspapers about various social problems. He never applies the same canons of criticism to contemporary Muslim society: the idealized notion of 'Islam' is forever compared with the actual imperfections of Western society: like is not compared with like (p. 327)

مثال کے طور پر مولانا مودودی کی کتاب اتحاد فی الاسلام میں ایک طرف قرآن وحدیث کے حوالے ہیں اور دوسری طرف مغربی واقعات کے حوالے۔ گویا اس کتاب میں آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کیا گیا ہے۔ یہی سید قطب اور موجودہ زمانہ کے دوسرے مصنفین کا حال ہے۔ وہ "مسلمان" کا تقابل "مغربی" سے نہیں کرتے ، بلکہ اسلام کا تقابل مغربی سے کرتے ہیں۔ بین اقوامی معاملات میں اسلام کی نمائندگی کے لیے وہ حجۃ الوداع کا خطبہ پیش کریں گے اور مغرب کی نمائندگی کے لیے مغرب کی واقعی سوسائٹی کو۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے خطبہ کا تقابل اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے منشور سے کیا جائے۔ اور مغربی حکومتوں کا تقابل مسلم حکومتوں سے —— یہی حال موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ

شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ بہت مشہور کتاب ہے۔ اس کو اسلام کی مدلل ترجمانی سمجھا جاتا ہے۔ مصنف نے کتاب کے آغاز میں لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے علم اسرار الدین پر لکھی ہے۔

قدیم خیال یہ تھا کہ شریعت کے احکام مصالح پر مبنی نہیں ہوتے۔ یہ گویا آقا کی طرف سے اپنے بندے کے لیے حکم ہے اور اس کی اطاعت یا عصیان پر جزا و سزا کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

مصنف نے قرآن و حدیث کی بہت سی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ کیوں کہ خود شارع نے اپنے متعدد احکام میں یہ اشارہ کیا ہے کہ وہ مصالح پر مبنی ہیں۔ مثلاً ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (البقرہ ۱۷۹) یا صدقہ کے بارہ میں یہ حدیث کہ تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم۔ اسی طرح انھوں نے صحابہ و تابعین کے کچھ اقوال جمع کیے ہیں جن میں مصالح احکام کا تذکرہ ہے بعد کے زمانہ میں علماء کے یہاں بھی جزئی طور پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً الغزالی، الخطابی، ابن عبد السلام وغیرہ (۳ — ۶)

تاہم حجۃ اللہ البالغہ کا معاملہ ایک استثنائی معاملہ ہے۔ کیوں کہ یہ کتاب مکمل طور پر اسرار شریعت ہی کے موضوع پر ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق، ان کو بطریق کشف اس کا اشارہ ملا۔ پھر اللہ نے ان پر الہام کیا (ثم الھمنی ربی) کہ وہ اس قسم کی ایک کتاب لکھیں۔ حتی کہ خواب میں حضرات حسنین نے ان کو ایک قلم دیا اور کہا کہ : ھذا قلم جدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس قسم کی چیزیں بتاتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں :

ان الشریعۃ المصطفویۃ اشرفت فی ھذا الزمان علی ان تبرز فی قمص سابغۃ من البرھان (صفحہ ۳)	شریعت محمدی کے لیے اس زمانہ میں وہ وقت آگیا کہ وہ دلیل و برہان کے مکمل پیراہن کے ساتھ جلوہ افروز ہو۔

علماء، خاص طور پر ہندستانی علماء، اس کتاب کو ایک معرکۃ الآراء کتاب سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں موجودہ دورِ عقلیت کے لیے تشفی کا وافر سامان موجود ہے۔ حتی کہ ان کا خیال ہے کہ کسی مذہب کی عقلی تائید اور اس کی حکیمانہ توجیہہ کے موضوع پر آج تک اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی (۲۱۶) نواب صدیق حسن خاں (۱۸۹۰ — ۱۸۲۲) نے لکھا ہے کہ اسرار احکام کے موضوع پر بارہ سو سال کے درمیان عرب و عجم کے کسی عالم کی ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی (مثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجری ہیچ یکے از علماء عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ)

میرے پاس حجۃ اللہ البالغہ کا وہ نسخہ ہے جو قاہرہ (دار التراث) سے ۱۳۵۵ھ میں چھپا ہے۔

اس کا جز، اول ۱۹۸ صفحہ پر مشتمل ہے اور جز ثانی ۲۱۵ صفحہ پر۔ زیر نظر مقالہ کی ترتیب کے دوران میں نے اس کتاب کو تقریباً مکمل دیکھا۔ بعض حصے کئی کئی بار پڑھے۔ مگر میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ مجھے ساری کتاب میں کوئی ایک بھی ایسا بیان نہیں ملا جس کو جدید سائنٹفک معیار کے مطابق، عقلی دلیل کا درجہ دیا جاسکتا ہو۔

کتاب کا نام (حجۃ اللہ البالغہ) جو قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے، وہ بلاشبہ نہایت اعلیٰ ہے۔ مگر اصل کتاب حجت بالغہ کے انداز میں نہیں، بلکہ صرف تقلیدی انداز میں شریعت اسلامی کی تشریح کرتی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب بنیادی طور پر کتب فقہ کی ترتیب پر قائم کی گئی ہے۔ یہ ترتیب بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ شاہ ولی اللہ قدیم تقلیدی ڈھانچہ سے باہر نہ نکل سکے۔ کیوں کہ ابواب فقہ دراصل ابواب احکام ہیں نہ کہ ابواب اسرار۔

کتاب کے مباحث عام طور پر اِعْلَمْ کے لفظ سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ بھی تقلیدی مزاج کا ثبوت ہے۔ یہ اس دور کا انداز کلام ہے جب کہ آدمی مقام عالم سے بولتا تھا۔ جدید انداز کلام مقام علم سے بولنے کا ہے۔ مگر شاہ ولی اللہ اس فرق کو سمجھ نہ سکے۔ اسی طرح کتاب میں جگہ جگہ نَبِیُّنَا لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ایک غیر علمی اسلوب ہے جو صرف اعتقادی کتابوں کے لیے موزوں ہے۔ علمی اعتبار سے اصل موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ہمارے نبی تھے۔ اصل موضوع بحث یہ ہے کہ کیا وہ خدا کے نبی تھے۔ اس کتاب میں طہارۃ سے لے کر سیاست مدن تک ہر چیز پر کلام کیا گیا ہے، مگر سب کا سب تقلیدی اور اعتقادی اسلوب میں ہے نہ کہ حقیقۃً علمی اسلوب میں۔

مثال کے طور پر نیت اور عبادت کی تشریح میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں: اعلم ان النیۃ روح والعبادۃ جسد ولاحیاۃ للجسد بدون الروح (الجزء الثانی ۸۳) یعنی جان لو کہ نیت روح ہے اور عبادت جسم ہے۔ اور روح کے بغیر جسم کی کوئی زندگی نہیں۔

اسرار الصلاۃ کے تحت لکھتے ہیں: احسن الصلاۃ ما کان جامعًا بین الاوضاع الثلاثۃ مترقیًا من الادنی الی الاعلیٰ لیحصل الترقی فی استشعار الخضوع والتذلل (الجزء الاول، ۳) یعنی بہترین نماز وہ ہے جس میں تینوں وضع جمع ہو جائے۔ جس میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو (قیام پھر رکوع پھر سجدہ) تاکہ خضوع اور تذلل کو محسوس کرنے کی طرف ترقی حاصل ہو سکے۔

اسرار الحج کے تحت لکھتے ہیں : ربما یشتاق الانسان الی ربہ أشدّ شوق فیحتاج الی شیئ یقضی بہ شوقہ فلا یجدہ الا الحج (الجزء الاول ۵۔۶) یعنی کبھی انسان کے اندر اپنے رب کے لیے شدید شوق پیدا ہوتا ہے۔ پس وہ ایک ایسی چیز کا محتاج ہوتا ہے جس سے وہ اپنے شوق کو پورا کرے۔ اس وقت وہ حج کے سوا کوئی اور چیز نہیں پاتا جس سے وہ اپنے شوق کو پورا کرے۔

اسی قسم کی تشریحات پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر اس قسم کی باتیں شریعت کی واعظانہ تفہیم ہیں۔ وہ کسی بھی درجہ میں شریعت کی علمی اور عقلی وضاحت نہیں۔ جو لوگ اس کو عقلی وضاحت سمجھیں ان کے بارہ میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ "عقلی وضاحت" کا مطلب نہیں جانتے۔

حجۃ اللہ البالغہ کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کتاب کے بارہ میں میری رائے اور دوسرے علماء کی رائے اتنی زیادہ مختلف کیوں ہے۔ آخر کار میری سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے علماء اس کتاب کو قدیم کے معیار پر دیکھتے ہیں اور میں اس کو جدید کے معیار پر دیکھ رہا ہوں۔ علماء کے پاس ایک ہی معلوم معیار ہے اور وہ اسلامی کتب خانہ کی قدیم کتابوں کا ہے۔ اس معیار پر دیکھنے میں حجۃ اللہ البالغہ انھیں ایک منفرد کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ ایک معرکۃ الآراء قسم کی عقلی کتاب ہے۔ مگر میں اس کو جدید معیار تعقل پر جانچتا ہوں تو مجھ کو نظر آتا ہے کہ وہ سرے سے کوئی عقلی کتاب ہی نہیں۔

اس کتاب کے مدّاح اگر یہ کہیں کہ قدیم ذخیرۂ کتب کے مقابلہ میں وہ ایک ممتاز کتاب ہے تو مجھے ان سے کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس کتاب کو عقلی معیار استدلال کا اعلیٰ نمونہ بتائیں تو میری تنقید باقی رہے گی۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کتاب کا عقلی معیار استدلال سے کوئی تعلق نہیں۔

غیر علمی انداز

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین پر مصری عالم سید قطب کا مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔ سید قطب نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کے سلسلہ میں مصنف نے محض وجدانی قسم کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا ہے بلکہ یہ کتاب موضوعی حقائق کو اپنا ذریعہ استدلال بناتی ہے (بل یتخذ الحقائق الموضوعیۃ أداتہ، صفحہ ۱۸)

اب اس کی روشنی میں اصل کتاب کو دیکھئے۔ مولانا موصوف کی اس کتاب کا مرکزی تخیل یہ ہے کہ مسلمان قیادۃ الامم (صفحہ ۲۲) کے منصب پر سرفراز کیے گئے ہیں۔ کتاب کے تصدیر نگار دکتور محمد یوسف موسیٰ نے اس کے لیے قیادۃ الانسانیۃ (۱۳) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صاحب مقدمہ سید قطب کے نزدیک، اس کتاب کا مقصد مسلمانوں کو قیادت عالم کی بازیابی (ردالقیادۃ العالمیۃ، ۲۲) پر ابھارنا ہے۔

اگر یہ کتاب موضوعی اصول پر لکھی گئی ہے تو مصنف کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ وہ قرآن و حدیث کی واضح نص سے اپنے اس دعوے کو ثابت کریں کہ مسلمان کا منصب یہ ہے کہ وہ دنیا کا قائد اور اقوام عالم کا امام بنے۔ مگر ۲۲۶ صفحات کی اس کتاب میں کہیں بھی قرآن و حدیث کے دلائل سے یہ ثابت نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمان کا منصب سارے عالم کی قیادت و امامت ہے۔ ساری کتاب میں اس نوعیت کی صرف ایک دلیل دی گئی ہے۔ اور وہ اقبال کا شعر ہے جو انھوں نے ابلیس کی مفروضہ مجلس شوریٰ کی بنیاد پر کہا ہے۔ مصنف نے کتاب کے صفحہ ۲۸۵ سے ۲۸۷ تک اقبال کی اس تخیلاتی نظم کا ترجمہ دیا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ شعر نظم کیا تھا:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مگر اصل موضوع کی نسبت سے اقبال کا یہ حوالہ سراسر غیر علمی ہے۔ اصل بات ثابت کرنے کے لیے مصنف کو یا تو ایسی کوئی آیت یا حدیث پیش کرنی چاہیے جس میں عبارت النص کی سطح پر ان کا مذکورہ نقطۂ نظر ثابت ہوتا ہو۔ یا پھر وہ یہ ثابت کریں کہ شریعت کی منشا کو جاننے کا ماخذ صرف اللہ اور رسول کا کلام نہیں۔ بلکہ اس کا ایک تیسرا ماخذ بھی ہے، اور وہ ابلیس کا کلام ہے۔

اس طرح کی کتابوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ علمی اور موضوعی کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں، یہ ثابت کرتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے علما نہ صرف یہ کہ وہ حقائق موضوعی کی بنیاد پر مطلوبہ لٹریچر تیار نہ کر سکے۔ بلکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ حقائق موضوعی کی بنیاد پر لٹریچر تیار کرنے کا مطلب کیا ہے۔

استدلال کا معیار

اصول استدلال کے سلسلہ میں مشہور غرناطی عالم الشاطبی نے ایک بہت بنیادی بات کہی ہے۔ وہ اپنی کتاب الموافقات فی اصول الاحکام میں علم الجدل کے قواعد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی دعویٰ

کے حق میں جب کوئی دلیل دی جائے تو ضروری ہے کہ مخاطب اس کا دلیل ہونا تسلیم کرتا ہو۔ اگر دلیل فریق ثانی کے نزدیک نزاعی ہو تو وہ اس کے نزدیک دلیل نہیں ہوگی۔ ایسی دلیل کو پیش کرنا بے کار ہوگا، اس سے نہ کوئی فائدہ ملے گا اور نہ کوئی مقصد حاصل ہوگا (اذا کان الدلیل عند الخصم متنازعاً فیہ فلیس عندہ بدلیل فصار الإتیانُ بہ عبثاً لا یفید فائدۃ ولا یحصّل مقصوداً) الجزء الرابع، صفحہ ۱۹۸

اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل وہ ہے جو مخاطب کے مسلّمہ معیار کے مطابق ہو۔ جو دلیل کسی ایسی بنیاد پر قائم کی جائے جو مخاطب کے نزدیک مسلّم نہ ہو وہ اس کے لیے دلیل بھی نہیں بن سکتی۔

چند مثالیں

۱۔ ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸) اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ متکلم بھی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان کی اکثر دلیلیں الشاطبی کے مذکورہ معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ کم از کم موجودہ زمانہ میں ان کی قیمت بہت کم ہوگئی ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنی ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے جسمانی معراج ہونے پر عقلی دلیل دی ہے۔ ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح نے اپنے جسم اور روح کے ساتھ آسمان کی طرف صعود کیا (ان المسیحَ صَعِدَ الی السماء ببدنہ و رُوحہ) اسی طرح اہل کتاب کا عقیدہ ہے کہ الیاس نے اپنے جسم کے ساتھ آسمان کی طرف صعود کیا (ان اِلیاسَ صَعِدَ اِلیٰ السماء ببدنہ) الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح ۴/۱۷۰-۱۶۹

جسمانی معراج کی یہ دلیل کسی مخصوص مخاطب کے لیے جدلی یا الزامی طور پر دلیل بن سکتی ہے جو حضرت مسیح اور حضرت الیاس کے جسمانی صعود کا عقیدہ رکھتا ہو۔ مگر اصل مسئلہ جدلی یا الزامی دلیل کا نہیں ہے بلکہ علمی اور عقلی دلیل کا ہے۔ علمی اور عقلی دلیل وہ ہے جس کی بنیاد ایسے معلوم حقائق پر رکھی گئی ہو جو اہل علم کے یہاں عمومی طور پر تسلیم شدہ ہوں۔ چونکہ یہ کوئی علمی مسلّمہ نہیں ہے کہ مسیح اور الیاس نے اپنے دنیوی جسم کے ساتھ آسمان کی طرف صعود کیا اس لیے مذکورہ دلیل عقلی دلیل بھی نہیں۔

۲۔ جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ حتیٰ کہ آپ مہر کے بغیر بھی کسی عورت کو اپنے نکاح میں لے سکتے تھے۔ اس کثرت ازواج پر مخالفین کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۸-۱۹۴۹) اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں:

"یہ اس اکمل البشر کی سیرت کا ذکر ہے جس نے خود اپنی نسبت فرمایا کہ مجھ کو جو جسمانی قوت عطا ہوئی ہے وہ اہل جنت میں سے چالیس مردوں کے برابر ہے جن میں سے ایک مرد کی قوت سو کے برابر ہوگی۔ گویا اس حساب سے دنیا کے چار ہزار مردوں کے برابر قوت حضور کو عطا فرمائی گئی تھی۔ اس حساب سے اگر فرض کیجئے چار ہزار بیویاں آپ کے نکاح میں ہوتیں تو آپ کی قوت کے اعتبار سے اس درجہ میں شمار کیا جا سکتا تھا جیسے ایک مرد ایک عورت سے نکاح کر لے۔ لیکن اللہ اکبر، اس شدید ریاضت اور ضبط نفس کا کیا ٹھکانا ہے کہ تریپن سال کی عمر زہد کی حالت میں گزار دی۔ پھر حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد حضرت عائشہ سے عقد کیا۔ ان کے سوا آٹھ بیوائیں آپ کے نکاح میں آئیں۔ وفات کے بعد نو موجود تھیں۔ دنیا کا سب سے بڑا انسان جو اپنے فطری قوی کے لحاظ سے کم از کم چار ہزار بیویوں کا مستحق ہو، کیا نو کا عدد دیکھ کر کوئی انصاف پسند اس پر کثرتِ ازواج کا الزام لگا سکتا ہے (صفحہ ۵۵۰)

مذکورہ اعتراض کا یہ جواب مخالفین کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس جواب کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے چار ہزار مردوں کے برابر طاقت حاصل تھی۔ مگر مجیب اور اس کے مخاطب کے درمیان یہ امر متفق علیہ نہیں۔ اس لیے مخاطب کی نسبت سے وہ عقلی دلیل بھی نہیں بن سکتا۔

۳۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں "مبحث فی الجہاد" کے عنوان سے ۹ صفحات کا مفصل باب ہے۔ اس باب کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے ـــــ جان لو کہ سب سے زیادہ کامل شرع اور سب سے زیادہ کامل قانون وہ شریعت ہے جس میں جہاد کا حکم دیا جائے (اِعلم أنّ أتمّ الشرائعِ واکملَ النوامیس ھو الشرعُ الذی یُؤمَر فیہ بالجھاد) الجزء الثانی، صفحہ ۱۷۰

جہاد (بمعنی قتال) کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ صاحب کتاب یہ بتاتے ہیں کہ ایسا قتال انسانیت کے حق میں رحمت ہے۔ اہل فساد جب دلیل و حجت سے نہ مانیں تو ان کے خلاف تشدد کرنا پڑتا ہے تاکہ ان کے ظلم و شر سے انسانوں کو نجات دے دی جائے۔ اور خود ظالموں کو بزور دین صحیح اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے جو ان کے لیے خیر ہے مگر وہ اپنی نادانی کی بنا پر اس کو نہیں سمجھتے۔ یہ قتال ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر جسم کے سڑے ہوئے عضو

کو صاحب جسم کے علی الرغم کاٹ کر پھینک دے :

والشر القلیلُ اِذا کان مفضیاً الی الخیر الکثیر اور تھوڑا شر جب زیادہ خیر کی طرف لے جانے
واجب فعلہٗ (الجزء الثانی، صفحہ ۱۱۰) والا ہو تو اس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

قتال کے حق میں شاہ ولی اللہ کی یہ دلیل جدید انسان کے مسلّمات کے مطابق نہیں۔ اس کو سن کر جدید انسان کہے گا کہ آپ کا جذبۂ صالح قابل قدر ہے۔ مگر آپ کی اسکیم سراسر نادانی کی اسکیم ہے۔ آپ کی یہ توجیہہ تلواروں کی لڑائی کے زمانہ میں باوزن محسوس ہو سکتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کی لڑائی میں وہ بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ نئے ہتھیار بن جانے کے بعد اب لڑائی خود تمام برائیوں سے زیادہ بڑی برائی بن چکی ہے۔

آج کی لڑائی ایٹم بم کی لڑائی ہے۔ اور اگر ایٹم بم کی لڑائی چھیڑی جائے تو قدیم شمشیری جنگ کی طرح اس کا نقصان صرف مقاتل افراد تک یا جنگ کے میدان تک محدود نہیں رہے گا۔ بلکہ پورے کرۂ ارض پر اس کے اثرات پھیل جائیں گے۔ حتیٰ کہ اس کے بعد زمین ہی ناقابل رہائش ہو جائے گی۔ پھر جب خود انسانی دنیا ہی باقی نہ رہے گی تو وہ کون سا مقام ہوگا جہاں آپ جنگ جیت کر اپنا نظام خیر قائم کریں گے۔

۴۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن چھ جلدوں میں ہے۔ اس کی پانچویں جلد میں سورہ الصف (آیت ۶) کی تشریح کے تحت انجیل برناباس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس انجیل کے تعارف اور اس کے اقتباسات پر تفہیم القرآن میں دس صفحے شامل کیے گئے ہیں۔ اس انجیل کے بیانات مسلمانوں کے عقائد سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں "محمد" کا نام بھی موجود ہے۔ مثلاً: سردار کاہن نے مسیح سے پوچھا کہ وہ آنے والا کس نام سے پکارا جائے گا۔ مسیح نے کہا کہ "سو اس کا مبارک نام محمد ہے"۔ اس انجیل میں درج ہے :

"اے محمد، انتظار کر۔ کیوں کہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا۔ اور اس کو تجھے تحفہ کے طور پر دوں گا۔ یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی"۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے علاوہ مولانا عبد الماجد دریابادی وغیرہ نے بھی انجیل برناباس

--

کے ذریعہ موجودہ مسیحیت کی تردید کی ہے اور اس کے بیانات کی بنیاد پر مسلم موقف کو صحیح ثابت کیا ہے۔ مگر علمی اعتبار سے یہ استدلال درست نہیں۔ کیوں کہ استدلال کی بنیاد صرف وہ چیز بن سکتی ہے جو متکلم اور مخاطب دونوں کے درمیان مسلّم ہو۔ انجیل برنباس کی صحت عیسائیوں کے یہاں مسلّم نہیں۔ ایسی حالت میں عیسائیوں کے مقابلہ میں وہ دلیل کس طرح بن سکتی ہے۔

مسیح کے بعد ابتدائی زمانہ میں انجیل کے بہت سے نسخے الگ الگ پائے جاتے تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں مسیحی چرچ نے چار انجیلوں کو معتبر اور مسلّم انجیل (Canonical gospels) قرار دیا۔ اور بقیہ تمام اناجیل کو غیر قانونی اور مشکوک الصحت (Apocryphal) بتاکر رد کر دیا، انجیل برنباس انھیں رد کی ہوئی انجیلوں میں سے ایک ہے۔ اس بنا پر ہمارے اور مسیحی حضرات کے درمیان انجیل برنباس کی حیثیت ایک مسلّم بنیاد کی نہیں رہی، ایسی حالت میں کسی مسلم عالم کے لیے انجیل برنباس کی بنیاد پر مسیحیت کے مقابلہ میں کوئی دلیل قائم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسیحی عالم موضوع روایات کی بنیاد پر اسلام کے بارہ میں کوئی بات ثابت کرے۔

اسلام اور اسلامی تاریخ کے بارہ میں موضوع روایتیں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ مسلم علما ان روایتوں کی صحت کو نہیں مانتے، اس لیے وہ اسلام کے معاملہ میں کسی بات کو ثابت کرنے کی معقول بنیاد نہیں بن سکتیں۔ یہی معاملہ برنباس کا بھی ہے۔

۵۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۹۴۹ - ۱۸۸۸) کا شمار ممتاز علماء دیوبند میں ہوتا ہے۔ ان کی تفسیر قرآن بہت مشہور ہے جو انھوں نے ۱۳۵۰ھ میں لکھ کر مکمل کی تھی۔ انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیت کو ثابت کرتے ہوئے سورہ النجم کی آیت ۲ کے تحت لکھا ہے:

"جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے لے کر غروب تک ایک مقرر رفتار سے متعین راستہ پر چلے جاتے ہیں، کبھی اِدھر اُدھر ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ (اسی طرح) آفتاب نبوت بھی اللہ کے مقرر کیے ہوئے راستہ پر برابر چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ایک قدم اِدھر یا اُدھر پڑ جائے۔ انبیاء علیہم السلام آسمان نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب درخشاں طلوع ہوتا ہے، ایسے ہی تمام انبیاء کی تشریف آوری کے بعد آفتاب محمدی مطلع عرب سے طلوع ہوا۔ (صفحہ ۶۸۲)

دیگر انبیاء کے اوپر پیغمبر اسلامؐ کے امتیاز کو ثابت کرنے کے لیے اس عبارت میں ایک مثا
کو استعمال کیا گیا ہے۔ قدیم زمانہ میں مثال کو بطور دلیل استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کا انس
مثال کو دلیل کا قائم مقام نہیں سمجھتا۔ اس لیے عقلی استدلال کے طالب کے لیے مذکورہ مثا
دلیل نہیں بن سکتی۔

اس سے قطع نظر، خود یہ مثال متکلم اور مخاطب کے درمیان کوئی متفق علیہ واقعہ نہیں۔ آ
کا ایک انسان ستاروں کو سورج سے چھوٹا نہیں مانتا۔ اور نہ وہ ستاروں کے غائب ہو۔
یا ڈوبنے کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ دونوں مظاہر موجودہ زمانہ میں اضافی ہیں نہ کہ واقعی۔ پھر جب مذ
کردہ مثال کی واقعیت پر طرفین کا اتفاق نہ ہو تو وہ مخاطب کی نظر میں دلیل کس طرح بن سکتی ہے

۶۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) کی مشہور کتاب تفہیمات حصہ اول میں ایک
مضمون ہے جس کا عنوان "عقل کا فیصلہ" ہے۔ اس مضمون کا مقصد رسول کی رسالت کو عقلی دلیل
کے ذریعہ ثابت کرنا ہے۔ مگر جو دلیل دی گئی ہے، وہ مذکورہ معیار کے مطابق اعتقادی دلیل ہے
کہ عقلی دلیل۔

اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے ہزاروں سال کے اندر کثرت سے انبیاء آئے۔ ایک ط
یہ ہزاروں انبیاء تھے جن کے درمیان باہمی طور پر کوئی اتصال نہ تھا۔ اس کے باوجود ان سب
ہمیشہ ایک ہی بات کہی۔ ان سب نے ہمیشہ ایک ہی بات کی طرف دعوت دی۔ انھوں نے
ایک دوسرے سے مختلف پیغام دنیا کو نہیں دیا۔ اس کے برعکس ان کا انکار کرنے والوں کا
یہ تھا کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف باتیں کرتے رہے۔ مدعیان رسالت متحد الخیال ۔
اور مکذّبین رسالت مختلف الخیال۔

اب دونوں فریق کا معاملہ عقل کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ عقل کی عدالت فیصلہ کرتی
کہ متحد الخیال لوگ صحیح ہیں اور ایک سرچشمہ ہدایت سے بول رہے ہیں۔ اگر ان سب کا ایک
سرچشمہ نہ ہوتا تو ان کے درمیان یہ کامل اتفاق ممکن نہ تھا، ان کے مقابلہ میں مختلف الخیال لوگ غا
ہیں۔ ان کا کوئی واحد ذریعہ علم نہیں۔ اسی لیے ہر ایک الگ الگ باتیں کر رہا ہے۔

دور جدید کے صاحب عقل کے لیے یہ دلیل قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ اس میں

چیز کو استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے وہ صرف متکلم کا عقیدہ ہے، وہ متکلم اور مخاطب دونوں کا مشترک مسلّمہ نہیں۔ جدید انسان اس طرح کے معاملات میں صرف تاریخ کو معیار مانتا ہے۔ اور تاریخ ان میں سے کسی بات کا بھی ذکر نہیں کرتی۔ مدون انسانی تاریخ میں نہ انبیاء کا کوئی ذکر ہے۔ اور نہ ان کے متحد الخیال ہونے کا۔ اسی طرح تاریخ میں نہ مکذّبین انبیاء کا ذکر ہے اور نہ ان کے مختلف الخیال ہونے کا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا مضمون (عقل کا فیصلہ) بتاتا ہے کہ وہ اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ موجودہ زمانہ میں عقلی استدلال کا معیار کیا ہے۔ انھوں نے نقلی دلیل پر مبنی کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا اور اس کے اوپر عقلی استدلال کا عنوان قائم کر دیا۔

خلاصۂ بحث

۱۔ علماء اسلام کو سب سے پہلے شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ انھیں عملی سیاسیات سے مکمل طور پر الگ رہنا ہے۔ ان کا اصل کام وہ ہے جو علم و فکر اور دعوت و اصلاح کے میدان میں انجام دیا جاتا ہے۔ سیاسی معاملات میں بوقت ضرورت وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مگر سیاسی معاملات میں عملی حصہ لینا ان کے لیے کسی حال میں درست نہیں۔

۲۔ علماء کو مروجہ دینی تعلیم کے ساتھ لازمی طور پر عصر حاضر کے افکار سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر وہ عصر حاضر میں اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتے۔

۳۔ علماء کے یہاں ایک دوسرے کے خلاف تنقید کی کھلی اجازت ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر لوگوں میں ذہنی جمود کا ٹوٹنا اور حکیمانہ بصیرت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

۴۔ علماء کے درمیان برداشت کے مزاج کو فروغ دینا چاہیے اور اختلاف کے باوجود اتحاد کا ماحول پیدا کرنا چاہیے۔ جب تک ایسا نہ ہو، ملت کے اندر کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ امت کی تعلیم و تربیت کے ساتھ دوسرا اہم کام جو علماء کو انجام دینا ہے وہ دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی غیر مسلم قوموں کو دین حق کا پیغام پہنچانا اور اس کے جزوی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو آخری حد تک جاری رکھنا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اگست ۱۹۹۳، شمارہ ۲۰۱

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)

دنیا اور آخرت

دنیا میں ہر آدمی کی زندگی دو مرحلوں میں بٹی ہوئی ہے ـــــ تیاری، اور نتیجہ تیاری۔ آدمی اپنی زندگی کے پہلے مرحلہ میں تیاری کرتا ہے، اور اپنی زندگی کے دوسرے مرحلہ میں اس کا پھل پاتا ہے۔ یہی حال ہر آدمی کا ہے، خواہ وہ کسان ہو یا تاجر، خواہ وہ ڈاکٹر ہو یا انجینیر، خواہ وہ لیڈر ہو یا عہدے دار۔ ہر آدمی کا معاملہ یہی ہے۔ اس میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ ہر آدمی اپنے ذاتی تجربہ سے اس خدائی منصوبہ کو سمجھ سکے جس کے تحت تمام انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہ دنیا کے محدود تجربہ کے ذریعہ اس وسیع تر تجربہ کو بتاتا ہے جو دنیا اور آخرت کی صورت میں ہر آدمی کو پیش آنے والا ہے

یہ دنیا جس کے اندر ہم پیدا ہوئے ہیں، یہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے، اور نہ ہم اس کے مالک ہیں۔ اس دنیا کو بنانے والا خدا ہے۔ اور وہی بلاشریک اس کا مالک ہے۔ ایسی حالت میں انتہائی ضروری ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں ہے وہ سب سے پہلے یہ جانے کہ اس دنیا کے بارہ میں اس کے خالق اور مالک کا منصوبہ کیا ہے۔ اس منصوبہ سے مطابقت کر کے ہی ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس منصوبہ سے مطابقت نہ کرنا اپنے آپ کو جان بوجھ کر تباہی کی طرف لے جانا ہے۔

خدا کے منصوبہ کے مطابق، یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں آدمی کو رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون شخص کیسا ثابت ہوتا ہے۔ تاکہ اس کے مطابق اس کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے۔

جو شخص بھی اس دنیا میں آتا ہے، اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ وہ خدا کا شکر کرنے والا اور اس کی تابعداری کرنے والا بن جائے۔ وہ ہر اعتبار سے صرف ایک خدا کو اپنا بڑا قرار دے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے آگے جھک جائے۔ آدمی کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے تعلق کے دوران ان حدود کا پابند رہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں انصاف اور خیر خواہی کے اصول پر کاربند رہ

قلب سلیم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں آدمی کو جو چیز نفع دے گی، وہ صرف قلب سلیم (الشعراء ۸۹) ہے۔ وہی لوگ جنت میں داخل کیے جائیں گے جو قلب سلیم لے کر وہاں پہنچیں۔ "قلب سلیم" کی تشریح مختلف الفاظ میں کی گئی ہے مگر سب کا مدعا ایک ہے۔ یہاں ہم تفسیر ابن کثیر کا متعلقہ حصہ نقل کرتے ہیں :

(الا من اتی اللہ بقلب سلیم) ای سالم من الدنس والشرك- قال ابن سیرین القلب السلیم ان یعلم ان اللہ حق وان الساعة آتیة لاریب فیها وان اللہ یبعث من فی القبور- وقال ابن عباس (الا من اتی اللہ بقلب سلیم) القلب السلیم ان یشهد ان لا الہ الا اللہ- وقال مجاهد والحسن وغیرهما (بقلب سلیم) یعنی من الشرك- وقال سعید بن المسیب القلب السلیم هو القلب الصحیح وهو قلب المومن لأن قلب الكافر والمنافق مریض- قال ابو عثمان النیسابوری هو القلب السالم من البدعة المطمئن الی السنة (۳/۳۲۹)

مگر وہ جو قلب سلیم لے کر آیا، یعنی گندگی اور شرک سے پاک دل۔ ابن سیرین نے کہا کہ قلب کا سلیم ہونا یہ ہے کہ وہ جانے کہ اللہ حق ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ ضرور ان کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ ابن عباس نے کہا کہ قلب سلیم یہ ہے کہ وہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ مجاہد حسن اور دوسروں نے کہا کہ قلب سلیم کا مطلب شرک سے پاک دل ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا کہ قلب سلیم سے مراد قلب صحیح ہے اور وہ مومن کا دل ہے، کیونکہ کافر اور منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ ابو عثمان نیساپوری نے کہا کہ اس سے مراد وہ دل ہے جو بدعت سے پاک اور سنت پر مطمئن ہو۔

جنت میں داخلہ کا معیار ظاہری اعمال کی مقدار نہیں ہے بلکہ آدمی کی اندرونی کیفیت ہے۔ قیامت میں اصل چیز جو دیکھی جائے گی وہ یہ کہ آدمی کس قسم کی شخصیت لے کر وہاں پہنچا ہے۔ جو لوگ ربانی شخصیت لے کر وہاں پہنچیں گے، وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے اندر معرفت کی روشنی لیے ہوئے ہوں۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوں۔ جو منفی رجحانات سے پاک ہوں جنھوں نے دنیا میں فطرت خداوندی کی سطح پر جینے کا ثبوت دیا ہو۔

اعتدال کا طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما احسن القصد فی الغنی ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادۃ (کیا ہی اچھی ہے میانہ روی دولت مندی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی مفلسی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی عبادت میں) ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: القصد القصد تبلغوا (میانہ روی، میانہ روی، تم منزل پر پہنچ جاؤ گے)

قرآن میں ہے سفراً قاصداً (التوبہ ۴۲) یعنی بے مشقت سفر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ایک صحابی کہتے ہیں: کانت صلاتہ قصداً وخطبتہ قصداً (آپ کی نماز معتدل ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی معتدل ہوتا تھا) لسان العرب میں قصد کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ درمیانی عمل جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط (لسان العرب ۳/۳۵۴)

مومن کا طریقہ قصد کا طریقہ ہے، انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ وہ ہمیشہ معتدل انداز اختیار کرتا ہے، خواہ وہ ایک طرح کی صورت حال میں ہو یا دوسری طرح کی صورت حال میں۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں کسی فرد یا قوم کی حالت کبھی یکساں نہیں رہ سکتی۔ یہاں انسان کے لیے کبھی اچھے حالات ہوتے ہیں اور کبھی برے حالات۔ اس کو کبھی پُرسکون ماحول میں رہنا ہوتا ہے اور کبھی اشتعال انگیز ماحول میں۔ وہ لوگوں کے درمیان کبھی طاقتور ہوتا ہے اور کبھی کمزور۔ اس کی زندگی کبھی اپنوں کے درمیان گزرتی ہے اور کبھی غیروں کے درمیان۔ اس کو کبھی دوستوں کے ساتھ سابقہ پیش آتا ہے اور کبھی دشمنوں کے ساتھ۔

مگر ایمان اس کو ایک تھما ہوا انسان بنا دیتا ہے۔ وہ ہر حال میں اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کی رسی میں باندھے رہتا ہے۔ اہل ایمان اہل اعتدال ہوتے ہیں۔ حالات کا اتار چڑھاؤ ان کے سکون کو برہم نہیں کرتا۔ ان کے خود اپنے مقرر اصول ان کی زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں نہ کہ بیرونی اشخاص کے چھیڑے ہوئے مسائل۔

کتاب کی دنیا

جس آدمی کے پاس کتاب ہے وہ اکیلا نہیں ہے ـــــ اکیلا شخص وہ ہے جس کے پاس ذہنی مشغولیت کے لئے کچھ نہ ہو۔ کتاب آدمی کو بہترین ذہنی مشغولیت دیدیتی ہے۔ پھر جو آدمی کتاب پڑھے وہ اکیلا کیسے رہے گا۔

کتاب کیا ہے۔ وہ صاحب کتاب کے مطالعہ اور تجربہ کا نچوڑ ہے۔ ہر کتاب گویا ایک خاموش آدمی ہے۔ جب ہم کتاب پڑھتے ہیں تو گویا ہم کسی آدمی کے ساتھ خیالات کے تبادلہ میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک کتاب پڑھنا ایک آدمی کی ہم نشینی ہے اور بہت سی کتابیں پڑھنا بہت سے آدمیوں کی ہم نشینی۔

ایک آدمی محدود مدت تک زندگی گزار کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اگر کتاب کا طریقہ نہ ہو تو گزرے ہوئے آدمیوں کے بارہ میں جاننا ہمارے لئے ناممکن ہو جائے۔ مگر کتاب کی صورت میں آدمی کے بعد بھی اس کا ریکارڈ موجود رہتا ہے۔ کتاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آپ ایک مقام پر رہ کر ساری دنیا کے لوگوں سے مل سکیں۔ آپ ایک زمانہ میں ہوتے ہوئے ہر زمانہ کے لوگوں کے خیالات سے فائدہ اٹھائیں۔

کتاب کا مطالعہ آدمی کے علم کو بڑھاتا ہے۔ اس کے تجربات کو شخصی سطح سے بڑھا کر عمومی انسانیت کی سطح تک پہنچا دیتا ہے۔ کتابوں کی لائبریری گویا عالمی انسانی اجتماع ہے۔ اس اجتماع گاہ میں داخل ہو کر آپ کسی بھی وقت کسی بھی آدمی کی بات سن سکتے ہیں، کسی بھی جگہ کسی بھی آدمی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

کتاب کے طریقہ نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ آپ سفر کئے بغیر دوسروں سے واقفیت حاصل کریں اور اسی طرح خود اپنے سے دوسروں کو واقف کرائیں۔ ملاقات کا سب سے بڑا کمرہ وہ ہے جہاں کتابیں ہوں، واقفیت کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے پاس ہے جو کتابوں سے استفادہ کرنے میں لگا ہوا ہو۔ کتاب بہترین دماغوں کا ریکارڈ ہے۔ کتاب اعلیٰ انسانوں کی نمائندہ ہے۔ کتاب علم کا خزانہ ہے۔ اور بلاشبہہ اس دنیا میں علم کے خزانہ سے بڑی کوئی چیز نہیں۔

الرسالہ اگست ۱۹۹۳

اگلا پیراگراف

زندگی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے۔ اس کہانی کو صرف وہی شخص کامیابی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس کی توجہ ہمیشہ کہانی کے اگلے پیراگراف پر لگی رہے ـــــ ہر آدمی کی زندگی اسی قسم کی ایک کہانی ہے۔ خواہ وہ چھوٹا آدمی ہو یا بڑا آدمی۔ خواہ وہ معمولی حالات میں زندگی گزار رہا ہو یا اونچے اور شاندار حالات میں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک تلخ تجربہ کا نام ہے۔ کھوئے ہوئے مواقع کا افسوس، گزرے ہوئے حادثات کی تلخیاں، لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے برے سلوک کی یاد، اپنی کمیوں اور تنگیوں کی شکایت۔ غرض بے شمار چیزیں ہیں جو آدمی کی سوچ کو منفی رخ کی طرف لے جاتی ہیں۔ آدمی اگر ان باتوں کا اثر لے تو اس کی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے کی طرف دیکھے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کے بجائے آنے والے دن پر اپنی نظریں جمائے رکھے۔

ہر آدمی اپنے قول و عمل سے اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہا ہے۔ مگر اس کو خود نہیں معلوم کہ اس کہانی میں کون سے مراحل پیش آئیں گے، اور نہ کوئی شخص یہ جانتا کہ یہ کہانی کہاں جا کر ختم ہوگی۔ اس لئے لازم ہے کہ آدمی ہر سامنے آنے والے مرحلہ کا استقبال کرے۔ کہانی کے اگلے ابواب لکھنے کی کوشش میں وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے۔

زندگی میں اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ اس نے کیا پایا۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ وہ کیسے جیا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک کم آمدنی والا شخص اچھی زندگی گزارے اور ایک دولت مند آدمی بری زندگی گزار کر مر جائے۔ ایک جاہل آدمی اپنے معاملات میں زیادہ سمجھ داری کا ثبوت دے اور ایک پڑھا لکھا آدمی اپنے معاملات کو سلجھانے میں بے سلیقہ ثابت ہو۔

یہ نہ دیکھئے کہ آپ زندگی میں کیا حاصل کر رہے ہیں۔ یہ دیکھئے کہ آپ زندگی کس طرح گزار رہے ہیں۔ جس شخص کو اچھی زندگی گزارنا آجائے وہی وہ شخص ہے جو دنیا میں کامیاب رہا۔ وہی وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے مستقبل تک پہنچایا۔

اپنی ذات

جو شخص اپنے آپ پر فتح حاصل کر لے ، اس کے لئے دوسروں پر فتح حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ـــــ آدمی اپنی قسمت آپ بناتا ہے۔ اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا نام کامیابی ہے اور اپنی کمزوریوں سے مغلوب ہوجانے کا نام ناکامی۔

ایک شخص کے اندر خود پسندی ہو تو اس کے گرد خوشامدی قسم کے لوگ جمع ہو جائیں گے۔ اور خوشامدی لوگ بلاشبہ کسی آدمی کا سب سے زیادہ برا سرمایہ ہیں۔ ایک شخص عجلت پسند ہو تو وہ ایسے موقع پر گھبرا اٹھے گا جب کہ اسے آنے والے وقت کا انتظار کرنا چاہئے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر ضروری طور پر آنے والی کامیابی سے محروم ہو جائے گا۔ ایک شخص صرف اپنے آپ کو جانتا ہو تو وہ لوگوں کے ساتھ درست معاملہ نہ کر سکے گا، جب کہ لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کے لئے لوگوں کے ساتھ درست معاملہ کرنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے اسباب آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ناکامی کے اسباب بھی خود آدمی کے اندر ہی پائے جاتے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ سب سے پہلے وہ اپنا جائزہ لے۔ ہر پسپائی کا سبب خود اپنے اندر تلاش کرے۔ جو چیز آپ کے اندر ہو اس کو آپ باہر تلاش کر کے نہیں پا سکتے۔ جو نتیجہ اپنے آپ پر عمل کر کے ملتا ہو، اس کو آپ دوسروں پر زور آزمائی کر کے حاصل نہیں کر سکتے۔

آدمی کے اندر بیک وقت دو قسم کی صلاحیتیں ہیں۔ اس کے اندر اعتراف کا مادہ ہے اور اسی کے ساتھ بے اعترافی کی خواہش بھی۔ اس کے اندر شکر کا جذبہ بھی ہے اور ناشکری کی نفسیات بھی۔ اس کے اندر تواضع کا مزاج بھی ہے اور گھمنڈ کا مزاج بھی۔ اس کے اندر امانت داری کا مادہ بھی ہے اور حق تلفی کا مادہ بھی۔ وہ دوسرے کی ترقی پر خوش ہونا بھی جانتا ہے اور دوسرے کی ترقی پر حسد کرنا بھی۔

اس دنیا میں جیت اس کے لئے ہے جو اپنے اندر کی بری خواہشوں کے مقابلہ میں جیت حاصل کرے۔ اور ہار اس کے لئے ہے جو اپنے اندر کی بری خواہشوں کے مقابلہ میں ہار جائے۔

الرسالہ اگست ۱۹۹۳

دشواریاں زینہ ہیں

انسان قدرت کا چھپا ہوا خزانہ ہے۔ مشکلات کی ٹھوکریں اس خزانہ کو اندر سے باہر لے آتی ہیں ــــ پوری تاریخ کا تجربہ ہے کہ وہی لوگ سب سے زیادہ ابھرے جنھیں سب سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بیج جب پھٹتا ہے تو اس کے اندر سے عظیم درخت برآمد ہوتا ہے۔ یہی انسان کی شخصیت کا حال بھی ہے۔ انسان کی شخصیت پر جب حالات کا دباؤ پڑتا ہے تو اس کی اندرونی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ جو چیز پہلے "بیج" کے روپ میں چھپی ہوئی تھی، وہ "درخت" کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مشکل کو صرف مشکل سمجھیں۔ دوسرے وہ جو مشکل کو چیلنج کی نظر سے دیکھیں۔ مشکل کو مشکل سمجھنا مایوسی کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اور مشکل کو چیلنج سمجھنے سے یہ ذہن پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سامنا کیا جائے۔

اگر آپ مشکل کو صرف مشکل سمجھیں تو آپ کی موجود صلاحیتیں بھی مرجھا جائیں گی۔ آپ کی سوچنے کی طاقت مفلوج ہو جائے گی۔ مگر جب آپ مشکل کو چیلنج سمجھیں تو آپ کے اندر نئی ہمت جاگتی ہے۔ آپ کا ذہن پہلے سے زیادہ کام کرنے لگتا ہے۔ آپ کو نئی نئی تدبیریں سوجھتی ہیں جن کو استعمال کرکے آپ آگے بڑھ سکیں۔

جس آدمی کو صرف آسانیاں پیش آئیں وہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی فکر میں سطحیت آجاتی ہے۔ مگر جس آدمی کو مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے وہ لامحدود انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔

دشواری ایک معلم ہے۔ دشواری سے آدمی ان باتوں کو جان لیتا ہے جن کو کسی درس گاہ میں پڑھایا نہیں جا سکتا۔ دشواری آدمی کے علم میں تجربہ کا اضافہ کرتی ہے۔ دشواری آدمی کی سنی یا پڑھی ہوئی بات کو اس کی ذاتی دریافت بنا دیتی ہے۔

زندگی کی دشواریاں زندگی کے زینے ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ آپ کو نیچے سے اوپر لے جائیں۔ تاکہ وہ آپ کے چھپے ہوئے خزانہ کا آپ کو مالک بنا دیں۔

بدخواہی نہیں

کوئی بھی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اپنا برا کئے بغیر دوسرے کا برا کر سکے ——— ہر برائی سب سے پہلے اپنے لئے برائی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کسی دوسرے کے لئے برائی بن سکتی ہے۔

آپ کسی کی ترقی کو روکنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے اندر حسد پیدا کرنا ہوگا۔ اپنے اندر حسد کی آگ بھڑکانے کے بعد ہی آپ دوسرے کی ترقی کے خلاف کوئی سازش کر سکتے ہیں۔ آپ کسی کو مارنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے سینہ کو تخریب کاری کا اڈہ بنانا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی آپ کسی کو اپنے تخریبی منصوبہ کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔

اس دنیا میں سب سے بڑی برائی دوسرے کا برا چاہنا ہے۔ کیوں کہ آپ خواہ دوسرے کا برا نہ کر سکیں، مگر اپنا برا یقیناً آپ کر لیتے ہیں۔ دوسرے کو تباہ کرنا کسی آدمی کے اختیار میں نہیں۔ مگر جب کوئی شخص کسی دوسرے کی تباہی کا نقشہ بناتا ہے تو وہ اپنے آپ کو یقیناً تباہ کر لیتا ہے۔

اگر آپ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانا چاہیں تو یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسرے کے خلاف سوچیں۔ اس کے خلاف نقصان کی تدبیریں کریں۔ اپنی کوششوں کو منفی رخ پر چلانا شروع کر دیں۔ یہ تمام چیزیں اپنی تباہی کا سامان ہیں۔ یہ دوسرے کی بدخواہی کی خاطر خود اپنی ذات کا بدخواہ بننا ہے۔

اگر آپ دوسرے کے خلاف اپنے اقدام میں کامیاب ہو جائیں تب بھی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے آپ خود اپنے جان و مال کا بہت سا نقصان کرتے ہیں۔ دوسرے کو زخم پہنچانے کی کوشش میں خود اپنے آپ کو بھی زخمی کر چکے ہوتے ہیں۔ پھر ایسی کارروائی سے کیا فائدہ۔

دوسرے کی بدخواہی صرف دوسرے کی بدخواہی نہیں، اسی کے ساتھ وہ خود اپنی بدخواہی بھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اگر وہ دوسرے کا خیر خواہ نہیں بن سکتا تو اپنی ذات کا خیر خواہ بنے۔ وہ دوسرے کو دینا نہیں چاہتا تو کم از کم اپنے آپ کو محروم نہ کرے۔ وہ دوسرے کے لئے جینا نہیں چاہتا تو اپنے آپ کے لئے جئے۔

دو قسم کے انسان

منفی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا معمول ہوتا ہے، اور ایجابی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا عامل ـــــ اول الذکر انسان کو تاریخ کے حالات بناتے ہیں۔ ثانی الذکر انسان وہ ہے جو حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے، وہ خود ایک نئی تاریخ بناتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ ناخوش گوار حالات ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایسے اسباب پیش آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہو۔ ایسے موقع پر جو لوگ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں، وہ گویا تاریخ کا معمول بن گئے۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ایسے لوگ ہمیشہ احتجاجی کارروائیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ کوئی مثبت کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔

اس کے برعکس انسان وہ ہے جو حالات سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ جو ردعمل کے بغیر خود اپنی آزادانہ سوچ کے تحت اپنی رائے بنائے۔ ایسا انسان گویا تاریخ کے اوپر ہے۔ وہ اس حیثیت میں ہے کہ دنیا سے متاثر ہونے کے بجائے خود دنیا کی صورت گری کرے۔ وہ تاریخ کا عامل بن جائے۔

تمام حیوانات تاریخ کی پیداوار ہیں۔ مگر انسان کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی جدوجہد سے تاریخ بنائے۔ وہ خود اپنی ذات سے تاریخ ساز بن جائے۔

منفی نفسیات کسی انسان کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو آدمی منفی نفسیات میں مبتلا ہو، وہ گویا اپنے حالات کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے آپ کو منفی رجحانات اور ردعمل کی نفسیات سے بچائے، وہ گویا خارجی دنیا کے حملوں کے باوجود زندہ رہا۔ اس نے اپنی ہستی کو فنا ہونے سے بچا لیا۔

منفی نفسیات کی بنیاد آدمی کے باہر ہوتی ہے، اور مثبت نفسیات کی بنیاد آدمی کے اندر۔ منفی نفسیات والا انسان دوسروں کے اوپر کھڑا ہوتا ہے، اور مثبت نفسیات والا انسان خود اپنی ذات پر۔ یہی واقعہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ دونوں میں سے کون ہے جس کو اعلیٰ انسان کا لقب دیا جاسکے۔ سب سے زیادہ محروم اور نادان وہ شخص ہے جس کے لئے اس دنیا میں عامل بننے کا موقع تھا، اس کے باوجود وہ صرف معمول بن کر رہ گیا۔

حق کے مطابق

اپنے حق سے زیادہ چاہنا اپنے آپ کو اپنے واقعی حق سے بھی محروم کرلینا ہے ـــــ جب آدمی صرف اپنے حق کا طالب ہو تو پورا نظام عالم اس کا ساتھ دے رہا ہوتا ہے، اور جب وہ اپنے حق سے زیادہ کا طالب بن جائے تو نظام عالم اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا آدمی کامیاب ہوتا ہے، اور دوسرا آدمی ناکام۔

جب آپ اپنے حق کے بقدر چاہتے ہیں تو آپ وہ چیز چاہ رہے ہوتے ہیں جو واقعۃً آپ کی ہے، جو ازروئے انصاف آپ ہی کو ملنا چاہئے۔ مگر جب آپ اپنے واقعی حق سے زیادہ چاہیں تو گویا آپ ایسی چیز چاہ رہے ہیں جو ازروئے انصاف آپ کی چیز نہیں ہے، بلکہ دوسرے کی چیز ہے۔ پھر دوسرا شخص کیوں آپ کو اپنی چیز دینے پر راضی ہوجائے گا۔

جب بھی آدمی اپنے حق سے زیادہ چاہے تو فوراً اس کا ٹکراؤ دوسروں سے شروع ہوجاتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اب کش مکش اور ضد اور مزاحمت وجود میں آتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اصل سے زیادہ کی طلب میں اصل کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔

اپنے حق سے زیادہ کی طلب کرتے ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی تضاد میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے حصہ کی چیز لینے کے لئے ایک دلیل دیتا ہے، اور دوسرے کے حصہ کی چیز پر قبضہ کرنے کے لئے دوسری دلیل استعمال کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقدمہ کو خود ہی کمزور کرلیتا ہے۔ وہ اپنی نفی آپ کردیتا ہے۔ دو قسم کی دلیلوں سے وہ ثابت کرتا ہے کہ پہلی چیز اگر اس کی ہے تو دوسری چیز اس کی نہیں ہے، اور اگر دوسری چیز اس کی ہے تو پہلی چیز اس کی نہیں ہوسکتی۔

ایسے آدمی کے اوپر وہ مثال صادق آتی ہے کہ جو شخص دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی نہیں پکڑ سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اصل حق کے ساتھ مزید کا طالب بنے، وہ اصل کو بھی کھو دے گا اور اسی کے ساتھ مزید کو بھی۔

پوری انسانی تاریخ، ایک اعتبار سے، اسی حقیقت کا عملی اظہار ہے۔

بہتر سلوک

برے سلوک کا بہترین جواب اچھا سلوک ہے ۔ جہالت کا بہترین حل اس کو نظر انداز کر دینا ہے ـــــ اسی روش کا نام اعلیٰ اخلاق ہے ۔ اور اعلیٰ اخلاق سے زیادہ بہتر اور کارگر چیز اس دنیا میں اور کوئی نہیں ۔

ایک شخص آپ کے ساتھ برا سلوک کرے ، اس کے جواب میں آپ بھی اس کے ساتھ برا سلوک کریں تو دونوں کا معاملہ برابر ہوگیا ۔ ایسی حالت میں دوسرا شخص اپنے آپ کو برا نہیں سمجھے گا ۔ وہ صرف یہ کرے گا کہ آپ کو برا سمجھنے لگے ۔ یا کم از کم یہ کہ جیسا میں ہوں ، ویسا ہی میرا حریف بھی ہے ۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ۔

مگر جب آپ برا سلوک کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو فوراً اس کی ساری توجہ خود اپنی طرف لگ جاتی ہے ۔ اب آپ اس کو اس کے ضمیر کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں جو اس سے یہ کہنا شروع کرتا ہے کہ صرف تم برے ہو ۔ اس کی دو طرفہ سوچ اب یک طرفہ بن جاتی ہے ۔

برا کرنے والے کے ساتھ برا کرنا ، اس کو یہ موقع دینا ہے کہ وہ اپنی برائی کو بھول کر صرف دوسرے کی برائی کو یاد رکھے ۔ اس کے برعکس برا کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ، اس سے یہ موقع چھین لینا ہے کہ وہ دوسرے کو برا بتا کر مطمئن ہو سکے ۔ اب وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ صرف اپنے آپ کو برا سمجھے ۔

برائی کرنے والے کے ساتھ برائی کرنا اس کو زندگی دینا ہے ۔ اور برائی کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا یا کم از کم نظر انداز کر دینا اس کو خود اسی کے ہاتھوں ہلاک کرنا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کی اس سے بڑی کوئی اور سزا نہیں ہو سکتی کہ خود اس کی ضمیر کی عدالت سے اس کے خلاف فیصلہ دلایا جائے ، اور برائی کے جواب میں اچھائی کرنا کسی کو اسی قسم کی سزا دینا ہے ۔

اگر آپ کو غصہ اتارنا ہے تو برائی کرنے والے کے ساتھ برائی کیجئے ۔ اور اگر آپ برائی کرنے والے کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس کی برائی کے جواب میں اس کے ساتھ اچھائی کیجئے ۔ ایسے آدمی کی اس سے زیادہ سخت سزا اور کوئی نہیں ۔

سو برس

سو سال کا سفر کبھی اس طرح طے نہیں ہوتا کہ ہم اپنے کاغذی کیلنڈر میں سو سال آگے کا ہندسہ لکھ لیں —— جو لوگ حقیقت کے اعتبار سے پیچھے ہوں وہ بڑے بڑے لفظ بول کر آگے نہیں ہو سکتے۔ آگے ہونے کے لئے حقائق کو اپنے مطابق کرنا پڑے گا۔

زمین سورج کے گرد اپنے لمبے مدار پر ایک سو بار گھومتی ہے تب اس کی سو سالہ تاریخ پوری ہوتی ہے۔ یہی انسان کا معاملہ بھی ہے۔ انسان کو بھی اگر کسی دور کی منزل تک پہنچنا ہے تو اس کو لمبی مدت تک اس کی طرف سفر کرنا ہوگا، اس کے بعد ہی وہ اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

ایک شخص سماج کے اندر اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو پہلے ضروری جدوجہد کر کے اس کے تمام اسباب جمع کرنے ہوں گے، اس کے بعد ہی اس کو واقعی معنوں میں اونچا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک قوم کو ترقی یافتہ قوم بنانا ہے تو پہلے اس کو تیاری کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا۔ ضروری تیاری کے مرحلوں کو پورا کئے بغیر وہ ایک ترقی یافتہ قوم نہیں بن سکتی۔

ترقی اور کامیابی ہمیشہ کسی تیاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پہلے تیاری کی جاتی ہے، اس کے بعد اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ تیاری کے بغیر اس کا نتیجہ پا لیں تو موجودہ دنیا میں یہ بالکل ناممکن ہے۔ آپ نتیجہ سے اپنی زندگی کا سفر شروع نہیں کر سکتے۔ زندگی کا سفر جب بھی شروع ہوگا تو وہ تیاری سے شروع ہوگا، ورنہ کبھی شروع ہی نہ ہوگا۔

لوگ کسی کی ترقی کو دیکھ کر حسد کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تیاری کو حذف کر کے نتیجہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح جب انھیں نتیجہ نہیں ملتا تو وہ دوسرے شخص سے جلن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ دوسرے شخص کی طرح ضروری تیاری کرتے تو یقیناً وہ بھی اسی نتیجہ کو پا لیتے جس کو دوسرے شخص نے پایا ہے۔

اگر آپ سو سال کا سفر طے کرنا چاہتے ہیں تب بھی آپ کو ایک ایک دن کی رفتار سے آگے بڑھنا ہوگا۔ کاغذ کے اوپر آپ کوئی بھی اپنا دل پسند لفظ لکھ سکتے ہیں۔ مگر حقیقت کی دنیا کو اپنی پسند کے مطابق بنانے کے لئے حقیقی جدوجہد کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔

۱۵ الرسالہ اگست ۱۹۹۳

مستقبل کا مسئلہ

قل لا املك لنفسي نفعا وضرا الا ما شاء الله ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسني السوء (الاعراف ۱۸۸)

اے پیغمبر کہہ دو کہ میں اپنے لیے نہ نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

اس آیت کا ایک ابتدائی مفہوم ہے جو اس کے سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت میں ایک کلی اصول بھی بتا دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں فائدہ اور نقصان کا تعلق تمام تر مستقبل بینی سے ہے۔ جو آدمی حال میں مستقبل کو دیکھے، جو آج میں کل کو پالے وہی آدمی یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ اس کے برعکس جو شخص مستقبل بینی کے اس امتحان میں پورا نہ اترے وہ یہاں کوئی بڑی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

غور کیجئے تو یہ کلیہ تمام امور کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تجارت کا معاملہ ہو یا سیاست کا، علمی ترقی کا میدان ہو یا کسی اور میدان میں آگے بڑھنے کا، ہر جگہ مستقبل کی رعایت کرنے والا فائدہ اٹھاتا ہے، اور جو شخص مستقبل کی رعایت نہ کر سکے وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ موجودہ دنیا میں تمام نقصانات آدمی کی اسی کوتاہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

کوئی آدمی مستقبل (یا غیب) کو نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی بار بار نقصان اٹھاتا ہے۔ آدمی کو یہ تجربہ اس لیے کرایا جاتا ہے کہ آدمی آخرت کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔ آدمی جب ایک نقصان سے دوچار ہو تو وہ مستقبل کی اہمیت کو سمجھے۔ وہ سوچے کہ زندگی کی کامیابی کا راز "مستقبل" کی رعایت میں چھپا ہوا ہے، اس دنیا میں بھی اور بعد کو آنے والی دنیا میں بھی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا یہ نظام اس لیے بنایا ہے تاکہ آخرت کے بارہ میں آدمی کے احساس کو جگایا جائے۔ تاکہ آدمی مستقبل کی رعایت کے بارہ میں نہایت حساس ہو جائے۔ یہ عقیدہ آدمی کو حقیقت پسندانہ زندگی گزارنے کا سبق دیتا ہے۔

۱۶ الرسالہ اگست ۱۹۹۳

حکمت دین

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ۔

اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ آیت قرآن میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو جگہ آئی ہے (البقرہ ۱۲۹، آل عمران ۱۶۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آپ کی امت کو جو ہدایت ملی، اس کے خاص اجزاء چار تھے ——— تلاوت آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔

تلاوتِ آیات سے مراد نازل شدہ قرآن کو پڑھ کر سنانا ہے۔ اپنی زندگی میں آپ نے اس کو براہ راست پڑھ کر سنایا۔ اب مطبوعہ مصحف کی صورت میں آپ اس کو بالواسطہ طور پر ہمیں سنا رہے ہیں۔ تزکیہ سے مراد تطہیر قلب ہے۔ آپ کی یہ فیض رسانی اب جمع شدہ احادیث کی صورت میں ہم کو پہنچ رہی ہے۔ تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تفہیم ہے۔ آپ کا یہ کار رسالت ہم کو قرآنی روایات کے ذریعہ مل رہا ہے۔

آپ کے پیغمبرانہ کام کا ایک جزء تعلیم حکمت ہے۔ اس سے مراد آدمی کو وہ طرز فکر یا وہ نقطۂ نظر دینا ہے جس کی روشنی میں وہ موجودہ دنیا میں اپنے خدا پرستانہ رویہ کو متعین کر سکے:

(الحکمۃ) المعرفۃ بالدین والفقہ فی التاویل والفہم الذی ہو سجیۃ ونور من اللہ تعالی قالہ مالک ۔۔۔ ویعلّم طریق النظر بما یلقیہ اللہ الیہ من وحیہ (تفسیر القرطبی ۲/۱۳۱)

حکمت سے مراد دین کی معرفت اور تاویل احکام کی سمجھ ہے اور وہ فہم جو اس کی طبیعت ہے اور اللہ کی طرف سے روشنی ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ اور یہ کہ پیغمبر وہ طرز نظر سکھاتا ہے جو اللہ اس کو بذریعہ وحی بتاتا ہے۔

حکمت سے مراد دینی روح پر مبنی طرز فکر ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح سوچ ہے جو ہر معاملہ میں آدمی کو غیر دینی رخ سے ہٹا کر دینی رخ کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کو ایک لفظ میں دینی بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں

ذہنی بُعد

وإذا قرأت القرآن جعلنا بينك
وبين الذين لا يؤمنون بالآخرة
حجابا مستورا ۔ وجعلنا على قلوبهم
أكنة أن يفقهوه وفي آذانهم وقرا
وإذا ذكرت ربك في القرآن وحده
ولوا على أدبارهم نفورا
(الاسراء ۴۵ - ۴۶)

اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت کو نہیں مانتے۔ اور ہم ان کے دلوں پر پردہ رکھ دیتے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں۔ اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

اس آیت میں حجاب مستور سے مراد دراصل وہی چیز ہے جس کو ذہنی بُعد (intellectual gap) کہا جاتا ہے۔ یعنی متکلم اور سامع کے درمیان سوچنے کے انداز میں فرق ہونا۔ جب بھی دونوں کے درمیان اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں یہی ہوگا کہ ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

مذکورہ آیت میں دو ذہنی فرق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک آخرت اور دوسرے توحید۔ جن لوگوں کی سوچ آخرت والی سوچ نہ ہو۔ جو دنیا کے مسائل کو اہمیت دیتے ہوں۔ جو دنیا کے عزت و وقار کی اصطلاحوں میں سوچتے ہوں۔ جن کا ذہن صبح و شام دنیا کے مفاد میں گھومتا ہو۔ جو صرف دنیوی خبروں کو جانتے ہوں اور آخرت کی خبروں سے بے خبر ہوں۔ ایسے لوگ دنیوی اہمیت کی باتوں کو فوراً سمجھ لیں گے۔ لیکن جب ان سے وہ باتیں کہی جائیں جو آخرت کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہوں تو وہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

اسی طرح جو لوگ شخصیتوں میں اٹکے ہوئے ہوں۔ جو انسانی اکابر کی عظمتوں میں گم ہوں اور جنھیں خدائے ذوالجلال کی عظمتوں سے واقفیت نہ ہو، ان کے سامنے جب ایسی بات لائی جائے جو خدا کی عظمت کے اعتراف پر مبنی ہو، جو خدا کی بڑائی میں جینے کی دعوت دیتی ہو، تو اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی بنا پر ایسی بات میں انھیں اٹ پٹا پن محسوس ہوگا۔ وہ اس کی اہمیت کا ادراک کرنے میں عاجز ثابت ہوں گے۔

دعوت، اصلاح

قرآن میں ہے کہ یہ کتاب اس لیے اتاری گئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈرایا جائے اور وہ ایمان والوں کے لیے یاد دہانی ہو (لتنذر بہ وذکری للمومنین) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے ذریعہ حاملین قرآن کو جو کام کرنا ہے، وہ دو ہے۔ ایک، عمومی انذار۔ دوسرا، اہل ایمان کی تذکیر۔

عمومی انذار سے وہی چیز مراد ہے جس کو دوسرے مقام پر دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی غیر مسلم اقوام یا عام بندگان خدا کو خدا کے دین کا پیغام پہنچانا۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ یہاں جو شخص بھی پیدا کیا جاتا ہے، وہ آزمائش کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ موت اس آزمائش کی مدت کا خاتمہ ہے۔ اس کے بعد آخرت میں آدمی کی ابدی زندگی شروع ہوتی ہے جہاں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق سزا یا انعام دیا جائے گا۔

تمام انسانوں کو اس صورت حال کی آگاہی دینا اور انھیں جنتی اعمال اور جہنمی اعمال سے باخبر کرنا، اسی کا نام دعوت ہے۔ اس دعوت کا تعلق عام انسانوں سے ہے۔ وہ تمام لوگ جو ابھی خدا کے دین میں داخل نہیں ہوئے، ان سب پر یہ دعوتی عمل انجام دینا ضروری ہے۔

قرآن کے ذریعہ جو دوسرا کام کرنا ہے، اس کو اصلاح المسلمین کا کام بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد اولاً یہ ہے کہ مسلمانوں میں روح ایمان بیدار کی جائے۔ ان کے ایمان کو زندہ ایمان بنایا جائے۔ ان کے اندر وہ گہرا دینی شعور پیدا کیا جائے جو دینی زندگی کے لیے محرک کا کام دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کو وہ عملی تقاضے بتانا اور ان پر انھیں قائم کرنا جو مومن و مسلم ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کی اصلاح کا یہ کام "لسان عصر" میں کیا جانا ضروری ہے۔ روایتی انداز کا کام خوش عقیدہ لوگوں کی بھیڑ جمع کر سکتا ہے۔ مگر افراد میں حقیقی ایمانی انقلاب لانا "لسان عصر" کے بغیر ہرگز ممکن نہیں۔

ازسرِ نو ایمان

قرآن (البقرہ ۶۲) میں بتایا گیا ہے کہ بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، جو ایمان لایا ان میں سے اللہ پر اور روز قیامت پر اور کام کیے نیک، تو ان کے لیے ہے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غم گین ہوں گے (ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب)

اس آیت میں مسلمان (الذین آمنوا) سے کون لوگ مراد ہیں، اس کی وضاحت کے لیے تفسیر قرطبی (۱/۴۳۲) کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

قال سفیان المراد المنافقون۔ کانہ قال، الذین آمنوا فی ظاھر امرھم۔ فلذلک قرنھم بالیھود والنصاریٰ والصابئین۔ ثم بیّن حکم من آمنَ باللہ والیوم الآخر من جمیعھم۔	سفیان ثوری نے کہا کہ اس سے مراد منافق ہیں۔ گویا کہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے ظاہری معاملہ میں ایمان لانے والے بنے۔ اسی لیے ان کو یہود اور نصاریٰ اور صابئین کے ساتھ شامل کیا۔ پھر سب میں سے اس شخص کا حکم بیان فرمایا جو واقعۃً اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا۔

اس آیت میں دراصل پیغمبروں کی بعد کی امتوں کا ذکر ہے۔ یعنی وہ لوگ جو بعد کے زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں اور نسلی تعلق کی بنا پر پیغمبر کی امت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ خواہ دوسرے پیغمبروں کی امت سے اپنے کو منسوب کیے ہوئے ہوں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے تعلق رکھتے ہوں، سب کا معاملہ آخرت کے اعتبار سے ایک ہے۔ یعنی محض نسلی یا تاریخی تعلق کی بنا پر ان میں سے کوئی بھی نجات پانے والا نہیں۔ ان میں سے ہر شخص کو دوبارہ مومن باللہ بننا ہے۔ اس کو دوبارہ آخرت پر یقین لانا اور عمل صالح کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اس کے لیے جنت کے دروازے کھولے جائیں۔

مسلمان کو اپنے تقلیدی ایمان کو شعوری ایمان بنانا ہے۔ دین خداوندی کی صداقت کو اسے ازسرِ نو دریافت کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اس کو مطلوب اہل ایمان کی فہرست میں شمار کیا جائے۔

۲۰ الرسالہ اگست ۱۹۹۳

نیا دور

ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۹۲) میں صفحہ ۱۰ پر نقطۂ نظر (Viewpoint) کے کالم کے تحت مسٹر چندرابی کھنڈوری کی یادداشت چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے : (The Muslim Role)
مسٹر کھنڈوری لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے انڈیا کی آزادی کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھا تھا، انھیں یاد ہوگا کہ اس وقت وہ بٹوارہ کے المیہ پر بری طرح رو رہے تھے :

Those who watched Maulana Azad on the eve of independence remember him weeping bitterly at the tragedy of partition. (Chandra B. Khanduri)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ملک کے بٹوارہ کا کتنا زیادہ غم تھا۔ وہ یہ یقین کرنے میں حق بجانب تھے کہ بٹوارہ ملک کے لیے زہر ہے۔ اس کے نتیجہ میں آزادی ایک نئے قسم کی بربادی کے ہم معنی بن جائے گی۔

اس معاملہ میں واقعہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بات نہیں چلی۔ مسلمانوں کے درمیان مسٹر محمد علی جناح نے سب سے بڑے قائد کی حیثیت حاصل کرلی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مولانا آزاد کے نقشہ کے خلاف انڈیا دو حصوں میں بٹ گیا۔

مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ وہ یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اس نے اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کو مسلمانوں کے درمیان رہنما نمبر ایک کی حیثیت دے دی۔ ملک کے تمام مسلمان اب ان کی طرف دیکھنے لگے کہ نئے ہندستان میں وہ انھیں کوئی راہ دکھائیں۔ مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں فعال قائد بننے والے مولانا آزاد ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں ایک غیر فعال قائد بن کر رہ گئے۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو نئے حالات کے اعتبار سے کوئی واضح رہنمائی نہ دی۔ حالانکہ ملک کی تقسیم کے بعد مولانا آزاد گیارہ سال تک زندہ رہے۔ اس طرح انھیں کام کرنے کا طویل وقفہ حاصل ہوا۔

اسی سے ملتا جلتا معاملہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کا ہے۔ مولانا مدنی آزادی کے بعد دس سال تک زندہ رہے۔ مولانا سیوہاروی کو آزادی کے بعد پندرہ سال تک جینے

کا موقع ملا۔ مسلمانانِ ہند کے تحفظ کے سلسلہ میں ان لوگوں کی خدمات بلاشبہہ قابل قدر ہیں۔ مگر ان حضرات نے بھی نئے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی واضح اور مثبت رہنمائی نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

مثال کے طور پر، ۱۹۴۷ سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سب کے سب یہ کہتے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس لیے اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد اس معاملہ میں یہ سب حضرات بالکل خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ مسلمانوں میں علٰحدگی پسندی کا ذہن ختم کریں اور ان کے اندر ہندستانی قومیت کا ذہن بنائیں۔ جب کہ حالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ ضروری کام یہی تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہندستانی مسلمانوں کو سوچ کا ایک رخ مل جاتا، اور ان کے لیے ممکن ہو جاتا کہ وہ حالات سے موافقت کر کے اس ملک میں اپنی زندگی کی تعمیر کر سکیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم خیال دوسرے رہنماؤں کی اس غیر فعالیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے انڈیا میں بھی مسلمانوں کے اندر وہی سوچ جاری رہی جو ۱۹۴۷ سے پہلے کے انڈیا میں انھیں مسٹر جناح نے دی تھی۔ ۱۹۴۷ کے بعد اٹھنے والے نئے لیڈروں میں بھی کوئی اس صلاحیت کا نہ تھا کہ وہ مسٹر جناح اور ان کے ہم نوا ڈاکٹر اقبال کے فکری غلبہ کو توڑ سکے۔ چنانچہ بعد کا دور عملی طور پر پچھلی قیادت کی توسیع بن گیا جو آج تک جاری ہے۔

مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو دو قومی نظریہ سکھایا تھا۔ مسلمانوں کا پورا ذہن اس فکر کے تحت بنا تھا کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ اس فکر نے مسلمانوں کو جو طریقہ دیا وہ دوری اور ٹکراؤ کا طریقہ تھا۔ وہ احتجاج اور مطالبات پر مبنی تھا۔ وہ حقوق طلبی کی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مسائل کو نمایاں کیا جائے اور مواقع کو غیر مذکور چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد کا پورا دور اسی سابقہ فکری راستہ پر چل پڑا۔ مسٹر جناح نے چودہ پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کیے تھے۔ نئی لیڈرشپ نے بیس پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کر دیے۔ مسٹر جناح نے علٰحدہ قومیت کی بات کی تھی، نئی قیادت نے علٰحدہ تشخص کی بات شروع کر دی۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار ہندو کو بتایا تھا۔ نئے لیڈروں نے اکثریتی فرقہ

کی حکومت کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار بتانے پر اپنی ساری طاقت خرچ کر دی۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں میں زرد صحافت کو رواج دیا تھا۔ وہ مزید شدت کے ساتھ بعد کے دور میں بھی جاری رہی۔

مسٹر جناح کی غلط رہ نمائی کے نتیجہ میں مسلمانوں نے انتہائی غلط طور پر ہندوؤں کو غیر قوم سمجھ لیا تھا، ۱۹۴۷ کے بعد رہ نمائی کے خلا کی بنا پر مسلمان دوبارہ ہندوؤں کو غیر قوم ہی سمجھتے رہے۔ مسٹر جناح کی غلط رہ نمائی نے مسلمانوں کا یہ ذہن بنایا تھا کہ مشترک ہندستان ان کا وطن نہیں بن سکتا، یہی ذہن بعد کو بھی مسلمانوں میں کم وبیش باقی رہا۔ وہ اب بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے رہے کہ ہندستان ان کا اصلی وطن نہیں ہے۔ اس طرح مسلمان ذہنی طور پر خود اپنے وطن میں بے وطن بن کر رہ گئے۔

میرے نزدیک، موجودہ مسلم قیادت، بے ریش اور باریش دونوں، تقریباً بلا استثنا، مسٹر جناح کے قیادتی انداز کی توسیع ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ہر ایک بنیادی طور پر وہی بات کہہ رہا ہے جو مسٹر جناح نے اور ان کے فکری ہم نوا ڈاکٹر اقبال نے کہی تھی۔ دونوں کے درمیان الفاظ کا فرق ہو سکتا ہے، مگر ان میں حقیقت کا کوئی فرق نہیں۔

اور ہندو بھی

گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو ہندو بھی عملاً مسٹر جناح کے راستہ پر چل پڑے۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ بھی مسٹر جناح کے فکری پیرو بن گئے۔ انھوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسٹر جناح کے زیر تاثر یہ سمجھ لیا کہ انڈیا میں دو قومیں بستی ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ یہی وہ چیز ہے جو ہندو مسلم تعلقات کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔

انڈیا میں مسلمان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے آباد ہیں۔ ان کی تعداد پہلے تھوڑی تھی۔ اب بڑھتے بڑھتے تقریباً پندرہ کرور ہو چکی ہے۔ یہ مسلمان کون لوگ ہیں۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو پہلے ہندو تھے۔ بعد کو انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ گویا کہ یہ مسلمان بھی نسلی اعتبار سے اسی طرح انڈین ہیں جس طرح دوسرے ہندو انڈین ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا طور پر لکھا ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران ہندوؤں میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ صرف ہندو لوگ انڈین ہیں، مسلمان انڈین نہیں ہیں۔ ہندو عقیدہ یہ ہے کہ

سچائی ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے جب کوئی ہندو اسلام قبول کر لیتا تو وہ اپنے عقیدہ کے مطابق، یہ سمجھتے تھے کہ وہ سچائی کے ایک حلقہ سے نکل کر سچائی کے دوسرے حلقہ میں چلا گیا ہے۔ اور چونکہ نسلی اعتبار سے وہ ان کی اپنی نسل ہی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ ان کے انڈین ہونے پر بھی کوئی شک نہیں کرتے تھے (ڈسکوری آف انڈیا ۸۱-۲۸۰)

مغل دور میں بیشتر راجاؤں نے مغلوں کا ساتھ دیا۔ شیواجی نے اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کی۔ مگر اس کا تعلق کچھ بھی اس بات سے نہیں تھا کہ اورنگ زیب مسلمان ہے۔ شیواجی کو اورنگ زیب کی صرف بعض پالیسیوں سے اختلاف تھا۔ چنانچہ جے پور کے راجہ کے نام ایک خط میں شیواجی نے لکھا تھا کہ دہلی کے تخت پر اگر اورنگ زیب کے بجائے دارا شکوہ ہوتا تو وہ ہرگز اس کے خلاف لڑائی نہ لڑتے۔ وہ اس کی ماتحتی قبول کر لیتے۔

۱۹۴۰ سے انڈیا کی تاریخ میں ایک نیا دور آتا ہے جب کہ مسٹر محمد علی جناح نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومیت کا تعلق وطن سے نہیں ہے بلکہ مذہب سے ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں کا اور ہندوؤں کا مذہب الگ الگ ہے اس لیے دونوں الگ الگ قوم ہیں۔ انھوں نے اپنے اسی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر برصغیر ہند میں دو الگ الگ وطن کا مطالبہ کیا۔

مسٹر محمد علی جناح کے اس فکر کے ردعمل میں پہلی بار ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمان الگ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم ہیں۔ انتہا پسند ہندو اب مسلمانوں کی وطنی وفاداری پر شک کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان غیر ملکی ہیں۔ یہ خیال پختہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پاکستان جیسے مسلم ملک کے مقابلہ میں بریگیڈیر عثمان اور حوالدار عبد الحمید کی غیر معمولی قربانیاں بھی اس فکر کا خاتمہ نہ کر سکیں۔ مسٹر جناح کے ردعمل میں پیدا ہونے والا فکر کسی جوابی فکر سے ٹوٹ سکتا تھا۔ چونکہ ۱۹۴۷ کے بعد کوئی ایسی طاقتور فکری تحریک برپا نہیں ہوئی اس لیے یہ فکر بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہو سکا۔

انڈیا کے لوگ ہمیشہ سے یہ مانتے آرہے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ جو لوگ ایک وطن میں ہوں وہ سب ایک قوم ہیں۔ مگر مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ سے متاثر ہو کر یہاں کے ہندو یہ سمجھنے لگے کہ چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب الگ الگ ہے، اس لیے دونوں الگ الگ قوم ہیں۔

انڈیا کا ہندو مسلم مسئلہ پچاس فی صد اس لیے ہے کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد بھی یہاں کے

مسلمان مسٹر جناح کے علٰحدگی پسندی کے نظریہ سے متاثر رہے۔ اور بقیہ پچاس فی صد اس لیے ہے کہ یہاں کے ہندو بھی کم از کم عملی طور پر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ قوم وطن سے نہیں بنتی بلکہ مذہب سے بنتی ہے۔ اس لیے ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ وہ جناح کو رد کرتے ہیں، مگر وہ جناح کے نظریہ کو پوری طرح قبول کیے ہوئے ہیں۔

دورِ انقلاب

کسی فکری انقلاب کے لیے حالات کی موافقت ضروری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد وہ حالات مکمل طور پر پیدا ہو گئے ہیں جب کہ مسٹر جناح کے اس فکری تسلسل کو آخری طور پر توڑ دیا جائے۔ بابری مسجد کے نام پر مسلمانوں کے درمیان جو تحریک اٹھی، وہ مکمل طور پر جناحی پیٹرن پر اٹھنے والی تحریک تھی۔ بابری مسجد کا ڈھایا جانا بلاشبہ ایک ٹریجڈی تھی۔ لیکن اگر بابری مسجد کا انہدام مسٹر جناح کے فکری تسلسل کا انہدام بن جائے تو میں سمجھوں گا کہ اس ٹریجڈی میں بھی ایک تابناک پہلو موجود ہے۔ یہ ناموافق حادثہ اپنے اندر ایک موافق پہلو لیے ہوئے ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۹۳) میں مسٹر چندرا بی کھنڈوری کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے ایک مسلم خاتون ناہید اشرف کے ایک مطبوعہ مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے اس مضمون کو پڑھا۔ اس نے مجھ کو، میرے گھر والوں کو اور میرے دوستوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ جو چیز ہمارے دلوں میں گھس گئی، وہ مسلم خاتون کے یہ الفاظ تھے کہ اب لیڈروں کو ایک بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ کوئی بھی ہندستانی مسلمان اس ملک کو چھوڑنے والا نہیں ہے۔ بس ایک بار کافی تھا، مسلمان مہاتما گاندھی کی طرح مرجائیں گے مگر وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ خواہ ہمارا کھنڈر ہی یہاں ہماری یاد کے لیے باقی رہ جائے :

Reading 'Once Was Enough' by Naheed Ashraf moved me, my children and my friends. What penetrated our hearts were the words: 'Now let the leaders keep one thing in mind that no Indian Muslim is going to leave this country. Once was enough...they will rather die like Gandhi...let the ruins keep reminding us...' Naheed shows the greatness of our Muslim community.(p.10)

جاپان میں دوسری عالمی جنگ کے بعد عمل معکوس (reverse course) کے نام سے ایک

تحریک اٹھی۔ اس کا مقصد جاپانیوں کے قبل از جنگ ذہن کو بدل کر ان میں نیا تعمیری ذہن پیدا کرنا تھا۔ آج ہمیں بھی اسی قسم کے ایک عمل معکوس کی ضرورت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ عمل معکوس اب انڈیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے اندر شروع ہو چکا ہے۔

اب ہمیں ایک طرف ہندستانی مسلمانوں کو بتانا ہے کہ تم اور ہندو دو قوم نہیں ہو بلکہ ایک قوم ہو۔ ہمیں ان کے اندر نفرت کے بجائے محبت کی ہوائیں چلانا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کو بتانا ہے کہ تم کو ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں ان کے اندر یہ شعور ابھارنا ہے کہ نئے انڈیا میں ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی دوسرے کا۔ البتہ یہ حصہ ان کو میرٹ کی بنیاد پر ملے گا نہ کہ رزرویشن اور مطالبہ کی بنیاد پر۔ ہمیں مسلمانوں میں نئی تعمیری صحافت کو وجود میں لانا ہے، ایسی صحافت جو منصفانہ واقعہ نگاری پر مبنی ہو، جو مسائل سے زیادہ مواقع کو نمایاں کرنے میں دلچسپی رکھتی ہو۔

اسی قسم کی تحریک ہندوؤں کے درمیان چلنا بھی ضروری ہے۔ ہندو بھائیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ جناحی طرز فکر کو چھوڑ دیں، اور اپنے ماضی والے فکر کو دوبارہ اختیار کر لیں۔ وہ جناح کے مذہب کے بجائے خود اپنی روایات والے اس مذہب پر آجائیں جس کا اہم ترین پہلو تعدد میں وحدت کو دیکھنا ہے۔ مسٹر چندرا بی کھنڈوری نے اپنا مذکورہ مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے مشترک کلچر کے مطابق اپنی روایتی عقلیت اور رواداری کی طرف لوٹ آئیں :

In consonance with our composite culture, we need, therefore, to return to our traditional rationality and tolerance.

یہ الفاظ کسی ایک شخص کے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ کروروں ہندوؤں کے دل کی ترجمانی ہیں۔ اس کا ایک اظہار وہ ہے جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کے بعد بار بار پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔

یہی بھارت کا ضمیر ہے۔ بھارت کا ضمیر جو ۶ دسمبر سے پہلے عارضی طور پر سو گیا تھا، اب وہ پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھا ہے۔ اور ضمیر جب جاگ اٹھے تو وہ اپنی تکمیل سے پہلے دوبارہ کبھی نہیں سوتا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ ضمیر کی آواز ہر دوسری آواز پر غالب آتی ہے۔ اور انڈیا کا معاملہ بلاشبہہ فطرت کے اس عالمی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ انڈیا میں اب نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے، فی الحال یہ آغاز زیادہ تر ایک تاریخی عمل (historical process) کی صورت میں ہے۔ مگر دھیرے دھیرے انشاء اللہ وہ شعور کا درجہ اختیار کرے گا۔ اور جب وہ شعور کے درجہ میں پہنچے گا تو اس کا عمل بھی زیادہ تیز اور موثر ہو جائے گا۔ اس واقعہ کو بہر حال ظہور میں آنا ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ضروری مدت کے سوا کوئی بھی دوسری چیز حائل نہیں۔

انسانی زندگی میں جب بھی کوئی نیا دور آتا ہے تو وہ ہمیشہ اس طرح آتا ہے کہ اس میں پچاس فی صد حصہ تاریخی عوامل ادا کرتے ہیں، اور بقیہ پچاس فی صد حصہ خود اس انسانی گروہ کو ادا کرنا ہوتا ہے جس کے درمیان وہ انقلاب آرہا ہو۔

آج ہم اسی امتحانی دور میں ہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ابھرنے والے تاریخی عوامل کو پہچانیں اور پھر حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انھیں اپنے حق میں استعمال کریں۔ اگر ہم نے اپنے حصہ کا یہ ۵۰ فی صد کام درست طور پر انجام دے دیا تو اس کے بعد مطلوبہ نئے دور کا آنا اتنا ہی یقینی ہو جائے گا جتنا گردش زمین کے قانون کے تحت تاریک شام کے بعد روشن صبح کا نمودار ہونا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اس وقت ہم مکی دور میں ہیں اور ہم مکی دور میں اترنے والے احکام کے مخاطب ہیں۔ آپ کس بنیاد پر ایسا کہتے ہیں جب کہ اب مکمل قرآن اتر چکا ہے اور وہ آج مکمل صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات قرآن کے اصول تکلیف (لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا) سے نکلتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان یا کسی جماعت کے اوپر قرآن کے احکام کا انطباق باعتبار وسع ہے نہ کہ باعتبار تنزیل۔ حج اور زکوٰۃ کے احکام اتر چکے ہیں۔ مگر ان احکام کی فرضیت صرف ان افراد کے اوپر ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔ یہی معاملہ تمام احکام کا ہے۔ آدمی جس حکم کی تعمیل کی استطاعت رکھتا ہو اس کا وہ مکلف بن جائے گا۔ اور جس حکم کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اس کا وہ مکلف نہیں بنے گا۔

۶ نومبر کو مغرب اور عشار کی نماز کے بعد پونہ کی مکہ مسجد میں عمومی خطاب ہوا۔ موضوع رکھا گیا تھا: حالات حاضرہ اور مسلمان۔ میں نے کہا کہ اس عنوان کا میرے نزدیک دو پہلو ہے۔ ایک، مشکلات حاضرہ اور مسلمان۔ اور دوسرا، امکانات حاضرہ اور مسلمان۔ اس کے بعد تفصیل سے میں نے بتایا کہ بلاشبہ ہمارے لئے کچھ مشکلات ہیں۔ مگر اس قسم کی مشکلات ہر سماج میں اور ہر ملک میں ہمیشہ رہتی ہیں۔ مزید مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ امکانات کی مقدار مشکلات کی مقدار سے ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور آج بھی بہت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ امام صاحب نے نماز پڑھانے پر اصرار کیا۔ مگر میں نے نماز نہیں پڑھائی۔ بلکہ امام صاحب کو پکڑ کر انھیں آگے کر دیا۔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے پیچھے نماز ادا کی۔

میرے ساتھ ایسا بار بار پیش آتا ہے۔ جب بھی میں کہیں جاتا ہوں تو جس مسجد میں نماز کے لئے داخل ہوتا ہوں اس کے امام صاحب نماز پڑھانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ درست نہیں۔ زیادہ درست طریقہ یہ ہے کہ مقامی امام ہی نماز پڑھائے۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد میں کتاب الصلاۃ کے تحت امامۃ الزائر کا ایک مستقل باب ہے۔ ابو عطیہ تابعی کہتے ہیں کہ مالک بن حویرث ہماری مسجد میں آئے۔ جب نماز کھڑی ہوئی تو ہم نے ان سے کہا کہ آگے آئیے اور نماز پڑھائیے۔ انھوں نے کہا کہ تم اپنے میں سے کسی شخص کو کھڑا کرو اور وہ نماز پڑھائے۔ پھر میں تم کو بتاؤں گا کہ میں کیوں ایسا کرتا ہوں۔ اس کے بعد

انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی قوم میں جائے تو وہ ان کی امامت نہ کرے بلکہ خود ان میں کا کوئی شخص ان کی امامت کرے (مَنْ زار قوماً فلا يؤمّهم وليؤمّهم رجل منهم) حدیث نمبر ۵۹۶

انڈیا میں پارسیوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ان میں سے زیادہ بڑی تعداد بمبئی میں ہے۔ اس کے بعد ان کی زیادہ تعداد پونہ میں ہے۔ پارسیوں کا اصول ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے اپنے بچوں کے اندر خود اعتمادی کا مزاج پیدا کرتے ہیں۔

ایک پارسی نے اپنے چھوٹے بچہ کو گھر کے چبوترے پر کھڑا کیا۔ خود چبوترہ کے نیچے کسی قدر فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ہاتھ بڑھا کر بچہ سے کہا بیٹے میری گود میں آجاؤ۔ بچہ بڑھتا مگر نیچے گرنے کے ڈر سے چبوترہ پر ٹھہر جاتا۔ اسی طرح کئی بار کرنے کے بعد باپ اور قریب آگیا اور بچہ کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بچہ اپنے باپ کو قریب دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ مگر جیسے ہی بچہ آگے بڑھا، باپ پیچھے ہٹ گیا۔ بچہ چبوترہ کے نیچے منھ کے بل گر گیا۔ اب باپ نے جلدی سے اس کو اٹھالیا اور کہا: بیٹے دیکھو باپ پر بھی بھروسہ نہ کرنا۔

پونہ میں بمبئی کے ہفتہ وار السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (۲ - ۸ نومبر ۱۹۹۱) کا شمارہ دیکھا۔ اس کے آخری صفحہ پر آشا کرشنا کمار کا مضمون نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں فرقہ پرست ہندوؤں کی ایک بات کا جواب تھا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی آبادی ہندستان میں تیزی سے بڑھ رہی ہے اور مستقبل میں ان کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہو جائے گی۔ مضمون میں اس فرضی پروپگنڈے کا نہایت طاقت ور جواب دیا گیا تھا۔ ایڈیٹر نے مضمون کے آغاز میں اس کے بارہ میں یہ الفاظ لکھے تھے:

> That the minority Muslim community is reproducing at a faster rate as compared to the Hindus and would thus outnumber them, was one of the mainstays of the BJP's communal politics. This simplistic statement is one more example of the Party's brand of Hindutva, based on deliberate distortion and vicious misinterpretation of facts, argues Asha Krishnakumar in an in-depth analysis.

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا پڑھا لکھا طبقہ اپنے سائنٹفک مزاج کی بنا پر مسلمانوں کا زبردست حامی ہے۔ مگر مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔

وہ جلسہ جلوس کی سیاست کے ذریعہ ہندو عوام کو بھڑکاتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کا معاملہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھ سے نکل کر ہندوؤں کے جاہل طبقہ کے پاس چلا جاتا ہے اور جاہل طبقہ خواہ وہ ہندوؤں کا ہو یا غیر ہندوؤں کا وہ عقلی بنیاد پر سوچ کر اپنا طرز عمل متعین نہیں کرتا بلکہ اندھے جذبات کے تحت اپنا طرز عمل متعین کرتا ہے۔ یہی وہ غلط سیاست ہے جس کا برا انجام اس وقت مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مولانا سید نور ابراہیم (۲۸ سال) پونہ کی ایک مسجد میں امام ہیں۔ ۱۹۸۷ میں یہ واقعہ ہوا کہ انھوں نے ایک مطبوعہ اردو اعلان مسجد میں پڑھ کر سنایا۔ اس اعلان میں "آرگنائزیشن" کا لفظ تھا وہ اس کا صحیح تلفظ نہ کر سکے۔

اس کے بعد انھیں احساس ہوا کہ میں نے مدرسہ سے عالم کی فراغت حاصل کرلی مگر انگریزی سے میں اتنا زیادہ بے بہرہ ہوں کہ انگریزی کا ایک لفظ جو اردو خط میں چھپا ہوا ہے اس کو میں پڑھ نہیں سکتا۔ یہ سوچ کر ان کے اندر غیرت آئی۔ بازار سے انھوں نے انگریزی کتابیں حاصل کیں اور بطور خود انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ اب ذاتی کوشش سے انھوں نے اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ وہ الرسالہ انگریزی پورا کا پورا سمجھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ وہ ہر مہینہ باقاعدہ طور پر انگریزی الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

ناپسندیدہ واقعہ سے اگر منفی اثر لیا جائے تو وہ تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اور اگر ناپسندیدہ واقعہ سے مثبت اثر لیا جائے تو وہ آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔

پچھلے ماہ میں تقریباً دو ہفتہ کے لئے لاہور میں تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ تقریباً ہر مسلمان کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام مسٹر محمد علی جناح کا کارنامہ ہے۔ پاکستانی دانشوروں کے نزدیک ہندو لیڈرشپ کسی طرح پاکستان بننے دینا نہیں چاہتی تھی۔ یہ مسٹر جناح کی عظیم قیادت تھی کہ انھوں نے ہندو لیڈروں کو پاکستان کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

مگر ہندستان کے مسلم دانشوروں کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کو مسلمانوں نے نہیں بنوایا بلکہ ہندوؤں نے بنوایا۔ بمبئی کے زمانۂ قیام میں یہاں کے ایک اخبار (انقلاب ۹ نومبر ۱۹۹۱) نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا ــــــ مشہور ماہر قانون ایچ ایم سیروائی نیز دیگر محققین نے اپنی متعدد تصانیف میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی وجہ سے

رحقیقت جن سنگھی ذہنیت اور انگریزوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔"

بمبئی کے اردو اخبار کے مذکورہ اداریہ کا عنوان تھا : "مسلمان کیا کریں" اس کو دکھاتے ہوئے ب سے میں نے کہا کہ جو مسلم دانشور پچاس برس میں یہ بھی طے نہ کر سکے کہ پاکستان کس نے مسلمان کیا کریں" کے بارہ میں قوم کو کیسے کوئی درست رہنمائی دے سکتے ہیں۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۳ نومبر ۱۹۹۱) میں ایک جرنلسٹ راج دیپ سارڈیسائی کے قلم سے پ مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــ طاقتور تلوار، اس سے بھی زیادہ طاقتور قلم :

Mighty sword, mightier pen.

س مضمون میں بتایا گیا تھا کہ شیوسینا نے ایک عرصہ تک تلوار (تشدد) کے وسیلہ پر اعتماد کیا۔ مگر یہ س سکے لئے زیادہ مفید نہ ہو سکا۔ چنانچہ اب خود شیوسینا کے اپنے اخبار مارمِک نے لکھا ہے یس کی طاقت کو استعمال کرنا چاہئے۔ شیوسینا کے آرگن نے اردو شاعر کے شعر کو کسی قدر فرق نقل کیا ہے کہ کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو، گر توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو :

Do not remove a sword, When even a cannon becomes useless, bring a newspaper. (p.13)

ا نومبر کو ۱۰ بجے بمبئی میں ایک خطاب کا پروگرام تھا۔ اس کا انتظام پاٹکر ہال میں کیا گیا اور اس کا " محمدؐ ــــ پیغمبر انقلاب۔ اس موضوع پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک داب کا پروگرام تھا۔ حاضرین میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود تھے۔

ج کا دن کسی سنجیدہ اجتماع کے لئے بہت غیر موزوں تھا۔ کیوں کہ آج اتوار تھا اور آج ہی ع تھا اور جب اس قسم کا میچ ہو تو تمام لوگ ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مگر وسیع طرح بھرا ہوا تھا۔ جناب ہارون رشید (چیف اڈیٹر بلٹنر) نے کہا کہ یہ منظر دیکھ کر مجھے تعجب ہو رہی ہے۔ اس پروگرام کی پروفیشنل انداز میں معیاری ویڈیو ریکارڈنگ کرائی گئی۔ اس کا سلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (بمبئی) کے پاس موجود ہے۔

ا نومبر کی سہ پہر کو پالی کی مسجد میں نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً آدھ ب تقریر ہوئی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے جو حالات ہیں وہ بہت امید

افزا ہیں۔ اس میں ہمارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ اس کو میں نے قرآن و حدیث سے اور تاریخ کی مثالوں سے واضح کیا۔

۷ نومبر کی صبح کو میں بمبئی میں تھا۔ یہاں ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب کے مکان پر قیام رہا۔ ان کے مکان کے قریب جیسمین اپارٹ منٹس کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ یہاں فجر کی نماز کے بعد مختصر طور پر نماز سے متعلق ایک حدیث کی تشریح بیان کی۔ مولانا ممتاز احمد قاسمی اس مسجد کے امام ہیں۔

۸ نومبر کو صبح ۱۱ بجے آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے میری ایک ٹاک کو ریکارڈ کیا۔ یہ ٹاک چند دن کے بعد براڈکاسٹ کی جائے گی۔ اس کا عنوان تھا ـــــ قومی یک جہتی کا مسئلہ۔ یہ تقریر انشاء اللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ بمبئی میں باندرہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ پہلے سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ نماز جمعہ کے بعد مسجد میں عبادت کے موضوع پر میری تقریر ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ نماز جمعہ کے بعد یہاں بہت کم لوگ ٹھہریں گے۔ مگر اتنے زیادہ آدمی ٹھہرے کہ وسیع مسجد بالکل بھری ہوئی تھی۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تک نماز کی روشنی میں اسلامی عبادت کی تشریح کی۔

انگریزی روزنامہ فری پریس جرنل نے ٹیلی فون کیا تھا کہ وہ مجھ سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ مقررہ وقت کے مطابق ان کی خاتون نمائندہ مسز سیرہ نے میری رہائش گاہ پر مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے مسلمانوں سے متعلق تھا۔ کچھ سوالات اسلام کے بارہ میں بھی تھے۔ یہ انٹرویو ۸ نومبر کو نماز عصر کے بعد ریکارڈ کیا گیا۔

۸ نومبر کو نماز مغرب کے بعد قارئین الرسالہ کا اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ایک ہال میں تھا۔ پہلے قارئین الرسالہ کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے الرسالہ مشن کی وضاحت پر ایک مفصل تقریر کی۔

۸ نومبر کی رات کو ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ احمد اظہار اور ہندستان ڈیلی کے نمائندہ عبدالرحمٰن صدیقی نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں دو قسم کے سوالات کئے گئے۔ الرسالہ مشن اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل۔ الرسالہ مشن کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس کا مشن لوگوں کو باشعور بنانا ہے۔ مسائل کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کہا کہ

مسئلہ اس صورت حال کا نام ہے جس کا حل بروقت موجود نہ ہو۔ مسلمانوں کے مسائل کا حل چوں کہ موجود ہے، اس لیے میں ان کو مسئلہ نہیں سمجھتا۔ مثلاً فساد کے مسئلہ کا یقینی حل اعراض ہے۔ سروس کے مسئلہ کا یقینی حل محنت ہے۔ معاشی پسماندگی دور کرنے کا یقینی حل صنعت و تجارت میں آگے بڑھنا ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ ظالم حکمرانوں کے خلاف چیلنج کے نام پر بے معنی سیاسی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں اور اس کو حسینی نمونہ کی پیروی کہتے ہیں۔ یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ تاریخ سازی ہے۔ کیوں کہ تاریخی شواہد کے مطابق حضرت حسین کے اقدام کی یہ نوعیت ثابت ہی نہیں ہوتی۔

حضرت حسین مکہ سے اس لئے نکلے ہی نہیں تھے کہ وہ یزید کو چیلنج کریں اور یزید کی فوجوں سے لڑیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مکہ سے دمشق جاتے۔ وہ اپنے خاندان کو لے کر، نہ کہ فوج کو لیکر، اس خبر کی بنیاد پر نکلے تھے کہ کوفہ کے لوگوں نے عمومی طور پر آپ کے حق میں بیعت کرلی ہے۔ جب وہ کوفہ کے قریب پہنچے اور معلوم ہوا کہ خبر صحیح نہ تھی۔ نیز یہ کہ کوفہ کے جن لوگوں نے بالواسطہ طور پر آپ کے لئے بیعت کی تھی، وہ سب کے سب اپنی بیعت سے پھر گئے ہیں تو آپ نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ کسی بھی تاریخی ریکارڈ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ یزید کے لشکر سے لڑنا چاہتے تھے۔ مگر یزید کو اس کی خبر نہ ہوسکی اور کوفہ کے مقامی حاکم نے حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کو گھیر کر انھیں لڑنے پر مجبور کردیا، اس لئے کربلا کی لڑائی پیش آئی۔ گویا کربلا کی جنگ مجبورانہ دفاع کے لئے تھی نہ کہ ظالموں کے خلاف جنگی اقدام کے لئے۔

موجودہ زمانہ میں جو "نظریہ جہاد" حضرت حسین کے واقعہ سے نکالا جارہا ہے وہ یقینی طور پر ایک خودساختہ نظریہ ہے، اس کا حضرت حسین کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۹ نومبر کو فجر کی نماز کے بعد مسجد میں درس حدیث کا پروگرام تھا۔ تین حدیثوں کی روشنی میں دین کی حقیقت کو واضح کیا۔ میں نے بتایا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان ربانی انسان بن جائے۔ ربانی انسان وہ ہے جس کو عظمت خداوندی کے احساس نے عجز و فروتنی کے درجہ پر پہنچا دیا ہو۔ جس کا ایمان اس سے سرکشی کا احساس چھین لے۔ جس کا حال یہ ہو کہ معاملہ کی وضاحت کے بعد کوئی چیز اس کے لئے اعتراف حق میں رکاوٹ نہ بنے۔

۹ نومبر کو ۱۰ بجے جامعۃ البنات میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کا پروگرام تھا۔ کسی قدر

تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اسلام میں کس طرح عورت کو عزت کا مقام دیا گیا ہے۔ البتہ عملی تقاضے کی بنا پر اسلام میں عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن میں کچھ وقت گزارا۔ کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے یہ ادارہ قائم کیا ہے۔ اور اس کو اعلیٰ معیار پر چلا رہے ہیں۔ انگریزی ماہنامہ آئی لینڈ (Island) کے شمارہ اگست ۱۹۹۱ میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں اس ادارہ کا تعارف کراتے ہوئے جو سرخی قائم کی گئی تھی وہ اس کا بہترین تعارف ہے۔ اس کا عنوان تھا ــــــ پرانے خیالات، نئے طریقے:

Old ideas, new techniques.

اس ادارہ کے پیچھے سب سے زیادہ ڈاکٹر ذاکر نائک اور ڈاکٹر محمد نائک کا ذہن کام کر رہا ہے۔

۹ نومبر کی سہ پہر کو فیمینا (Famina) کی خاتون نمائندہ مسز شالینی پردھان نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر مسلم خواتین کے رول کے بارہ میں تھے۔

۹ نومبر کو نماز مغرب کے بعد انڈین مرچنٹس چیمبر میں تقریر ہوئی۔ موضوع تھا: اسلام داعیٔ امن۔ تقریباً سوا گھنٹہ کی تقریر کے بعد سوال و جواب ہوا۔ اس اجتماع میں بمبئی کے اعلیٰ اذہان شریک ہوئے۔ ہال کی تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

تقریر کے بعد سوال و جواب کا وقفہ ہوا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ اعراض کی تلقین کرتے ہیں۔ پھر اعراض کب تک۔ میں نے کہا کہ اعراض اس وقت تک جب کہ اعراض کرنے کا امکان ہی سرے سے ختم ہو جائے۔

۹ نومبر کو عشاء کی نماز کے بعد سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر جاوید آنند سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف تعصب (Prejudice) ہے۔ اس کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو لوگ تعصب کہتے ہیں، اس کو میں چیلنج کہتا ہوں۔ اور یہ چیلنج ہمیشہ رہے گا۔ کیوں کہ زندگی میں چیلنج کا ہونا کسی انسان کا منصوبہ نہیں۔ یہ خدا کا منصوبہ ہے۔ پھر وہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ ہم چیلنج کی صورت حال کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنے لئے زندگی کی راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

۱۰ نومبر کو نماز فجر کے بعد جیسمین اپارٹمنٹس کی مسجد میں حدیث کا درس دیا۔ یہ مسجد اپنی ظاہری

صورت کے اعتبار سے مسجد نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں گنبد اور مینار جیسی چیزیں موجود نہیں ہیں۔ بمبئی میں نئے عبادتخانہ کی تعمیر کی اجازت مشکل سے ملتی ہے۔ اس بنا پر لوگوں نے ایسا کیا ہے کہ وہ مدرسہ کے نام پر ایک ہال بنا لیتے ہیں اور اس کے اندر تعلیم کے ساتھ نماز بھی ادا کرتے ہیں۔

بمبئی والوں کا یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ آدمی جس ماحول میں ہو وہاں کا ماحول اگر ایک چیز دینے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو اشو بنا کر اس کے لئے ٹکرانا نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔ آدمی کو چاہئے کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کو لے لے اور بقیہ کے لئے پرامن طور پر اپنی تعمیری کوشش جاری رکھے۔

بمبئی میں کئی پروگرام ہوئے۔ یہاں کے حلقہ الرسالہ نے تمام پروگراموں کو جس طرح آرگنائز کیا وہ یقیناً قابل تعریف تھا۔ تمام لوگوں نے ایک ٹیم کے انداز میں کام کیا۔ ڈاکٹر عبدالکریم نائک، ڈاکٹر محمد نائک، ڈاکٹر ذاکر نائک، مسٹر افضل لادی والا، ہارون بھائی ہوزری والا، مسٹر فاروق فیصل، مسٹر نسیم علی خاں، مولانا ممتاز قاسمی، مسٹر جی ایم صدیقی، مسٹر آفتاب احمد صدیقی وغیرہ اس میں شریک تھے۔ انھوں نے ہر جزء کو پیشگی طور پر منصوبہ بند انداز میں طے کیا اور اس کو حسن وخوبی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا۔ آخر میں ان لوگوں نے تمام پروگرام کا پریس ریلیز انگریزی میں تیار کیا اور اس کو بمبئی کے ۳۶ میگزین اور اخباروں کے نام روانہ کیا۔ کئی پروگراموں کے ویڈیو کیسٹ تیار کرائے، جو لوگ ویڈیو کیسٹ بہ قیمت لینا چاہیں وہ ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کریں:

Islamic Research Foundation, Masalawala Building, 2nd Floor, 56 Tandel Street North, Dongri, Bombay 400009, India. Tel. 864968

بمبئی کے پروگراموں میں مقامی اخباروں کے نمائندے بھی آتے رہے۔ مسٹر بال ٹھاکرے کے مراٹھی اخبار "سامنا" کا نمائندہ بھی شریک ہوا۔ اس طرح مسٹر بال ٹھاکرے کو میری باتوں کی رپورٹ پہنچتی رہی۔ چنانچہ بال ٹھاکرے نے سامنا کے شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ میں پورا اڈیٹوریل اسی کے بارہ میں لکھا۔ جناب فاروق فیصل صاحب نے اس اڈیٹوریل کا تراشہ اس کے اردو ترجمہ کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ اس مفصل اڈیٹوریل کا ایک حصہ یہ ہے:

"نئی دہلی، اسلامی مرکز کے فاؤنڈر، الرسالہ کے اڈیٹر مولانا وحید الدین خاں، انھوں

نے کچھ دن پہلے بمبئی میں آکر یہ کہا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے جھگڑا کرنے سے اوائڈ کرنا چاہئے۔ جھگڑے کو اوائڈ کرنے کا مطلب اپنے حق پر پانی ڈالنا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے —— آگے بڑھنے کا موقع ڈھونڈھ لو۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان لیڈر آج تک فرقہ وارانہ معاملوں پر بحث کرتے رہے لیکن اس دیش میں مسلمانوں کے لئے آگے بڑھنے کے لئے کتنے مواقع حاصل ہیں اس بارہ میں کبھی چرچا نہیں کی جاتی۔ تعلیم اور روزگار یہ اصلی مسائل آج ہماری قوم کے سامنے کھڑے ہیں لیکن ہمارے لیڈر کئی فالتو مسئلوں پر بڑی سرگرمی سے اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ ہندستان میں مسلمان صرف ایک پروٹسٹ کرنے والی اقلیت بن گئے ہیں۔ اس طرح کی ایمج کو بدل دینا چاہئے۔ دیش کی ترقی کا کام کرنے والی جماعت، یہ ایمج بنانا چاہئے۔ آج تک مسلمان مانگنے والی جماعت بنے رہے۔ اب اس سے آگے بڑھ کر دینے والی قوم کی ایمج بنانا چاہئے۔ ترقی کے ہر ایک میدان میں سب سے اچھا کام کرنے والی قوم، یہ ایمج بنانا چاہئے۔ ترقی کے ہر ایک میدان میں سب سے اچھا کام کرنے والی قوم یہ ایمج بنانا چاہئے۔ اس طرح کے خیالات مولانا وحید الدین خاں صاحب نے ظاہر کئے ہیں۔ مہاراشٹر کے مسلمان ان خیالات سے کتنا اثر لیتے ہیں اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے گا"

ہارون بھائی ہوزری والے نے ایک سبق آموز واقعہ بتایا۔ ۴ نومبر کو ایک ہندو بھائی ان کے یہاں سامان خریدنے کے لئے آئے۔ اس دوران انھوں نے اپنی ایک پریشانی کا ذکر کیا۔ ان کو بمبئی سے اندھیری جانا تھا۔ مگر بجلی میں کچھ گڑبڑ ہو جانے کی وجہ سے الکٹرک ٹرینیں رک گئی تھیں۔ ان کے پاس ایک بڑا قالین تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں قالین لے کر گھر پہنچنا ہے۔ اگر ہم ٹیکسی کریں تو وہ سو روپیہ سے زیادہ کرایہ لے گا۔

ہارون بھائی نے کہا کہ آپ قالین ہماری دکان پر رکھ دیں اور کل اس کو یہاں سے منگوا لیں۔ انھوں نے کہا کہ کل دیوالی ہے اور اس قالین کو کل تک اندھیری پہنچ جانا ہے۔ ہارون بھائی نے چاہا کہ ریلوے انکوائری میں ٹیلی فون کرکے ٹرین کی تازہ پوزیشن معلوم کریں۔ مگر بار بار ڈائل کرنے کے باوجود ٹیلی فون سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ آخر کار ہارون بھائی نے سائیکل کے ذریعہ اپنا آدمی ریلوے اسٹیشن بھیجا۔ وہ پتہ کرکے آیا کہ ٹرینیں چل رہی ہیں۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور اپنا قالین لے کر چلے گئے۔

اس دوران میں جب کہ وہ ہارون بھائی کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے، ہارون بھائی نے انگریزی الرسالہ

ا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ انھیں پڑھنے کے لئے دیا۔ اس میں ایک حدیث پڑھ کر انھوں نے کہا :

You have followed this (Hadith). It should be in practice. It should not be only in books.

فاروق فیصل صاحب (پیدائش ۱۹۵۵) نے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے رمیرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میری پیدائش سے قبل تقسیم ہند ہوئی۔ حیدرآباد پولیس ایکشن، لک کے فسادات اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر مجھے ایسا احساس ہوتا تھا کہ ہم مسلمانوں کی تباہی بربادی کی تاریخ کا آخری حصہ ہیں۔ چنانچہ ایک طرح کی مایوسی دل ودماغ پر طاری ہوگئی تھی لیکن الرسالہ ھ کر احساس ہوا کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ کی تباہی وبربادی دیکھنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ سلمانوں کی نئی تاریخ' کا باب شروع کرنے کے لئے اس دور میں پیدا کئے گئے ہیں۔ کیا اب بھی لوگ یہ ہیں گے کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے — میں سمجھتا تھا کہ میں تاریخ کا آخری حصہ ہوں لیکن الرسالہ ھ کر احساس ہونا شروع ہوا کہ میں تاریخ کا اول حصہ بننے والا ہوں۔ تاریخ میرے عمل سے بنے گی۔ یقت یہ ہے کہ الرسالہ اقدام اور حوصلہ مندی سکھاتا ہے نہ کہ بزدلی اور پسپائی۔

بمبئی سے ایک انگریزی اخبار انڈپنڈنٹ چھپنا شروع ہوا ہے۔ یہ کافی آزاد اور غیر جانب دار بار ہے اور اعلیٰ حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کا تعلق ٹائمس آف انڈیا گروپ سے ہے۔ اس ے بارہ میں اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے جناب نسیم علی خاں صاحب نے کہا: انڈپنڈنٹ مسلمانوں ے مسائل سمیت تمام ضروری باتیں غیر جانب دارانہ انداز میں شائع کرتا ہے۔ اب کسی مسلمان لیڈر کو دہ سے مسلمانوں کا انگریزی اخبار نکالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود لکھنا چاہیں تو وہ انڈپنڈنٹ ے صفحات کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرسکتے ہیں۔

بمبئی میں کئی اخبار کے نمائندوں نے انٹرویو لیا۔ ان میں اردو، مراٹھی، انگریزی اخبارات مل تھے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا بمبئی کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ انھوں نے سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" کے جواب میں ایک کتاب محمد اور قرآن یزی) لکھی۔ اس کتاب کو رشدی کی کتاب ہی کے پبلشر پنگوئن (Penguin Books) نے شائع کیا

جس کی مثالیں امریکہ، برطانیہ اور ہندستان میں ہیں۔ یہ کتاب آج پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر فروخت ہو رہی ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا کرم ہے کہ اس کتاب کا خود پنگوئن والوں پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ انھوں نے معاہدہ کے باوجود رشدی کی کتاب کا پیپر بیک اڈیشن نکالنے سے انکار کر دیا (نئی دنیا ۱۳ اپریل ۱۹۹۲)

اس سے مثبت انداز کار کی غیر معمولی اثر انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال کے مطابق سلمان رشدی کی بیہودہ کتاب کے جواب میں اسلام پر ایک صحیح تعارفی کتاب تیار کی گئی۔ اس کتاب کو "شیطانی آیات" کے پبلشر ہی نے اپنے یہاں سے شائع کیا اور پھر ہر جگہ اس کو پڑھا جانے لگا۔ مزید یہ کہ خود پبلشر پر اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شیطانی آیات کی مزید اشاعت سے باز آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مثبت طریق کار میں معجزاتی تاثیر چھپی ہوئی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

"گاڈ ارائزز" کا ترجمہ مراٹھی زبان میں ایک ہندو پروفیسر نے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں فاروق فیصل صاحب نے بتایا کہ یہ ترجمہ اب بمبئی میں جی ایم صدیقی صاحب کے پاس پہنچ چکا ہے۔ توقع ہے کہ انشاء اللہ وہ جلد ہی شائع ہو سکے گا۔

سفر سے واپسی کے بعد بمبئی سے کچھ لوگوں کے خطوط موصول ہوئے۔ جناب محمد لیسین تاڑے (Tel. 6115718) لکھتے ہیں: الحمد للہ بندہ آپ کے بمبئی کے پروگرام میں حاضر تھا۔ اور آپ کی تقریر سے بے حد متاثر ہوا۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ اور اسی طرح امت مسلمہ آپ کی کاوشوں سے بہرہ ور ہو، آمین۔

جناب محمد افضل لادی والا (کرلا) اپنے خط میں لکھتے ہیں: بمبئی میں آپ کا پروگرام الحمد للہ بے حد کامیاب رہا۔ اللہ رب العزت کے کروروں احسانات ہیں کہ سارے پروگرام حسب منشا خوب سے خوب تر رہے۔ لوگوں کے دماغ ہی نہیں روح تک کو آپ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کئی لوگ ایسے بھی آئے کہ ہم کو مولانا کا پروگرام رکھنا ہے۔ مگر وقت کی کمی کے سبب یہ ممکن نہ تھا۔ انشاء اللہ آپ کے اگلے دورہ میں اس سے بہتر پروگرام رکھیں گے۔ آئندہ آپ کو کم از کم دس روز بمبئی کے لئے دینا ہوگا۔ آپ کے ساتھ بمبئی میں سہ روزہ پروگرام کے دوران جو وقت گزرا وہ مجموعی طور پر زندگی کا بہترین وقت

گزرا ہے۔ جو روحانی کیفیت ان اجتماعات میں حاصل ہوئی اس کا بیان قلم سے ممکن نہیں۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت بیانی ہے"۔

حسب پروگرام ۱۰ نومبر کی شام کو ۱۰ بجے سدلیشور ایکسپریس کے ذریعہ بمبئی سے سولاپور کے لئے روانگی ہوئی۔ بمبئی میں مسلسل پروگرام کی وجہ سے دماغ بالکل تھک گیا تھا۔ رات کو بہت اچھی نیند آگئی۔ صبح اٹھا تو ابھی دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ یہ سفر ایک رفیق سفر کی وجہ سے بہت آسانی کے ساتھ طے ہوگیا۔ یہ ایک ریلوے افسر تھے جو پونہ سے رات کے وقت سوار ہوئے تھے اور وہ بھی سولاپور جارہے تھے:

P.K.A. Narayan, Divisional Personnel Officer, Central Railway, Solapur.

موصوف کے ساتھ دو اور ریلوے افسر تھے۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے وہ بار بار لطیفے بیان کرتے تھے۔ خود بھی ہنستے رہے اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اس قسم کے لطیفے صرف لوگوں کو ہنسانے کے لئے بیان کرتے ہیں یا اپنا ٹنشن نکالنے کے لئے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا ٹنشن نکالنے کے لئے۔

مزید گفتگو کے دوران انھوں نے کہا "مجھ کو قرآن کی ایک کاپی ہونا" میں نے سولاپور کے ایک ساتھی سے کہا کہ وہ موصوف سے ملیں اور ان کو قرآن کا انگریزی یا ہندی ترجمہ پہنچا دیں۔

موصوف نے ایک دلچسپ بات بتائی۔ آپ کوئی کاغذ لے کر اس کو فولڈ کریں۔ سات موڑ کے بعد اس کو مزید موڑنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ کاغذ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہم نے پہلے ایک چھوٹا کاغذ (لیٹرہیڈ) سے لے کر موڑنا شروع کیا۔ وہ سات موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ پھر انگریزی اخبار کا بڑا کاغذ لیا۔ وہ بھی سات موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ دوسرے ریلوے افسر مسٹر گرگ نے کہا کہ ہر چیز کی ایک تکمیلی حد (Saturating point) ہے۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد انسان آگے نہیں جاسکتا۔ کاغذ کی فولڈنگ کی ایک حد ہے۔ اسی طرح ہر چیز کی ایک حد ہے۔

سولاپور کی وجہ تسمیہ کے بارہ میں کئی رائیں ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ سولہ پور ہے۔ ابتداءً یہاں سولہ گاؤں تھے۔ ان سب کو ملاکر شہر بنایا گیا۔ اس طرح اس کا نام سولاپور ہوگیا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ ابتداءً شعلہ پور تھا۔ اس کے بعد وہ شولاپور بنا، اور پھر سولاپور ہوگیا۔

سولاپور میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عبد الواحد عبد الغفور شیخ اور زاہد علی خاں وغیرہ سے مسلسل ربط رہا۔ جناب زاہد علی خاں صاحب (پیدائش ۱۹۴۱) نے ایک موقع پر بہت بامعنی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ "حکمت بھوک میں رکھی گئی ہے اور لوگ حکمت کو شکم سیری میں ڈھونڈ رہے ہیں"۔

قدیم زمانہ میں شولاپور میں دیوگری یادو کا راج تھا۔ پھر وہ مسلم بہمنی سلطنت کا جز بنا۔ اس کے بعد اس پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۹۴۷ سے وہ تقسیم کے بعد بننے والے ملک (بھارت) کا ایک حصہ ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ایام کو ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (آل عمران ۱۴۰)

حکومتی اقتدار اس دنیا میں کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے۔ یہ خدا کی سنت ابتلاء کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی ایک گروہ کو سیاسی غلبہ دیتے ہیں اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ کسی گروہ کو سیاسی اقتدار ملے تب بھی وہ اس کے لئے امتحان ہے اور کسی گروہ سے سیاسی اقتدار چھن جائے تب بھی وہ اس کے لئے امتحان۔ آدمی کو چاہئے کہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دے۔ نہ کہ اقتدار ملنے پر احساس برتری میں مبتلا ہو اور اقتدار چھنے تو احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۱ کی صبح کو میں سولاپور پہنچا۔ یہاں میرا قیام ڈاک بنگلہ میں تھا۔ مقامی ساتھیوں سے کچھ دیر ملاقات کرنے کے بعد ہوٹل کنارہ گیا۔ وہاں پریس کانفرنس ہوئی۔ ایک درجن سے زیادہ اخبارات کے ایڈیٹر اور نامہ نگار جمع ہوگئے۔ ان میں سے ایک اردو اخبار کے اڈیٹر تھے۔ بقیہ مرہٹی اخبارات سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک مرہٹی اخبار کے نمائندہ نے کہا کہ سب سے ضروری کام مذہبی نفرت کو ختم کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جس چیز کو مذہبی منافرت کہا جاتا ہے وہ حقیقۃً قومی منافرت کا دوسرا نام ہے۔ اس کو ہم ختم نہیں کرسکتے۔ البتہ حسن تدبیر سے اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ اور وہ حسن تدبیر رواداری (tolerance) ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

ولاپور کا ایک خصوصی پروگرام روٹری کلب کے زیر انتظام ہوا۔ روٹری کلب یا روٹری انٹرنیشنل (Rotary Intern ایک سروس کلب ہے۔ اس کو ۱۹۰۵ میں شکاگو کے ایک اٹارنی یرس (Paul P. Harris) نے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بزنس اور پروفیشن لاقی معیار پیدا کیا جائے۔ اور تاجروں اور پروفیشنل لوگوں کے درمیان عالمی روابط قائم ۔ اس وقت ڈیڑھ سو ملکوں میں اس کے تقریباً سات لاکھ ممبر پائے جاتے ہیں۔ اس کا ہیڈ ریکہ کے شہر ایونسٹن (Evanston) میں ہے۔

وٹری کے موجودہ عالمی پریسیڈنٹ راجندر سابو (Rajendra K. Saboo) ہیں۔ ظریہ کے مطابق، روٹرین (Rotarian) سے ان کا کہنا ہے کہ اپنے آپ سے آگے دیکھو (Look beyond yc روٹری نیوز کے شمارہ اگست ۱۹۹۱ میں ان کا پیغام چھپا ہے۔ صہ اُن کے اِن الفاظ میں ہے —— اپنے کام کا نقشہ بناؤ اور اپنے نقشہ کو عمل میں لاؤ:

Plan your work, work your plan.

انومبر کو مجھے سولاپور کے قمر النساء ویمنس اسکول میں جانا ہوا۔ وہاں کے ایک بڑے کمرہ ے بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کی دیوار پر دنیا کا ایک بڑا نقشہ بنایا گیا تھا۔ اس میں سوویت اوپر لکھا ہوا تھا: متحدہ سوویت سوشلسٹ جمہوریت۔ میں نے کہا کہ برسوں پہلے جب یہ الفاظ تھے اس وقت وہ مطابق واقعہ تھے۔ مگر اب وہ خلاف واقعہ بن چکے ہیں۔ کیوں کہ اب سوویت ریت ڈس یونین میں تبدیل ہو چکا ہے۔

و یا یہ دیوار ابھی تک گزرے ہوئے دور میں جی رہی ہے۔ وہ زمانۂ حاضر میں داخل نہیں ہوئی۔ لم دانشوروں کا ہے۔ وہ زمانہ حاضر سے بے خبر ہیں۔ وہ صرف گزرے ہوئے ماضی کو جانتے ی کو سوچ سوچ کر اس سے اپنے لئے فخر کی غذا لیتے ہیں۔

انومبر کو ۳ بجے خواتین کا اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ویمنس کالج کے احاطہ میں ہوا۔ اپنی تقریر میں مارے یہاں پچاس سال سے سماجی لیڈر اٹھ رہے ہیں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ کیوں کہ ج تمام تر مبنی بر نظام (system-based) ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک حکومت کو توڑتے ئے میں۔ حکومت بدل جاتی ہے مگر سماج نہیں بدلتا۔

میں نے کہا کہ صحیح سوچ وہ ہے جو مبنی برفرد (individual based) ہو۔ یعنی فرد کو اصلاح یافتہ بنانا۔ یہ کام سب سے زیادہ عورتوں کے کرنے کا ہے۔ کسی قوم کی نسل سب سے پہلے عورت کی تحویل میں آتی ہے۔ اگر عورت یہ فیصلہ کرلے کہ ہمیں قوم کے افراد میں کیریکٹر پیدا کرنا ہے تو ہر گھر اصلاح افراد کا کارخانہ بن جائے۔ اس طرح کے افراد جب سماج کا مجموعہ بنیں گے تو ان کے ذریعہ پورا سماج بہتر سماج بن جائے گا۔

۱۱ نومبر کو نماز مغرب کے بعد جامع مسجد میں تقریر ہوئی۔ موضوع تھا: روشن مستقبل۔ میں نے ایک گھنٹہ کی تقریر میں بتایا کہ مسلمانوں کا مستقبل اس ملک میں دینی اعتبار سے بھی روشن ہے اور معاشی اعتبار سے بھی۔ دینی اعتبار سے اس لئے کہ اسلام غیر محرف مذہب ہونے کی بنا پر اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ اور معاشی اعتبار سے اس لئے کہ صنعتی انفجار کے بعد معاشی ذرائع اتنے زیادہ بڑھ چکے ہیں کہ اب کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی آپ کو معاشی ترقی سے روک نہیں سکتی۔

۱۱ نومبر کو عشاء کی نماز کے بعد ہوٹل پرتھم میں تقریر ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: اسلام اور سائنس۔ یہ اجتماع روٹری کلب کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی نشست ہوٹل کے خوب صورت لان میں ہوئی۔ وسیع لان مکمل طور سے بھرا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ایسا اجتماع یہاں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان سائنس میں پچھڑ گئے ہیں۔ مگر اس کا تعلق اسلام سے نہیں۔ اسلام تو جدید سائنس کا خالق ہے۔ پھر وہ اس کا مخالف کس طرح ہو سکتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں مختلف مثالوں سے اس کو واضح کیا۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کے وقفہ میں ایک صاحب نے کہا کہ سائنس میں پچھڑ جانے کے بعد کیا مسلمان ترقی کر سکیں گے۔ میں نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا: زندہ تو رہیں گے، مگر ترقی نہ کر سکیں گے۔

۱۲ نومبر کو سولاپور کی مودی مسجد میں نماز ظہر کے بعد ایک تقریر تھی۔ اس کا عنوان تھا: اسلامی دعوت کے جدید امکانات۔ میں نے سادہ انداز میں بتایا کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح دعوت کی اشاعت کے لئے موثر امکانات پیدا ہو گئے ہیں جن کو استعمال کر کے دین کو وسیع پیمانہ پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

۱۲ نومبر کی سہ پہر کو ایک سمپوزیم کا پروگرام تھا۔ اس کا اہتمام قومی ایکتا کمیٹی کی طرف سے کیا گیا تھا۔

ادمانی ہال میں کیا گیا۔ مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ۳۰ سال
ل انٹگریشن کونسل قائم ہوئی۔ مگر وہ مکمل طور پر فیل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے
ع میتھڈالوجی نہیں۔ ایکتا کا راز انیکتا کو گوارا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی ایکتا کی بنیاد
من نہیں ہے بلکہ ٹالریشن ہے۔

۱۲ نومبر کو نماز مغرب کے بعد مکہ مسجد میں تقریر ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: "داعی کی ذمہ داریاں"
سنت رسول کی روشنی میں اس کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ داعی کو مدعو کا خیر خواہ ہونا چاہئے۔
ان میں ناصح کہا گیا ہے۔ اور داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو امین سمجھے۔ وہ مدعو پر احسان کرنے والا
بلکہ وہ مدعو کی امانت ادا کرنے والا ہے۔ اسی کے ساتھ مدعو کے اندر صبر کی صفت ہونا چاہئے۔
عو کی زیادتیوں کو نظر انداز کر کے اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرسکے۔

۱۲ نومبر کو عشاء کے بعد سوشل ہائی اسکول میں تقریر ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: اسلام میں تعلیم کی
یہ تقریر زیادہ مفصل تھی۔ دور اول کی مثالوں سے میں نے بتایا کہ اسلام میں علم اور تعلیم کی
نی زیادہ ہے کہ ہر دوسری مصلحت کو نظر انداز کر کے اس کو اختیار کرنا چاہئے۔

۱۳ نومبر کی صبح کو سولاپور سے پونہ کے لئے واپسی ہوئی۔ راستہ میں عزیز الحق صاحب کا ساتھ تھا۔
میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک درزی گھرانے سے تھا۔ ان کے بڑے بھائی پونہ میں ایک مسجد
تھے۔ عزیز الحق صاحب سلائی، کٹائی کا کام سیکھنے کے بعد روزگار کی تلاش میں ۱۹۶۱ میں پونہ
ل دو مہینہ تک کام کی تلاش میں پھرتے رہے۔ مگر کام نہ ملا۔ آخر کار انھوں نے ارادہ کیا کہ اپنے
واپس چلے جائیں۔ مگر بڑے بھائی نے روکا اور کہا کہ چند دن اور کوشش کر لو۔

یک روز وہ پونہ کے بازار میں نکلے۔ ایک جگہ ایک گجراتی ہندو کی ٹیلرنگ کی بڑی دکان تھی۔
س داخل ہوئے "سیٹھ" سے کہا کہ ہم کو کام چاہئے۔ اس نے پوچھا، کیا تم سوٹ کی کٹنگ کا کام
انھوں نے کہا ہاں۔ مگر اس وقت عزیز الحق صاحب کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ سیٹھ کو یقین نہیں
بھی کٹنگ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کو لینے میں اسے تامل ہوا۔ عزیز الحق صاحب نے سیٹھ سے کہا کہ
ی الحال عارضی طور پر رکھ لیں۔ اس کے بعد آپ جس سوٹ کی کٹنگ اور سلائی کا کام مجھے دیں
ڑے کی پوری قیمت ضمانت کے طور پر میری طرف سے رکھ لیں۔ اگر میرا تیار کیا ہوا سوٹ آپ کو

اور گاہک کو پسند نہ آئے تو ضمانت کی رقم آپ کی اور سوٹ میرا۔

اگلے دن عزیز الحق صاحب پانچ سو روپیے لے کر دوبارہ مذکورہ ٹیلرنگ ہاؤس میں پہنچے اور سیٹھ کو روپیہ پیش کیا۔ مگر سیٹھ نے روپیہ نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ پیسے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم کام شروع کر دو ـــــ عزیز الحق صاحب کا پر اعتماد انداز ان کی ظاہری کمی کی تلافی بن گیا۔

محمد عمر (۲۳ سال) ہمارے ڈرائیور تھے۔ وہ سولاپور کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ چار سال سے گاڑی چلا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کبھی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ سڑک پر ایکسیڈنٹ نہ ہونے کی تدبیر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: آگے کو دیکھتے رہنا اور گاڑی پر کنٹرول رکھنا ـــــ یہی وسیع تر معنوں میں سفر حیات کی کامیابی کا راز ہے۔

۱۳ نومبر اس سفر کا آخری دن تھا۔ مغرب کی نماز نیوایرا کالونی (پونہ) کی مسجد میں پڑھی۔ یہ پونہ کی ایک کھلی ہوئی صاف ستھری کالونی ہے۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ مغرب سے پہلے حاجی یونس آدم صاحب کی رہائش گاہ پر کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ یہاں تذکیری انداز میں کچھ باتیں عرض کی گئیں۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ انڈیا میں مسلمانوں کی انتخابی سیاست کیا ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ تقریباً بیس سال سے میں یہ کہتا رہا ہوں کہ اس معاملہ میں ملکی سطح پر مسلمانوں کی کوئی واحد سیاسی پالیسی ہونا ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مقامی حالات کے اعتبار سے اپنی پالیسی بنائیں اور مقامی اعتبار سے جو نمائندہ انھیں اپنے لئے موزوں اور مفید نظر آئے اس کو ووٹ دیں۔

اس کے بعد میں نے دو حدیثوں کی روشنی میں ایک تذکیری درس دیا۔ ایک حدیث: لكل امة فتنة وفتنة امتي المال۔ دوسری حدیث: كل محدث بدعة وكل بدعة ضلالة۔

۱۴ نومبر کی شام کو واپسی ہوئی۔ پونہ سے دہلی کا سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۵۰ کے ذریعہ طے ہوا۔ ایر پورٹ پر میں جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ٹیلیفون لگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے پاس کی سیٹ سے ایک صاحب اٹھے۔ وہ چلتے ہوئے ٹیلیفون تک پہنچے۔ اس کو ڈائل کر کے اس کے اندر ایک روپیہ کا سکہ ڈالا اور پھر خاص انداز میں کھڑے ہو کر بات کرنے لگے۔ ان کی ہر حرکت سے فاتحانہ تبختر کا انداز جھلک رہا تھا۔ ان کی ہیئت بظاہر یہ کہہ رہی تھی ـــــ میری جیب میں پیسہ ہے،

میں ٹیلی فون کرسکتا ہوں۔

موجودہ زمانہ میں جو چیز سب سے زیادہ اٹھ گئی ہے وہ شکر ہے۔ صنعتی انفجار کے بعد چاہئے تھا کہ انسان ہمیشہ سے زیادہ شکر کرنے والا بن جائے، مگر اس کے بعد وہ ہمیشہ سے زیادہ ناشکری کرنے والا بن گیا۔

دوران پرواز کھانے کی سروس شروع ہوئی تو ایئر ہاسٹس نے پوچھا ـــــ ویجیٹیرین یا نان ویجیٹیرین۔ میری زبان سے نکل گیا نان ویجیٹیرین۔ جب کھانا سامنے آیا اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سالن کی پلیٹ فوراً ہٹادی اور روٹی اور کھیر کھانے پر اکتفا کیا ـــــ اختیار کے دائرہ میں بھی انسان کتنا زیادہ بے اختیار ہے۔

"تھوڑی دیر میں ہم دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔" اناونسر کی آواز کان میں آئی۔ میں نے سوچا کہ اب میں پونہ سے دور اور دہلی سے قریب ہوں۔ پھر اس حقیقت کی طرف دھیان گیا کہ اب میری عمر ۷۶ سال ہو چکی ہے۔ خیال آیا کہ میں بھی زندگی سے دور اور موت سے قریب پہنچ چکا ہوں۔ دنیا میرے پیچھے ہے اور آخرت میرے آگے۔ انسانوں کے درمیان کچھ دن گذار کر اب میں وہاں پہنچنے والا ہوں جہاں میرا سامنا رب العالمین سے ہوگا۔

دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، جس طرح تونے موجودہ منزل تک حفاظت کے ساتھ پہنچایا ہے اسی طرح اگلی منزل تک بھی حفاظت کے ساتھ پہنچا دے۔ دنیا سے آخرت تک میرے ساتھ خیریت کا معاملہ فرما۔

واپسی کے بعد شولاپور سے جناب زاہد علی خاں صاحب کا خط ملا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: شولاپور میں آپ کے پروگرام کی رپورٹ مرہٹی میں مقامی اخبارات کو دے دی ہے۔ آپ سے شولاپور میں مختصر سی ملاقات ایک حقیقی خواب کی تعبیر دے گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سنجیدہ مشن ہی پیغمبرانہ مشن کی صحیح اتباع ہے۔ اللہ اور رسول کی مرضی حاصل کرنے کی کوشش پر چاہے کتنی ہی سخت مخالفت ہو ہر مومن کو آپ کا ساتھ ثابت قدمی کے ساتھ دینا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ آپ کو الرسالہ مشن کے سفر کی اعلیٰ ترین کامیابیاں صحت کاملہ کے ساتھ نصیب کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ شولاپور کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں جن لوگوں کا تعاون حاصل ہوا ان میں حسب ذیل حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں

شری بالاصاحب جادھو ، شری موہن پسنور ، شری کے سی مڈے ، شری شانتی لال بتڈا ، شری رمیش اگروال ، وغیرہ۔

ڈاکٹر رمیش ایشور داس اگروال (سکریٹری روٹری کلب ، سولاپور) کی طرف سے ایک خط مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ موصول ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے :

We were very pleased to hear you on a rather rare subject – Islam and science. Your lecture has really clarified the doubts from the minds of the audience so for as Islamic contributions to the development of science is concerned.

دس سفر

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کا حادثہ پیش آنے کے بعد صدر اسلامی مرکز نے ہندستان کے مختلف حصوں کے سفر کیے۔ اور وسیع پیمانہ پر برادرانِ وطن سے نیز مسلمانوں سے ربط قائم کیا۔ ذمہ دار شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور کانفرنسوں کو خطاب کیا۔ ان سرگرمیوں کی روداد تیار ہو کر زیر کتابت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی ان کو دس سفر کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

اقرأ باسم ربك

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۰

۱۔ بھوپال کا کل ہند اسلامی اجتماع (اکتوبر ۱۹۹۲) کی روداد ڈاکٹر حمید اللہ ندوی اور مولانا محمد صدیق قاسمی تیار کر رہے ہیں۔ تیاری کے بعد انشاء اللہ اس کو مکمل طور پر شائع کر دیا جائے گا۔

۲۔ مولانا اکبر الدین قاسمی اپنے خط میں اطلاع دیتے ہیں: حیدر آباد میں "الرسالہ فورم" کے قیام کے بعد اس کے چار باقاعدہ اجلاس ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ کہ لوگ ان خطوط پر سرگرام ہیں۔ ۲۵ اپریل کے اجلاس میں ایک درجن ذمہ دار افراد شریک ہوئے۔ سہ نکاتی فارمولا، شہر میں گروپ میٹنگ، ماہانہ اجتماع وغیرہ کی بابت امور طے پائے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مستقل دفتر کے لیے مناسب جگہ کی تلاش کی جائے۔ اس کا آخری اجلاس ۲۵ مئی ۱۹۹۳ کو ہوا ہے:

Maulana Syed Akbaruddin Qasimi, Jamia Riazul Islam, Uppal (V), Hyderabad (A.P.) Tel. 527774

۳۔ ہندی اخبار ویر ارجن کے نمائندہ مسٹر سدانند پانڈے نے ۴ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات و جوابات کا تعلق زیادہ تر اس معاملہ سے تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ کیا ہے اور اس کو موجودہ حالات میں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ لوک سوراج اندولن کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے پٹنہ کا سفر کیا۔ ۱۱-۱۲ اپریل ۱۹۹۳ کے درمیان وہاں کئی تقریریں کیں۔ ۱۲ اپریل کی سہ پہر کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ کئی اخبارات کے نمائندوں کو تفصیلی انٹرویو دیے۔ مختلف ہندو اور مسلم شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔

۵۔ ہندستان ٹائمس کی نمائندہ کم کم چڈھا نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم پرسنل لا سے متعلق مسائل سے تھا۔ یہ انٹرویو ہندستان ٹائمس کے سنڈے اڈیشن ۲۵ اپریل ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔

۶۔ کالی کٹ سے نکلنے والے ملیالم روزنامہ مدھیامم (Madhyamam) کے نمائندہ مسٹر اے رشید الدین نے ۱۴ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ مسلم مسائل سے تھا۔

۷- اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک میٹنگ ۱۰ اپریل ۱۹۹۳ کو انڈین لا انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ہوئی۔ اس کا موضوع نیشن بلڈنگ کے سوال پر گفتگو کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز اس میں شریک ہوئے اور اپنا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ عام طور پر لوگوں نے پسند کیا۔

۸- مسٹر راجندر گپتا (گریٹر کیلاش، نئی دہلی) کی رہائش گاہ پر ۲۳ اپریل ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں تقریباً چالیس کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع بحث کامن سول کوڈ تھا۔ ان کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنی تقریر میں اسلامی نقطۂ نظر کو بیان کیا۔

۹- گاندھی اسمارک ندھی (نئی دہلی) میں ۲۰ اپریل ۱۹۹۳ کو تعلیم یافتہ افراد کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں سرودیہ سماج سے تعلق رکھنے والے افراد اکٹھا ہوئے۔ ان کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور شانتی اور کمیونل ہارمنی کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۰- ٹائمس آف انڈیا کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر عسکری ایچ زیدی نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر اجودھیا کے بعد پیش آنے والے مسلم مسائل سے تھا۔

۱۱- انگریزی ہفت روزہ (Frontline) کے نمائندہ مسٹر ایس کے پانڈے نے ۲۴ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد کے حالات و امکانات سے متعلق تھا۔

۱۲- نئی دہلی کے صحافتی ادارہ (Contemporary News & Features) کے نمائندہ مسٹر نجم الحسن نے ۲۸ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس امر سے تھا کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے احوال کیا ہیں اور ان کے مسائل کا حل کیا ہے۔

۱۳- ۳۰ اپریل ۱۹۹۳ کو نئی دہلی کی فرنچ نیوز ایجنسی (French News Agency) نے ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس بات سے تھا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد کیا مسلم عوام کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ اور یہ کہ جو بعض مسلم افراد یہ مانگ

کر رہے ہیں کہ "مسجد دوبارہ وہیں بناؤ" یہ مسلم عوام کی آواز ہے یا ان کی اپنی بات ہے۔ اس سلسلہ میں اپنا نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۱۱۔ نئی دہلی کے پندرہ روزہ انگریزی میگزین سیکولا (Secula) کے نمائندہ مسٹر اسامہ منظر نے ۲۸ اپریل ۱۹۹۳ کی شام کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر سیکولرزم اور مسلمان سے تھا، ان کو بتایا گیا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کے مواقع موجود ہیں، بشرطیکہ وہ دانش مندانہ انداز میں زندگی گزارنا سیکھ لیں۔

۱۷۔ روزنامہ قومی آواز کے نمائندہ مسٹر معصوم مرادآبادی نے یکم مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل خود مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ ہیں اور مسلمانوں کی اپنی کوشش ہی سے وہ حل کیے جا سکتے ہیں۔

۱۰۔ مصری جرنلسٹ بدوی محمود ۳ مئی ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز آئے اور قاہرہ کے عربی جریدہ الجمھوریۃ کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کافی مفصل تھا۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے حالات اور ہندستانی مسلمانوں اور عرب ملکوں سے تعلقات کے بارہ میں تھے۔

۱۸۔ دہلی کے ہندی روزنامہ ویرارجن کے دفتر میں ۱۱ مئی ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ ہوئی جس میں اخبار کے ادارتی اسٹاف کے لوگ جمع ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور تین نکاتی فارمولے کی وضاحت کی۔ آخر میں کچھ سوالات کیے گئے جس کا جواب دیا گیا۔

۱۸۔ ۸ مئی ۱۹۹۳ کو گول مارکٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ افراد کی ایک میٹنگ ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ سوال و جواب میں یہاں موجودہ مسلم مسائل پر گفتگو ہوئی۔

۱۹۔ بمبئی کے انگریزی اخبار مڈڈے (MID-DAY) کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اخبار مذکور کے شمارہ ۱۳ مئی ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔ سوال و جواب کا تعلق زیادہ تر ملی مسائل سے تھا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

عظمتِ مومن

مولانا وحید الدین خاں

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

عجیب لوگ

ایران حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں فتح ہوا ہے۔ اس وقت ایران کی مسلم افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔ چنانچہ انہوں نے گفت وشنید کی پیش کش کی۔ حضرت سعد نے مختلف وفود کو رستم اور یزدگرد کے دربار میں بھیجا۔ مثلاً نعمان بن مُقرن۔ فرات بن حیان۔ حنظلہ بن ربیع۔ عُطارد بن حاجب۔ اشعث بن قیس۔ مغیرہ بن شعبہ۔ عمرو بن معدیکرب کے وفود (البدایہ والنہایہ)

تاریخ میں ان سفارتوں کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ آخری مرحلہ میں حضرت مغیرہ کا وفد شہنشاہ یزدگرد کے زرق برق دربار میں آیا۔ مدائن کے محل میں انھوں نے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تقریر کی۔ یزدگرد اس کو سن کر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ تم میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ ایلچی قتل نہ کئے جائیں تو میں تم کو ضرور قتل کر دیتا۔ اب تم واپس جاکر اپنے امیر کو بتا دو کہ میں سپہ سالار رستم کی سرکردگی میں ایسا لشکر بھیجنے والا ہوں جو تم سب کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے محل کے آدمیوں سے کہا کہ ایک ٹوکری میں مٹی بھر کر لاؤ۔ مٹی لائی گئی تو اس نے مسلمانوں کے وفد سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ شریف کون ہے۔ وفد کے افراد چپ رہے۔ اس کے بعد عاصم بن عمرو بولے کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں۔ یزدگرد نے حکم دیا کہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکائی جائے اور ان کو یہاں سے بھگا دیا جائے یہاں تک کہ وہ مدائن کے باہر چلے جائیں۔

شاہی حکم کے مطابق مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکا دی گئی۔ وہ اس کو لے کر مدائن کے محل سے نکلے اور اونٹنی پر سوار ہو کر تیزی سے قادسیہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں حضرت سعد بن ابی وقاص مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے حضرت سعد کو ساری روداد سنائی اور مٹی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد مسلم سردار نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

ابشروا فقد واللہ اعطانا اللہ اقتالید ملکھم و تفاءلوا بذالک اخذ بلادھم

خوش ہو جاؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دیدی ہیں۔ اور انھوں نے اس سے ان کے ملک پر قبضہ کی فال لی۔

یہ مسلمان اگر مٹی پاکر غصہ ہوتے تو ان کے حصہ میں نفرت اور شکایت کے سوا کچھ نہ آتا۔ مگر جب وہ غصہ نہیں ہوئے تو مٹی دینے کا واقعہ ان کے لئے ملک دینے کے ہم معنیٰ بن گیا۔ ایک انتہائی ناخوشگوار واقعہ سے بھی انھوں نے اپنے لئے یقین اور حوصلہ کی غذا حاصل کرلی۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر گروہ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی نے موجودہ دنیا کو مقابلہ (Competition) کی دنیا بنا دیا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے آدمی کی کاٹ میں ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

ایسی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ آدمی غصہ اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو۔ وہ انتقامی نفسیات میں جلتا رہے۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ منتشر رہے گا۔ وہ کبھی گہری منصوبہ بندی نہ کرسکے گا۔ ایسے آدمی کے لئے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ اعتدال کی حالت میں رہے گا۔ وہ اپنے منفی اور مثبت پہلوؤں کو کسی کمی بیشی کے بغیر جان لے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ تمام حقیقتوں کو نگاہ میں رکھے اور حالات کے عین مطابق منصوبہ بندی کرے۔ ایسے شخص کے لئے کامیابی اتنی ہی یقینی ہے جتنا رات کے بعد سورج کا نکلنا۔

جو شخص اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے اس کی سوچ نہایت اعلیٰ سوچ بن جاتی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ امکانات پر ہوتی ہے۔ وہ مٹی کی ٹوکری میں پورے ملک کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ حوصلہ شکنی کے واقعات اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہوکر حوصلہ مندی کے واقعات بن جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شکست کو فتح میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ ناکامی میں کامیابی کا راز دریافت کرلیتے ہیں۔

تاریخ کی آواز

حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن پر ایرانی شہنشاہ کی اتنی عظمت تھی کہ حضرت عمرؓ اس مہم کی سربراہی کے لیے خود مدینہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگیے۔ مگر لوگوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو اس مشکل مہم کا سپہ سالار بنایا گیا۔

اس مہم کا آخری معرکہ قادسیہ کے قریب ایک میدان میں ہوا۔ یہاں میدانِ جنگ کے کنارے ایک قدیم شاہی عمارت تھی۔ حضرت سعدؓ اس کی چھت پر چڑھے اور میدان کی طرف رخ کرکے تکیہ کے سہارے بیٹھ گیے۔ وہ جنگ میں خود شریک نہیں ہوئے۔ اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو میدان مقابلہ کا سردار مقرر کیا۔ حضرت سعد عمارت کے اوپر بیٹھے ہوئے مسلسل جنگ کا مشاہدہ کر رہے تھے اور حسب ضرورت اپنی ہدایات پرچی پر لکھ کر خالد بن عرفطہ کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔

یہ جنگ اسلامی تاریخ کی انتہائی ہولناک جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایرانی ہاتھیوں کی فوج لائے تھے جن کا اس سے پہلے عربوں نے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک موقع پر ہاتھیوں کی کالی آندھی نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ حضرت سعد یہ دیکھ کر بے تاب ہوگیے اور بار بار کروٹیں بدلنے لگے۔ حضرت سعد کی اہلیہ سلمیٰ جو اس وقت ان کے پاس تھیں، یہ دیکھ کر بول اٹھیں "کاش آج مثنیٰ ہوتا"۔ حضرت سعد نے سلمیٰ کو تھپیڑ مار کر کہا۔ "مثنیٰ ہوتا تو وہ کیا کر لیتا"۔ سلمیٰ نے جواب دیا۔ "سبحان اللہ، بزدلی کے ساتھ غیرت بھی"۔ سلمیٰ نے یہ بات اس لیے کہی کہ حضرت سعدؓ خود لڑائی میں شریک نہیں تھے۔

اس کے بعد تاریخ لمبی تفصیل بیان کرتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے ایران کی فوجی تیاریوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر شاندار فتح حاصل کی۔

اس جنگ میں ایرانیوں کا سردار رستم تھا۔ رستم کو ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے قتل کیا۔ اگرچہ فردوسی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ رستم کا مقابلہ حضرت سعد سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شاہنامہ میں لکھا ہے :

زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد

حضرت سعدؓ کے براہِ راست جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت فوج کے اندر کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک مسلمان فوجی نے نظم کہی جس کے دو اشعار یہ تھے:

وَقَاتَلْتُ حَتَّى أَنْزَلَ اللهُ نَصْرَهُ ۔۔۔ وَسَعْدٌ بِبَابِ الْقَادِسِيَةِ مُعْصِمُ

فَأُبْنَا وَقَدْ أُمَتْ نِسَاءٌ كَثِيرَةٌ ۔۔۔ وَنِسْوَةُ سَعْدٍ لَيْسَ فِيهِنَّ أَيِّمُ

میں لڑا یہاں تک کہ اللہ نے اپنی مدد بھیجی۔ اور سعد قادسیہ کے دروازے سے چپٹے رہے۔ پھر ہم واپس ہوئے اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اور سعد کی بیویوں میں سے کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ اسلام کے بڑے بڑے مجاہدوں میں شامل تھے۔ لیکن مذکورہ واقعہ کو اگر اس کی ظاہری صورت میں لیا جائے تو ایک شخص یہ رائے قائم کرے گا کہ نعوذ باللہ وہ ایک بزدل آدمی تھے۔ انھوں نے دوسروں کی عورتوں کو بیوہ بنایا اور خود اپنی بیوی کے ساتھ شاہی قلعہ میں محفوظ بیٹھے رہے۔

مگر یہ شبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اصل واقعہ کو ادھوری شکل میں دیکھا جائے۔ واقعہ کو پوری شکل میں دیکھیے تو یہ شبہ باقی نہ رہے گا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو عرق النسار کی بیماری تھی۔ اور وقفہ وقفہ سے اس کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ ایرانی جنگ کی ابتدا میں وہ ٹھیک حالت میں تھے۔ چنانچہ قادسیہ کے آخری معرکہ سے پہلے دوسری جنگوں میں وہ براہ راست شریک رہے۔ مگر قادسیہ کے معرکہ کے موقع پر ان کو عرق النسار کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ اس بنا پر مقابلہ میں براہِ راست شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ان کے جنگی تجربات اور ان کی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان کو بدستور سپہ سالاری کے عہدہ پر باقی رکھا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر جنگ میں شریک نہ تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی رہنمائی اور ان کی منصوبہ بندی ہی کی وجہ سے اس معرکہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔

ان کی جنگی ذہانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے عین معرکہ کے وقت ایران کی ہاتھیوں کی فوج کا حل دریافت کیا جس نے کالی آندھی کی طرح مسلمانوں کو روندنا شروع کر دیا تھا۔ عرب ذہن کے لیے یہ بالکل ایک نیا مسئلہ تھا اس لیے وہ اس کا حل سوچنے سے عاجز ہو رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے یہ کیا کہ ان ایرانیوں کو بلایا جو پہلے پارسی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے نام ضخم اور سلم وغیرہ تاریخوں میں آئے ہیں۔

حضرت سعدؓ نے ان ایرانی نومسلموں سے پوچھا کہ اس کالے طوفان کا کیا علاج ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا حل یہ ہے کہ کسی طرح ان کے سونڈ اور ان کی آنکھیں بے کار کر دی جائیں ۔

اس کے بعد حضرت سعد نے مسلم فوج سے کچھ خاص جوانوں کو طلب کیا۔ ان کو پوری بات سمجھائی اور ان کو ابھارا کہ تم جان پر کھیل اس مہم کو سر کرو۔ چنانچہ قعقاع اور کچھ دوسرے جوانوں نے دو ہاتھیوں کو منتخب کیا۔ یہ دونوں ہاتھی جسامت میں سب سے بڑے تھے اور بقیہ ہاتھیوں کے لیے سردار کا کام کر رہے تھے ۔ ان میں سے ایک ہاتھی کا نام ابیض تھا اور دوسرے کا نام اجرب ۔ مسلم جوانوں نے ان دونوں ہاتھیوں کو نرغے میں لے لیا۔ انھوں نے نہایت پھرتی سے برچھا مار کر ان کی آنکھوں کو بے کار کر دیا۔ اس کے بعد سونڈ پر اتنے زور سے تلوار ماری کہ وہ کٹ کر الگ ہو گئی۔ اب دونوں ہاتھی پیچھے کی طرف بھاگے ۔ ان کو دیکھ کر بقیہ ہاتھی بھی ان کے ساتھ مڑ کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے ۔ ہاتھیوں کی جو فوج پہلے مسلمانوں کو روندرہی تھی اس نے انتہائی بے دردی کے ساتھ خود ایرانی فوج کو روند ڈالا ۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مذکورہ واقعہ میں دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو آدمی کو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو فوراً مان لے ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ کی پوری جانچ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات اس سے بالکل مختلف تھی جو بظاہر ابتدائی رپورٹ سے سامنے آئی تھی ۔ جس خبر میں کسی کے خلاف بدگمانی کا پہلو ہو اس کو مکمل تحقیق کے بغیر مان لینا سراسر ایمانی تقاضے کے خلاف ہے ۔

دوسرا سبق وہ ہے جس کا ثبوت قادسیہ کے موقع پر عرب فوجیوں نے دیا۔ انھیں اپنے سردار سے زبردست شکایت تھی۔ حتیٰ کہ اس شکایت کا اظہار انھوں نے اشعار کی صورت میں کیا اور وہ اشعار تمام فوجیوں کے درمیان پھیل گئے ۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ لوگ اپنے سردار سے بغاوت کر دیں یا جنگ میں بے جگری کے ساتھ نہ لڑیں ۔ سردار سے شکایت کے باوجود وہ اپنا فرض بھرپور طور پر ادا کرتے رہے ۔

یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں ۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہ صرف یہ کریں گے کہ آپس میں لڑ بھڑ کر بنتے ہوئے کھیل کو بگاڑ دیں اور ایک جنگ جو جیت پر ختم ہونے والی تھی اس کو شکست اور ناکامی میں تبدیل کر دیں ۔

ایک باپ

اموی خلیفہ مروان بن الحکم نے اپنے بعد علی الترتیب عبدالملک اور اس کے بعد اپنے بھائی عبدالعزیز کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا۔ مروان کے بعد عبدالملک حکمراں ہوا تو اس کی نیت بگڑ گئی جلد ہی بعد عبدالعزیز کا انتقال ہوگیا۔ اب عبدالملک کو موقع مل گیا۔ اس نے ولید اور سلیمان کی ولی عہدی پر بیعت لینے کے لئے صوبوں کے حاکموں کے نام فرمان جاری کر دئے۔ ہشام بن اسماعیل مدینہ کا حاکم تھا۔ سعید بن المُسَیّب (۹۴-۱۳ھ) جو سید التابعین کہے جاتے ہیں، اس وقت مدینہ میں موجود تھے۔ ہشام نے چاہا کہ سب سے پہلے حضرت سعید بن المسیب سے بیعت لے۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر انھوں نے بیعت کر لی تو اس کے بعد تمام اہل مدینہ بیعت کریں گے۔

سعید بن المسیب نے بیعت سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک خلیفہ کی زندگی میں دوسرے خلیفہ کے لئے بیعت نہیں کر سکتا۔ ہشام کے حکم سے سعید بن المسیب کو کوڑے مارے گئے اور سخت سزائیں دی گئیں۔ چند دن کے بعد ہشام نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن کو ان سے بات کرنے کے لئے بھیجا۔ واپسی کے بعد ہشام نے پوچھا: کیا سعید مار کے بعد کچھ نرم پڑے۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے جواب دیا: تمہارے اس سلوک کے بعد خدا کی قسم وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنا ہاتھ روک لو۔

خلیفہ عبدالملک کو معلوم ہوا تو اب اس نے دوسری تدبیر سوچی۔ سعید بن المسیب کی ایک لڑکی تھی جو صورت اور سیرت دونوں میں ممتاز تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے وقت کے مطابق، اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ عبدالملک نے سوچا کہ ولی عہد سے اس لڑکی کا نکاح کر دیا جائے۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سعید بن المسیب اپنے آپ نرم پڑ جائیں گے۔ خلیفہ نے امیر مدینہ ہشام بن اسماعیل المخزومی کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ وہ سعید بن المسیب کو اس رشتہ کے لئے راضی کرے۔

ہشام نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سعید بن المسیب سے ملاقات کی۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، اس کے بعد کہا: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹے ولید کی آئندہ خلافت کے لئے لوگوں سے بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے، بیعت لینے سے پہلے، امیرالمومنین یہ چاہتے ہیں کہ آپ ولید کو اپنی دامادی میں لے لیں۔ یہ سنتے ہی سعید بن المسیب کے چہرہ پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ انھوں

نے کہا: مجھے ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی منظور نہیں۔

اس انکار کے بعد سعید بن المسیب کو دوبارہ مختلف قسم کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ ان پر طرح طرح سے دباؤ ڈالے گئے۔ مگر وہ برابر اپنے انکار پر قائم رہے۔ اسی کے ساتھ وہ خاموشی سے یہ سوچتے رہے کہ کوئی مناسب رشتہ سامنے آئے تو لڑکی کا عقد کر دیا جائے۔ آخر کار انھوں نے قریش کے ایک غیر معروف طالب علم ابو وداعہ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا۔ مورخ ابن خلکان (۶۸۱ - ۶۰۸ھ) نے ابو وداعہ کے الفاظ میں یہ واقعہ مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ابو وداعہ کہتے ہیں :

میں سعید بن المسیب کے حلقۂ درس میں نہایت پابندی سے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ مدت تک حاضر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جب گیا تو انھوں نے پوچھا، اتنے دنوں تم کہاں تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔ انھوں نے کہا، پھر ہمیں تم نے کیوں نہ خبر کی۔ ہم بھی اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے۔

اس کے بعد جب میں اٹھنے لگا تو انھوں نے کہا، تم نے دوسری بیوی کا کوئی انتظام کیا۔ میں نے کہا خدا آپ پر رحم فرمائے۔ کون میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کرے گا جب کہ میں چند درہم سے زیادہ کی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا، اگر میں کروں تو تم کرنے کے لئے تیار رہو۔ میں نے کہا بہت خوب۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور اسی وقت دو یا تین درہم پر میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔

ابو وداعہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں اپنے مکان پر پہنچا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ اب رخصتی وغیرہ کے لئے قرض کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس دن میں روزہ سے تھا۔ نماز کے بعد میں نے چاہا کہ کھانا کھاؤں جو کہ روٹی تھا اور زیتون کا تیل۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی "سعید" میں نے سعید بن مسیب کو چھوڑ کر اس نام کے ہر شخص کا تصور کیا۔ کیوں کہ سعید بن مسیب تو چالیس برس سے اپنے گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں دیکھے نہیں گئے تھے۔

اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں سعید بن مسیب کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر معاً خیال ہوا کہ شاید ان کا خیال بدل گیا ہے اور وہ فسخ نکاح کرانے آئے ہیں۔

میں نے کہا " اے ابو محمد، آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ مجھے بلا بھیجا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، اس وقت مجھ کو ہی تمہارے پاس آنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا پھر کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا، مجھے خیال آیا کہ تم اپنے گھر میں تنہا ہو گے، حالاں کہ اب تو تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے گوارا نہیں ہوا کہ تم تنہا رات بسر کرو، اور یہ ہے تمہاری بیوی"۔ اس وقت ابن مسیب کی صاحبزادی ٹھیک ان کے پیچھے کھڑی تھیں۔ انھوں نے صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر کے باہر سے خود ہی دروازہ بند کر دیا اور واپس چلے گئے۔

میری بیوی شرم کے مارے گر پڑی، پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کے بعد چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی۔ وہ لوگ جمع ہوئے اور پوچھا قصہ کیا ہے۔ میں نے کہا، سعید بن مسیب نے آج اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا۔ اور آج ہی اچانک وہ اسے میرے گھر بھی پہنچا گئے۔ اور وہ یہاں گھر میں موجود ہے۔ لوگوں نے آکر اسے دیکھا اور میری ماں کو خبر ہوئی تو وہ بھی آگئیں اور انھوں نے کہا، اس کو چھونا تمہارے لئے حرام ہے جب تک میں حسب دستور تین دن تک اسے بنا سنوار نہ لوں۔ چنانچہ میں تین دن تک رکا رہا۔ اس کے بعد اس کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک حسین وجمیل خاتون ہے۔ کتاب اللہ کی حافظ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم ہے۔ اور حقوق شوہری کو خوب پہچاننے والی ہے۔

ابو وداعہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ماہ تک میں گھر ہی پر رہا۔ اس دوران میں سعید بن مسیب کا نہ کوئی حال ملا اور نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ پھر ایک مہینہ کے بعد میں ان کی صحبت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہاں مجلس قائم تھی۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کوئی بات چیت نہ کی۔ یہاں تک کہ جو لوگ مسجد میں تھے سب چلے گئے۔ اس کے بعد جب میرے سوا کوئی وہاں نہیں رہ گیا تو انھوں نے پوچھا۔ تمہارے ساتھی کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا، بہترین حال ہے۔ انھوں نے فرمایا: ان رابك شيء فالعصا۔ یعنی وہ کوئی ناپسندیدہ حرکت کرے تو اس کو مارو۔

پھر میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ اور یہ سعید بن مسیب کی لڑکی وہ تھی جس کے لئے خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے لڑکے ولید کا پیغام دیا تھا جب اس نے اس کو ولی عہد بنایا تھا، تو سعید بن مسیب نے شہزادہ ولید سے رشتہ کرنے سے انکار کیا۔ جس کی وجہ سے عبد الملک سعید بن مسیب کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے دن میں انھیں کوڑے سے پیٹا گیا اور اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالا گیا۔

مسلم جج

قاضی شُریک بن عبید اللہ بن الحارث النخعی مشہور عالم اور فقیہ ہیں۔ وہ بخاریٰ میں ۹۵ھ (۷۱۳ء) میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں ۱۷۷ھ (۷۹۴ء) میں ان کی وفات ہوئی۔ خلافت عباسی کے زمانہ میں ۱۵۳ھ میں وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔

قاضی شریک کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت ان کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ کوفہ کے حاکم موسیٰ بن عیسیٰ (خلیفہ مہدی کے چچا) کے ہاتھ جب وہ اپنا باغ فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوئی تو انھوں نے اپنے غلاموں کو حکم دیا اور انھوں نے باغ کے حدود اور نشانات مٹا دیے اور اس کو امیر موسیٰ کے باغ میں ملا دیا۔

قاضی شریک نے امیر موسی کے یہاں کہلوایا کہ وہ عدالت میں عورت کے ساتھ حاضر ہوں۔ امیر نے کوفہ کے پولیس افسر کو قاضی کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان سے گزارش کریں کہ وہ اس معاملہ میں دخل دینے سے باز رہیں۔ قاضی نے پولیس افسر کو پکڑ کر قید کر دیا۔ جب امیر موسی کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بعض درمیانی افراد کو بھیجا۔ انھوں نے قاضی کو ان کے اس فعل پر ملامت کی۔

قاضی شریک نے ان لوگوں سے کہا کہ امیر نے کیوں اپنے آپ کو عدالت کی حاضری سے بالاتر سمجھا۔ کیا عدالت صرف عوام کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ہے۔ عدالت بلاشبہ بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق نہیں کرے گی۔ اور تم نے عدالت کے معاملہ میں مداخلت کی ہے۔ ضروری ہے کہ تم کو اس کی سزا دی جائے۔ پھر قاضی نے ان لوگوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد امیر موسی اپنے محافظ سواروں کے ساتھ قیدخانہ گئے اور قیدیوں کو بزور اس سے نکال دیا۔

اس کے بعد قاضی شریک سفر کر کے بغداد گئے۔ تاکہ خلیفہ مہدی سے ملیں اور اس سے یہ کہیں کہ وہ ان کو قضاء کے عہدہ سے الگ کر دے۔ انھوں نے خلیفہ سے کہا: خدا کی قسم، میں نے بنو عباس سے قاضی کا عہدہ نہیں مانگا تھا، خود انھیں نے مجھ کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا، اور انھوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم با اختیار اور آزاد ہوں گے۔ اگر ہم کو قاضی بنایا گیا تو ہم اپنے فیصلے پوری طرح عدل کے مطابق کریں گے۔ مگر اب قاضی کے عہدہ پر باقی رہنے کی کوئی صورت

نہیں ہے جب کہ ہم دیانت دارانہ فیصلہ کرنے میں بے بس ہیں۔
پھر امیر موسی نے قاضی سے ملاقات کی اور ان سے مہربانی کی درخواست کی۔قاضی شریک نے کہا کہ میرے نزدیک اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ تمام لوگ دوبارہ قید خانہ میں لوٹائے جائیں جن کو قید کیے جانے کا میں نے حکم دیا تھا۔چنانچہ امیر موسی نے مجبور ہو کر تمام لوگوں کو دوبارہ قید خانہ میں واپس کیا۔ اور خود عورت کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوئے۔پھر قاضی شریک نے یہ فیصلہ دیا کہ امیر عورت کے باغ کو اسے لوٹائے اور جو حدود اور نشانات ڈھا دیے گئے تھے ان کو دوبارہ قائم کرے۔چنانچہ اس حکم کا نفاذ کیا گیا :

روی ان القاضی (شریک بن عبید الله) قد شکت الیه امرأة من انها عندما امتنعت عن بیع بستانها للامیر موسی بن عیسی عم امیر المومنین المهدی امر غلمانه فأزالوا حدود بستانها ومعالمه — وخلطوه ببستانه ، فارسل یستدعی الامیر للحضور فی مجلس القضاء مع المرأة۔ فارسل الامیر رئیس الشرطة بالکوفة لیطلب منه العدول عن هذا فحبس رئیس الشرطة ، ولما علم الامیر بذلك بعث بعض الوسطاء یعتبون علی القاضی فقال لهم (شریك) لماذا ترفع الامیر عن الحضور الی مجلس الحکم؟ هل نصب القضاء للفصل بین العامة فحسب ، ان العدالة لا تفرق بین امیر و صغیر ، وانتم بتداخلکم فی امر القضاء لا بد ان یحل بکم جزاء ، ثم امر بحبسهم۔ فذهب الامیر فی رکب من حراسه الی السجن واخرج المسجونین عنوة فاعد القاضی نفسه للسفر الی بغداد للقاء الخلیفة المهدی لیطلب اعفاءه من القضاء قائلا: (والله ماطلبت من بنی العباس ولایة القضاء ، وانما هم الذین اکرهونا علیها۔ ولقد وعدونا ان نکون اعزة احرارا نتوخی العدل فی احکامنا ان تولینا القضاء۔ اما الآن فلا سبیل الی البقاء فی مجلس الحکم مادمنا عاجزین عن اداء الامانة) فلحق به الامیر واخذ یستعطفه فقال : الحل عندی ان یرد الی السجن جمیع من امرت بسجنهم فاضطر الامیر الی اعادتهم الی السجن والی حضور مجلس القضاء مع المرأة ، وحکم علیه شریك برد البستان ، واقامة الحدود والمعالم التی هدمت فنفذ الحکم۔

بارش شروع ہوگئی

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اندلس میں سلطان عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت تھی۔ اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا۔ قاضی منذر بن سعید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزہرار کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کئے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی۔ قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً: کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (شعراء) تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جاگری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقید یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگرچہ

سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمہارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور رہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (ھذا امالایکون) مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (بل یصلی بالناس حیاتنا وحیاتہ انشاء اللہ تعالیٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقار کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں۔ کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھذہ ناصیتی بیدك، اتراك تعذب بی الرعیة وانت ارحم الراحمین)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہو گیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہو گی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

امکان ختم نہیں ہوتا

عبدالرحمٰن بن معاویہ ابن ہشام (۷۳۱–۷۸۸ء) بنو امیہ کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت ابتدا ہی سے نہایت شاہانہ انداز میں کی گئی۔ اس کو اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ بڑا ہو تو کامیابی کے ساتھ تخت خلافت پر بیٹھ سکے۔

مگر ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت ختم ہو کر بنو عباس کی خلافت شروع ہو گئی۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ جب عباسی لشکر شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض ہو گیا اور بنو امیہ کا قتل عام ہونے لگا اس وقت اتفاق سے عبدالرحمٰن دمشق میں موجود نہ تھا۔ بلکہ باہر دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے اس کی جاگیر تھی اور اس کے باغات وغیرہ تھے۔ اس وقت وہ یہیں پر مقیم تھا۔

عبدالرحمٰن کو جب معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے افراد کا قتل عام ہو رہا ہے تو وہ یہاں درختوں کے جھنڈ میں خیمہ لگا کر چھپ گیا۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں تھا کہ اس کا چار سال کا لڑکا خوف زدہ حالت میں خیمہ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ بنو عباس کے سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس باغ تک پہونچ گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے اپنے بچہ کو گود میں اٹھایا اور دریا کی طرف بھاگا۔ وہ دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ دمشق سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم کئی سال تک اس کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی رہی۔ دشمن سے بچنے کے لیے دریا میں کودنا، جنگلوں میں پناہ لینا، بھوکے پیاسے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگنا، یہ اس کی زندگی تھی۔ اسی حال میں وہ سبطہ پہونچا جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھا۔

بظاہر عبدالرحمٰن کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ بچپن کی عمر میں جس کا یہ حال تھا کہ تخت خلافت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جوانی کی عمر کو پہونچ کر اس کے لیے زمین میں ایک گوشہ بھی نہیں رہا جہاں وہ سکون کی زندگی گزار سکے۔

ِسی کی آخری حد پر پہونچ کر اس کے لیے امید کی روشنی پیدا ہو گئی۔ عین اسی زمانہ میں اندلس
سردار ہو کر آپس میں لڑ رہے تھے۔ دمشق کے مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہ حال
ر قرطبہ کے درمیان ایک پیغام کے آنے جانے میں اکثر مہینوں لگ جاتے تھے۔ اس بنا پر
ر دمشق کی مضبوط گرفت باقی نہیں رہی تھی۔

ں کے یہ حالات عبدالرحمٰن بن معاویہ کے لیے ایڈوانٹیج بن گئے۔ وہ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے
۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک سردار کی ضرورت تھی۔ عبدالرحمٰن اپنی شخصی قابلیت نیز بنو امیہ کا
کی وجہ سے بہت جلد وہاں کے لوگوں کا مرجع بن گیا اور بالآخر اس نے اندلس میں مضبوط
قائم کی۔ یہی امیر عبدالرحمٰن اندلس کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کا بانی ہے۔ وہ شخص جس کی
ں ختم ہو چکی تھی اس نے اپنی حوصلہ مندی کی بنا پر قرطبہ میں اپنی ایک نئی شاندار تر تاریخ

ت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے لیے امکان ختم نہیں ہوتا۔ جہاں ایک موقع ختم ہو
یادہ بہتر موقع اس کے لیے موجود رہتا ہے۔ جب ایک تاریخ اختتام پر پہونچتی ہے تو
ی تاریخ کے آغاز کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔

ئے امکانات کبھی اپنے آپ واقعہ نہیں بنتے۔ ان کو استعمال کر کے انھیں واقعہ بنانے کے
لہ مند انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی ہمت نہ کھوئے، اگر وہ نئی جدوجہد
رطیں پوری کرنے کے لیے تیار ہو تو اس کے لیے ناکامی کا سوال نہیں۔ یہ دنیا خدا نے
ہے کہ آدمی یہاں جدوجہد کر کے کامیاب ہو۔ اب جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اپنی نادانیوں
تا ہے، وہ خود اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتتا ہے۔

ن کے لیے کبھی امکان ختم نہیں ہوتا"، یہ جملہ اتنا ہی بامعنی ہے جتنا یہ کہنا کہ "اس دنیا میں کبھی
نہیں ہوتا"۔ جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد دوبارہ
ر آنا یقینی ہے۔ تاہم رات کے بعد نئی صبح لانے کے لیے زمین و آسمان کو عظیم گردش کرنی
طرح کسی آدمی کی زندگی میں ناکامی کے بعد کامیابی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کی خاطر
ر کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسلامی حکمراں

صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳ - ۱۱۳۸) مصری سلطان کی فوج میں معمولی سپاہی تھے۔ اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے وہ ۳۱ سال کی عمر میں مصری افواج کے سپہ سالار مقرر کیے گیے۔ اسی کے ساتھ انھیں مصر کا وزیر بھی بنا دیا گیا اور انھیں مَلِک کا خطاب دیا گیا۔ بعد کو ایک انقلاب کے نتیجہ میں وہ مصر کے خود مختار سلطان ہو گیے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ طویل صلیبی جنگوں کے درمیان یورپ کی مسیحی طاقتوں نے یروشلم (فلسطین) پر قبضہ کر لیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے مسلم حکمرانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی متحدہ کوشش ہی سے مسیحی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مصر، شام وغیرہ ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے پوری قوم میں جہادی روح پیدا کر دی۔ انھوں نے زبردست تیاری کے بعد جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین (فلسطین) کے مقام پر مسیحی افواج پر حملہ کیا اور ان کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ یروشلم تک پہونچ گئیں اور بالآخر یروشلم کو فتح کر کے فلسطین کو دوبارہ اسلامی خلافت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم سلطان صلاح الدین کی فوجی کارروائی نمایاں طور پر مسیحی اقوام کی کارروائیوں سے مختلف تھی۔ مسیحی اقوام نے فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے مکمل ضبط سے کام لیا۔ انھوں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> Saladin's crowning achievement and the most disastrous blow to the whole crusading movement came on October 2, 1187, when Jerusalem, holy to both Muslim and Christian alike, surrendered to the Sultan's army after 88 years in the hands of the Franks. In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops.
>
> *Encyclopaedia Britannica*, 1984 Volume 16, p. 177

صلاح الدین کی شاندار کامیابی اور پوری صلیبی تحریک کی سب سے زیادہ تباہ کن شکست ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو ظہور میں آئی جب کہ یروشلم، جو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے، وہ ۸۸ برس تک مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد دوبارہ سلطان کی فوجوں کے قبضہ میں آ گیا۔ مسیحیوں نے جب شہر پر قبضہ کیا تھا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر اس کے باشندوں کو قتل کیا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ مہذب انسانوں کا قبضہ تھا، صلاح الدین اور اس کی فوجوں نے مفتوح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔

رعایا کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یہ انصاف محض اتفاقی نہ تھا۔ یہ اس کی اسلامیت کا نتیجہ تھا۔ صلاح الدین صرف ایک بہادر اور حوصلہ مند شہ سوار ہی نہ تھا۔ وہ ایک خدا ترس اور عبادت گذار آدمی تھا۔ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات کے تحت بنا تھا۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے سلطان صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا سے زیادہ آخرت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ قیامت میں اس سے اس کی رعایا کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ اسلام اس کے لیے اس میں مانع بن گیا تھا کہ اس کے اندر گھمنڈ کا مزاج پیدا ہو۔ اس کے برعکس اس کے اندر زہد اور تواضع کا مزاج تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سلطان صلاح الدین کے زہد و تقویٰ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

---- and on March 4, 1193, he died. While his relatives were already scrambling for pieces of the empire, his friends found that the most powerful and most generous ruler in the Muslim world had not left enough money to pay for his grave. (16/178)

اور ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ اس کے رشتہ دار ابھی سلطنت کے ٹکڑوں کے لیے آپس میں کش مکش کر رہے تھے، اس کے دوستوں نے پایا کہ مسلم دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ فیاض حکمراں نے اپنے پیچھے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی ہے جو اس کی قبر کے اخراجات کو پورا کر سکے۔

اسلام ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کو اس سے روکتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنے لگے۔

اختلاف کے باوجود

اموی خاندان کے ایک نوجوان عبدالرحمٰن نے ۷۵۶ء میں اسپین میں بنوامیہ کی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا۔ اسی خاندان میں ایک سلطان الحکم گزرا ہے۔ اس نے ۹۶۱ء سے لے کر ۹۷۶ء تک اسپین میں حکومت کی۔

الحکم کو مسلم اسپین کا سب سے بڑا حکمراں کہا جاتا ہے۔ مورخ ابن اثیر نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں: کان محبّا لاھل العلم، عالمًا، فقیھا فی المذاھب، عالمًا بالانساب والتواریخ، جمّاعا للکتب والعلماء (وہ اہل علم کو دوست رکھتا تھا۔ عالم اور فقیہ تھا۔ انساب اور تاریخ کا ماہر تھا۔ کتابوں اور علماء کو اپنے پاس جمع رکھتا تھا) الکامل فی التاریخ ۸/۶۷۷

الحکم کی علم پسندی نے اس کو اہل علم کا بے حد قدرداں بنا دیا تھا۔ وہ اہل علم کو نہایت عزت اور احترام کا درجہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک عالم اگر اس کی ذات پر تنقید کرے یا اس کی مرضی کا لحاظ نہ کرے تب بھی اس کی قدردانی میں کمی نہیں آتی تھی۔ اپنے تمام تر جاہ وجلال کے باوجود وہ اہل علم کے آگے جھک جاتا تھا۔ اس کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الحکم کے زمانہ میں ایک عالم تھے جن کا نام ابوابراہیم تھا۔ ایک روز وہ قرطبہ کی مسجد ابوعثمان میں وعظ بیان کر رہے تھے۔ عین اس وقت سلطان کا ایک قاصد مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ اے ابوابراہیم، امیرالمومنین باہر آپ کے انتظار میں ہیں۔ اور آپ کو اسی وقت بلا رہے ہیں۔ ابوابراہیم نے بے پروائی کے ساتھ اس شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم جا کر امیرالمومنین سے کہہ دو کہ ابوابراہیم اس وقت اللہ کے کام میں مصروف ہے۔ وہ جب تک اس کام سے فارغ نہ ہو جائے، آپ کے پاس نہیں آسکتا۔

الحکم کے قاصد کو یہ جواب سن کر حیرانی ہوئی۔ وہ سلطان کی طرف واپس گیا اور ڈرتے ڈرتے اس کو ابوابراہیم کا جواب سنایا۔ قاصد کی توقع کے خلاف، الحکم نے اس کا کوئی بُرا اثر نہیں لیا۔ اور کسی خفگی کے بغیر کہا کہ تم جا کر ابوابراہیم سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ ان کی اس

بات کو سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ وہ اللہ کے کام میں مصروف ہیں۔ جب ان کو اس کام سے فراغت ہو جائے تو اس وقت وہ میرے پاس آجائیں۔ میں دربار میں ان کا انتظار کروں گا۔

شاہی قاصد نے دوبارہ مسجد میں آکر ابوابراہیم کو الحکم کا پیغام سنایا۔ ابوابراہیم نے کہا کہ تم جاکر امیرالمومنین سے کہہ دو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ پیدل چل کر ان کے پاس آؤں یا گھوڑے کی سواری کروں۔ باب السدّہ جو کھلا ہوا ہے وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ باب الصنع قریب ہے مگر وہ بند رہتا ہے۔ اگر امیرالمومنین باب الصنع کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں اس دروازہ سے ان کے پاس آجاؤں گا۔

باب الصنع ایک مخصوص دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ کسی ہنگامی موقع پر ہی اس کو کھولنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ابوابراہیم مذکورہ پیغام دے کر اپنے وعظ میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف مذکورہ قاصد الحکم کے پاس گیا اور اس کو ابوابراہیم کا پیغام پہنچایا۔ الحکم نے قاصد سے کہا کہ تم جاکر مسجد میں بیٹھ جاؤ اور جب وہ اپنا وعظ ختم کر لیں تو ان کو باب الصنع کے راستہ سے گزار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ قاصد واپس آکر مسجد میں بیٹھا رہا۔ ابوابراہیم نے جب اپنا وعظ ختم کیا تو اس نے ان سے کہا کہ باب الصنع آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے اور امیرالمومنین آپ کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد ابوابراہیم مسجد سے نکلے اور چلتے ہوئے باب الصنع پر پہنچے۔ وہاں امراء اور درباریوں کی بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ابوابراہیم دربار کے اندر داخل ہوئے۔ الحکم نے کچھ دیر تک ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ اسی باب الصنع سے عزت و احترام کے ساتھ واپس ہو گئے۔

دورِ اول میں جو اسلامی انقلاب آیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں میں اکابر پرستی کے بجائے خدا پرستی پیدا کر دی۔ اس نے لوگوں میں یہ مزاج بنایا کہ وہ چیزوں کو شخصیتوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے حقیقتوں کی نسبت سے دیکھیں۔ یہ فکری انقلاب اتنا طاقت ور تھا کہ بعد کو جب مسلمانوں میں خلفاء کے بجائے سلاطین ہونے لگے اس وقت بھی لوگ ملوک اور سلاطین پر کھلی تنقیدیں کرتے تھے اور کسی کو بھی اس پر ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

پکار کے وقت

تھیوفیلس (Theophilus) بازنطینی سلطنت کے آخری دور کا حکمران ہے۔ اس کا مرکز سلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس کا زمانہ حکومت ۸۲۹ء تا ۸۴۲ء ہے۔ تھیوفیلس عباسی خلیفہ المعتصم کا ہم عصر تھا۔

دور اول کے مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کر لیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اب بھی بازنطینی حکمراں کے قبضہ میں تھا۔ موجودہ ترکی کے ایک حصہ پر اب بھی اس کی حکومت قائم تھی۔

قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ تھیوفیلس ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) میں ایک بڑا لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہونچ کر زبطرہ پر چھاپہ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے مسلم قلعہ پر حملہ کیا۔ ان حملوں میں اس نے بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ انھیں گرفتار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کا مُثلہ کیا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ بازنطینی سپاہیوں نے ایک عربی عورت کو پکڑا اور اس کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ عورت چلّا اٹھی۔ اس کی زبان سے نکلا: وامعتصماہ (ہائے معتصم)

خلیفہ المعتصم اس وقت بغداد میں تھا۔ وہاں سے آنے والوں نے خلیفہ کو بازنطینی حکمراں کے مظالم کی خبریں بتائیں۔ اسی کے ساتھ مذکورہ عرب عورت کا قصہ بھی بتایا۔ المعتصم اس کو سن کر تڑپ اٹھا۔ اس وقت وہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وامعتصماہ کا لفظ سنا تو اسی وقت لبیك لبیك کہتے ہوئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور پکار کر کہا: النفیر، النفیر (کوچ، کوچ)

اس کے بعد المعتصم نے زبردست تیاری کی اور ایک طاقت ور فوج کو لے کر مقام حادثہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (Amorium) پہونچ گیا۔ عموریہ (ترکی) اس وقت بازنطینیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ المعتصم نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ منجنیق کے ذریعہ اس پر گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ اس کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ المعتصم اپنی فوج کو لے کر قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ المعتصم نے تمام مسلم قیدیوں کو چھڑایا اور اس عرب عورت کو بھی قید سے رہا کیا جس نے اس سے پہلے وامعتصماہ کہہ کر خلیفہ کو پکارا تھا۔

مظلوم کی پکار پہ دوڑنا زندہ انسان کی خاص علامت ہے۔ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو۔ جو اپنے مردانہ اوصاف پر قائم ہو، وہ ایسی کسی پکار کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ یہی وہ انسانی صفت ہے جس کے بارہ میں عرب شاعر نے کہا ہے کہ ان کا بھائی جب اپنی کسی مصیبت پر انھیں پکارے تو اس وقت وہ تفصیل نہیں پوچھتے، وہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں :

لا یسئلون اخاھم حین یندبھم　　فی النائبات علیٰ ما قال برھانا

مظلوم کی مدد کرنا یا مظلوم کی پکار پر دوڑنا ایک فطری صفت ہے۔ جن لوگوں کی فطرت زندہ ہو، ان کے اندر یہ انسانی خصوصیت بھی ضرور زندہ ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے اعتبار سے زندہ ہو اور اس کے اندر یہ صفت نہ پائی جائے۔

قومی تعصب یا ذاتی تعلق کے تحت ہر آدمی اپنے لوگوں کی مدد کے لیے دوڑتا ہے۔ مگر اس قسم کے دوڑنے کو کوئی اعلیٰ اخلاقی صفت نہیں کہا جاسکتا۔ اعلیٰ اخلاقی صفت کا درجہ صرف اس دوڑنے کو حاصل ہے جو ذاتی تعلق یا قومی تعصب جیسی چیزوں سے بلند ہو۔ جب کہ آدمی اس لیے دوڑ پڑے کہ پکارنے والا مظلوم ہے، نہ اس لیے کہ ذاتی مفاد یا جماعتی حمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی پکار پر دوڑا جائے۔

مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ مفاد کے لیے تڑپتے ہیں، مومن اصول کے تڑپتا ہے۔ دوسرے لوگ اپنی ذات کے لیے عمل کرتے ہیں، مومن اپنے سوا دوسروں کے لیے عمل کرتا ہے۔ عام آدمی اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کہ اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو۔ جب کہ مومن کو صرف یہ بات متحرک کر دینے کے لیے کافی ہے کہ انسانی اصولوں میں سے کوئی اصول ٹوٹ گیا ہے۔

المعتصم کے جس واقعہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کا حوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (IX/939, 3/559) میں مختصر طور پر موجود ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تھیوفلس کو ایک خونی جنگ میں جولائی ۸۳۸ میں شکست ہوئی :

Theophilus was defeated in a bloody battle at Dazmana in July 838.

اسلامی شجاعت

حطین کی جنگ (۱۱۸۷) تاریخ کی مشہور جنگ ہے۔ حطین شمالی فلسطین کا ایک مقام ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسی مقام پر اپنی غیر معمولی جنگی منصوبہ بندی کے ذریعہ صلیبی فوجوں پر فتح حاصل کی۔ اس وقت مسلم فوج کی تعداد ۱۸ ہزار تھی، اور عیسائی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار۔ جنگ میں بیشتر عیسائی فوجی مارے گئے۔ اور مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔

جنگ کے بعد بہت سے عیسائی سردار گرفتار ہوئے۔ ان میں یروشلم کا بادشاہ (Guy de Lusignan) اور فرانسیسی جنرل ریجینالڈ (Reginald) بھی شامل تھا۔ ریجینالڈ کے متعلق مورخین متفق ہیں کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بار بار غدر کا معاملہ کیا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ ۱۱۴۷ء اور ۱۱۸۷ء کے درمیان ہونے والی صلیبی لڑائیوں میں اہم فوجی شخصیتوں میں سے ایک تھا جس کی صلح کی مدت کے دوران مسلم قافلوں پر ناعاقبت اندیشانہ حملوں کی پالیسی آخر کار یروشلم کی لاتینی بادشاہت کی بربادی اور اس کے بیشتر علاقوں کے کھوئے جانے کا سبب بنی:

> One of the leading military figures of the Crusades between 1147 and 1187, whose reckless policy in raiding Muslim caravans during periods of truce led to the virtual destruction of the Latin Kingdom of Jerusalem and the loss of most of its territory (VIII/480).

مورخ ابن شداد نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ نے ایک بار مسلم قافلہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ انھوں نے اس کو خدا کا واسطہ دلایا۔ اور اس معاہدہ صلح کا واسطہ دیا جو اس کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ مگر ریجینالڈ نے کہا کہ اپنے محمد سے کہو، وہ تمہیں بچائے۔ یہ خبر جب صلاح الدین ایوبی تک پہونچی تو اس نے نذر مانی کہ اللہ جب اس کے اوپر مجھے فتح دے گا تو میں خود اس کو قتل کروں گا (انہ لما غدر بالقافلۃ ناشدوا اللہ والصلح الذی بینہ وبین المسلمین۔ فقال: قولوا لمحمد کم یخلصکم۔ فلما بلغہ ذلک عنہ نذر انہ متی اظفرہ اللہ بہ قتلہ بنفسہ، صفحہ ۱۲۷)

جنگ کے بعد ریجینالڈ اور دوسرے لوگ قیدی کی صورت میں صلاح الدین ایوبی کے سامنے لائے گیے۔ صلاح الدین نے ریجینالڈ کی غداری کے واقعات اس کو یاد دلائے۔ نیز اس واقعہ کو یاد دلایا جب کہ اس نے حاجیوں کے ایک قافلہ کو لوٹا تھا۔ اور ان کی فریاد پر ان سے کہا تھا کہ اپنے محمد کو بلاؤ، وہ تم کو بچائیں گے۔ اس کے بعد صلاح الدین نے تلوار اپنے میان سے نکالی اور ریجینالڈ کی گردن مار دی۔ اس کو قتل کرتے ہوئے صلاح الدین نے کہا کہ لو یہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارا انتقام لیتا ہوں (ھا انا ذا انتصر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم)

یروشلم کے بادشاہ گائی نے جب ریجینالڈ کا یہ انجام دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ وہ ڈرا کہ اب میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس کو یقین ہوگیا کہ تلوار کا دوسرا وار اس کے اوپر پڑنے والا ہے۔ مگر سلطان صلاح الدین نے اس کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا:

لیس من عادۃ الملوك ان یقتلوا الملوك	یہ بادشاہوں کی عادت نہیں کہ وہ بادشاہوں
ولما ھذا فانہ نقض العھد مرۃ بعد مرۃ	کو قتل کریں۔ باقی اس شخص (ریجینالڈ) نے تو
فجری ما جری (النوادر السلطانیہ، ۶۴)	عہد کو بار بار توڑا تھا۔ پس ہوا جو کچھ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے بار بار کے غدر اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ناقابل معافی حد تک ایک برا آدمی ہے۔ مگر صلاح الدین نے اس شخص کو چھوڑ دیا جو اگرچہ دشمن تھا۔ مگر اس نے خبث اور کمینگی اور نقض عہد کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اسی کا نام اسلامی شجاعت ہے۔ سچا اسلامی بہادر وہ ہے جو لڑنے کے ساتھ صلح بھی کرنا جانتا ہو۔ جو انتقام لینے کے ساتھ معاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ کب تلوار اٹھائی جاتی ہے اور کب یہ ضروری ہوتا ہے کہ تلوار کو میان میں ڈال لیا جائے۔

مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حد کے اندر رہتا ہے۔ کسی سے خوش ہو تب بھی وہ ایک حد کے اندر رہ کر خوشی کا اظہار کرے گا۔ وہ اگر کسی سے غصہ ہو جائے تب بھی اس کا غصہ اس کو حد سے باہر کرنے والا ثابت نہیں ہوگا۔ مومن کی یہ صفت اس کو قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بنا دیتی ہے۔

تاریخ کا صفحہ

اسپین میں تقریباً ۸۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ ۱۴۹۲ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ خاتمہ کے وقت بھی مسلمان اپنے حریف اسپینیوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مسیحیوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسیحیوں نے متحد ہو کر اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی اور مسلمانوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے اپنے آپ کو بے حد کمزور کر لیا۔

مسلم دور حکومت میں بھی اسپین کا ایک نسبتاً چھوٹا حصہ مسیحیوں کے پاس تھا۔ اس کو اپنا سیاسی مرکز بنا کر وہ مسلم حکومت کے خلاف کارروائی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر آخری دور میں اپنا رقبہ کافی بڑھا لیا تھا اور مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ (Granada) رہ گیا تھا۔

دور آخر کا ایک مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن تھا۔ مسیحی حکمراں فردی نند (Ferdinand II) نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر تھا۔ اس نے فردی نند کو جواب میں لکھا کہ " غرناطہ کے دار الضرب میں اب سونے کے سکوں کے بجائے فولادی تلواریں تیار کی جارہی ہیں تاکہ مسیحیوں کی گردنیں ماری جائیں" اس کے بعد دونوں کے درمیان کئی مسلح تصادم ہوئے۔ آخر کار ۸۸۷ھ میں لوشہ کے مقام پر دونوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس میں فردی نند کی فوجوں کو مکمل شکست اور سلطان ابوالحسن کی فوجوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

اس کے بعد فردی نند نے از سر نو اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اس وقت مسیحی اسپین میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک اراغون (Aragon) جہاں فردی نند کی حکومت تھی۔ دوسرا قسطلہ (Castile) جہاں ملکہ ازبیلا (Isabella I) تخت کی مالک تھی، فردی نند نے یہ دانش مندی کی کہ ازبیلا کو راضی کر کے ۱۴۶۹ء میں اس سے نکاح کر لیا۔ اس طرح دونوں کو ملا کر ایک بڑی مسیحی سلطنت وجود میں آگئی۔

ایک طرف مسیحی دنیا میں یہ اتحادی واقعہ ہوا۔ دوسری طرف یہ اختلافی واقعہ پیش آیا کہ سلطان ابوالحسن کے لڑکے ابوعبداللہ محمد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی، وہ سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ اب سلطان ابوالحسن کی حکومت صرف چار ہزار مربع میل پر مشتمل ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف فردی نند کی سلطنت کا رقبہ بڑھ کر سوا لاکھ مربع میل ہو گیا۔ اس صدمہ کے بعد

سلطان ابوالحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی بینائی بھی ختم ہوگئی۔

سلطان ابوالحسن اس کے بعد غرناطہ کے تخت سے دستبردار ہوگیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو سلطان مقرر کیا۔ اس کے بعد ایک سازش کے تحت ابوعبداللہ زغل کو سلطنت سے ہٹا دیا گیا اور ابوعبداللہ محمد پورے سلطنتِ غرناطہ کا حکمراں بن گیا۔ مگر اس کے اندر اپنے باپ والی دانشمندی موجود نہ تھی۔ چند مقابلوں میں اس نے مسیحی حکمراں سے شکست کھائی۔

آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قلعہ کو مسیحی فوجوں نے گھیر لیا۔ ابوعبداللہ محمد جس نے اپنے اور اپنے چچا کے مقابلہ میں بہادری دکھائی تھی وہ مسیحی فوجوں کے مقابلہ میں صرف بزدل ثابت ہوا۔ آخر کار ۲ جنوری ۱۴۹۲ کو اس نے قلعہ اور غرناطہ کی دستبرداری کے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ پر ایک طرف فاتح فردی نند نے اپنا دستخط ثبت کیا۔ اور دوسری طرف مفتوح ابوعبداللہ محمد نے۔

ایک مورخ نے اسپین کے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غرناطہ کے آخری مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن نے فردی نند اور ازبیلا کو شکست دی تھی۔ مگر اس کے اپنے لڑکے ابوعبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی جو آخر کار اس کے باپ کے زوال کا سبب بنی۔

The last ruler of Granada, Sultan Abul-Hasan, defeated Ferdinand II (1452-1516) and Queen Isabella, but his own son, Abu Abdullah, made a coup against his father which resulted to the downfall of his father.

اس دنیا میں باہمی اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے اور باہمی اختلاف سب سے بڑی کمزوری۔ یہ بلاشبہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے۔

اختلاف کا سبب کیا ہوتا ہے اور اتحاد کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جب لوگوں کے اوپر ذاتی مفاد کا غلبہ ہو جائے تو ان کے درمیان اختلاف ابھر آئے گا۔ اور جب وہ قومی مفاد کو اہمیت دیں تو وہ باہم متحد رہیں گے۔ قوم کے وسیع تر مفاد کا احساس انفرادی اختلافات پر غالب آجاتا ہے۔ لوگ اختلاف کے باوجود متحد رہتے ہیں۔ لوگ اختلاف کے باوجود اپنے اختلاف کو اپنی ذات تک رکھتے ہیں، وہ اپنے اختلاف کو اجتماعی تعلق میں موثر نہیں ہونے دیتے۔

ماضی اور حال

ہارون الرشید (۸۰۹ - ۷۶۶) عباسی دور کا مشہور خلیفہ ہے۔ اس کی حکومت مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو اس کی زبان سے نکلا: امطری حیث شئتِ فسیأتینی خراجكِ (جہاں چاہے جاکر برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا۔ اس نے فرانس کے بادشاہ شارلیمان (۸۱۴ - ۷۴۲) کے لیے ایک گھڑی بطور تحفہ بھیجی تھی۔ یہ گھڑی پانی سے چلتی تھی اور وقت بتانے کے لیے آواز کرتی تھی۔ اس کو دیکھ کر شارلیمان کے درباری حیران رہ گئے۔ وہ اس کی تشریح نہ کر سکے۔ انھوں نے گمان کیا کہ اس گھڑی کے اندر ایک شیطان ہے جو اس کو حرکت دیتا ہے (اهدى لشارلمان ساعة مائية دقاقة۔ احتار رجال شارلمان فی تفسیرها وظنوا أن فیها شیطاناً یحرکها)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کا ایک واقعہ عرب تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے، اس زمانہ میں نقفور اوّل (NICEPHORUS I) روم کی باقی ماندہ سلطنت کا جانشین تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس کی حکومت عباسی خلافت کو جو خراج دے رہی تھی، اس کو روک دے۔ اس نے ہارون الرشید کو ایک خط لکھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

من نقفور ملك الروم إلى هارون ملك العرب۔ اما بعد فإن الملكة التی كانت قبلی اقامتك مقام الرُّخ واقامت نفسها مقام البیذق۔ فحملت إلیك اموالها احمالا۔ وذلك لضعف النساء وحمقهن۔ فإذا قرأت كتابی فاردد ما حصل قبلك من اموالها والا فالسیف

شاہ روم نقفور کی طرف سے شاہ عرب ہارون کے نام

اس کے بعد یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جو ملکہ تھی اس نے تم کو رخ (خیالی قسم کا بڑا جانور) کی حیثیت دے دی اور اپنے آپ کو بیذق (شطرنج کا پیادہ) سمجھ لیا۔ چنانچہ اپنا مال لاد کر تمہارے پاس بھیج دیا۔ یہ عورتوں کی کمزوری اور ان کی بے وقوفی کی وجہ سے ہوا۔ پس جب تم میرے اس کو پڑھو تو اس کا جو مال تم کو اس

بیننا وبینک (تاریخ الخلفاء للسیوطی، ۲۶۷) سے پہلے پہنچا اس کو مجھے لوٹا دو۔ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔

ہارون الرشید نے جب اس خط کو پڑھا تو وہ سخت غضب ناک ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے قلم دوات منگوائی۔ اور اسی خط کی پشت پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ہارون امیر المومنین کی طرف سے رومی کتے نقفور کے نام، اے کافر عورت کے بچے، میں نے تمہارا خط پڑھ لیا۔ اس کا جواب تم جلد ہی دیکھ لو گے (۲۶۸)

اس جواب کو بھیجنے کے فوراً بعد خلیفہ نے تیاری کا حکم دے دیا۔ اور پھر ایک طاقت ور فوج لے کر تیزی سے رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے نقفور سے کئی لڑائیاں لڑ کر اس کو بری طرح شکست دی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور ہو گیا کہ دوبارہ بغداد کو خراج دینے پر راضی ہو جائے۔

نقفور سے پہلے ملکہ آئرین (Irene) رومی تخت کی وارث تھی۔ ۸۰۲ میں ایک انقلاب ہوا اور ملکہ آئرین کی حکومت ختم ہو گئی۔ نقفور ۸۱۱ تک حکمراں رہا:

When Nicephorus withheld the tribute that Irene had agreed to pay the Baghdad calipah Harun ar-Rashid, was followed, and Arab forces defeated the Byzantine emperor at Crasus in Phrygia (805). In 806 Harun captured Heraclea, Tyana, and other places. Nicephorous was forces to agree to pay a yearly tribute of 30,000 gold pieces. (EB-VII/322)

جب نقفور نے اس خراج کو روک دیا جس کو ملکہ آئرین نے بغداد کے خلیفہ ہارون الرشید کو دینا منظور کیا تھا تو دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ عرب فوجوں نے بازنطینی بادشاہ کو ۸۰۵ میں کراس کے مقام پر شکست دی۔ ۸۰۶ میں ہارون نے ایشیائے کوچک پر ایک لاکھ ۳۵ ہزار سے زیادہ لشکر کے ساتھ حملہ کیا اور ہرقل اور ریانہ اور دوسرے مقامات پر قبضہ کر لیا۔ نقفور کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بغداد کو سالانہ ۳۰ ہزار سونے کا سکہ ادا کرے۔

دورِ اوّل کے مسلمانوں کی طاقت کا راز صرف تلوار نہ تھی۔ ان کی طاقت کا اصل راز یہ تھا کہ وہ علم میں دوسری قوموں سے حیران کن حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے۔ علم ہی کے ذریعہ آدمی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے۔ علم ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی منصوبہ بندی کر سکے۔ علم اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

رحم دل فاتح

۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء مسلم تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جب کہ صلیبی طاقتوں کے ۸۸ سالہ قبضہ کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

۱۰۹۵ء میں پوپ نے یورپی قوموں کو صلیبی جنگ پر ابھارا تاکہ "مسیح کی مقدس قبر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیا جاسکے"۔ اس کے جواب میں یورپ کے مسیحی حکمراں جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہولناک لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ مسیحیوں نے فلسطین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فتح کے نشہ میں انھوں نے تمام انسانی قدروں کو پامال کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کو فلسطین سے بزور نکالنے لگے اور انھیں ہلاک کرنا شروع کیا۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ حال میں ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) میں اس کے بارہ میں ایک مفید معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی مستشرق آلان روکو کے فرانسیسی مقالہ کا ترجمہ ہے جو مصطفیٰ کمال الجابری نے کیا ہے۔

صلاح الدین ایوبی ۲۷ نومبر ۱۱۷۴ء کو دمشق پہنچے۔ پھر وہ حلب گئے۔ جلد ہی اپنی خصوصیات کی بنا پر انھیں دمشق، حلب، قاہرہ کے حاکم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے دمشق کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ خلیفہ بغداد نے ان کو مصر اور شام کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اپنی صفات کی بنا پر وہ عامۃ الناس کے محبوب بن گئے۔ ان کو سیف الاسلام کہا جانے لگا۔

صلاح الدین نے اس کے بعد اپنی فوج کو طاقتور انداز میں منظم کیا۔ اور پھر انھوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جو فلسطین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ارض مقدس سے صلیبی طاقتوں کو نکال کر رہیں گے۔ اعلیٰ ترین جنگی منصوبہ ثابت کرتا ہے کہ صلاح الدین جنگی امور میں عبقری مہارت رکھتے تھے (خطۃ حربیۃ عالیۃ المستوی تدل علیٰ عبقریۃ صلاح الدین العسکریۃ) انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صلیبی فوجوں کو پانی سے محروم کر دیا اور حطین کے مقام پر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

صلاح الدین نے مسلسل فتوحات حاصل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۱۸۷ء میں قلعۃ القدس پر قبضہ کرلیا۔ صلیبیوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں فلسطین کے مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے۔ مگر صلاح الدین نے فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ ان کی تلوار صلیبی جارحیت کے خلاف میان سے نکلی تھی، صلیبی جارحیت کو ختم کرتے ہی وہ دوبارہ میان میں چلی گئی۔

فرانسیسی مستشرق نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے مسیحیوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ معاملہ کیا۔ قدس میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے حکم جاری کیا کہ اسپتالوں میں جو مسیحی لوگ زیر علاج ہیں، ان کا علاج جاری رکھا جائے۔ تمام بڑے بڑے چرچ مسیحیوں کے قبضہ میں بدستور باقی رہے۔ انھوں نے ۱۵۰۰۰ مسیحیوں کے اوپر سے جزیہ معاف کردیا، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ مفلسی کی وجہ سے جزیہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ایک بڑے صلیبی عہدیدار کو اجازت دی کہ وہ چرچ کے خزانہ کو اپنے ساتھ جہاں چاہے لے جائے۔ وغیرہ

صلیبی فوجی جو گرفتار ہوگیے تھے، ان کی عورتیں صلاح الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے صلاح الدین کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے فوجی شوہروں کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے تمام فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

فرانسیسی مورخ گستاؤ لیبان یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ تاریخ نے عربوں سے زیادہ رحم دل فاتح نہیں دیکھا

فقد كان المورخ الفرنسي (جوستاف لوبون) على حق عندما قال جملته المأثورة: لم يعرف التاريخ فاتحاً ارحم من العرب (صفحه ۱۰۱)

جنگ کے بارہ میں یہی اسلام کا اصول ہے۔ اسلام جارحیت کے خلاف دفاع کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ مگر جب جارح کی تلوار ٹوٹ جائے تو اس کے بعد اہل اسلام بھی اپنی تلوار توڑ لیتے ہیں۔ اسلام میں دفاع ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں حفاظتی کارروائی ہے مگر انتقامی کارروائی نہیں۔ اسلام میں اپنا حق وصول کرنا ہے مگر اسلام میں یہ جائز نہیں کہ آدمی دوسرے کے خلاف دست درازی کرنے لگے۔ اسلام جس دل میں اترتا ہے وہ اس کو مثبت احساسات میں جینے والا انسان بناتا ہے نہ کہ منفی احساسات میں جینے والا انسان۔

ظالم کا دل ہل گیا

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق، ایران، ترکستان میں مسلم تہذیب وسلطنت کو زیر وزبر کر ڈالا۔ مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور تقریباً پوری کی پوری قوم مسلمان ہوکر اسلام کی پاسبان بن گئی۔ اس زمانہ کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جارہے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا جو ایران پر حکومت کررہی تھی۔ شیخ جمال الدین ایرانی چلتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ تاتاری اس زمانہ میں ایرانیوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ شہزادہ کے سپاہیوں نے شکارگاہ میں ایک ایرانی کی موجودگی کو برا فال سمجھا اور ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ اس گستاخ ایرانی کو شہزادہ کے پاس لے گئے۔ شہزادہ ان کو دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا: تم ایرانیوں سے تو ایک کتا اچھا ہے۔ شیخ جمال الدین تاتاری کے اس نفرت انگیز سوال کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے: اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔

تاتاری اگرچہ وحشی تھے مگر ان میں فطری مردانگی کا جوہر موجود تھا۔ وہ منافقت سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تغلق تیمور کے لئے سخت جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہوجاؤں تو اس ایرانی کو میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کئے گئے تو وہ ان کو تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ دین کیا ہے۔ شیخ جمال الدین نے نڈر ہوکر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادہ کا دل ہلا دیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنا اسے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہوگیا کہ اسلام قبول کرے۔ تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا، بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لاسکتا۔ اس نے شیخ جمال الدین سے کہا: اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

شیخ جمال الدین اپنے گھر واپس آگئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ تغلق تیمور کی تخت نشینی کی خبر انھیں معلوم ہو۔ مگر یہ نوبت ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لڑکے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادہ کا قصہ بتاکر کہا کہ دیکھو میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مقدر نہیں۔ اس لئے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اس کو میرا اسلام کہنا

اور بے خوفی کے ساتھ اس کو شکار کا واقعہ یاد دلانا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادہ کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی ان کو خبر ملی کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو دربانوں نے خیمہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ کیوں کہ ان کے پاس دربانوں کو بتانے کے لئے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ خیمہ کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

ایک روز وہ فجر کے لئے اٹھے۔ اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کیا۔ یہ آواز خیمہ کے اس حصہ تک پہنچ گئی جہاں شاہ تغلق تیمور سو رہا تھا۔ بادشاہ کو ایسے وقت میں یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ دیکھو یہ کون پاگل ہے جو اس وقت ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہا ہے۔ اس کو پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ شیخ رشید الدین فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دئے گئے۔

اب بادشاہ نے ان سے سوال و جواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہے ہو۔ شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہو جائے تو تم میرے پاس آنا۔ مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آگیا۔ اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

بادشاہ نے پورے قصہ کو غور کے ساتھ سنا۔ آخر میں بولا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمہارے انتظار میں تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا کہ ایک راز میرے سینہ میں تھا جس کو آج اس ایرانی فقیر نے یاد دلایا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں، تمہاری کیا رائے ہے۔ وزیر نے کہا کہ میں بھی یہی راز اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا اور بالآخر ایران کی پوری تاتاری قوم نے بھی۔

تاریخ کا ایک صفحہ

چودھویں صدی عیسوی میں دو بڑے مسلم حکمراں تھے۔ ایک تیمور لنگ (۱۴۰۵-۱۳۳۶) اور دوسرا بایزید اول (۱۴۰۲-۱۳۸۹) تیمور لنگ سمرقند (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید اول اناتولیہ (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس کا دار السلطنت ایڈریانوپل تھا۔

ان دونوں مسلم حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت ہولناک جنگ ہوئی جس کو تاریخ میں جنگ انگورہ (Battle of Angora) کہا جاتا ہے۔ انگورہ موجودہ انقرہ کا انگریزی نام ہے۔ تیمور نے چاہا کہ وہ بایزید کی سلطنت کے ایشیائی علاقہ پر قبضہ کر لے۔ یہاں سے دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔ بایزید نے تیمور کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ تیمور نے بایزید کے دشمنوں سے تعلق قائم کیا، وغیرہ۔

اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۴۰۲ میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دونوں کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ دونوں طرف نہایت بہادر لوگ تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان سخت ہولناک لڑائی ہوئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکرا گیے۔ دونوں طرف کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مارے گیے۔ آخر کار بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں تیمور اور بایزید کے برابر کوئی طاقتور بادشاہ موجود نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی تو عالم یہ تھا کہ دور تک خون اور لاشوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس ہولناک جنگ کے سلسلہ میں کچھ لوگ تیمور کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ بایزید کو۔ تاہم ذمہ دار جو بھی ہو، نتیجہ بہر حال ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس لڑائی سے عالم اسلام کو شدید ترین نقصان پہونچا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یورپ جو عثمانی ترکوں کے ذریعہ اسلامی براعظم بننے جا رہا تھا، وہ اس باہمی جنگ کے نتیجہ میں عیسائی براعظم بن کر رہ گیا۔

جنگ کا فیصلہ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ کو ہوا۔ بایزید گرفتار ہو گیا۔ تیمور نے اس کو ایک لوہے کے

کٹہرے میں بند کروایا۔ تیمور اپنے سفروں میں اس کٹہرے کو ساتھ ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اس کی تشہیر کرے۔ سلطان بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کرسکا۔ گرفتاری کے صرف آٹھ ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ خود تیمور بھی اپنی فتح کے ڈھائی سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوکر وہیں چلا گیا جہاں اس نے اپنے مفتوح سلطان کو پہونچایا تھا۔ دنیا میں بظاہر ایک فاتح تھا اور دوسرا مفتوح۔ مگر آخرت نے دونوں کے فرق کو ختم کر دیا۔ آخرت میں دونوں یکساں طور پر خدا کے بندے کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کر دیئے گیے۔

تیمور اور بایزید دونوں نہایت بہادر تھے۔ تیمور کی ہیبت مشرقی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور بایزید کی ہیبت مغربی دنیا پر جس نے اسلام کے حدود دریائے ڈینوب (ہنگری) تک پہونچا دیئے تھے۔

اگر ایسا ہوتا کہ تیمور اپنے عمل کا میدان مشرق کو بناتا اور بایزید مغرب کی سمت میں آگے بڑھتا تو وہ دونوں پورے عالم کو اسلام کے سایہ میں لانے کے لیے کافی ہوجاتے۔ مگر آپس کی لڑائی نے اس امکان کو واقعہ بننے نہیں دیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے تیمور کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے:

> By defeating the Ottoman Sultan Bayezid at Angora (modern Ankara) in 1402 and thus preventing him from extending his domain into Europe, the fall of Constantinople and the death agony of Byzantium were delayed half a century by this Muslim nomad (18/242).

یعنی تیمور نے عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) کے مقام پر ۱۴۰۲ میں شکست دی۔ اس طرح اس نے بایزید کو یورپ میں اپنا اقتدار بڑھانے سے روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی فتح اور بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نصف صدی تک کے لیے موخر ہوگیا۔

مسلمان اکثر دوسری قوموں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنے بھی نقصان پہونچے ہیں، سب اپنوں کی وجہ سے پہونچے ہیں۔ مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں، گزرے ہوئے دور میں بھی اور حال کے زمانہ میں بھی۔ مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

ترک فاتح

ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا جو اب استانبول کہا جاتا ہے۔ یہ مسیحی دنیا کے لیے سب سے زیادہ ہلادینے واقعہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک یونانی کتبہ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعہ نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا :

There has never been and there never will be
a more dreadful happening (p. 336).

حضرت عثمان کی خلافت (۶۴۴ - ۶۵۶) کے زمانہ میں مسلمان ترکی میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں انھوں نے ترک علاقہ میں مزید پیش قدمی کی۔ مگر اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ انتہائی محفوظ جغرافیہ اور بے حد مضبوط قلعہ کی بنا پر اتنا مستحکم تھا کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس کو مسخر نہ کر سکے۔ اس کی تسخیر ۸۰۰ سال بعد صرف ۱۴۵۳ میں ممکن ہوسکی۔

ترکی کا عثمانی سلطان محمد دوم جو محمد فاتح کے نام سے مشہور ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طویل مہم کو کامیابی تک پہنچایا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہایت گہرا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمد ۱۴۵۱ میں تخت پر بیٹھا جو اس وقت ادرنہ (Edirne) میں تھا۔ اس نے خاموش اور مسلسل عمل کے ذریعہ تمام ممکن سیاسی اور فوجی تدبیریں اس مقصد کے لیے مہیا کیں۔

۱۴۵۲ کا پورا سال اس نے باسفورس کے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے میں صرف کیا جہاں سے جنگی کارروائیوں کو منظم کیا جاسکے۔ یہ قلعہ بعد کو قلعہ رومیل (Rameli Hisari) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۳۱ جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا تیار کروایا تاکہ سمندر کے راستہ سے موثر حملہ کیا جاسکے۔ اس نے ہنگری کے ایک استاد اربان (Urban) کو بلاکر اتنی بڑی توپ تیار کرائی جو اس وقت کے یورپ میں ایک نادر چیز تھی۔ یہ توپ سازی بے حد اہم تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ قسطنطنیہ کی مضبوط سنگی فصیل توڑی جاسکی۔

اس قسم کی مختلف ضروری تیاریوں کے علاوہ اس نے مزید یہ کیا کہ بوقت جنگ یونان اور ہنگری کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے ان سے امن معاہدے کیے جن کی شرائط یک طرفہ طور پر ان کے مفاد میں تھیں :

To keep Venice and Hungary neutral, he signed peace treaties favourable to them (11/860).

یہ عین وہی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار فرمائی، اور جس کے ذریعہ آپ نے مکہ کے قریش کو خیبر کے یہودیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش اس کے پابند ہو گئے تھے کہ بوقت جنگ وہ یہود کی مدد نہیں کریں گے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد سلطان محمد خاموش نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس نے جنگی کارروائی کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پوری مہم کے دوران وہ بذات خود اس میں شریک رہا۔ قسطنطنیہ کی مہم کی تیاری اور اس کی کارروائیوں کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس زبردست منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کا آخری تاجدار قسطنطین (Constantine XI) جنگ کرتا ہوا شہر کے دروازے پر مارا گیا۔ ترکی میں مسلمانوں کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس فتح کے بعد ترکی کی راجدھانی ادرنہ (ایڈریانوبل) کے بجائے قسطنطنیہ قرار پائی اور آج تک وہ وہیں قائم ہے۔ اب اس کا نام استانبول ہے۔ قسطنطنیہ گیارہ سو سال سے زیادہ مدت تک مسیحی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم سلطنت کی راجدھانی بنا۔ تقریباً پانچ سو سال تک وہ عظیم عثمانی خلافت کی راجدھانی اور پورے عالم اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بار صرف جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ - ۱۸) میں ختم ہوئی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳) تک اسلامی تاریخ کے تمام بڑے بڑے فاتحانہ واقعات گہری حکمت اور عظیم منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ مسلمان تدبیر اور منصوبہ بندی کے بغیر محض جوش و خروش کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر بالاکوٹ مارچ (۱۸۳۱) سے لے کر اجودھیا مارچ (۱۹۸۹) تک ان کے تمام اقدامات صرف ناکامی پر ختم ہو رہے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی فراست سے بچو۔ کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ مومن کا ایمان اس کو زیادہ بہتر تدبیر کے قابل بنا دیتا ہے۔

ناکامیوں کے بعد

ظہیر الدین محمد بابر (۱۵۳۰ - ۱۴۸۳) فرغانہ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اِس وقت اوزبکستان (ازبیک) میں شامل ہے۔ باپ کے واسطے سے اس کا سلسلہ نسب تیمور سے ملتا ہے اور ماں کے واسطے سے چنگیز خاں سے۔ بابر کا باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ کا حاکم تھا۔ اُس وقت یہ مقام کوہ ہندوکش کے شمال میں ایک چھوٹے پرگنہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

فرغانہ کے پڑوس میں سمرقند تھا جو تیمور کی قدیم راجدھانی تھا۔ یہاں محمد شیبانی خاں کی حکومت تھی جو چنگیز خاں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ بابر کا باپ مستقل اس کوشش میں رہا کہ وہ سمرقند کو فتح کرکے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ باپ کی وفات پر ۱۴۹۴ میں بابر فرغانہ کا حاکم بنا جب کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ باپ کی پیروی میں اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کے لیے اس پر کئی حملے کیے۔ مگر ۱۵۰۱ میں اس کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی موروثی سلطنت فرغانہ کو بھی کھو دیا۔

ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ ایک کم سن بادشاہ کی حیثیت سے بابر نے فرغانہ کو کھو دیا۔ وہ مصیبتوں کے ایک دور میں داخل ہوگیا۔ اس کو خود اپنے پدری اور مادری چچاؤں سے لڑائی لڑنی پڑی۔ مگر ۲۰ سالہ مصیبت اور جنگ کے دوران اس نے اپنے حریفوں (ترک، مغل، ایرانی اور افغانی) سے کامیاب جنگی تدبیریں اور حربی طریقے سیکھ لیے۔ اس نے ان طریقوں میں سائنٹفک امتزاج پیدا کیا۔ سالہا سال کی شکستوں اور وطن سے محرومی اور طرح طرح کی مشکلات کے نتیجہ میں وہ ایک اچھا فوجی جنرل بن گیا۔ اپنے باپ دادا کے علاقہ کو حاصل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی ناکامی کے بعد بابر نے اپنی توجہ ہندستان کی طرف موڑ دی:

As a boy king he lost Farghana and passed through a period of adversity, having to fight his own paternal and maternal uncles. During 20 years of adversity and warfare Babur trained himself by appropriating military tactics and modes of warfare of his adversaries – Turks, Mongols, Persians, and Afghans, and he made a scientific synthesis of these systems. He became a good general through a career of many defeats and through years of homeless wanderings, privations and hardships... Foiled in his design of recovering his ancestral domain in Central Asia, Babur turned his attention to India. (9/378).

بابر نے پہلی بار ۱۵۱۹ میں ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرکے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے وطن فرغانہ کو اس نے ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے چھوڑا تھا، مگر ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ کو آگرہ میں جب اس کا انتقال ہوا تو تاریخ اس کو اپنے صفحات میں ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے درج کر چکی تھی۔

بابر کو کامیابی اس حوصلہ مندانہ عمل کی بنا پر ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کیا۔ اس نے خود ناکامی کے اندر وہ پہلو تلاش کر لیے جو اس کو عظیم تر کامیابی کی طرف لے جانے والے ہوں۔

بابر کو جب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس نے شکایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ان کی سازشوں اور ان کے تخریبی منصوبوں کی فہرست مرتب کرنے لگے۔ وہ اپنے حریفوں کے خلاف لفظی گولہ باری میں مشغول ہو جائے۔

اس کے بجائے بابر نے اپنا ذہن اس سوچ میں لگایا کہ میرے حریفوں کو میرے مقابلہ میں کامیابی کیونکر حاصل ہوئی۔ میری ہار اور ان کی جیت کا سبب کیا تھا۔ بابر کی اس سوچ نے اس کو بتایا کہ اس کے حریف زیادہ کارگر تدبیروں کو جانتے تھے۔ انھوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کرکے اس کو ناکام بنا دیا۔

اب بابر نے اپنے حریف کے حربوں اور ان کی تدبیروں کو اپنانا شروع کیا۔ اس نے مزید غور و تجربہ کے ذریعہ ان کو مزید ترقی یافتہ بنایا۔ اس طرح زیادہ بہتر طور پر مسلح ہو کر اس نے ایک نئے وسیع تر میدان (برصغیر ہند) کی طرف رخ کیا۔ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ اپنے وطن میں اس نے جتنا کھویا تھا، اس سے بہت زیادہ اس نے وطن کے باہر حاصل کر لیا۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامیوں کا پیش آنا لازمی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اپنی ناکامی کو اپنے لیے غذا بنا سکے۔ وہ کھونے میں پانے کا راز دریافت کر لے۔

مومن سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ کیونکہ مومن کا اللہ پر بھروسہ اس کو کبھی مایوس اور پست ہمت نہیں ہونے دیتا۔ وہ ہر حال میں پرامید رہتا ہے، کیونکہ ہر حال اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ ضرور اس کا ساتھ دے کر اس کو

میدانِ جنگ میں نماز

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۱۸ - ۱۷۰۷) مشہور مغل حکمراں ہے۔ اس کے زمانہ میں مغل سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ اس کی زندگی کا تقریباً نصف حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ اس کی بہادری کے بہت سے عجیب واقعات تاریخ کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔

اورنگ زیب نوجوانی کی عمر ہی میں اپنی امتیازی صلاحیتوں کی بنا پر شاہی خاندان میں نمایاں ہو گیا تھا۔ جب وہ نوجوان تھا، اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مست ہاتھی اس کے سامنے آگیا۔ اس وقت وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ پہلے اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہاتھی کا مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن گھوڑا بدکنے لگا۔ اورنگ زیب اس سے ہراساں نہیں ہوا۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور زمین پر آکر تلوار کے ذریعہ ہاتھی کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ہاتھی کو زیر کر لیا۔

انھیں صفات کی بنا پر شاہ جہاں اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ نوجوانی کی عمر ہی سے اس کو بڑی بڑی مہموں پر بھیجنے لگا تھا۔ اورنگ زیب لڑائی کے گُر سے خوب واقف تھا۔ وہ دشمن کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرتا تھا اور کبھی گھبراتا نہ تھا۔ مستقل مزاجی کی صفت اس کے اندر کمال درجہ میں تھی۔ ان تمام صفات کے باوجود وہ انتہائی سادہ مزاج تھا اور بالکل معمولی زندگی گزارتا تھا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جزیرہ نمائے ہند میں (اورنگ زیب کے زمانہ میں) اگرچہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے کچھ ہولڈنگ رکھتی تھی، مگر کابرٹ کے زمانہ میں اور اس کے بعد تک فرانسیسیوں کی پیش قدمی بہت سست رہی۔ اس کی وجہ جزئی طور پر یہ تھی کہ آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب انڈیا پر حکومت کر رہا تھا اور یہاں غالب تھا:

In the Indian peninsula, where the English East India Company had holdings, French progress was slow in Colbert's time and after, partly because the last great Mughal emperor, Aurangzeb, reigned and dominated India. (4/887)

اورنگ زیب کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ۱۶۴۷ میں پیش آیا۔ جب کہ اس نے عین میدان کارزار میں گھوڑے سے اتر کر نماز ادا کی۔ ڈاکٹر آر سی مجمدار اور ڈاکٹر ایچ سی رائے چودھری نے اپنی مشترک کتاب (An Advanced History of India) میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں درج کیا ہے :

Aurangzeb was a pious Muslim, and with the zeal of Puritan he scrupulously observed the injuctions of the Holy Qur'an. Once during the Balkh campaign he knelt down to finish his prayers at the proper time, though the fighting was going on all around him. (p. 501-502)

اورنگ زیب ایک پارسا مسلمان تھا۔ اور ایک سخت محتاط مذہبی انسان کی طرح جوش کے ساتھ وہ مقدس قرآن کے احکام کی اطاعت کرتا تھا۔ ایک بار بلخ کے معرکہ کے دوران وہ زمین پر جھک گیا تاکہ ٹھیک وقت پر اپنی نماز کو مکمل کرے۔ اگرچہ اس وقت اس کے چاروں طرف لڑائی جاری تھی۔

جنگ وہ لمحہ ہے جب کہ ہر طرف تیر، تلوار اور نیزوں کی جھنکار ہوتی ہے۔ چاروں طرف قتل اور خون کا بھیانک منظر دکھائی دیتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا، اس وقت عین میدان جنگ میں نماز کے لیے کھڑا ہونا اور اطمینان کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے وہ کونسی طاقت ہے جو ایک انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس قسم کا حیرت ناک واقعہ ظہور میں لاسکے۔

یہ اللہ پر ایمان کی طاقت ہے۔ ایک مومن جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کی حمایت میں آگیا ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ جو ہر خطرہ کے مقابلہ میں اس کی طرف سے ناقابل تسخیر ڈھال بن سکتا ہے۔ یہ احساس مومن کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو اپنے سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایمان ایک عظیم عقیدہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک عظیم طاقت بھی۔

حسد کے نقصانات

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں سلطان محمد بن تغلق سے بغاوت کرکے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد سے ہے۔ اس بنا پر اس کا خاندان بہمنی خاندان کہا جاتا ہے۔

حسن گنگو نے گلبرگہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا اور اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۵۹ میں حسن گنگو کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی ہوا۔ اس نے شہر بیدر بسایا اور گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔

دکن کی یہ بہمنی سلطنت ۱۸۰ سال تک رہی اور ۱۵۲۷ء میں ختم ہوگئی۔ اس سلطنت کا وزیر ۱۴۶۳ سے لے کر ۱۴۸۱ تک محمود گواں تھا۔ اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کا سب سے زیادہ کامیاب زمانہ ہے۔ اس نے سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اپنے تدبر سے اس کو نہایت مستحکم کیا۔ مورخین نے بالاتفاق اس کی اعلیٰ لیاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ " محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے " انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں :

The most notable personality of the period,
a leading administrator (9/372)

(اس عہد کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت، ایک اعلیٰ انتظام کار) این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۸۷) کے مصنفین نے ان الفاظ میں اس کے اخلاص کا اعتراف کیا ہے :

Though possessed of wide powers, Mahmud Gawan never abused his authority. By virtue of his skilful diplomacy and successful military operations, he brought the dominions of the Bahmanis to an extent never achieved by former sovereigns
An Advanced History of India (1987) p. 354

اگرچہ محمود گواں کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے مگر اس نے کبھی اپنے اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اپنی ماہرانہ سیاست اور اپنے کامیاب فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے بہمنی سلطنت کے

رقبہ کو ایسی حدود تک پہونچایا جو پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں کبھی نہیں پہونچا تھا۔

محمود گواں اس قدر محنت کا عادی تھا کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کر لی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔

محمود گواں کے زمانہ میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔ محمود گواں نے اس اقتدار کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر بھی دربار کے امراء اس کے قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کر لی۔ اس کے بعد ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔ وہ بادشاہ کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے وجے نگر کے راجہ کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس لائق وزیر کو قتل کرا دیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے۔ اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک سال کے اندر ۱۲ مارچ ۱۴۸۲ کو مر گیا۔

محمود گواں کے خلاف اس شرم ناک سازش کا اصل دماغ ملک نائب تھا۔ مگر محمود گواں کے بعد اس کو بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ اب دربار میں اس کے مخالفین پیدا ہو گیے۔ دوبارہ اس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۱۴۸۶ میں ملک نائب کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ مقتول کے خاتمہ کے صرف پانچ سال بعد خود قاتل کا بھی ذلت کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

محمود گواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت دوبارہ سنبھل نہ سکی۔ ۱۵۲۴ء میں اس کے آخری حکمراں کی وفات کے ساتھ بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ایک سلطنت پانچ الگ الگ سلطنت میں تقسیم ہو گئی۔

عالی ظرفی

مظفر حلیم (متوفیٰ ۹۳۲ھ) گجرات کا حاکم تھا اور محمود خلجی مانڈو (احمد آباد) کا۔ دونوں ہم زمانہ تھے۔ پاس پاس ہونے کی وجہ سے دونوں میں باہم لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ محمود خلجی اکثر گجرات پر حملہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس "خوبصورت اور سرسبز" ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ تاہم اسے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس درمیان میں ایک واقعہ پیش آیا جو بظاہر مظفر حلیم کے لئے بہت خوش کن تھا۔ وہ یہ کہ اس کے حریف محمود خلجی کے وزیر منڈلی رائے نے موقع پاکر بغاوت کردی۔ اس کی بغاوت کامیاب رہی، اس نے سلطان کو تخت سے بے دخل کردیا اور خود ملک پر قابض ہوگیا۔ تاہم سلطان محمود خلجی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔

اب اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا کرے۔ اس کی نظر میں صرف ایک ہی شخص تھا جو اس نازک وقت میں اس کی مدد کرسکتا تھا اور یہ وہی سلطان مظفر حلیم تھا جس کے اوپر وہ اپنے اقتدار کے زمانہ میں بار بار حملے کرچکا تھا۔ سلطان محمود خلجی کو معلوم تھا کہ سلطان مظفر حلیم اگرچہ اس کا حریف ہے مگر وہ ایک بہادر اور شریف انسان ہے۔ اور شریف اور بہادر انسان کی یہ صفت ہے کہ وہ مدد مانگنے والے کی مدد کرتا ہے، خواہ وہ اس کا حریف اور دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

سلطان محمود خلجی نے کئی دن کے حیص بیص کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلطان مظفر حلیم کے پاس جائے گا اور اس سے مدد طلب کرے گا۔ وہ جرأت کرکے اس کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے باغی وزیر کے خلاف اس کی مدد کرے۔

سلطان مظفر حلیم کو موقع تھا کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل کرے۔ وہ طعن و تشنیع کرکے اس کے بارے میں اپنے سینہ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ فوراً اپنے حریف سلطان کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ سلطان مظفر حلیم نے حکم دیا کہ اس کی فوج مانڈو کی طرف کوچ کرنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس نے محمود خلجی کو لیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ مانڈو کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وزیر منڈلی رائے کی فوج سے زبردست مقابلہ ہوا۔ بالآخر منڈلی رائے کی فوج نے ہتھیار ڈال دئے اور گجرات دوبارہ فتح ہوگیا۔

اب فوجیوں کی فاتحانہ نفسیات نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ سلطان مظفر حلیم کے فوجی سرداروں نے کہا کہ یہ ملک اب آپ کا ہے۔ کیونکہ اس کو آپ کی فوجوں نے لڑکر فتح کیا ہے۔ آپ اس کو محمود خلجی کے حوالے نہ کریں بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیں۔ اس معاملہ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان مظفر حلیم کے لئے یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ تاہم اس نے جرأت سے کام لیا اور اپنے فوجی سرداروں کے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کو یہ بات اپنی بہادری اور غیرت کے خلاف معلوم ہوئی کہ جس ملک کو اس نے سلطان محمود خلجی کے نام پر فتح کیا ہے، اس کو سلطان کے حوالے نہ کرے اور خود اس پر قابض ہو جائے۔ سلطان کی جو شرافت اس کی محرک بنی تھی کہ وہ اپنے دشمن کی مشکل وقت میں مدد کرے، وہی شرافت دوبارہ اس میں مانع ہوگئی کہ وہ دشمن کی کمزوری کا غلط فائدہ اٹھائے اور اس کی چیز کو خود اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس کے ایک طرف شرافت تھی اور دوسری طرف ملک۔ اس نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کو پانے کی خاطر اپنی شرافت کو کھو دے۔

تاہم سلطان مظفر حلیم کو اندیشہ تھا کہ اس کی فوج اگر مفتوحہ علاقہ میں ٹھہری رہی تو فتح کے جوش میں وہ کوئی نازک مسئلہ نہ کھڑا کر دے اور موجودہ فضا باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک حکم جاری کیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ اس کی فوجوں کا کام اب یہاں ختم ہو چکا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی فوج کا کوئی شخص مزید آگے بڑھ کر مفتوحہ شہر کے اندر نہ داخل ہو۔ تمام کی تمام فوج بلا تاخیر اپنے وطن کی طرف واپس چلی جائے۔

اس حکم پر فوراً عمل ہوا۔ سلطان مظفر حلیم کی فوج اپنے فتح کئے ہوئے ملک کو سلطان محمود خلجی کے حوالے کر کے گجرات واپس چلی گئی۔ سلطان مظفر حلیم نے ایک مفتوحہ ملک کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اپنی شرافت اور اپنی بہادری کو محفوظ رکھ سکے (ظفر الوالہ، از آصفی)

کوئی انسان کیا ہے، ہمیشہ غیر معمولی حالات میں معلوم ہوتا ہے اور ان غیر معمولی حالات میں سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی فاتح اور غالب کی حیثیت میں ہو۔ اپنے کو فتح و غلبہ کے مقام پر پاکر بھی جو شخص شرافت اور انصاف پر قائم رہے وہی وہ انسان ہے جو امتحان میں پورا اترا۔

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی) کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہوگئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

مجسٹریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کئے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ انکی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کر سکے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمھاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کر دوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے، یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمھارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمھارے حق میں کر دوں گا۔" ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے والد مولانا محمود بخش (م ۱۲۵۸ھ) تھے مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریب موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچہری پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ مجسٹریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منھ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کرکے تشریف لائیں، کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ

کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہوگئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتایئے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا" مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔ ان نومسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سربلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریقہ حق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کامیاب ہوتا ہے نہ کہ افادی موقف۔

مفاد کی قربانی

دور اول میں جنوبی اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس علاقہ کو اصطلاحی طور پر اندلس کہا جاتا ہے۔ تاہم شمالی اسپین کا ایک حصہ ہمیشہ عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس بنا پر دونوں قوتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ اور مقابلہ کی صورت قائم رہتی تھی۔ گیارھویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں حالات بہت بگڑ گئے۔ مسیحی بادشاہ الفانسو (Alfonso VI) نے ۱۰۸۵ء میں طلیطلہ (Toledo) کو فتح کر کے اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی۔ اس نے مسلم شہروں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے یہ حملے اتنے شدید تھے کہ یہ اندیشہ محسوس کیا جانے لگا کہ بہت جلد اسپین سے مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس وقت المعتمد بن عباد اسپین کے مسلم علاقہ کا سلطان تھا۔ اس کا دار السلطنت اشبیلیہ (Selves) تھا۔ اس کو بہت مشکل حالات میں حکومت کا نظام سنبھالنا پڑا۔ پڑوس کے مسیحی حکمراں نہایت بے رحمانہ طور پر مسلم علاقہ کی طرف اقدام کر رہے تھے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا اسپین دوبارہ مسیحی اقتدار کے تحت آجائے گا :

> He was destined to rule in difficult times: neighbouring prices were resuming the inexorable advance that in time would bring all of Spain once again under Christian rule. (VII/138)

الفانسو نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد المعتمد سے اپنے سفیر کے ذریعہ خراج ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ المعتمد نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور اس کو خراج کی رقم بھیج دی۔ یہ خراج چاندی کے سکوں کی صورت میں تھا۔ مسیحی حکمراں نے چاندی کے سکے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اتنے ہی مقدار میں سونے کے سکہ کا مطالبہ کیا۔ اب المعتمد کو غصہ آگیا۔ اس نے مسیحی سفیر کو قتل کر دیا اور زر خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

الفانسو اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک متکبر بادشاہ تھا۔ مذکورہ واقعہ کے بعد وہ سخت برہم ہوا اور سختہ ارادہ کر لیا کہ اشبیلیہ پر حملہ کر کے نہ صرف اپنا انتقام لے بلکہ ہمیشہ کے لیے مسلم

سلطنت کا خاتمہ کر دے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب اسپین کی باقی ماندہ مسلم سلطنت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پورے ملک پر مسیحیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

حالات کی نزاکت کے پیش نظر المعتمد نے فیصلہ کیا کہ وہ مراکش کے طاقت ور سلطان یوسف بن تاشقین سے مدد طلب کرے۔ دوبارہ یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں یہ واضح اندیشہ تھا کہ الفانسو کی جگہ یوسف بن تاشقین اس کے ملک پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے کچھ مشیروں نے سنجیدگی کے ساتھ اس اندیشہ کا اظہار کیا۔ المعتمد نے اس وقت اپنے مشیروں کو جو تاریخی جواب دیا وہ یہ تھا :

رعي الجمال ولا رعي الخنازير۔	اونٹ کی چرواہی منظور ہے مگر خنزیر کی
(لئن اكون اسيرا لدى ملك	چرواہی منظور نہیں۔ اگر میں ایک عربی مسلم
عربي مسلم أرعى له الجمال	بادشاہ کا قیدی بن جاؤں اور اس کے
خير من ان اكون اسيرا لدى	اونٹوں کو چراؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ
ملك الافرنج أرعى له	میں فرنگی بادشاہ کا قیدی بنوں اور اس کے
الخنازير)	خنزیروں کو چراؤں۔

اس کے بعد المعتمد نے سلطان یوسف بن تاشقین کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔ وہ افریقہ سے ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے وہ اسپین میں داخل ہوا۔ اس وقت مسلم لشکر کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار تھی۔ اور مسیحی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ تھی۔ زلاقہ کے میدان میں دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ یہ رمضان کے مہینہ کا پہلا عشرہ تھا۔ مسیحی لشکر کو کثرتِ تعداد کے باوجود بری طرح شکست ہوئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ شدید مقابلہ میں خود المعتمد کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ اس دن اس نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ آخر میں فرنگی فوجوں میں سے صرف تین گھوڑے سوار اپنی جان بچا کر بھاگ سکے۔ مسلمانوں کو غیر معمولی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا (۱۰/۱۵۴)

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ——— ۱۰۸۶ء میں یوسف نے جبرالٹر کی آبنائے کو پار کیا اور زلاقہ کے مقام پر مسیحی فوجوں کو بری طرح شکست دی :

In 1086 Yusuf crossed the Strait of Gibraltar and at Zallaka inflicted a crushing defeat upon the Christian forces: (VII/138)

فتح کا یہ واقعہ بے حد اہم تھا۔ مسلمانوں کی حکومت اسپین میں اس وقت خاتمہ کے عین کنارے پہنچ گئی تھی۔ مگر اس فتح نے اسپین میں مسلم عہد کو چار سو سال مزید آگے بڑھا دیا۔

تاہم یہ عظیم سیاسی کامیابی ایک عظیم نفسیاتی قربانی کے ذریعہ ممکن ہو سکی۔ ایسا صرف اس وقت ہوا جب کہ سلطان المعتمد نے یہ قربانی دی کہ اس نے اپنے سیاسی مفاد کی پروا نہ کرتے ہوئے یوسف بن تاشقین سے بلا شرط فوجی اتحاد کر لیا۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کو قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر فیصلہ لینا پڑتا ہے۔ جب تنگ نظری کے بجائے وسعت نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوتاہ بینی کی جگہ دور بینی کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ جب اس عالی حوصلگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی چھوٹے مقاصد کو نظر انداز کر کے بڑے مقصد کے لیے آگے بڑھ جائے۔

ایک سچا مومن ایسے مواقع پر سب سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ مومن کا آفاقی مزاج اُس کو اِس سے بچاتا ہے کہ وہ چھوٹی باتوں میں اس طرح الجھے کہ بڑی بات کو وہ کھو دے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اعلیٰ مقاصد پر ہوتی ہے۔ اور جس انسان کی نظر اعلیٰ مقاصد پر ہو وہ کبھی چھوٹی باتوں میں الجھ کر اپنا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتا۔

زندگی کے تمام فیصلوں میں اصل اہمیت مزاج کی ہے۔ صحیح مزاج کے لوگ صحیح فیصلہ لیتے ہیں اور غلط مزاج کے لوگ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ ایمان کسی آدمی کے اندر سب سے زیادہ صحیح مزاج بناتا ہے۔ ایمان آدمی کو صحیح ترین طرز پر سوچنے والا بنا دیتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۳ ، شمارہ ۲۰۳

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

طمع کا نقصان

عن سفیان ، اَنّ عمرَ بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال لکعبٍ۔ مَن اربابُ العلم۔ قال الذین یعملون بما یعلمون۔ قال فما اخرجَ العلمَ مِن قلوبِ العلماء۔ قال الطمع۔

(مشکاۃ المصابیح ۱/۸۸)

سفیان کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب سے پوچھا کہ علم والے کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ لوگ جو اس پر عمل کرتے ہیں جس کو وہ جانتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے جو علماء کے دلوں سے علم کو نکال دیتی ہے۔ جواب دیا کہ طمع۔

عام آدمی کی طمع صرف پیسہ کی حد تک ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرے تاکہ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرے اور اپنے لیے ایک فراغت کی زندگی حاصل کر سکے۔

یہ طمع کی ابتدائی صورت ہے۔ مگر طمع کا جذبہ اتنا طاقت ور جذبہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بظاہر پائے ہوئے لوگوں میں بھی وہ اسی طاقت کے ساتھ موجود رہتا ہے جتنا کہ نہ پائے ہوئے لوگوں میں۔

جس آدمی کو ضرورت کے بقدر مل جائے وہ عیش کے بقدر حاصل کرنے کی لالچ میں پھنس جاتا ہے۔ جس آدمی کو تھوڑا اقتدار مل جائے وہ زیادہ اقتدار کی ہوس میں پڑ جاتا ہے۔ جو آدمی ایک حلقہ میں مشہور ہو جائے وہ تمام حلقوں میں بلکہ ساری دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔ جس آدمی کے گرد ہزاروں کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے وہ چاہنے لگتا ہے کہ کروروں کی بھیڑ اس کے گرد دکھائی دینے لگے۔ وغیرہ۔

اس طمع کی خاطر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ علم رکھنے کے باوجود جہالت کی بات کرتا ہے۔ اس کا دل ایک حقیقت کو مان رہا ہوتا ہے مگر وہ لوگوں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ اصول کی زبان بولنے کے بجائے مصلحت کی زبان بولتا ہے۔ وہ اندر سے کچھ ہوتا ہے مگر اوپری طور پر وہ کسی اور شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سب وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کی امیج خراب نہ ہو۔ تاکہ اس کا مفاد خطرہ میں نہ پڑے، تاکہ عوام کے درمیان اس کی مقبولیت میں کمی نہ ہو، تاکہ لوگوں کے درمیان اس کی اعلیٰ پوزیشن برقرار رہے۔ وہ باہر کے اعتبار سے بڑھتا ہے مگر وہ اندر کے اعتبار سے ختم ہو جاتا ہے۔

اپنے اوپر فتح

ایڈمنڈ ہلیری (Edmud Hillary) ۲۰ جولائی ۱۹۱۹ کو نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں پیدا ہوا۔ کو پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق تھا۔ پہلے وہ اپنے ملک کے پہاڑوں پر چڑھائی کیا کرتا تھا۔ اس ، پہلی بار ۱۹۵۱ میں ایک ٹیم کے ساتھ ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش کی جو ۲۹۰۲۸ ٹ اونچی ہے۔ پہلی بار اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری بار وہ ۱۹۵۳ میں ایک برٹش ٹیم کے ؤ ایورسٹ پر چڑھائی کے لیے روانہ ہوا۔ اس بار اس نے ایک نیپالی تنزنگ نارگے کو بطور ساتھ لیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۵۳ کو وہ ایورسٹ کی بلندی پر پہنچ گیا، وہ پہلا انسان تھا جس نے دنیا کی ب سے بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھا۔ چنانچہ فوراً ہی وہ ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ برطانی حکومت ۱۶ جولائی کو اسے سر کا خطاب دیا۔ اس نے اپنی پہاڑی مہم پر ایک کتاب لکھی جو ۱۹۵۵ میں ایڈونچر (High Adventure) کے نام سے شائع ہوئی۔

سر ایڈمنڈ ہلیری نے اپنی کتاب میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک سبق کی بات یہ ہے کہ ہاڑ کو فتح نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم خود اپنے آپ کو فتح کرتے ہیں :

It is not the mountain we conquer but ourselves.

یہ ایک سادہ سی بات ہے مگر وہ بے حد اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ۃ دراصل اپنے آپ پر فتح پانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر فتح سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ اس ، لیے ضروری جد وجہد کی جائے۔ گویا کہ آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو جد وجہد کا اہل ت کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی اس دنیا میں وہ اس کا اہل قرار پاتا ہے کہ اس کو فتح و ابی کا مقام عطا کیا جائے۔

خواہ پہاڑ پر چڑھنا ہو یا اور کوئی کامیابی حاصل کرنا ہو، آدمی کو سب سے پہلے محنت اور ست کے امتحان میں پاس ہونا پڑتا ہے۔ اس کو یہ ثبوت دینا پڑتا ہے کہ وہ صبر اور برداشت کی جیت رکھتا ہے۔ جس دن آدمی اپنے اندر ضروری اہلیت کا ثبوت دے دیتا ہے اس کے دن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ کامیابی کی بلند چوٹی پر فاتحانہ کھڑا ہوا ہے۔

انتظار کیجئے

نومبر ۱۹۹۱ میں میرا ایک سفر بمبئی کے لیے ہوا تھا۔ وہاں میری ملاقات حاجی اکبر خان صاحب سے ہوئی۔ وہ بمبئی کے پرانے تاجر ہیں۔ انھوں نے ایک نیا آئٹم تیار کرایا اور اس میں اپنی بہت بڑی رقم لگا دی۔ یہ آئٹم خلاف اندازہ مارکٹ میں نکل نہ سکا۔ حاجی صاحب پر اس نقصان کا بہت برا اثر پڑا۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ ان کو ذیابیطس کی شکایت ہو گئی۔ وغیرہ

حاجی صاحب کی رہائش گاہ پر ان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا اور دل کے اندر ان کے لیے دعا کرتا رہا۔ آخر میں جب روانگی کا وقت آیا تو میں نے ایک کاغذ لیا۔ اس پر ایک جملہ لکھا۔ اور اس کو بند لفافہ میں دیتے ہوئے ان سے کہا کہ اس کو میرے چلے جانے کے بعد کھول کر پڑھ لیں۔ وہ جملہ یہ تھا: آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد ۸ جون ۱۹۹۳ کی ڈاک سے حاجی اکبر خان صاحب کا ایک خط مجھے ملا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"۹ نومبر ۱۹۹۱ کے روز آپ میرے غریب خانہ پر تشریف فرما تھے، اور میری روداد غم سن کر مجھے یہ نسخۂ کیمیا عطا کر گئے تھے: "آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔"

یقین کیجئے، آپ کے اس جملہ کا مجھ پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ نفسیاتی طور پر صبر کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش میں، میں اپنے غم کو کافی ہلکا محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ آج جب جون ۱۹۹۲ کا الرسالہ میرے سامنے ہے اور سفر نامہ کے تحت اس واقعہ کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، الحمدللہ، اسی "صبر" یعنی انتظار کے خانہ میں ڈالنے والے عمل کی وجہ سے اس نقصان کی کافی تلافی ہو چکی ہے۔ حالات نے خوش گوار کروٹ لی ہے، اور قوی امید ہے ۱۹۹۱ میں نظر آنے والا نقصان ۱۹۹۲ میں ان شاء اللہ بھرپور منافع کی صورت میں اجاگر ہوگا۔ یہ ایک درسِ عظیم ہے کہ دنیا کے معاملہ میں صبر کا جب یہ صلہ ہے تو آخرت کے معاملہ میں صبر کا کس درجہ کا صلہ ہوگا۔ (اکبر خاں، مجگاؤں، بمبئی ۱۰)

انتظار ہر زخم کا مرہم ہے۔ انتظار محض انتظار نہیں، وہ خود ایک تدبیر ہے۔ مسئلہ پیش آنے پر آدمی اگر بے صبر نہ ہو، وہ صبر کرتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرلے تو بہت جلد وہ محسوس کرے گا کہ انتظار اس کے مسئلہ کا حل بن گیا ہے۔ انتظار نے اس کام کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیا ہے جس کو وہ خود انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہمہ گیر طور پر فطرت کا قانون اصلاح رائج ہے۔ یہاں ہر زخم کے اندمال کا انتظام ہے۔ یہاں مسئلہ پیش آتے ہی فطرت کی طاقتیں سرگرم ہو جاتی ہیں کہ اس کا قریب ترین حل نکال سکیں۔ جو چیز انسان کے لیے انتظار ہے، وہ فطرت کے نظام میں مداخلت نہ کرکے اسے یہ موقع دینا ہے کہ وہ تلافی مافات کے عمل کو بہ سہولت اپنے آخری مرحلہ تک پہنچا سکے۔

ایک آدمی رات کے اندھیرے میں اس طرح پھنس جائے کہ اس کے پاس روشنی کا کوئی سامان موجود نہ ہو تو اس کو سادہ طور پر صرف انتظار کے اصول کو اپنا لینا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ دیکھے گا کہ ایک مدت گزرنے کے بعد صبح کی روشنی اپنے آپ نمودار ہو گئی ہے تاکہ اس کی راہوں کو روشن کرکے اس کے لیے منزل کی طرف سفر کو آسان بنا دے۔

خود صاحب معاملہ کی نسبت سے بھی انتظار محض انتظار نہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک تدبیر ہے۔ کیوں کہ انتظار نہ کرنے والے شخص کا ذہن بیتے ہوئے واقعہ میں اٹکا رہتا ہے، جب کہ انتظار کرنے والے کا ذہن نئے حالات اور نئے امکانات کے دائرہ میں کام کرنے لگتا ہے۔ انتظار نہ کرنے والا اگر غم اور افسوس میں جیتا ہے تو انتظار کرنے والا مایوسی کے اندھیرے سے نکل کر امید کی روشنی میں چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انتظار بے عملی نہیں، انتظار خود ایک عمل ہے۔ انتظار کا مطلب ٹھہرنا نہیں ہے۔ انتظار دراصل اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ماضی سے اپنی نظریں ہٹا کر مستقبل کی طرف چل پڑا۔ اس دنیا میں ہر کھونے کے بعد پانا مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں انتظار حقیقۃً یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی محرومی کو بھلا کر یافت کو اپنا مرکز توجہ بنالے۔

انتظار نہ کرنا ہمیشہ آدمی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ انتظار کرنا ہمیشہ آدمی کے لیے فائدہ کا سبب بنتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

، الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۳

دینی فہم

قرآن میں ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو..... اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھوں کو تم کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے دونوں کے لیے عبرت ناک سزا۔ اور اللہ عزیز و حکیم ہے (المائدہ ۳۸)

ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ وہ جس کسی کو بھی چوری کرتا ہوا پائے اس کو پکڑ کر اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ مگر اس آیت کا یہ مطلب نہیں۔ اس طرح کی آیات میں اہلِ ایمان سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو باقاعدہ طور پر حکومت و اقتدار کے مالک ہوں۔ جب بھی چوری یا اور کوئی قابل سزا جرم واقع ہو تو حکومت کے تحت قائم شدہ عدالتی نظام میں مجرم پر مقدمہ چلایا جائے گا اور باقاعدہ قانونی کارروائی کے بعد اس کا ہاتھ کاٹنا یا اور کوئی سزا دینا جائز ہوگا:

وقد علم من قرع سمعه هذا الخطاب من اهل العلم ان المخاطبين بذلك هم الائمة دون عامة الناس. فكان تقديره فليقطع الائمة والحكام ايديهما وليجلدهما الائمة والحكام.	اہل علم میں سے جو کوئی اس حکم کو سنتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ اس کے مخاطب حکام ہیں نہ کہ عام لوگ۔ پس یہاں تقدیر کلام اس طرح ہے کہ ائمہ اور حکام کو چاہیے کہ وہ ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دیں اور وہ ان دونوں کو کوڑے ماریں۔

(ابوبکر الجصاص، احکام القرآن ۲/ ۲۸۲)

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفقہ فی الدین کیا چیز ہے۔ تفقہ سے یہ صلاحیت مراد ہے کہ آدمی ظاہری الفاظ سے گزر کر اس کی معنوی گہرائی کو سمجھ سکے۔ وہ سطور کے ساتھ بین السطور کو پڑھ سکے۔ وہ ظواہر سے آگے بڑھ کر حقائق کو دریافت کر سکے۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ یک من علم را دہ من عقل می باید۔ جن لوگوں کے پاس ایک من علم ہو مگر ان کے پاس دس من عقل نہ ہو وہ خود بھی بھٹکیں گے اور دوسروں کو بھی بھٹکانے کا ذریعہ بنیں گے۔

فطرت کا قانون

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔ ان ذلک علی اللہ یسیر۔ لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم۔ واللہ لا یحب کل مختال فخور۔

(الحدید ۲۳-۲۴)

کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں، مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں۔ بیشک یہ اللہ کے لیے آسان ہے، تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔ اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا۔ اور اللہ اترانے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن کے ان الفاظ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ فطرت کے اس قانون کو جو لوگ جان لیں، ان کے لیے چھینے جانے کا واقعہ بھی اتنا ہی بامعنی ہو جاتا ہے جتنا کہ حاصل ہونے کا واقعہ۔

یہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے۔ یہاں ہر ایک کو موافق اور ناموافق حالات سے گزارا جاتا ہے، تاکہ ہر پہلو سے آدمی کی جانچ ہو، اور یہ معلوم ہو جائے کہ کس طرح کی صورت حال میں آدمی نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ اس نے کس موقع پر اپنے آپ کو کیسا ثابت کیا۔ حالات کا اتار چڑھاؤ فطرت کا ایک قانون ہے جو کبھی کسی کے لیے بدلتا نہیں۔

اس دنیا میں کھونے اور پانے، دونوں قسم کے تجربے پیش آئیں گے، انفرادی سطح پر بھی اور قومی سطح پر بھی۔ مگر نہ یہاں کا پانا کامیابی ہے اور نہ یہاں کا کھونا محرومی۔ بلکہ دونوں ہی امتحان کے لیے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کھونے کو محرومی سمجھ کر بددل نہ ہو جائے۔ اسی طرح اس کو چاہیے کہ وہ پانے کو اپنے لیے اعزاز سمجھ کر فخر وتکبر میں مبتلا نہ ہو۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ دونوں حالتوں کا استقبال معتدل نفسیات کے ساتھ کرے۔ ظاہری کامیابی بھی اس کے لیے فکری غذا کا ذریعہ ہو، اور ظاہری ناکامی بھی اس کی روحانیت میں اضافہ کرے۔ کوئی بھی واقعہ اس کے ذہن کو اس طرح ڈسٹرب نہ کرے کہ وہ مثبت طور پر سوچنے کے قابل نہ رہے۔

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۳ محرم ۱۴۱۳ھ، ۲۳ جولائی ۱۹۹۲ء) میں صفحہ ۱۷ پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے : ۴۳ قبیلۃ تعتنق الاسلام فی الفلبین (فلپائن میں ۴۳ قبیلوں کا قبول اسلام)

اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی فلپائن کے علاقہ مینڈناو (Mindanao) کے ۴۳ بت پرست قبیلوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے والے ان قبیلوں میں قبیلہ مانوبہ بھی ہے جو کہ کیدان وان میں رہتا ہے۔ کیدان وان ایک شہر ہے جو صوبہ کوتاباتو (Catabato). میں واقع ہے۔ ان میں ۲۳۰ وہ اشخاص ہیں جنھوں نے پہلے مسیحیت قبول کر لی تھی، مگر اب وہ سب اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ صرف ایک مہینہ میں پیش آنیوالا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے پچھلے سالوں میں بھی وہاں کے لوگ برابر اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ عرب ملکوں میں کام کرنے والے فلپائن کے لوگوں کے بارہ میں اکثر یہ خبریں آتی رہتی ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ایک طرف دعوت کے اعتبار سے اسلام کی تسخیر کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف اسی فلپائن کے ایک علاقہ میں پچھلے ۳۰ سال سے "مورو لبریشن فرنٹ" کے نام سے مسلمان سیاسی آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ زبردست قربانیوں کے باوجود اب تک اس تحریک کا کوئی بھی مثبت فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ فلپائن کے اس علاقہ میں سات ملین مسلمان رہتے ہیں۔ تعلیم اور اقتصادیات کے اعتبار سے وہ بے حد پیچھے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۹ میں افریقہ کے ایک سفر میں میری ملاقات مورو لبریشن فرنٹ کے چیرمین مسٹر نور مسواری سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک تقریباً ۱۵۰ ہزار مسلمان اس جدوجہد میں اپنی جان دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود دور دور تک بھی کہیں کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ سیاست کے راستہ سے کچھ ملنے والا نہیں، مگر ساری دنیا میں لاکھوں مسلمان اس کے لیے اپنا جان و مال قربان کر رہے ہیں۔ دعوت کے راستہ میں، آج بھی "سرخ اونٹوں" کی دولت مل رہی ہے۔ مگر کسی کو اس کی راہ میں عمل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

ایک ملاقات

۲۹ نومبر ۱۹۹۲ کو دہلی میں ڈاکٹر محمد عالم (پیدائش ۱۹۲۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اعظم گڑھ (چکیا) کے رہنے والے ہیں اور تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ گودھرا (گجرات) میں پہلا تبلیغی اجتماع ۱۹۷۸ میں ہوا۔ اس میں انھوں نے شرکت کی۔ واپسی میں وہ گونڈہ آئے۔ یہاں سے بس کے ذریعہ اجودھیا پہنچے۔ اجودھیا میں بس نے گھاگھرا ندی کے کنارے اتارا۔ یہاں سے پیدل چل کر اس کا لمبا پل پار کیا۔ پھر پیدل چلتے ہوئے اجودھیا شہر میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ سڑک پر ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ کہیں کوئی مسلمان دکھائی دے تو اس سے ملیں۔ مگر اس وقت میلا تھا اور ہر طرف ہندو ہی ہندو دکھائی دے رہے تھے۔

وہ دکان کے سامنے کھڑے تھے کہ اندر سے ایک ہندو نوجوان جو کہ پنڈا تھا، باہر آیا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب، آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عالم صاحب نے کہا کہ اس وقت میری تین ضرورت ہے۔ مجھے استنجا کرنا ہے۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے اس لیے پانی پینا ہے، اور پھر مجھے ظہر کی نماز پڑھنا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ آئیے۔ اس نے ڈاکٹر عالم کا بستر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر پانی دے کر انھیں لے جا کر استنجا خانہ پہنچایا۔ وہ فارغ ہو چکے تو وہ ان کو اپنے منڈپ میں لے گیا۔ کمبل بچھا کر انھیں بٹھایا اور ان کو ٹھنڈا پانی اور ریوڑی پیش کیا۔ اور کہا کہ اس کو کھا کر پانی پیجئے۔ اس کے بعد اس نے وضو کا پانی دیا اور صاف کپڑا بچھا کر کہا کہ یہاں آپ نماز پڑھ لیں۔

ڈاکٹر عالم صاحب جب نماز پڑھ چکے تو نوجوان پنڈا نے کہا کہ اب آپ چاہیں تو یہاں آرام کریں۔ ڈاکٹر عالم صاحب نے کہا کہ نہیں، اب مجھے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اعظم گڑھ کی ٹرین پکڑنا ہے۔ اس کے بعد نوجوان پنڈا نے ڈاکٹر عالم صاحب کا بستر اٹھایا اور ان کو لے جا کر تانگہ اسٹینڈ تک پہنچایا۔ اور کہا کہ اب آپ تانگہ سے اسٹیشن جا سکتے ہیں۔

انسان کی سطح پر ہر آدمی ویسا ہی ہے جیسا کہ مذکورہ ہندو نوجوان۔ مگر جب آپ انسان کی سطح سے ہٹ جائیں تو دوسرا آدمی بھی انسان کی سطح سے ہٹ جائے گا۔

۱۱ الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۳

اعراض کا فائدہ

پونہ کے ایک سفر میں وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی، اور اس کی نسبت سے مسلمان اپنا میلاد النبیؐ کا جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ اگر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلتا تو یقینی تھا کہ دونوں میں ٹکراؤ ہو اور فرقہ وارانہ فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ اور پھر جشن کا دن شہر کے لیے غم کا دن بن جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی کی دانش مندی سے یہ خطرہ ٹل گیا۔ انھوں نے ایک اجتماع کر کے مشورہ کیا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اس معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تاریخ بدل دی۔ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن کی تاخیر کے ساتھ ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح ہندو جلوس اور مسلمان جلوس دونوں پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اس واقعہ پر شہر کے تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانش مندی کو سراہا۔ خاص طور پر پولیس کے لوگوں نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کے اس عمل کی تعریف کی۔ انھوں نے مسلمانوں سے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ فساد نہ ہونا پولیس کے لیے ایک ذاتی کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور یقینی طور پر پولیس کے لوگ چاہتے ہیں کہ یہ کارنامہ ان کی فہرست اعمال میں لکھا جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی نے جب تاریخ کی تبدیلی کا فیصلہ کیا تو اسی وقت انھوں نے اس کی خبر مراٹھی اخباروں میں شائع کرادی۔ اس طرح پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے جن مقامات پر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلنے والے تھے، وہاں بھی اسی طرح مسلمانوں نے اپنے جلوس کی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مہاراشٹر فساد کے نقصان سے بچ گیا۔

فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کی سب سے زیادہ کارگر تدبیر یہی اعراض کا طریقہ ہے۔ جہاں بھی لوگوں نے اس تدبیر کو استعمال کیا ہے وہاں فساد نہیں ہوا۔ فساد کے بم کو ناکارہ کرنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ فساد ہمیشہ غصہ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ سازش کے تحت۔

اعزاز یا ذمہ داری

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے حال میں مرکزی کیبنٹ میں اضافہ کیا ہے۔ جو نئے وزیر لیے گئے ہیں ان میں سے ایک ۲۹ سالہ خاتون سیلجا چودھری (Selja Chaudhary) ہیں۔ وہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم میں اسٹیٹ منسٹر مقرر کی گئی ہیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جب میں نے ٹیلی فون کے دوسری طرف سے کیبنٹ سکریٹری کی آواز سنی جس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ مجھے وزارت کے عہدہ پر مقرر کیا گیا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ صحیح ہے۔ بظاہر میں اچھل تو نہیں پڑی مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی :

I didn't believe it was true when I heard the Cabinet Secretary's voice on the other end of the line informing me of my new office. I did not exactly jump but I was really very happy.

The Pioneer, New Delhi, July 12, 1992, p. 5

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے حکمراں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ملک کو امن اور ترقی کا ملک نہ بنا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن لوگوں کو اقتدار کا منصب ملا ان کی نظر منصب کے اعزاز پر چلی گئی نہ کہ منصب کی ذمہ داریوں پر۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو وہ کبھی ملک میں ترقی اور خوش حالی کا دور نہیں لا سکتے۔

جن لوگوں کی نظر منصب کے اعزاز پر ہو وہ منصب کو صرف اپنی ترقی کا ذریعہ بنائیں گے۔ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے سوا کسی اور چیز سے انھیں کوئی حقیقی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر پورے ملک کو قربان کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے پوری قوم کا سودا کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس جس آدمی کی نظر منصب کی ذمہ داریوں پر ہو، وہ جب کسی منصب کو پاتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے لیے منصب ایک ایسا بوجھ بن جاتا ہے جس کے نیچے اس کی شخصیت دب کر رہ جائے۔ اول الذکر اگر قہقہوں کے ساتھ منصب کا استقبال کرتا ہے تو ثانی الذکر غم کے آنسوؤں کے ساتھ۔ جو لوگ منصب کو ذمہ داری سمجھیں ان کے لیے منصب کو پانا اپنی زندگی کی ویرانی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو ملک کو ایک سرسبز و شاداب باغ میں تبدیل کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

اسلام کا استحصال

ٹائم میگزین (۱۵ فروری ۱۹۹۳) نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک باتصویر رپورٹ چھاپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم اور فساد ہو رہا ہے، اس کی وجہ مسلمانوں کے خلاف وہ مذہبی نفرت (religious hatred) ہے جو ہندوؤں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندو نفرت کی تاریخ دسویں صدی عیسوی تک جاتی ہے جب کہ مسلم حملہ آوروں نے برصغیر ہند کو لوٹنا اور ہندو مندروں کو تباہ کرنا شروع کیا :

> Hindu hatred for Muslims dates back to the 10th century, when Muslim invaders first began looting the subcontinent and destroying Hindu temples (p. 25).

مسلم حملہ آوروں پر یہ الزام بہت عرصہ سے لگایا جا رہا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے اپنے اعلیٰ انشا پردازانہ اسلوب میں اس کا طاقت ور دفاع کیا۔ برٹش انڈیا میں ان کی یہ تحریریں بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد مسلمان لکھنے اور بولنے والوں کا یہی عام رجحان بن گیا۔ ہر ایک اسی طرح شبلی کے اسلوب میں مسلم بادشاہوں کا دفاع کرنے لگا۔

یہ اسلوب مسلمانوں کو خوش کرنے میں بہت کامیاب رہا۔ مگر ہندوؤں کے ذہن کو بدلنے میں وہ اتنا ہی ناکام ثابت ہوا۔ ہندوؤں کا ذہن برعکس طور پر شدید ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اب بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تاریخی نفرت اپنی آخری انتہا پر پہنچ گئی ہے۔ یہ الٹا انجام بتاتا ہے کہ شبلی کا اسلوب مفید نہ تھا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں اصل کام ہندو نفرت کو ختم کرنا ہے نہ کہ مسلمانوں کی واہ واہ حاصل کرنا۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس معاملہ میں اپنے پورے رویہ کو تبدیل کریں۔ ہمیں ان مسلم بادشاہوں کا دفاع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے برأت ظاہر کرنا ہے۔ ہمیں یہ کہنا ہے کہ اسلام بلاشبہہ ایک سچا مذہب ہے۔ مگر مسلمانوں کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ہیں جو اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے اسلام کا استحصال کرتے ہیں، اسی طرح پہلے بھی ہوا۔ مگر ان مسلمانوں کی کارگزاریوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

تاریخ کا سبق

سابق امریکی صدر جارج بش نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کو اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ایک شخص خارجہ پالیسی اور فوجی معاملات کو اقتصادی ترقی اور اصلاح سے جدا نہیں کر سکتا۔ دنیا نے واضح طور پر دیکھ لیا ہے کہ بڑھی ہوئی ہتھیار بندی اور جارحیت عراق کے لیے کتنی زیادہ مہنگی پڑی۔ دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ سیاسی اور فوجی طاقت پر بہت زیادہ توجہ دینا اور اقتصادیات کو نظر انداز کرنا سوویت یونین کے لیے کتنا زیادہ اور شاید مستقل طور پر نقصان کا باعث ثابت ہوا:

One can not separate foreign policy and military issues from economic growth and reform. The world has seen only too clearly the immense costs of over-armed, aggressive states such as Iraq. It has also seen how excessive focus upon projecting politico-military power and neglecting the economy has badly, perpahs permanently damaged the USSR.

موجودہ دنیا میں کبھی کبھی ضرورت کے طور پر طاقت کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مگر طاقت کا استعمال صرف انتہائی ضرورت کے تحت وقتی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ طاقت کو مستقل پالیسی بنانا کسی کے لیے بھی مفید نہیں، نہ فرد کے لیے اور نہ قوم کے لیے، نہ منی پاور کے لیے اور نہ سپر پاور کے لیے۔

کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اقتصادی ترقی اور ہتھیاروں کی دوڑ کو بیک وقت جاری رکھ سکے۔ ہتھیار بندی میں زیادہ وسائل لگانا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ اقتصادی ترقی میں اسی کے بقدر کمی کرنی پڑے۔ ایسی پالیسی ہمیشہ مہلک ہوتی ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کے عبرت ناک نمونے موجود ہیں۔

امن عمومی پالیسی کا عنوان ہے اور جنگ استثنائی اقدام کا عنوان۔ کسی بھی فرد یا قوم کے لیے صحیح ترین پالیسی یہی ہے کہ وہ امن اور حسن تدبیر کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات درست کرے۔ جنگ یا ٹکراؤ کا طریقہ صرف شدید ترین ضرورت کے لیے اتفاقی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

شانتی یاترا

دسمبر ۱۹۹۲ کے نصف آخر میں ایک سفر پیش آیا۔ یہ "شانتی یاترا" کا سفر تھا۔ دہلی۔ بمبئی۔ پونہ۔ ناگپور۔ بمبئی۔ دہلی کے درمیان بہت سی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں مجموعی طور پر تقریباً چھ ہزار کیلو میٹر کا سفر طے کرنا پڑا۔ یہ میری زندگی میں اپنی نوعیت کا پہلا سفر تھا۔ ذیل میں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

یہ سفر ایک ٹیم کی صورت میں تھا۔ میرے علاوہ اس میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں — اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، شانتی لال موتھا، انا صاحب ہزارے، جسٹس چندر شیکھر دھرما کاری۔

اچاریہ منی سوشیل کمار ہندستان کی ایک غیر نزاعی شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی امن کے پرچار میں لگا رکھی ہے۔ اجودھیا کے حادثہ نے انھیں بے چین کر دیا۔ نئی دہلی میں ان کے آشرم میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر مذہب کے رہنماؤں کی میٹنگیں ہوئیں۔ آخر کار طے ہوا کہ امن کے فروغ کے لئے اس سلسلہ میں کچھ عملی قدم اٹھائے جائیں۔

اس سلسلہ کا آغاز ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ کو ٹی وی پروگرام سے ہوا۔ پہلے ڈیفنس کالونی (نئی دہلی) کے آشرم میں مختلف مذہبوں کے لوگ جمع ہوئے۔ ٹی وی کی ٹیم یہیں آگئی تھی۔ اس نے ہر ایک سے ایک ہی سوال کیا "موجودہ حالات میں آپ دیش کے لوگوں کو کیا سندیش دینا چاہیں گے"۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے کہا کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ امن قائم ہو اور نفرت کا خاتمہ کیا جائے۔ میں نے بھی یہی بات اپنے انداز سے کہی۔

میں نے مزید کہا کہ جب کچھ لوگ مل کر رہیں، تو خواہ وہ ایک گھر میں ہوں یا ایک ملک میں، بہر حال ایسے مواقع آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس لئے عملی طور پر امن اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ اختلافی بات پیش آنے کے باوجود امن و محبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

آج ہی ٹی وی پر دوسرا پروگرام پینل کی صورت میں تھا۔ اس میں اچاریہ سوشیل کمار

بشپ گرگوریوز (Dr Paulos Mar Gregorios) اور راقم الحروف نے حصہ لیا۔ ہر ایک نے ریلیجن اینڈ پیس (مذہب اور امن) کے موضوع پر اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ میں نے کہا کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی شخصیت کو پاک کرنے کا ایک روحانی سسٹم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی زوال کی بنا پر لوگ باہر کی چیزوں پر زیادہ زور دینے لگے ہیں۔ اس لئے جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگوں میں سچی مذہبی اسپرٹ ہو تو وہ اندر کی صفات پر زیادہ زور دیں گے اور پھر جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

ٹی وی کے ان پروگراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ دور درشن نے یہ بہت اچھا کیا کہ آپ لوگوں کو وقت کے حالات پر بولنے کا موقع دیا۔ اس سے پہلے دور درشن والے ان موضوعات پر لیڈروں یا سیکولر لوگوں کو سامنے لاتے تھے۔ مگر مذہب اور انسانیت کے بارہ میں سیاسی لیڈروں یا سیکولر دانشوروں سے کہلوانے کا کوئی خاص عملی فائدہ نہیں۔ ان باتوں کو تو مذہبی لوگوں کی طرف سے سامنے آنا چاہئے۔ اس پروگرام کا لوگوں کے اوپر یقیناً اچھا اثر ہوگا۔

ٹیلی وژن کا اصول ابتدائی طور پر اگرچہ انیسویں صدی کے آخر میں دریافت ہو چکا تھا۔ مگر جدید ٹی وی سیٹوں کی تیاری اور ٹی وی کا باقاعدہ نظام دوسری عالمی جنگ کے بعد قائم ہو سکا۔ ٹی وی کو ایک طاقت ور میڈیا سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہر چیز آخر کار ایک تجارتی انڈسٹری بن جاتی ہے۔ اور اسی بنا پر ان کا استعمال زیادہ تر غیر مفید کاموں میں ہو رہا ہے۔

مثلاً دسمبر ۱۹۹۲ میں برصغیر کے فرقہ وارانہ فسادات کا سب سے بڑا سبب ٹی وی، خاص طور پر بی بی سی ہے۔ بی بی سی کے کارکن جدید ترین آلات سے لیس ہو کر ۶ دسمبر کو اجودھیا میں موجود تھے۔ انھوں نے مسجد پر ہندو انتہا پسندوں کی یلغار کا اور اس کو ڈھائے جانے کا مسلسل فوٹو لیا۔ اس تصویری رپورٹ کو پاکستان میں بڑے پیمانے پر ٹی وی پر دیکھا گیا۔ اس درمیان میں حکومت پاکستان نے مزید نادانی یہ کی کہ ۷ دسمبر کو یوم سیاہ منانے کا اعلان کر دیا۔ یوم سیاہ کے مظاہروں نے پاکستانی عوام کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ انھوں نے پاکستان میں ہندو مندروں پر بلڈوزر چلائے، کئی ہندوؤں کو مار کر درخت سے لٹکا دیا۔ وغیرہ۔ اس قسم کے مختلف سنسنی خیز مناظر دوبارہ بی بی سی نے ٹی وی پر دکھائے۔ ان مناظر کو دیکھ کر انڈیا کے ہندو بھڑک اٹھے۔ اس طرح ۸ دسمبر کو ہندستان کے مختلف

علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوگیا۔

۵ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل کر ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ فضا میں ہرطرف اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات کو میں نے ایک اردو پرچہ میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا ـــــ "ہرطرف اندھیرا" اس میں دکھایا گیا تھا کہ آج ہر جگہ کے مسلمان ظلم وزیاتی کا شکار ہورہے ہیں۔ ملت کے افق پر ہرطرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

میں نے سوچا کہ اس زمین پر خدا مسلسل یہ کر رہا ہے کہ وہ ہر ۲۴ گھنٹے کے اندر شام کو صبح میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ ہر روز رات کی تاریکی کو ختم کر کے دن کا اجالا پھیلا رہا ہے۔ اس طرح خدا دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ ایسی حالت میں قرآن کے حاملین "اندھیرا ہی اندھیرا" کی فریاد کیوں کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فکری اعتبار سے وہ اس حالت کو پہنچ گئے ہوں جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: ان قومی اتخذوا هٰذا القرآن مهجورا (الفرقان ۳۰)

ہمارے امن مشن کو دہلی سے پونہ پہنچنا تھا۔ مگر رات کو معلوم ہوا کہ پونہ کی فلائٹ کینسل ہوگئی ہے۔ فوری طور پر رات ہی کو جہاز تبدیل کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ دہلی سے بمبئی جائیں اور وہاں سے پونہ پہنچیں۔ چنانچہ ایرپورٹ پر خلاف معمول سناٹا تھا۔ بڑی تعداد میں انڈین ایرلائنز کے جہاز گراؤنڈ پر کھڑے ہوئے نظر آئے۔

انڈین ایرلائنز کے پائلٹوں نے اسٹرائک کر رکھی ہے۔ ایرپورٹ پر میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ اسٹرائک کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا کہ ان پائلٹ لوگوں کو فی گھنٹہ بارہ سو روپیہ ملتا ہے۔ وہ سات ہزار روپیہ روز کماتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانا رہنا سب فری ہے۔ تب بھی وہ خوش نہیں۔ انھیں مہینہ میں دو لاکھ روپیہ چاہئے۔

انڈین ایرلائنز کے پائلٹوں نے جب اسٹرائک کر دی تو سول اوی ایشن منسٹر نے فوراً متبادل انتظام کی تلاش شروع کر دی۔ پرمسرت تعجب کے ساتھ انھیں معلوم ہوا کہ روس کے ۵۰۰ ہوائی جہاز اوزبکستان میں خالی پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے روسی حکومت سے ربط قائم کیا اور آسان شرطوں پر چھ ہوائی جہاز فوری طور پر منگوا لئے۔ اس طرح ٹرنک روٹ (دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس) کی

پر وازیں بحال کریں۔

انڈین اکسپریس (۱۵ دسمبر ۱۹۹۲) میں صفحہ اول پر اس خبر کی سرخی کا عنوان تھا کہ اب روسی جہاز اسٹرائک زدہ انڈین ایئر لائنز کی مدد پر :

Now, Russian aircraft to the rescue of strike hit IA

میں نے سوچا کہ اگر مجھ کو اس خبر کی سرخی بنانا ہوتو میں لکھوں گا کہ ـــــ ہر کھوئی ہوئی چیز کا بدل اس دنیا میں موجود ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو صبح ۸ بجے دہلی سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک روسی ساخت کا جہاز ہے۔ اس کا تمام ٹکنیکل عملہ روسی ہے۔ صرف میزبان عملہ میں کچھ ہندستانی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاز کی پرواز خوشگوار تھی۔

جہاز میں انڈین اکسپریس (۱۵ دسمبر) کا مطالعہ کیا۔ اس میں بھوپال کی ڈیٹ لائن کے ساتھ مسٹر این ڈی شرما کی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ۱۹ - ۲۱ دسمبر کو ہونے والا تھا۔ توقع کے مطابق اس اجتماع میں دو لاکھ آدمی شریک ہوتے۔ مگر فسادات کی وجہ سے بھوپال میں ابھی تک کرفیو چل رہا ہے، اس لئے ریاستی انتظامیہ کو تشویش ہوئی۔ مدھیہ پردیش کی حکمراں پارٹی (بی جے پی) نے بدل کے طور پر یہ تجویز کیا کہ اجتماع کو مختصر طور پر غیر نمایاں انداز میں کیا جائے۔ اور تبلیغی جماعت کے لوگ راضی ہوگئے:

As an alternative, the ruling party leaders have requested the organisers to keep it a low-key affair and they have agreed (p. 12).

یہ نہایت صحیح فیصلہ ہے۔ اس طرح کے نازک مواقع پر اگر اس طرح ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بیشتر سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اسی مومنانہ مزاج کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مومن کی مثال میدان میں اگی ہوئی گھاس کی مانند ہے۔ اِدھر کی ہوا چلی تو اُدھر جھک گیا اور اُدھر کی ہوا چلی تو اِدھر جھک گیا۔

جہاز میں انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت کا شمارہ دسمبر ۱۹۹۲ مطالعہ کے لئے موجود تھا۔ اس کے ہندی سکشن میں ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا : گوپال نرائن پبلک لائبریری۔ یہ

ئبریری بھرت پورہ (بہار) میں واقع ہے۔ مضمون میں اس کا تفصیلی تعارف تھا۔ بتایا گیا تھا کہ اس ں بہت سے قدیم مخطوطات ہیں۔ ان میں سے کئی چیزوں کے فوٹو بھی دئے گئے تھے۔ ایک فوٹو سے علوم ہوا کہ اس لائبریری میں بہت سے قدیم کتبات ہیں۔ ایک کتبہ میں یہ فارسی شعر تھا کہ بلند ہمت سمان سے بھی اوپر اٹھ جاتا ہے اور آدمی ہمت کے ذریعہ فرشتہ سے آگے چلا جاتا ہے:

ہمت عالی ز فلک بگذرد   مرد بہ ہمت ز ملک بگذرد

صبح تقریباً ساڑھے نو بجے ہم بمبئی ایئرپورٹ پر اتر گئے۔ لینڈنگ اتنی اسموتھ تھی کہ محسوس ی نہیں ہوا کہ جہاز زمین پر اتر گیا ہے۔ بمبئی ایئرپورٹ میں داخل ہوا تو وہی مانوس منظر تھا جو ر ایئرپورٹ پر دکھائی دیتا ہے۔ لوگ مخصوص گاڑی سنبھال کر اپنا اپنا سامان لینے کے لئے کنویر بیلٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔

ایئرپورٹ سے ہم سب کو مسٹر رویندر کمار کی رہائش گاہ پہنچنا تھا۔ میں جس گاڑی میں تھا اس کو خود مسٹر رویندر کمار چلا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ بمبئی کا ایک مسلمان میکانک جس کی عمر ۲۸ سال تھی۔ وہ اس فساد میں مارا گیا۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔ مجھ سے بہت پریم تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بٹوارہ کے بعد دونوں فرقوں میں جو کڑواپن آیا تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ نئی پیڑھی کو ان پرانی باتوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اجودھیا کے جھگڑے کے بعد وہی دوری دوبارہ لوٹ آئی۔

یہ بہت صحیح ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمی یا دو گروہ میں کچھ شکایت کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ مگر فطرت بہت جلد ان کو بھلا دیتی ہے۔ پہلے جھگڑے کے بعد اگر دوسرے جھگڑے سے بچنے کا اہتمام کیا جائے تو فطرت خود مرہم کا کام کرتی ہے۔ اور تعلقات نارمل حالت پر آجاتے ہیں۔

۶ دسمبر کے واقعہ کے بعد بمبئی کے بعض علاقوں میں شدید فساد ہوا۔ مگر یہاں کا سب سے زیادہ حساس علاقہ بھیونڈی فساد سے مکمل طور پر بچا رہا۔ سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔ چنانچہ بھیونڈی ایڈمنسٹریشن کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ پڑھی۔ رپورٹر کا نام پرکاش چندر تھا، اور اس کا عنوان یہ تھا:

ACPs study Bhiwandi's technique of peace

اس میں بتایا گیا تھا کہ ۶ دسمبر کے بعد بھیونڈی کی حالت مثالی (exemplary) رہی۔
بھیونڈی ایک حساس ٹاؤن سمجھا جاتا تھا مگر یہاں بالکل کوئی فساد نہیں ہوا۔ چنانچہ ریاست مہاراشٹر کے مختلف مقامات سے انتظامیہ کے لوگ کیس اسٹڈی کے لئے بھیونڈی آئے۔ انھوں نے ہر جگہ معلومات حاصل کیں اور پانچ لاکھ روپیہ خرچ کر کے فلمس ڈویژن نے ایک ڈاکومنٹری تیار کی۔

اس معجزاتی واقعہ کا سادہ سبب صرف ایک تھا۔ ۶ دسمبر کے بعد جب تناؤ پیدا ہو تو دوسرے مقامات کے مسلمانوں نے " دفاع " کے اصول پر تیاریاں کیں۔ یہ دفاع عملاً فرقہ وارانہ فساد بن کر ظاہر ہوا۔ اس کے برعکس بھیونڈی کے مسلمانوں نے کئی محلہ کمیٹی بنائی۔ ان محلہ کمیٹیوں نے خود دفاع کرنے کے بجائے یہ کیا کہ جہاں کہیں کشیدگی کی صورت پیدا ہوئی فوراً وہاں پہنچ کر لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور حسب ضرورت پولیس کو اطلاع دی۔ جب بھی انھوں نے ایسا کیا، پولیس صرف چند منٹ میں وہاں پہنچ گئی اور فوری کارروائی کر کے معاملہ کو ختم کر دیا۔ بم پر بم مارنا فساد پیدا کرتا ہے۔ بم کو ڈیفیوز کرنا فساد کو ابتدا ہی میں ختم کر دیتا ہے۔

بمبئی میں دو گھنٹہ قیام کے بعد بذریعہ کار پونہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ نظر آیا کہ دو ٹرک سڑک کے اِدھر اُدھر الٹے پڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دونوں آمنے سامنے سے آرہے تھے غالباً ڈرائیور نشے میں تھا۔ اس نے گاڑی کو کنارے نہیں کیا۔ اور ٹکر ہوگئی۔ میں نے دیکھا تو ایک ٹرک کے پیچھے ہندی میں لکھا ہوا تھا: سڑے ہریا منڈے، روز کھاؤ انڈے۔

میں نے سوچا کہ ٹکر ہونے سے پہلے دونوں اس بھرم میں ہوں گے کہ میرا ٹرک میرا ٹرک ہے اس کو نقصان ہونے والا نہیں۔ اگر کچھ ہوا تو صرف دوسرے کا ہوگا۔ مگر جب ٹکر ہوئی تو دونوں کے دونوں تباہ ہوگئے۔ یہی عام جھگڑوں میں ہوتا ہے۔ دو فریق جب لڑتے ہیں تو پیشگی طور پر دونوں میں سے ہر ایک اپنے کو فاتح سمجھتا ہے۔ مگر لڑائی ہوجانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی دونوں کے حق میں تباہ کن تھی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں پہنچا۔

پونہ کی حد میں داخل ہوئے تو ریزرو بینک آف انڈیا کی بلڈنگ کے پاس ڈرائیور نے کسی وجہ سے گاڑی روکی۔ ہم تین آدمی (اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چید انند اور میں) تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہاں سے اپنے میزبان کو ٹیلیفون کر دیں تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ہم پونہ میں پہنچ چکے ہیں۔

ہل کی بلڈنگ میں داخل ہوئے تو سوامی چیدانند نے گیٹ کے چوکیدار سے ٹیلی فون کی بابت پوچھا۔
ں نے بہت رکھائی کے ساتھ جواب دیا اور کہا کہ باہر پبلک ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ سوامی جی نے کہا کہ
کیدار کو چھوڑ ئے۔ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص اسکوٹر سے وہاں آگیا۔ چوکیدار نے
ہا کہ یہ ہمارے افسر ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

آنے والا ہم لوگوں کو دیکھ کر خود ہی اسکوٹر سے اتر گیا اور نرمی کے ساتھ بولا : میں آپ لوگوں کی
یا سیوا کر سکتا ہوں۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم ٹیلیفون کرنا چاہتے ہیں تو فوراً اس نے کہا کہ آپ ہم کو
پنا نمبر دیدیجئے۔ میں خود ان کو ٹیلیفون کر کے بتا دیتا ہوں۔

یہی طریقہ ہر معاملہ میں درست ہے۔ نیچے کے لوگوں سے کبھی نہیں الجھنا چاہئے۔ ہمیشہ اوپر کے
وگوں سے ربط قائم کرنا چاہئے۔ کسی معاملہ کو حل کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

۱۵ دسمبر کی شام کو ہم لوگ پونہ پہنچ گئے۔ رات یہاں گزاری گئی۔ پونہ ایک تاریخی شہر ہے۔
۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی کچھ دنوں کے لئے پونہ میں ٹھہرے تھے۔ یہاں وہ ڈاکٹر ڈنشا مہتا کے
زیر علاج تھے جو پونہ میں ایک کلینک (nature-cure clinic) چلا رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کے
سوانح نگار لوئی فشر (Louis Fischer) نے جولائی ۱۹۴۶ میں ان سے پونہ میں ملاقات کی۔ ملاقات
کے دوران مہاتما گاندھی نے احمد آباد میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کا ذکر کیا۔ مہاتما گاندھی
نے کہا کہ اصل مشکل یہ ہے کہ ایک فریق چھرا مارنا اور قتل کرنا شروع کرتا ہے۔ اور پھر دوسرا فریق
بھی ایسا ہی کرنے لگتا ہے۔ اگر دوسرا فریق اپنی اموات پر انتقامی کارروائی نہ کرے تو اس قسم کی چیز
رک جائے گی :

> The trouble is that one side begins stabbing and killing and then the other does likewise. If one side did not avenge its deaths the thing would stop (p. 424).

بظاہر یہ بہت مشکل ہے۔ مگر اس مسئلہ کا یہی واحد حل ہے، اس کے سوا اور کوئی اس مسئلہ کا
حل نہیں۔ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک ہو۔ جب بھی ایک فریق کی طرف سے اشتعال انگیزی یا
تشدد کا کوئی واقعہ ہو تو دوسرے فریق کو برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس کو روکنے کی
کوشش کرنا چاہئے۔ غلطی کو انتقام کا مسئلہ بنانا غلطی کو بڑھاتا ہے۔ غلطی کو عفو و درگزر کا مسئلہ بناتا

غلطی کی آگ کو پہلے ہی مرحلہ میں بجھا دیتا ہے۔

پونہ میں عبدالصمد صاحب نے بمبئی کے دو اخبار دکھائے۔ ایک روزنامہ انقلاب تھا۔ اس کے شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے پر مختلف اصحاب فکر کا ردعمل شائع کیا گیا تھا۔ جناب محمود ایوبی صاحب کا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا :

"اس صورت حال کو پیدا کرنے میں یقیناً بی جے پی، وی ایچ پی، اور سنگھ پریوار کا ہاتھ ہے۔ لیکن ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بابری مسجد کے نام پر سیاسی دکان چمکانے والے مسلم لیڈروں نے بھی کافی اہم رول انجام دیا ہے۔ مسلم لیڈر صاحبان جو آج صبر کی تلقین کر رہے ہیں، وہی باتیں جب الرسالہ والے مولانا وحیدالدین خاں لکھتے اور کہتے تھے تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ بزدلی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان ہی لیڈروں نے لوگوں کو مشتعل کیا اور ہمیں آج یہ دن دیکھنا پڑا۔ اچھی بات ہے کہ مسلمان صبر و ضبط کا ثبوت دے رہے ہیں"

ہفتہ وار بلٹز کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۲ میں اس کے اڈیٹر جناب ہارون رشید علیگ کا مضمون تھا۔ اس کا ایک پیراگراف یہ تھا:

"ہر چند کہ ملک میں فسادات کی لہر پھیلی ہوئی ہے، مسلمانوں نے بڑے صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا ہے۔ ورنہ تباہی و بربادی اور بھی زیادہ ہوتی۔ وہ نام نہاد مسلم لیڈر جو اشتعال انگیز بیان دینے میں بے مثال تھے، وہ بھی آج مولانا وحیدالدین خاں کی بولی بول رہے ہیں (اور قوم کو صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہے ہیں)

پونہ میں لوگوں نے ایک ماروتی وین تیار کی تھی اس میں مجھ کو سفر کرنا تھا۔ میرے ساتھ پونہ کے چند مسلم احباب بھی شامل رہتے۔ اس طرح میں ایک علیحدہ گاڑی میں اپنے احباب کے درمیان سفر کرتا۔ ٹھہرنے کے مقام پر کسی مسلمان کے یہاں ٹھہرتا اور اجتماع کے وقت منچ پر جا کر تقریر کر دیتا اور پھر اپنے لوگوں میں واپس چلا آتا۔

یہ طریقہ مقصد سفر کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں نے مذکورہ ماروتی وین پونہ میں روک دی۔ مسلم احباب کو بھی سفر سے منع کر دیا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے شانتی یاترا کی بقیہ ٹیم کے ساتھ ہی اپنا پورا وقت گزارنا ہے۔ چلنا، اٹھنا اور بیٹھنا، سونا اور کھانا۔ غرض اس دوران دن اور رات انھیں لوگوں کے

ساتھ رہا ہے۔ تاکہ ایک طرف شانتی یاترا کے پروگراموں میں مکمل شرکت ہو اور اسی کے ساتھ برادران وطن سے قریبی تعارف بھی ہو سکے۔ چنانچہ یہ پورا سفر اسی طرح گزرا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو پونہ سے شانتی یاترا شروع ہوئی۔ سامنے ایک جیپ میں شانتی گیت کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ پیچھے ہماری کاروں کا قافلہ تھا۔ یہی صورت آخر تک جاری رہی۔ جیپ سے جو گیت نشر ہو رہا تھا وہ بڑا اثر انگیز تھا۔ گیت کا ایک شعر یہ تھا:

یدی بھلا کسی سے کر نہ سکو تو برا کسی سے مت کرنا

ایک اور گیت کے کچھ شعر یہ تھے:

آشا کی دیپک جلنے دو ٹوٹے ہوئے دل کو جڑنے دو
سب کو اک راہ دکھانا ہے بادھائیں دور ہٹانا ہے
اتہاس کے پنے لکھنے دو گنگا جمنا کو ملنے دو

آخری شعر سن کر میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بات گیت بن کر سڑکوں پر گونج رہی ہے جس کو سوامی ویویکانند نے سو سال پہلے کہا تھا کہ میں اپنے مستقبل کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اسلام باڈی اور ہندو برین دونوں مل کر نئے شاندار انڈیا کی تعمیر کر رہے ہیں۔ دل میں یہ تمنا ابھری کہ گنگا اور جمنا کے یہ دھارے ایک ہو کر کاش ایک بڑا سیلاب بن سکیں۔

یہ شانتی یاترا جگہ جگہ سے گزرتی ہوئی ۱۵ دسمبر سے ۲۱ دسمبر تک جاری رہی۔ وہ پونہ سے شروع ہوئی پھر چاکن، منچر، سنگم نیر، اسرا دھنا، ادیان، نانگاؤں، مالیگاؤں، شری رام پور، نواسا، اورنگ آباد، جالنا، بیڑ، عثمان آباد، لاتور، احمد پور، ناندیڑ، پربھنی، ہنگولی، آکولہ، امراوتی، سیواگرام، وردھا، ناگپور پہنچی۔ ناگپور اس یاترا کا آخری مقام تھا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو پونہ سے شانتی یاترا شروع ہوئی۔ اور ۲۰ اکتوبر کو ناگپور میں ختم ہوئی۔ ہر جگہ ٹیلی فون کے ذریعہ پیشگی طور پر تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔ اس علاقہ میں تناؤ کی وجہ سے جلسہ جلوس بالکل ممنوع ہے۔ مگر پونہ کے مسٹر شانتی لال موتھا کے اثر و رسوخ اور ان کی کوششوں سے ہر جگہ کے لئے اجازت حاصل ہوگئی۔ اور یہ سب کچھ صرف چند دنوں میں انجام پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ بستی میں داخل ہو کر پہلے ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ تک پیدل سفر (پد یاترا) کی جاتی۔

अखिल महाराष्ट्रीय जैन संघटना द्वारा आयोजीत

पुना से नागपुर शांतीयात्रा का अमरावती आगमन

नर,

पिछल कुछ दिनोसे महाराष्ट्र राज्यमें हुई हिंसक घटनाओसे निर्माण हुये मनमुटाव के वातावरण को शांती सद्भाव में बदलने हेतु और जीयो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म के तत्वोका संपुर्ण राज्यमें प्रसार हेतु अखिल महाराष्ट्रीय जैन संघटना द्वारा आयोजीत पुना से नागपूर शांतीयात्रा का आगमन अमरावती नगरमें सोमवार दिनांक २१ दिसंबर को सुबह ८.०० बजे होरहा है। जिसमें निम्न महानुभाव

आचार्य सुशीलमुनीजी, दिल्ली
(जैन धर्म के जियो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म तत्व के विश्वप्रसारक)
स्वामी चिदानंदजी, दिल्ली(अध्यक्ष परमार्थ निकेतन , दिल्ली)

मौलाना वहीदुद्दीन खान (प्रेसीडेंट ऑफ इस्लामिक सेंटर)
शांतीलालजी मुथ्था (सर्वधर्मीय सामुहिक विवाह प्रणेते)

भूषण अण्णा हजारे ★ अमरेंद्र मुनी, दिल्ली ★ अब्दुल करीम फारुखा, नागपूर ★ माधव गडकरी जी संपादक लोकसत्ता) ★ गोविंदभाई श्रॉफ (जेष्ठ समाजसेवक) ★ तात्यासाहेब शिरवाडकर (कुसुमाग्रज) गंगाधर पानतवणे (साहित्यीक) ★ डॉ. यु.म.पठाण (साहित्यीक) ★ प्राचार्य मुंगुळकर एवं ★ सुलेमान र (अध्यक्ष फईज-ए-आम-ट्रस्ट) आदी मान्यवर भी ईस शांतीयात्रामें सहभागी होकर अंबापुरी नगरमें आगमन रहे है। जो सुबह ८.०० बजे वर्तन बाजार स्थीत श्री जैन श्वेतांबर मंदीर से निकलकर अमरावती महानगरमें ो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म ईस तत्वोंका प्रसार करने एंव शांती तथा सद्भाव का वातावरण े निम्नो मार्गोसे भ्रमण करेंगे।

शांती यात्रा भ्रमण मार्ग

साथ, छत्रपुरी चौकसे, इतवारा बाजार चौक, जवाहर गेट, प्रभात चौक, सरोज चौक, जयस्तंभ से सामरा लेकर होतेहुये नेहरू मैदान के शहीद समारक में पहुचेंगी।

इस अवसरपर शांती यात्रा का समापन एवं बीदाई समारोह

अमरावती जिलाकी पालकमंत्री श्रीमती वसुधाताई देशमुख
अमरावती महानगरके महापौर डॉ. श्रीमान देविसिंहजी शेखावत
अमरावती गृहनिर्माण मंडल के अध्यक्ष ॲड.श्रीमान देवराजजी बोथरा

की उपस्थितीमें संपन्न होगा। आपसे विनम्र अनुरोध है की, इस महान कार्यमें सहभागी होने आपभी शांतीयात्रामें मित्रोसह सामील होईये।

— विनीत —

पुनमचंद मुथा ★ अभय कोटेचा ★ राजेंद्र लुनावत ★ मोहनलाल ओस्तवाल ★ नेमीचंद जैन
सुदर्शन गांग ★ प्रदीप जैन ★ अनिल कोठारी ★ कोमल बोथरा ★ नविन चोरडीया ★ अमृत मुथा
राजेंद्र मंसाली ★ नेहाकुमार चोरडीया ★ दिलीप सकलेचा ★ विजय बोथरा ★ प्रकाश मंसाली ★ विजय आचलीया
★ विजय मंसाली ★ शांतीलाल बरडीया ★ कंवरीलाल ओस्तवाल

जीयो और जीने दो का नारा है।

اس دوران لوگ بڑی تعداد میں نکل نکل کر ہمارے قافلہ میں شریک ہوجاتے۔ اس طرح یہ شانتی یاترا چلتی ہوئی کسی متعین مقام پر پہنچتی۔ یہاں پہلے سے اسٹیج تیار رہتا تھا۔ یہاں ہم لوگ ٹھہر کر تقریر کرتے جس میں امن اور تعمیر کی طرف متوجہ کیا جاتا۔ یہی طریقہ پورے سفر میں تمام مقامات پر جاری رہا۔ ہر جگہ لوگوں میں غیر معمولی جوش تھا۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر کوئی شکر یا شرینی لا کر ہم لوگوں کو دے رہا ہے۔ کوئی ہار لئے چلا آرہا ہے۔ کوئی پھول پیش کر رہا ہے۔ غرض لوگوں میں عجیب جوش تھا۔ شانتی یاترا کے آخر میں ہونے والے جلسہ میں ہر جگہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ امن اور شانتی کی آواز ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔ امن اور شانتی کی آواز بلند کرنا گویا لوگوں کی فطرت کے تاروں کو چھیڑ دینا ہے۔ اور جو پکار فطرت انسانی کے مطابق ہو، اس کو لوگوں کی طرف سے لبیک ملنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

چاکن میں داخل ہونے کے بعد پدیاترا، جلسہ اور دوسرے پروگرام کئے گئے۔ ملاقات کے دوران چاکن کے ایک صاحب نے پوچھا کہ شانتی یاترا نکالنے سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا مقصد انسان کی فطرت کو جگانا ہے۔ اس وقت دیش میں جھگڑنے کی جو فضا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے غلط باتیں کر کے انسان کو اس کی فطرت سے ہٹا دیا ہے۔ ہم انسان کو دوبارہ اس کی فطرت کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں، فطرت سے ہٹنے ہی کا نام بگاڑ ہے، اور فطرت پر قائم ہونے کا نام بناؤ۔

پھر میں نے کہا کہ سکھ والا سماج بے سکھ کو برداشت کرنے سے بنتا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں یہ مزاج بنایا جائے کہ کبھی کوئی کڑوی بات سامنے آجائے تو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کیوں کہ کبھی کبھی کوئی خلاف مزاج بات تو بہر حال پیش آئے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ پھول میں بھی کانٹے ہوتے ہیں۔ پھر خدا کا باغ جب کانٹوں سے خالی نہیں تو ہمارا سماج کس طرح ایسی چیزوں سے خالی ہو سکتا ہے۔

منچر میں حسب پروگرام شانتی یاترا کی تمام کارروائی انجام پائی۔ کئی لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ لوگوں نے اپنی شانتی یاترا مہاراشٹر سے کیوں شروع کی۔ میں ابھی کچھ بولا نہیں تھا کہ سوامی چیدانند نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ اس اسٹیٹ کا نام مہاراشٹر ہے۔ دوسری ریاستیں

اگر راشٹر ہیں تو یہ ہمارا راشٹر ہے۔ اس لئے بالکل نیچرل تھا کہ اس کو پہلے لیا جائے۔ کیوں کہ ہمارا راشٹر میں شانتی آجائے تو اس کا اثر سارے راشٹر پر پڑے گا۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک ہندو لیڈر سے ہوئی۔ وہ انتہا پسند ہندو گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کسی ریزرویشن کے بغیر مجھ سے بات کریں۔ وہ راضی ہوئے تو ہم دونوں ایک الگ کمرہ میں بیٹھے اور پھر دونوں میں بات شروع ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں سے کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں یہ کہ (live or leave) یعنی بھارت میں رہنا ہے تو ہمارے کہنے کے مطابق رہو، ورنہ دیش چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیے کہ مسلمان اگر دونوں میں سے کوئی کام نہ کریں، وہ نہ آپ کے کہنے پر چلیں اور نہ دیش کو چھوڑ کر باہر جائیں، تو پھر آپ کیا کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ پھر ہم ان کو سبق سکھا دیں گے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ انھوں نے کہا کہ ہندو ابھی تک اپنی طاقت کو نہیں جانتا تھا۔ اب رام مندر موومنٹ کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہندو نے اپنی طاقت کو جان لیا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ہندو طوفان کے مقابلہ میں بابری مسجد اور سپریم کورٹ کے فیصلے تنکے کی طرح بہہ گئے۔ پھر یہ مسلمان کس طرح اس سیلاب کا مقابلہ کریں گے۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ اپنی بات کہہ چکے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ اجودھیا کا اسٹرکچر پتھروں کا ڈھیر تھا۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ کچھ لفظوں کا مجموعہ تھا۔ آپ پتھر کے ڈھانچہ اور لفظوں کے مجموعہ کو انسان سے برابر (equate) کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ ایکویشن غلط ہے۔ پتھروں کے ڈھانچے کسی طوفان میں گر سکتے ہیں۔ الفاظ کے اوراق کسی آندھی میں اڑ سکتے ہیں۔ مگر پندرہ کروڑ انسانوں کے اوپر رولر چلانا کسی طرح ممکن نہیں۔ میری یہ بات سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

ہم سنگم نیر میں داخل ہوئے تو ہماری آگے کی جیپ پر اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔۔ گنگا جمنا کو ملنے دو۔

ہماری پارٹی کے ایک شخص نے کہا کہ ہمارا دیش گنگا اور جمنا کا سنگم ہے۔ اسی طرح یہ دیش مختلف کلچر کا بھی سنگم ہے۔ سنگم نیر اگر دیش کے اس پہلو کی ایک مثال بن جائے تو یہ اس کے نام کے

لحاظ سے اس کے لئے سب سے اچھی بات ہوگی۔

اراد ھنا ادیان میں ہم لوگ ایک جین مندر میں گئے۔ وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ اس کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے ہم کو ایک چھوٹے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک بوڑھے آدمی لیٹے ہوئے تھے۔ چادر اٹھائی گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بالکل دبلے ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہڈی کے ڈھانچہ کے اوپر ایک سوکھی کھال لپٹی ہوئی ہے۔ بولنے کی طاقت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم آنکھ کھول کر وہ آنے جانے والے کو دیکھ سکتے تھے۔

پہلے میں نے سمجھا کہ بیماری کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا ہے۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جین مذہب کے مطابق وہ عمل کر رہے ہیں جس کو سنتھارا کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صرف جین دھرم میں ہے۔ اس میں آدمی خود اپنے ارادہ سے ہر قسم کا کھانا اور پانی مکمل طور پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اسی طرح بھوکا پیاسا پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن مر جاتا ہے۔ ایک جینی اچاریہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم مرتیو سے نہیں مرتے، ہم اپنی مرضی سے شریر چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسرے جینی نے کہا: ڈسمس کئے جانے سے پہلے ہم خود ہی رزائن کر دیتے ہیں۔

اس دنیا میں کوئی شخص کتنا ہی زیادہ غیر معقول رویہ اختیار کرے، اس کو بہر حال اپنے عمل کو درست ثابت کرنے کے لئے الفاظ مل جائیں گے۔ اچاریہ منی سوشیل کمار نے یہ لطیفہ بتایا کہ غلام احمد قادیانی نے ایک عورت سے یہ کہہ کر نکاح کیا کہ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو میری جانشینی کرے گا۔ نکاح ہو گیا مگر اس خاتون سے کوئی لڑکا پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک اردو اخبار نے مرزا صاحب کی اس بات کو نقل کرتے ہوئے ان کا مذاق اڑایا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا: اس عقل کے اندھے کو پتہ نہیں کہ دو اٹھنی مل کر ایک روپیہ بن جاتا ہے۔ تمثیل کے ذریعہ استدلال کتنا کمزور ہوتا ہے، یہ واقعہ اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

مالیگاؤں میں ۷ دسمبر کی رات گزاری۔ پدیاترا کے بعد ایک بڑا اجتماع ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ دوسرے لوگوں کی تقریروں کے ساتھ میری بھی تقریر ہوئی۔ اگلی صبح کو فجر کی نماز کے بعد کچھ لوگ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر آئے۔ جناب محمد لقمان صاحب نے وہاں کے ایک صاحب کے بارہ میں بتایا کہ کل وہ میرے ساتھ آپ کو سننے

کے لئے آئے تھے۔ راستہ میں وہ مجھ سے جہاد کی باتیں کرتے رہے۔ مگر جب آپ کی باتیں سن کر واپس ہوئے تو انھوں نے کہا کہ میرا دماغ بالکل دھل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جہاد کا وقت نہیں ہے بلکہ صبر کا وقت ہے۔ اور یہ کہ صبر کوئی منفعل حالت نہیں، وہ زبردست عمل ہے۔ اور آج اسی صابرانہ عمل کی ضرورت ہے۔

اس یاترا کے دوران ہم لوگ جہاں جہاں گئے، ہر جگہ نئے نئے تجربے حاصل ہوئے۔ ۱۶ دسمبر کو ہم ناندگاؤں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں کئی دکانیں جلی ہوئی نظر آئیں۔ ایک دکان سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا اور پائپ کے ذریعہ وہاں پانی ڈال کر اس کو آخری طور پر بجھایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر دل کو سخت جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ اپنی دکان ہو تو آدمی اس کو نہایت شوق کے ساتھ سنوارتا ہے، اور جو دکان دوسرے کی ہو اس کو بے رحمی کے ساتھ آگ لگا دیتا ہے۔ خود غرضی کا دین بھی کیسا عجیب ہے۔

آگے بڑھے تو ایک اسکول کے چھوٹے بچے یونیفارم میں آگئے اور ہمارے ساتھ اپنے ننھے پیروں کے ساتھ چلنے لگے۔ ان کو دیکھ کر مجھے کسی کا یہ قول یاد آیا کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ خدا انسانوں سے مایوس نہیں ہوا۔ سوامی چیدانند نے اپنی تقریر میں کہا کہ ناندگاؤں میں اس قسم کا دنگا پہلی بار ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ لوگ یہ طے کریں کہ یہی پہلی بار بھی ہو اور یہی انتم بار بھی۔

مالیگاؤں میں پدیاترا بہت لمبی رہی۔ میرا گمان تھا کہ مالیگاؤں ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ کافی بڑا ہے اور بالکل شہر کی مانند ہے۔ مالیگاؤں میں ہم لوگ شام کو پہنچے۔ پدیاترا کے بعد تقریروں کا پروگرام تھا۔ کافی لوگ شریک ہوئے۔ صبح کو وہاں سے روانگی تھی۔ ابھی تک وہاں رات کا کرفیو چل رہا تھا۔ یہاں الرسالہ کے قارئین بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں سے ملاقات ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی پبلسٹی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو میری آمد کا علم نہ ہو سکا۔

شری رام پور میں حسب معمول تمام پروگرام ہوئے اور کافی کامیاب رہے۔ ملاقاتوں کے دوران شری رام پور کا ایک سبق آموز قصہ معلوم ہوا۔ یہاں ایک بزرگ کی قبر ہے۔ ۶ دسمبر کے بعد کسی شریر آدمی نے رات کے وقت قبر کو توڑ ڈالا۔ اس قسم کا ایک واقعہ عام طور پر دو فرقوں میں کشیدگی

اور پھر خونیں فساد کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر شری رام پور میں ایسا نہیں ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ قصہ پیش آیا تو فوراً ہی بستی کے ہندو اور مسلمان وہاں پہنچے۔ اور دونوں نے مل کر قبر کو پھر سے بنایا۔ اور پھر اس کے اوپر حسب قاعدہ چادر چڑھائی۔ اس طرح انھوں نے فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔ یہ واقعہ ۷ دسمبر کو مجھے معلوم ہوا جب کہ میں شانتی یاترا کے تحت شری رام پور میں پہنچا تھا۔

۷ دسمبر کی شام کو ہم نواسا پہنچے۔ یہاں پد یاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا جس میں ہمارے ساتھیوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ زندگی میں کبھی کبھی اختلاف کا پیدا ہونا عین فطری ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ خواہ وہ ایک سماج ہو یا کوئی دوسرا سماج۔ پھر اس کا حل کیا ہے۔

میں نے کچھ واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے حل کے لئے میں آپ کو دو آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ ایک یہ کہ —— دوری کو دور کیجئے۔ یعنی ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے لوگ آپس میں خوب ملیں۔ وہ باہمی دوری کو ختم کریں۔ اس کے بعد بہت سی غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

دوسرے یہ کہ جب جھگڑے یا اختلاف کی صورت پیدا ہو تو ایسے موقع پر آپ کا اصول ہونا چاہئے —— ٹکراؤ نہیں، تدبیر۔ یعنی ایسے مواقع پر آپ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ تدبیر کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ بم پر بم نہ ماریں بلکہ بم کو ڈیفیوز کر دیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ جھگڑے کو اس کے پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیں گے۔

میری تقریر کے بعد کچھ ہندو نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کبھی اس طرح سوچا نہیں تھا۔ مگر آج سمجھ میں آیا کہ یہی اصل بات ہے اور ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔

میں نے بتایا کہ اس کی ایک مثال دسمبر ۱۹۹۲ میں ہونے والا دہلی کا فساد ہے۔ دہلی میں ۱۲ دسمبر کو میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے غصہ کے ساتھ کہا "اس وقت ایسٹ دہلی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں، یہ پولیس مسلم فساد ہے"۔

یہ بات انھوں نے ویلکم کالونی کے فساد کے بارہ میں کہی تھی۔ مگر جس ایسٹ دہلی میں ویلکم کالونی ہے، اسی ایسٹ دہلی میں عین اس کے پاس ہی گونڈہ کالونی ہے۔ اور گونڈہ کالونی میں نہ کوئی فساد ہوا اور نہ کرفیو لگا۔ حالانکہ وہاں بھی "سازش" کے وہی واقعات ہوئے جس کا حوالہ دوسرے مقامات

پر دیا جاتا ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو میری ملاقات مولانا محمد قاسم قاسمی سے ہوئی۔ وہ مدرسہ حسین بخش میں استاد ہیں اور گونڈہ کالونی میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ۸ دسمبر کو جب پرانی دہلی میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی تو فوراً وہ گونڈہ کالونی چلے گئے اور ایک ہفتہ تک مسلسل وہیں رہے۔ انھوں نے ذاتی واقفیت کے تحت کئی واقعات بتائے۔

انھوں نے بتایا کہ گونڈہ کالونی میں ایک ہندو کالج ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ اس کالج میں ہتھیار جمع کئے گئے ہیں اور لڑکے وہاں اکٹھا ہو کر باقاعدہ فساد کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ کچھ مسلمانوں نے فوراً پولیس کے ذمہ داروں کو ٹیلی فون کیا اور انھیں بتایا کہ یہاں فساد کا خطرہ ہے، آپ لوگ اس کو روکنے کی کارروائی کریں۔ اس کے بعد پولیس کی ایک پارٹی کالج میں داخل ہوئی۔ اس نے تلاشی لی تو خبر صحیح نکلی۔ پولیس نے اسی وقت تمام ہتھیار اپنے قبضہ میں کر لئے اور لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔

اسی طرح گونڈہ کالونی کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہندو وکیل کے مکان کے اوپری حصہ میں گولہ بارود جمع ہے اور وہاں بم بنائے جا رہے ہیں۔ تحقیق کر لینے کے بعد کچھ سمجھدار مسلمان اس ہندو وکیل کے یہاں گئے اور اس سے کہا کہ آپ کے اوپر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب آپ یا تو سارا سامان ضائع کر دیں، ورنہ ہم پولیس کو بلاتے ہیں۔ ہندو وکیل نے معافی مانگی اور اسی وقت تمام سامان ضائع کر دیا۔

ایک رات کو کارسیوکوں کی ایک گاڑی گونڈہ کالونی میں آگئی۔ وہ ہر ہر مہا دیو کے نعرے لگانے لگے۔ اس کو سن کر کچھ مسلم نوجوان باہر نکل آئے۔ انھوں نے بھی اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ اس وقت فوراً کچھ سنجیدہ مسلمان باہر آئے۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو روکا اور پولیس کو ٹیلی فون کر کے بلایا۔ پولیس نے اسی وقت کارروائی کر کے کارسیوکوں کو وہاں سے بھگا دیا۔

مولانا قاسم صاحب نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد جب کشیدگی پیدا ہوئی تو فوراً ہی گونڈہ کالونی والوں نے باہم مشورہ سے امن کمیٹی بنائی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کو شریک کیا۔

امن کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق، کالونی کے ہندؤوں اور مسلمانوں کی ایک ٹیم پہرہ داری کے لئے مقرر کی گئی۔ اس میں کوئی نوجوان نہیں لیا گیا۔ سب ادھیڑ عمر کے لوگ شامل تھے۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں عین فساد کے زمانہ میں بھی گونڈہ کالونی پوری طرح فساد سے محفوظ رہی۔ حتی کہ وہاں کرفیو لگانے کی نوبت بھی نہیں آئی۔

فساد کے بم سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ دانش مندی کے ذریعہ فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا جائے۔ فرقہ وارانہ فساد کے نقصان سے بچنے کی اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں۔

اورنگ آباد میں شانتی یاترا کا پروگرام معمول کے مطابق مکمل کرنے کے بعد ہم نے یہاں کے گیسٹ ہاؤس میں رات گزاری۔ مجھے یاد آیا کہ سر جادو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخی کتاب (Aurangzeb) میں لکھا ہے کہ ۱۶۵۸ء میں جب کہ انڈیا میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ اورنگ آباد میں اجناس کا ریٹ یہ تھا: گیہوں اور دال ایک روپیہ میں ڈھائی من، جوار اور باجرا ایک روپیہ میں ساڑھے تین من، گڑ ایک روپیہ میں آدھا من، گھی ایک روپیہ میں چار سیر (جلد ۱، صفحہ ۱۷۳)

یہ ساڑھے تین سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت روپیہ مہنگا تھا اور چیزیں سستی تھیں۔ اب چیزیں مہنگی ہیں اور روپیہ سستا ہے۔ عام انسان کے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ یہ کہ قدیم انسان کے لئے مزید یہ تھا کہ اس کو سکون کی نعمت حاصل رہتی تھی۔ جب کہ آج یہ حالت ہے کہ نہ کم والے کو سکون ہے اور نہ زیادہ والے کو۔

جالنہ میں پدیاترا کے بعد بہت بڑا اجتماع ہوا۔ دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ تقریروں میں شام ہوگئی۔ یہاں شام سے صبح تک کا کرفیو چل رہا ہے۔ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے۔ مگر کرفیو کے اندیشہ کی وجہ سے آخر میں اٹھنے لگے۔ جالنہ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ منچ کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً اعلان کرایا کہ آپ لوگ کرفیو کا دھیان نہ کریں۔ آخر تک یہاں کے بیانات کو سنیں۔ اور اس کے بعد اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ چنانچہ جلسہ کی کارروائی مزید دیر تک جاری رہی۔

میں نے جالنہ کی تقریر میں کہا کہ یہاں اتنے آدمی ہیں جیسے کہ پوری بستی امنڈ آئی ہے۔ اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ امن و شانتی کے کتنے زیادہ خواہش مند ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان امن و سکون ہی کو پسند کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہمارے درمیان دنگا ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض چیزیں جس کو بھلا دے کے خانہ میں ڈالنا تھا اس کو ہم عمل کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ پیدا کرنے والے نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسی کے ساتھ اس نے ایک اور چیز پیدا کی جس کو آپ گلاب کہتے ہیں۔ گلاب کا پھول پھولوں کا راجہ ہے۔ کتنا اچھا ہوتا ہے وہ۔ لیکن گلاب کا پھول جس ڈنٹھل میں اگتا ہے، اس میں ساتھ ہی کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا فطرت کے ایک واقعہ کی زبان میں یہ پیغام دیا گیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوں گے۔ یہاں اگر پھول لینا ہے تو کانٹے کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ کانٹے کو نظر انداز کئے بغیر اس دنیا میں پھول جیسی قیمتی چیز نہیں مل سکتی۔ اسی اصول پر ہمیں اپنی سماجی زندگی کو چلانا چاہئے۔

۱۸ دسمبر کو بیٹر پہنچے۔ بے شمار لوگ شانتی یاترا میں شریک ہوگئے۔ آخر میں جب اجتماع ہوا تو اتنے آدمی اکٹھا ہوئے کہ دور دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ میری بھی کسی قدر مفصل تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد بہت سے لوگوں نے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ ایک مقامی ہندو جرنلسٹ راجندر منت نے بتایا کہ میں آگے منچ کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے قریب ہی یہاں کے کلکٹر مسٹر سنجے کمار شرما بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آپ کی تقریر بہت غور سے سن رہے تھے اور اس سے اثر لے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی تقریر سنتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

احمد پور میں شانتی یاترا کے پروگرام کی تکمیل کے بعد ایک ہندو لیڈر مسٹر کیدار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد کاہٹی میں کچھ واقعات ہوئے۔ اس میں ایک مندر بھی توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں ہندو اور مسلمان جمع ہوئے۔ سب نے اس کام کی مذمت کی اور طے کیا کہ دونوں مل کر دوبارہ مندر تعمیر کریں گے۔ چنانچہ دونوں فرقہ کے لوگوں نے مل کر خود اپنے ہاتھ سے مندر کی نئی تعمیر کی۔ اس میں کوئی بھی سرکاری امداد قبول نہیں کی گئی۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۲ کو دوپہر کے وقت ہمارا قافلہ لاتور پہنچا۔ لاتور (Latur) کا نام پہلے لتالور

تھا۔ لٹالور (Lattalur) کا لفظ ادائگی میں مشکل تھا، اس لیے وہ دھیرے دھیرے لاتور ہوگیا۔ یہی مثال ہر معاملہ کی ہے۔ عوام ہمیشہ اس چیز کو قبول کرتے ہیں جو انھیں آسان معلوم ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سطحی اسکیمیں، بہت جلد لوگوں کے درمیان مقبول ہو جاتی ہیں اور گہرے اور دور رس منصوبے لوگوں کو اپیل نہیں کرتے۔

لاتور جنوبی ہند کے اس علاقہ میں ہے جس کو دکن کہا جاتا ہے۔ پہلے یہ ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا۔ یہاں مسلمان تقریباً ۲۵ فی صد کی تعداد میں آباد ہیں۔

حسب معمول لاتور کی سرحد پر پہنچ کر ہم لوگ گاڑی سے اتر گئے اور سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ پدیاترا کے دوران ہم ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں ایک نیا منظر ہمارے سامنے تھا۔ یہ ایک بڑا مندر تھا، اس کے چاروں طرف دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ ان دکانوں کی تعداد ۸۰ تھی۔ گویا یہ ایک مندر کامپلکس تھا۔ اس مندر کے چاروں طرف سولہ راستے تھے۔ یعنی ۱۶ سڑکیں جو مندر سے شروع ہوکر شہر کی طرف جا رہی تھیں اس قسم کا مندر میں نے پہلی بار دیکھا۔

اس مندر کے قریب ہی ایک مسجد کا نیا گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک زیر تعمیر مسجد تھی جو اب تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ بہت بڑی مسجد ہے۔ قدیم مسجد میں کافی توسیع کر کے تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے اس کو از سرِ نو بنوایا جا رہا ہے۔

ہم نے پایا کہ یہاں اگرچہ دونوں پاس پاس ہیں مگر نہ مسجد والوں کو مندر سے کوئی شکایت ہے اور نہ مندر والوں کو مسجد سے کوئی شکایت۔ لاتور کے ہندو اور مسلمان دونوں مل جل کر امن کیساتھ رہ رہے ہیں۔ حالیہ ہنگامہ خیز دنوں میں بھی یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی جیسی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی۔

یہاں کے مسلمانوں کو پُر امن زندگی کی یہ قیمت ملی ہے کہ اس علاقہ میں وہ خوشحالی کے لیے مشہور ہیں۔ وہ بڑی بڑی تجارتیں کر رہے ہیں۔ اس لیے لاتور اس بے بنیاد نظریہ کی تردید ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق دراصل اس بات سے ہے کہ لوگ اس حقیقت کو بھول جائیں کہ زندگی کا ایک لازمی اصول اعراض ہے۔ اجتماعی زندگی میں ناخوش گواریاں ضرور پیش آتی ہیں۔ ایسے مواقع پر اعراض نہ کرنے سے فساد ہوتا ہے، اور اعراض کا طریقہ اختیار کرنا ہر فساد کو روک دیتا ہے۔

۱۹ دسمبر کا پروگرام مکمل کرنے کے بعد آج کی رات ناندیڑ میں گزاری۔ یہاں ایک ہندو تاجر

ہمارے میزبان تھے۔ ناندیڑ میں بڑی تعداد میں الرسالہ کے قارئین موجود ہیں۔ مگر شانتی یاترا کا پروگرام بہت کم وقت میں بنا تھا۔ اس لئے مقامی طور پر اس کی زیادہ پبلسٹی نہ ہو سکی۔ چنانچہ قارئین الرسالہ کی بہت تھوڑی تعداد سے ملاقات ہو سکی۔

آل انڈیا ریڈیو (ناندیڑ) کی ٹیم نے ایک انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا موضوع اسلام تھا۔ انٹرویو ر نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے، اس کے بارہ میں آپ ہمارے سننے والوں کو بتائیں۔ میں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں ۱۰ منٹ تک کچھ بنیادی باتیں بتائیں۔ میں نے خاص طور پر دو آیتوں کی تشریح کی۔ ان مع العسر یسرا۔ اور واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض۔

اس سفر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہندو صاحبان اسلام کے بارہ میں سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جب بھی میں نے اسلام کے حوالے کے بغیر عمومی انداز میں کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے تقاضا کیا کہ آپ اسلام کے حوالے سے ہمیں بتائیں۔ ہم ایک عالم کی زبان سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے۔

ناندیڑ میں ہمارا رات کا قیام مسٹر پرکاش چند سیٹھی کے نئے تعمیر شدہ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ وہ ٹرانسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کی کمپنی کا نام سری شانتی روڈ ویز ہے۔ میری عادت ہے کہ میں ہر آدمی سے اس کے اپنے میدان کی بات کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ سنانے سے زیادہ سننے کا شوق رہتا ہے۔ میں نے مسٹر سیٹھی سے کہا کہ ہم نے اس سفر کے دوران سڑکوں پر چھ ٹرک الٹے ہوئے دیکھے۔ آخر سڑک کے یہ حادثات کیوں ہوتے ہیں۔ کیا اس کا سبب انجن کی خرابی ہے۔

انھوں نے کہا کہ نہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ سڑک کا کوئی حادثہ انجن کی خرابی کی وجہ سے ہو۔ وہ تقریباً ہمیشہ ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو گاڑیاں اس وقت استعمال ہو رہی ہیں، ان کے بریک اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ بہت ہی کم اس کا چانس ہوتا ہے کہ وہ فیل ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ ڈرائیور کبھی نشہ میں ہوتا ہے۔ کبھی رات کو گاڑی چلاتے ہوئے اس کو جھپکی آجاتی ہے۔ اس بنا پر حادثہ پیش آجاتا ہے۔

میں نے سوچا کہ انسانی زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ عام انسانوں کی حیثیت گاڑی جیسی ہے، اور لیڈر کی حیثیت ڈرائیور جیسی۔ سماج میں جو فسادات پیش آتے ہیں وہ حقیقۃً عام انسانوں کی

کسی خرابی کی وجہ سے پیش نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ لیڈروں کی نالائقی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ اگر یہ لیڈر اپنے گھروں میں چپ ہو کر بیٹھ جائیں تو موجودہ فسادات اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اس کے بعد فطرت انسانوں کی رہنما ہوگی۔ اور فطرت کبھی رہنمائی میں غلطی نہیں کرتی۔

ناندیڑ میں ہم لوگ یہاں کا مشہور گرودوارہ دیکھنے گئے جو گرو گوبند سنگھ کے نام پر بنا ہے۔ یہ بہت بڑا اور بہت صاف ستھرا ہے۔ وہ ایک مکمل سکھ ادارے کے طور پر چلایا جا رہا ہے۔

گرو گوبند سنگھ سکھوں کے دسویں اور آخری گرو ہیں۔ وہ ۱۶۶۶ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خالصہ تنظیم قائم کی جو ایک مسلح سکھ تنظیم تھی۔ وہ پنجابی کے علاوہ فارسی، عربی اور سنسکرت زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ انھوں نے دسم گرنتھ کو مرتب کیا۔

ایک روز وہ اپنے مریدین کے درمیان تھے۔ لمبے مراقبہ کے بعد اچانک انھوں نے سر اٹھایا اور کہا کہ میری تلوار ایک سر مانگتی ہے۔ تم میں سے کون یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ اضطراب اور خاموشی کے ایک وقفہ کے بعد ایک شخص اٹھا۔ اس نے کہا کہ میں اس قربانی کے لئے تیار ہوں۔ گوبند سنگھ اور وہ آدمی دونوں ایک بند خیمہ میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد گوبند سنگھ خون آلود تلوار کے ساتھ باہر آئے۔ اور دوبارہ اسی قسم کی قربانی کی مانگ کی۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک کے بعد ایک پانچ آدمی "قربان" ہو گئے۔ آخر میں پانچوں آدمی زندہ حالت میں باہر آئے۔ گرو گوبند سنگھ نے صرف ان کی وفاداری کو آزمایا تھا۔ اس کے بعد ان پانچ افراد کو "پنج پیارا" کا لقب دیا گیا۔ یہ اس خالصہ تنظیم کے بنیادی ارکان تھے جو انھوں نے ۱۶۹۹ میں قائم کی۔

گرو گوبند سنگھ سکھوں میں فائٹنگ اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک طرف مغلوں سے اور دوسری طرف پہاڑی قبائل سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں انھوں نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ تاہم ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء میں وہ ناندیڑ میں قتل کر دئے گئے۔ ان کی قتل گاہ پر ناندیڑ کا موجودہ گوردوارہ بنا ہوا ہے۔

مغل دار و گیر کے زمانہ میں گوردواروں کی ایک بڑی تعداد ہندو مہنتوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ برٹش دور میں سکھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کوشش کے بعد آخر کار برٹش حکومت

نے ۱۹۲۵ میں سکھ گور دوارہ ایکٹ پاس کیا۔ اس کے تحت تمام گوردوارے دوبارہ سکھوں کو واپس مل گئے۔
(IV/805)

یہی قصہ ایک اور شکل میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ برٹش دور میں مسلمانوں کی بہت سی مسجدیں اور مقبرے وغیرہ آرکیالوجی کے قبضہ میں چلے گئے۔ مگر مسلم رہنما انگریزوں کے خلاف سیاسی لڑائی لڑنے میں اتنا زیادہ مشغول ہوئے کہ ان کو یاد نہ رہا کہ کثیر تعداد میں مسجدیں اور دوسرے بڑے بڑے مسلم مقامات آثار قدیمہ کے قانون کے تحت سرکاری قبضہ میں چلے گئے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں واگزاری کی کوشش نہ کی۔ یہاں تک کہ ملک آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے۔ اس نے مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مزید شدید تر مسائل پیدا کر دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہ انتہائی قیمتی جگہیں بدستور سرکار کے محکمہ آثار قدیمہ کے قبضہ میں باقی رہ گئیں۔

۲۰ دسمبر کو ساڑھے دس بجے ہم پربھنی میں داخل ہوئے۔ شانتی یاترا یہاں کی سڑکوں پر گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچی۔ یہاں کافی بڑا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر ہماری پارٹی کے مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ دسمبر ۱۹۹۲) میں درمیانی صفحہ پر ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا:

The Disorientation Goes on

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں اصل مسئلہ رخ سے بے رخ ہونے (disorientation) کا ہے۔ یہاں ہمارے لئے عمل کا رخ بگڑ گیا ہے۔ میں نے اس عنوان کو لے کر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اصل واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہمیں جس رخ پر اپنی کوششوں کو جاری کرنا چاہئے تھا، اس رخ پر ہم اپنی کوششوں کو جاری نہ کر سکے۔ اس لئے ہماری تمام کوششیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ آزادی کے بعد ہر ایک نے یہ کیا کہ دوسروں سے وہ اپنے جھگڑے نپٹانے میں لگ گیا۔ مثلاً اپنی زبان کو منوانا اور لسانی اسٹیٹ بنانا۔ اپنے مذہبی قانون کو منوانا اور اپنے لئے علیحدہ قانون بنوانا۔ اپنے تشخص کا مطالبہ لے کر اٹھنا اور دوسروں سے اس بات پر لڑنا کہ ہمارا تشخص بحال کرو۔

یہ سب کوششوں کے غلط رخ تھے۔ اصل رخ صرف ایک تھا، اور وہ تعلیم تھا۔ اگر ۱۹۴۷ کے بعد

سارا زور تعلیم پر دیا گیا ہوتا تو ہمارے بقیہ مسائل اپنے آپ حل ہو جاتے۔ قوم کو تعلیم یافتہ بنانا قوم کو باشعور بنانا ہے۔ اور جو لوگ باشعور ہو جائیں ان کے بقیہ تمام مسائل اپنے آپ حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ہنگولی میں شانتی یاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمام مسلمان علامہ اقبال کے پرستار ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک حدیث کے حوالے سے کہا ہے کہ ہندستان وہ ملک ہے جس کے بارہ میں پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے مجھ کو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے　　میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

میں نے کہا کہ ہمارے پیغمبر کو جس ملک میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں، وہاں رہ کر ہم کو بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ملنے چاہئیں۔ جہاں پیغمبر کو ٹھنڈی ہوا ملی وہاں ہم کو گرم ہوا ملے تو ہم کو اس جگہ سے شکایت نہیں ہونی چاہئے بلکہ خود اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ ایسا تو نہیں کہ خود ہماری کسی غلطی سے وہاں کی ٹھنڈی ہوا ہمارے لئے گرم ہوا بن گئی ہو۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک اصل معاملہ یہی ہے۔ ہم اس ملک میں پیغمبر والے احساس کے ساتھ نہیں رہ رہے ہیں۔ وہ صبر کے احساس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم بے صبری کے احساس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوا ہے کہ ٹھنڈی ہواؤں کا دیش ہمارے لئے گرم ہواؤں کا دیش بن گیا ہے۔

۲۰ دسمبر کو ہم آکولہ میں تھے۔ پروگرام کی تکمیل کے بعد شام کا کھانا ہم لوگوں نے یہاں کے ایک تاجر مسٹر دلیپ کوٹھاری (Tel. 26688) کے یہاں کھایا۔ کھانے کے بعد واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک نوجوان تولیہ لے کر آیا۔ اس نے کہا: مولانا صاحب، میرا نام محبوب ہے، میرے لئے دعا کریں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ تندرست اور خوش پوش نظر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ مجھ کو بہت مانتے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔

اس کے بعد مسٹر کوٹھاری نے کہا کہ ہمارے علاقہ میں کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ دیکھئے یہ مسلمان لڑکا ہمارے یہاں دس سال سے گھریلو ملازم کے طور پر ہے۔ مگر ہم اس کو اپنے بیٹے کی طرح رکھتے ہیں۔

ایک مسلمان لڑکی سے اس کی شادی بھی ہم نے خود کرائی ہے۔ دونوں خوشی خوشی ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں۔

انسان عام طور پر فطرت کی سطح پر جیتے ہیں۔ اور فطرت کی سطح پر ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان اچھے تعلقات ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے لیڈر جھوٹے اشو لے کر لوگوں کی سوچ بگاڑ دیتے ہیں اور یہیں سے فساد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ نا اہل لیڈر فطرت کے نظام کو بگاڑنے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس سے قرآن میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے: لاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا۔

آکولہ میں ۶ دسمبر کے بعد کچھ فسادات ہوئے اور جان و مال کا نقصان بھی ہوا۔ مسٹر رویندر کمار نے بتایا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک درگاہ ہے۔ ۶ دسمبر کی صبح کو کچھ ہندوؤں نے درگاہ پر دھاوا کر دیا۔ اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔ مگر اس کے بعد خود ہندوؤں نے اس پر افسوس ظاہر کیا۔ اسی دن شام کو بہت سے ہندو درگاہ پہنچے۔ انھوں نے اس کی مرمت اور تعمیر شروع کر دی۔ وہ لوگ ساری رات کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۸ دسمبر کی صبح طلوع ہوئی تو درگاہ دوبارہ بن کر تیار ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ درگاہ کی دوبارہ تعمیر حقیقۃً فطرت انسانی کا کارنامہ تھا۔ انسان کی فطرت میں شرمندگی (repentance) کا نہایت گہرا جذبہ ہے۔ انسان غلطی کرنے کے بعد ہمیشہ پچھتاوے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر فریق ثانی دوبارہ غلطی کرکے انسانی فطرت کے عمل کو روک نہ دے تو یہ فطرت ضرور کام کرے گی —— تخریب کے بعد خود شرمندہ ہو کر دوبارہ تعمیر کے کام میں لگ جائے گی۔

شانتی یاترا کے دوران ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہم لوگ امراوتی پہنچے تھے۔ حسب معمول سڑکوں پر پد یاترا کے بعد ہم ایک مقام پر ٹھہرے۔ یہاں ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اچاریہ منی سوشیل کمار اور سوامی چیدانند نے اپنی تقریر میں لوگوں سے شانتی قائم رکھنے کی اپیل کی۔

میں کھڑا ہوا تو سفر کے دوران نفرت کا ماحول اور فساد کے مناظر دیکھنے کی وجہ سے میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے۔ تقریر شروع کی تو میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے: شانتی یاترا کس لئے نکلی ہے۔ یہ شانتی یاترا اس لئے نکلی ہے کہ جس آگ کو فائر بریگیڈ

کا پانی نہ بجھا سکا، اس کو سنت اور فقیر کے آنسوؤں سے بجھا دیا جائے۔

عجیب بات ہے کہ شانتی یاترا سے واپسی کے بعد ۲۹ دسمبر کا اخبار آیا تو اس میں یہی بات پرائم منسٹر نرسمہا راؤ کے حوالے سے چھپی ہوئی تھی۔ سوامی ویویکانند نے ۱۸۹۳ میں شکاگو کی کانفرنس میں ایک خطبہ دیا تھا۔ اس کے سو سالہ جشن کے طور پر کنیاکماری میں راشٹر چیتنا (قومی بیداری) کی تقریب منائی گئی۔ اس موقع پر پرائم منسٹر نرسمہا راؤ نے شرکت کی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

دیش آج بحران سے دوچار ہے۔ اس بحران کی گھڑی میں ہم کو روحانی اور مذہبی پیشواؤں کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ سیاست دانوں کے مقابلہ میں عوام کے جذبات کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو یہ ملک رہنے کی زیادہ بہتر جگہ ہو جائے گا۔ مجھے اس حقیقی راستہ کی تلاش ہے جس پر آئندہ اس ملک کو چلنا چاہئے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ دسمبر ۱۹۹۲) کی رپورٹ کے مطابق انھوں کہا کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ ایک ایسے پیاسے مسافر کی طرح ہیں جو پانی کی تلاش میں ہے۔ مگر افسوس کہ پانی کے بجائے میں ایک سراب میں جا پڑا:

> He was like a thirsty traveller looking for water. But instead of water, I stepped into a mirage (p. 4).

ایک جگہ مجھے معلوم ہوا کہ جلوس پر فساد ہوا۔ کچھ مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا۔ دوسرے فرقہ کے لوگوں نے روک ٹوک کی۔ اب دونوں طرف کے لوگ مشتعل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات میں ہوتا ہے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انڈیا میں سب سے بڑی بدعت جلوس ہے۔ موجودہ مزاج کے ساتھ جلوس نکالنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ بالفرض اگر جلوس کو جائز سمجھا جائے تو وہ ان لوگوں کے لئے جائز ہوگا جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جمہوریت میں مظاہرہ کا حق ہے اور جلوس دراصل مظاہرہ کے لئے نکالا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بر داشت والے لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام مظاہرہ ہے، اور بے برداشت لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام فساد۔ اور فساد کسی بھی قانونی نظام میں جائز نہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ مشن کیا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ مشن احیاء دین کا مشن ہے۔ الرسالہ کا مشن امت کو قرآن وسنت کی طرف بلانا ہے۔ الرسالہ کا مشن وہی ہے جو ہر دور میں مصلحین امت کا مشن رہا ہے۔ ایک مشہور دینی حلقہ کی طرف سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کے ٹائٹل کے صفحہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے: شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید۔ ایک اور بڑے دینی حلقہ کی طرف دوسرا عربی ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر یہ فقرہ درج ہوتا ہے — دعوتنا: عودة بالامة الی الکتاب والسنة۔

تمام دینی حلقے اور تمام اسلامی جماعتیں اس قسم کے الفاظ میں اپنا مقصد ظاہر کرتی ہیں۔ الرسالہ مشن کے سامنے بھی عین یہی نشانہ ہے۔ ہمارے اور دوسروں کے درمیان جو فرق ہے وہ اصول کا نہیں طریقہ کا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں جو دین مسلم ہے وہی ہمارا دین بھی ہے۔ البتہ اس کو پیش کرنے کے لئے ہم نے عصری اسلوب اختیار کیا ہے۔

۶ دسمبر کے بعد ہونے والے بمبئی کے فساد میں دو سو آدمی ہلاک ہوگئے۔ یہ سب کے سب سلم علاقے میں رہنے والے لوگ تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ بمبئی کے سلم علاقوں میں فساد ہوا، مگر یہاں کی کالونیوں میں فساد نہیں ہوا۔

انھوں نے جواب دیا کہ ایک سادہ سی مثال سے آپ اس کی وجہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ مکان جس میں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں، اس میں ہر کمرہ کے ساتھ الگ الگ ٹائلیٹ موجود ہے، لیکن اگر آپ سلم علاقہ میں جائیں تو آپ پائیں گے کہ وہاں ایک سو آدمی پر ایک ٹائیلٹ کا اوسط ہے۔ ہر ٹائیلٹ پر آدمیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی ہے۔ فساد کی سب سے بڑی وجہ اسی قسم کی بھیڑ ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے۔ اگر لوگوں میں تعلیم بڑھ جائے اور لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جائے تو اس قسم کے لڑائی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

یہ پورا سفر اتنے بندھے ہوئے پروگرام کے تحت ہوا کہ مشکل سے کہیں اس کا موقع ملا کہ کسی جگہ ٹھہر کر اخبار پڑھا جائے۔ چنانچہ اخبارات زیادہ تر سفر کے دوران گاڑی میں پڑھے گئے۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر ۱۹۹۲) میں صفحہ ۸ کی ایک خبر کی سرخی یہ تھی:

Tirupati temple's income on the rise

خبر میں بتایا گیا تھا کہ آندھرا پردیش کی تروکلا پہاڑیوں میں واقع وینکٹیشور کے مندر میں اس کے عقیدت مندوں کی طرف سے حاصل ہونے والی رقم میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ۱۹۲۰ میں اس مندر میں ایک سال کے اندر ۱۰ لاکھ روپئے وصول ہوئے۔ مئی ۱۹۹۲ میں صرف ایک گم نام عقیدت مند نے ۲۷ لاکھ روپئے لاکر مندر کے بکس میں ڈال دئے۔

زائرین کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ۱۹۹۱ میں صرف ایک دن میں پچاس ہزار آدمیوں نے آکر مورتی کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ یہاں آنے والے زائرین جو بال کٹواتے ہیں وہ خود اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ۹۲-۱۹۹۱ کے درمیان جمع ہونے والے بال کی مقدار دو لاکھ کیلوگرام سے زیادہ تھی۔ اور ان کو بیچ کر مندر کے ٹرسٹ کو ۱۸ ملین روپیہ حاصل ہوا۔ ریلوے کی طرف سے ۲۷ کنکٹنگ ٹرینیں تروپتی کے لئے چلائی گئی ہیں۔ اور اب مندر میں آنے والوں کا اوسط روزانہ ۶۰ سے ۷۰ ہزار تک ہوتا ہے۔

یہ تمام تر برکتی مذہب کا کرشمہ ہے جو ہر مذہب میں اور ہر مقام پر جاری ہے، اور اسی طرح خود مسلمانوں میں بھی۔ ہر مذہبی بھیڑ برکتی مذہب کی بھیڑ ہوتی ہے۔

ہماری پارٹی کے ایک فرد جسٹس چندر شیکھر دھرمادھیکاری (ریٹائرڈ) بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بتایا کہ آزادی سے پہلے ۱۹۲۰ کے لگ بھگ زمانہ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے ایک جلسہ میں ایک مسلمان بیرسٹر مسٹر عالم تقریر کر رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ بیرسٹر صاحب، آپ پہلے مسلمان ہیں یا پہلے ہندستانی ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے جواب دیا کہ میرے بھائی آپ نے سوال صحیح نہیں کیا۔ آپ کو ابھی سوال کرنے کا طریقہ سیکھنا چاہئے۔ یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ پہلے اپنی ماں کے ہو یا پہلے اپنے باپ کے ہو۔ انھوں نے کہا کہ آدمی بیک وقت اپنے باپ کا بھی ہوتا ہے اور اپنی ماں کا بھی۔ اسی طرح میں بیک وقت مسلمان بھی ہوں اور اسی وقت ہندستانی بھی۔

جسٹس چندر شیکھر نے یہ تقریر ۲۱ دسمبر کو ناگپور میں اہنسا بھون کے جلسہ میں کی۔ اس کو سن کر میں نے کہا کہ اس سوال کا سب سے زیادہ فطری جواب یہی ہے۔ ہمارے بعض لیڈروں کا یہ کہنا کہ "میں پہلے مسلمان ہوں اور اس کے بعد ہندستانی ہوں" بلاشبہ ایک لغو بات ہے۔ اس کا تعلق نہ

اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

یہ امن کارواں کئی گاڑیوں پر مشتمل تھا۔ ایک گاڑی میں اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس گاڑی کا ڈرائیور ایک مسلمان تھا۔

منتظمین نے گاڑی کے اندر پھل، میوے، چائے وغیرہ کافی مقدار میں رکھ دیا تھا۔ راستہ میں جب بھی کوئی کھانے کی چیز نکالی جاتی تو میں نے دیکھا کہ سوامی چیدانند جی اصرار کے ساتھ مسلمان ڈرائیور کو اس میں شریک کرتے۔ پورے راستہ میں وہ اسی طرح ڈرائیور کے ساتھ بالکل برابری کا سلوک کرتے رہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ڈرائیور صاحب غلط راستہ پر مڑ گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ہم غلط راستے پر آگئے ہیں۔ پھر گھوم کر صحیح سڑک پر آئے۔ اس کی وجہ سے ہم لوگ منزل پر پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئے اور پروگرام بھی گڑبڑ ہو گیا۔

اس وقت سوامی چیدانند جی نے نہایت تاکید کے ساتھ ہم لوگوں سے کہا کہ منزل پر پہنچ کر کوئی بھی شخص یہ لفظ منھ سے نہ نکالے کہ ہم لوگ تو صحیح وقت پر روانہ ہوئے تھے مگر ڈرائیور صاحب کی غلطی سے دیر ہو گئی۔ اس کی ذمہ داری ہم لوگ اپنے اوپر لے لیں۔ ڈرائیور پر ہرگز اس کی ذمہ داری نہ ڈالیں۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور ڈرائیور صاحب بازپرس سے بچ گئے۔

۲۱ دسمبر کو واردھا پہنچے۔ واردھا کا لفظ پہلی بار تقسیم ہند سے پہلے اس وقت میرے علم میں آیا جب کہ ظفر علی خاں نے مولانا ابو الکلام آزاد پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر لکھا تھا:

آئیں ابو الکلام جو وردھا سے گھوم کر

تحریک آزادی میں واردھا کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ کیوں کہ یہاں مہاتما گاندھی نے ایک بستی بسائی تھی جو سیواگرام آشرم کے نام سے مشہور ہوئی۔ مہاتما گاندھی کے بعد ان کے شاگرد ونوبا بھاوے ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہے۔ دیکھنے سے پہلے واردھا کے بارے میں ایک افسانوی تصور میرے ذہن میں تھا۔ مگر جب شانتی یاترا کے ساتھ میں اس کی سڑکوں سے گزرا تو وہ مجھے عام شہروں جیسا ایک شہر نظر آیا۔

یہاں سے ہم لوگ سیواگرام پہنچے۔ مہاتما گاندھی نے اپریل ۱۹۳۶ میں اس کو واردھا شہر کے

کنارے قائم کیا تھا۔ یہ ایک پرسکون مقام ہے جہاں کھلے میدانوں اور ہرے درختوں کے درمیا
جھونپڑے (huts) بنے ہوئے ہیں۔ اسی میں سے ایک گاندھی جی کا جھونپڑا ہے جو صرف لکڑی ا
کا بنا ہوا ہے۔ تمام جھونپڑوں کے اوپر منگلور ٹائل لگے ہوئے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے جھونپڑے کو" باپوکٹی " کہا جاتا ہے۔ وہ انتہائی سادہ تھا۔ جنوری ۸ ،
میکسیکو کے آلوان اِلِچ (Ivan Illich) یہاں آئے تھے۔ وہ باپوکٹی کی سادگی سے اتنا م
ہوئے کہ وہ روزانہ دیر دیر تک یہاں دھیان لگا کر بیٹھے رہتے تھے تاکہ اس سے روحانی فیض حا
برٹش گورنمنٹ نے بطور خود یہاں ٹیلی فون لگوایا تھا تاکہ برطانی ذمہ دار مہاتما گاندھی سے بات

گاندھی جی کے ایک شاگرد مسٹر گنیش دتہ گادرے (۲۷ سال) نے بتایا کہ گاندھی جی کی
غریبی پر امیرانہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر گادرے کے بیان کے مطابق ،مسز سروجنی نائیڈو (۱۹۴۹-۹
نے تقسیم سے پہلے ایک بار کہا تھا کہ گاندھی کی غریبی کو باقی رکھنے کے لئے برلا کو دو ھ
روپیہ روزانہ خرچ کرنا پڑتا ہے:

It takes Birla two thousand rupees per day to keep Gandhi poor.

واضح ہو کہ یہ پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت دو ہزار روپیہ روزانہ آج کے لحاظ سے
روپیہ روزانہ سے بھی زیادہ تھا۔

۲۱ دسمبر کو سیوا گرام کی ایک نشست میں میں نے کہا کہ یہاں کا پورا ماحول سکون اور شا
ماحول ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سکون اور شانتی کا یہی ماحول پورے ملک میں عام ہو جائے۔ میں
مہاتما گاندھی نے آزادی کی تحریک میں عوام کو نان وائیلنس (اہنسا) کی بنیاد پر موبیلائز
ہم تعمیر ملک کی تحریک کو دوبارہ نان وائیلنس کی بنیاد موبیلائز کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۸ میں جہا
گاندھی کا مشن ختم ہوا تھا، وہیں سے دوبارہ ہمیں اپنے عمل کا آغاز کرنا ہے۔

شانتی یاترا میں میرے ساتھ ایک بڑے ہندو گروہ بھی تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ لو
کے ساتھ غیر معمولی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور ان سے آشیرواد (برکت) لے رہے
میں نے غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کو لوگ اتنا زیاد

دینے لگتے ہیں۔ یہی چیز خود مسلمانوں میں بھی " اکابر" کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ درحقیقت انسانی فطرت میں چھپے ہوئے جذبۂ عبودیت کا غلط استعمال ہے۔ عبودیت کا جذبہ ہر انسان میں نہایت طاقت ور صورت میں موجود ہے۔ وہ اس لئے تھا کہ خدا کو اس کا مرجع بنایا جائے۔ مگر نادان لوگ خود ساختہ اکابر کو اس کا مرجع بنا لیتے ہیں۔

جو لوگ انسانی اکابر کو اپنے جذبۂ عبودیت کا مرکز بنا لیتے ہیں، ان سے آپ ملیں تو وہ ہمیشہ سکون اور آنند کی بات کریں گے۔ جب کہ اصحاب رسول کے یہاں ہم پاتے ہیں کہ ان کے ایمان باللہ نے ان کو بے چینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی اکابر کے یہاں احتساب (accountability) کا کوئی تصور نہیں ہوتا، جب کہ خدا کے یہاں احتساب کا تصور شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ عبودیت، احتساب کے بغیر آنند ہی آنند ہے، اور عبودیت، احتساب کے ساتھ درد ہی درد۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو تاجر نے کہا کہ مسلمانوں میں ایک کمزوری ہے، اور وہی ان کی ساری مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔ مسلمان بہت آسانی سے کسی شوشہ کی بات پر بپھر جاتے ہیں۔ جو لوگ چاہتے کہ مسلمان ترقی نہ کریں وہ مسلمانوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک ان کو شوشوں میں الجھائے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی طاقت جو اپنی ترقی میں لگنا چاہئے وہ دوسروں سے لڑنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا حل صرف ایک ہے ـــــ مسلمانوں کو اتنا زیادہ باشعور بنا دیا جائے کہ لوگ اشتعال انگیزی کریں تب بھی وہ مشتعل نہ ہوں۔ یہاں اشتعال انگیزی کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مشتعل ہونے والے لوگ مشتعل ہونا چھوڑ دیں۔

۲۱ دسمبر کی شام کو ہم ناگپور میں داخل ہوئے۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک جگہ دیکھا کہ ایک بینر لگا ہوا ہے۔ اس پر ہندی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

رام للا ہم آئیں گے   مندر وہیں بنائیں گے۔

دہلی کے مسلم محلہ میں اسی قسم کا نعرہ میں نے برعکس صورت میں دیکھا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سڑک کے درمیان کالا کپڑا لٹکا ہوا ہے۔ اس پر یہ لکھا ہوا تھا:

مورتیوں کو ہٹاؤ   مسجد وہیں بناؤ

ایک آدمی پہلے نعرہ کو دیکھ ہندو کو برا کہے گا اور دوسرے نعرہ کو دیکھ کر مسلمان کو۔ مگر یہ
کہ یہ نعرے ہندوؤں یا مسلمانوں کے نعرے نہیں ہیں۔ یہ نعرے صرف کچھ جاہلوں کے نعرے ہیں۔ ہ
دیش میں ابھی تک ۷۰ فی صد آدمی جاہل ہیں۔ یہی جہالت تمام جھگڑوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر اس
سے جہالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد تمام بے فائدہ جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے
آدمی بھی ملک میں ترقی چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ تعلیم کے کام میں اپنے آپ کو لگا دے۔

ناگپور کو آر ایس ایس کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی تقریر میں میں نے خاص طور پر یہ بات کہ
مسائل کا حل ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ تدبیر ہے۔

ناگپور میں جناب عبدالسلام صاحب اور جناب حنیف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ ا
اپنے تجارتی مشاغل کے ساتھ دین کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔

عبدالسلام صاحب نے آکاش بلڈنگ کے نام سے ایک عمارت بنائی ہے۔ اس میں آٹھ ا
ہیں۔ اور نیچے کے حصہ میں چار دکانیں ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر انھوں نے ایک چھوٹی سی خوبصورت
بنائی ہے۔ عمارت اور دکان کے افراد یہاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے اندر تا
چالیس آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ واچ مین کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ وقت پر اذان دیدے۔ فجر کے
وہ ہر فلیٹ پر آکر گھنٹی بجا دیتا ہے۔ اس طرح اس بلڈنگ میں نماز با جماعت کا نظام قائم ہے
ایک اچھا نمونہ ہے جو قابل تقلید ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک سرگرم ممبر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے رام من
نام پر جو آندولن چلایا اور ۶ دسمبر کو اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کو سامنے رکھ کر آپ سوچیں تو آپ مانیں
کہ اس معاملہ میں آپ کے لئے چوائس مندر اور مسجد کے درمیان نہیں تھا، بلکہ مسجد اور انارکی کے
تھا۔ کیوں کہ مسجد کو ڈھا کر جو چیز آپ نے پائی ہے وہ حقیقۃً مندر نہیں ہے بلکہ انارکی ہے جس نے پو
دیش کے مستقبل کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو دیش سے محبت ہے تو آپ لوگوں کو وہی کرنا چاہئے جو ۲
میں مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ انھوں نے اہنسا کی بنیاد پر نان کوآپریشن کی تحریک چلائی۔ مگر جب چو
کے مقام پر کانگرسی کارکنوں نے تشدد کا واقعہ کیا تو انھوں نے فوراً ہی اپنی تحریک روک دی او

کو ہمالیائی غلط اندازہ (Himalayan miscalculation) قرار دیا۔ آپ لوگوں کے لئے صرف افسوس کا اظہار کافی نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنی تحریک کو مکمل طور پر روک دینے کا اعلان کریں۔ اس سے کم درجہ کی کوئی بھی چیز آپ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

ناگپور میں شانتی یاترا ختم ہو گئی۔ اب ہمیں ناگپور سے دہلی واپس جانا تھا۔ مگر پائلٹوں کی ہڑتال کی وجہ سے تمام ملک میں پروازیں معطل ہو رہی ہیں۔ صرف ٹرنک روٹ پر مشکل سے پروازوں کا سلسلہ باقی رکھا جا سکا ہے۔ اس لئے ہم لوگوں نے طے کیا کہ ناگپور سے بمبئی جائیں۔ اور بمبئی سے دہلی کے لئے ہوائی جہاز پکڑیں۔

ناگپور سے دہلی پہنچنے کے لئے ہمیں صرف ۹۵۰ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ مگر ناگپور سے بمبئی اور پھر بمبئی سے دہلی کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہماری منزل ۲۳۷۱ کیلو میٹر لمبی ہو گئی۔ "قریب" جب قابل عمل نہ ہو تو "دور" ہی زیادہ قریب بن جاتا ہے۔

۲۲ دسمبر کو ہم لوگ انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۷۴۰ کے ذریعہ ناگپور سے بمبئی پہنچے۔ یہاں قیام کرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۱۸۳ کے ذریعہ دہلی واپسی ہوئی۔ دہلی پہنچنے کے بعد بظاہر شانتی یاترا ختم ہو گئی۔ مگر میں نے سوچا کہ اصل کام تو اب شروع کرنا ہے۔ یعنی شانتی یاترا کے تجربہ کو مزید آگے بڑھانا ہے۔ چنانچہ مسٹر شانتی لال موتھا نے کہا کہ ہم اس شانتی اندولن کو پورے دیش میں چلائیں گے۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر) کے درمیانی صفحہ پر دو مضمون چھپے ہوئے تھے۔ ایک امولیا گنگولی کا تھا۔ اس مضمون میں ملک کے لوگوں کی غیر سنجیدہ سوچ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا یہ تبصرہ نقل کیا گیا تھا کہ ہوش و حواس کی بات کون سنتا ہے:

Who's going to listen to the voice of sanity.

انھوں نے ملک کی تاریک صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر یہی حالت باقی رہی تو اجودھیا کے واقعہ کے بعد انڈیا اعتباری بحران (credibility crisis) میں مبتلا ہو جائے گا۔ انڈیا دوسرا لبنان یا دوسرا یوگوسلاویہ بن جائے گا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے

کہ تعرف الاشیاء باضدادھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقابل کے ذریعہ باتیں سمجھ میں آتی

آپ یوں دیکھئے کہ ۶ دسمبر کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ مگر مسلمانوں نے مقابلۃً بہت ہی کم ردعمل کا
کیا۔ پھر ایک بابری مسجد کے انتقام میں پاکستان میں ۶۰ مندر ڈھائے گئے۔ گویا ایک کے بدلے
اس تناسب سے انڈیا کے ہندوؤں کو ۳۶۰۰ مسجدیں گرانا چاہئے تھا۔ پاکستانیوں نے بلڈوز
ذریعہ مندروں کو گرایا تو انڈیا میں ڈائنامائٹ کے ذریعہ مسجدوں کو ڈھانا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہ

اس تقابل میں امید کا پہلو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا کے لوگوں کا جذباتی ابال ا
کے اندر رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی طرح تناسب سے متجاوز نہیں ہو جاتا۔ یہ برداشت کی علا
اور برداشت بلاشبہ سب سے بڑی چیز ہے۔

۲۳ دسمبر کا دن بمبئی میں گزارا۔ کئی لوگوں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ کچھ اخبارات پڑھے
قابل ذکر ملاقات مسٹر راجندر سدرشن جین (۳۷ سال) سے تھی۔ ۹ سال کی عمر میں ہولی کے
نے ان کی ایک آنکھ کو نقصان پہنچایا۔ اس کا آپریشن کرایا تو سرجن کی غلطی سے دونوں آنکھ جاتی
اب وہ مکمل طور پر نابینا ہیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ بے تکلفی کے ساتھ اسی طرح ٹیلی فون نمبر ملا رہے ہیں جیسے کوئی آ
والا ٹیلی فون نمبر ڈائل کرتا ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ ان کا ایک بڑا بزنس ہے۔ پورا بزنس وہ خود کر
کرتے ہیں۔ حتی کہ بیرونی ملکوں میں تجارتی سفر کرتے ہیں اور بڑے بڑے تجارتی معاملات طے کرتے

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے اندر وہ چیز ہے جس کو چھٹی حس کہا جاتا ہے۔ انھوں۔
دیا کہ چھٹی سنس کوئی مسٹیریس چیز نہیں۔ جب آپ کے اندر سے کوئی سنس چلا جاتا ہے تو نیچر اس کی تا
ہے اور آپ کے اندر اپنے آپ ایک اور سنس پیدا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے دیکھے بغیر
اندازہ ہو جاتا ہے، اور وہ اکثر درست ہوتا ہے۔

"تلافی" کا یہ اصول قدرت کے پورے نظام میں ہے۔ جب بھی آپ کوئی چیز کھوئیں تو
طور پر یقین کر لیجئے کہ کھونے کے ساتھ وہیں ایسے اسباب پیدا ہو چکے ہوں گے جو آپ کی محرومی
کر سکیں۔ ہر محرومی اپنے ساتھ یافت کا سامان لئے ہوئے ہے۔

سوامی چیدانند رشی کیش کے سب سے بڑے آشرم کے چیئرمین ہیں۔ ان کا مشن یورپ

آسٹریلیا، ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ سال بھر عالمی سفر پر رہتے ہیں۔

واپسی کے بعد رشی کیش سے سوامی جی کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہندو دھرم اور جین دھرم پر کتابیں تیار کرا رہے ہیں۔ ان کے نام Hinduism and daily life اور Jainism and daily life ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمیں اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھ کر دیں جو Islam and daily life کے موضوع پر ہو۔ یہ کتاب تقریباً تین سو صفحہ تک ہو سکتی ہے۔ ہم ان کتابوں کو دنیا کی دس زبانوں میں چھاپ کر سارے ملکوں میں پھیلائیں گے۔

شانتی یاترا میں جب میں نکلا تو شروع میں میں نے اسلام کا نام لئے بغیر اخلاقیات کی زبان میں تقریر کی۔ مگر اسی دوران نجی مجلسوں میں اکثر میں قرآن و حدیث کی باتیں لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ سوامی چیدانند نے ایک دو تقریر سننے کے بعد کہا: مولانا صاحب، آپ ہم لوگوں کو قرآن و حدیث کی جو باتیں بتلاتے ہیں وہی آپ جلسہ میں بھی کہئے۔ وہ ہم کو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کی تقریروں میں قرآن و سنت کے حوالے سے میں اپنی بات کہنے لگا۔

شانتی یاترا سے پہلے نہ میں سوامی چیدانند کو جانتا تھا اور نہ وہ مجھ کو۔ دونوں ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ مگر دو ہفتہ کے ساتھ کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب وہ الرسالہ کے قاری بن گئے ہیں۔ اور وہ مجھ سے اسلام کے موضوع پر تین سو صفحہ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں تاکہ اس کو چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلائیں۔ دوری غلط فہمی پیدا کرتی ہے، اور قربت غلط فہمی کو ختم کر کے دو اجنبیوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتی ہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۲ کی رات کو بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ انڈین ایئر لائنز کا جہاز کئی گھنٹہ لیٹ ہو کر بمبئی سے روانہ ہوا۔ ایک ہم سفر نے کہا کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ پرائیویٹ کمپنیوں کے جہاز سے سفر کریں گے اور سرکاری انڈین ایئر لائنز کو مسافر ملنا مشکل ہو جائے گا۔ الّا یہ کہ دوبارہ قانون کا سہارا لے کر لوگوں کو صرف سرکاری جہازوں میں سفر کرنے پر مجبور کر دیا جائے

آج میں اپنے امن مشن کا پہلا دور ختم کر کے دہلی واپس جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کیا اس مشن میں مجھے کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے امریکہ کے فادر ڈیوائن (۱۹۶۵-۷۷ ۱۸) کی یاد آئی۔ انھوں نے امریکہ میں اسی قسم کا ایک مشن شروع کیا تھا جس کو امن مشن

کہا جاتا ہے۔ اس مشن میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس (Peace Mission) کامیابی کا راز کیا تھا، مبصرین کا خیال ہے کہ اس کا راز اہل شاگردوں کی جاں نثاری (devotion of competent disciples) تھا۔ ان کو ایسے لائق شاگرد مل گئے تھے جو اس مشن میں اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

ایسے ہی افراد کسی مشن کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے ایسے ساتھی مہیا فرمائے۔ اگر چہ ہماری قوم میں آج سب سے زیادہ جو چیز نایاب ہے وہ بلاشبہ یہی ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد ایک صاحب نے پوچھا کہ شانتی یاترا جیسے کام کی کیا کوئی شرعی بنیاد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ اسی قسم کا ایک کام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حلف الفضول کی صورت میں ملتا ہے۔ آپ کی بعثت سے قبل مکہ کے کچھ معزز افراد نے مل کر ایک انجمن بنائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سماجی بگاڑ کو روکا جائے۔ مظلوم کی فریاد رسی کی جائے۔ یہ اگر چہ بعثت نبوی سے قبل کا واقعہ ہے۔ مگر بعثت کے بعد آپ نے یہ فرما کر اس کی تصدیق کر دی کہ اگر اسلام میں بھی مجھے اس کی طرف بلایا جائے تو میں اس کو قبول کر لوں گا (لو دعیت الیہ فی الاسلام لاجبت)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی انصاف اور مشترک اجتماعی مصالح کے تحفظ کی خاطر کثیر جماعتی تعاون کا طریقہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ ایسے مشترک پروگرام میں شرکت کرنا ایک ایسا دینی تقاضا ہے جس کی اہمیت خود سنت نبوی کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۳، شمارہ ۲۰۴

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

ایک آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے (النساء ۹۲) پھر قاتل کا حکم بتانے کے بعد کہا گیا کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے، اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے (النساء ۹۳)

ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں :

یقول تعالیٰ لیس لمؤمن ان یقتل اخاه المؤمن بوجه من الوجوه كما ثبت في الصحيحين عن ابن مسعود ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : لا يحل دم امرئ مسلم يشهد ان لا اله الا الله واني رسول الله إلا باحدى ثلاث۔ النفس بالنفس والثيب الزاني والتارك لدينه المفارق للجماعة۔ ثم اذا وقع شيئ من هذه الثلاث فليس لاحد من آحاد الرعية ان يقتله وانما ذلك الى الامام او نائبه (۵۳۴)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مومن کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ اپنے بھائی مومن کو قتل کرے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک مسلم جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون جائز نہیں۔ اِلّا تین میں سے ایک کا۔ کسی کی جان مارنا۔ شادی شدہ زانی اور وہ شخص جو دین کو چھوڑ کر جماعت سے الگ ہو جائے (حدیث) پھر جب ان تین میں سے کوئی واقعہ ہو تب بھی عام لوگوں میں سے کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ وہ مجرم کو قتل کر دے۔ اس حکم کا نفاذ صرف امام یا اس کے نائب پر ہے۔

واضح ہو کہ یہاں "امام" سے مراد امام خمینی جیسا کوئی مذہبی پیشوا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد حاکم سلطنت ہے۔ یہ حاکم سلطنت یا اس کے مقرر کردہ با اختیار شخص کا حق ہے۔ نہ کہ کسی مفتی یا امام یا کسی خود ساختہ مجاہد کا حق۔

رسولؐ کا طریقہ

حدیبیہ کے سفر (۶ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً دو ہفتہ تک حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے تھے۔ یہ دو ہفتہ صورت حال کے مطالعہ اور قریش مکہ سے بات چیت میں گزرا۔ اس دوران مکہ کے بہت سے لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے۔ ان میں بُدیل بن ورقاء الخزاعی، الحلیس بن علقمہ، عروہ بن مسعود الثقفی بھی تھے۔ یہ تینوں اپنے قبیلہ میں سردار کی حیثیت رکھتے تھے۔

یہ لوگ اگرچہ مشرکین میں سے تھے۔ مگر وہ فطری طور پر انصاف پسند تھے۔ انھوں نے مکہ واپس جاکر آپ کے بارہ میں قریش کو اچھی رپورٹ دی۔ انھوں نے رسولؐ اور اصحاب رسول کے متعلق بتایا کہ وہ لوگ جنگ کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کے لیے آئے ہیں، اس لیے ان کو روکا نہ جائے۔ ایک سردار نے کہا کہ کیا اس آدمی کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا جائے گا جو اس کی تعظیم کے لیے آیا ہے (أیُصَدُّ عن بیت اللہ مَن جاء مُعظِّماً لہ) سیرۃ ابن ہشام ۳/۳۶۱

یہ بیانات واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تھے۔ مگر آپ نے انھیں مطلق استعمال نہیں کیا۔ قریش کے ساتھ گفتگو میں آپ نے کبھی ان لوگوں کی باتوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی باتیں خواہ کتنی ہی زیادہ منصفانہ کیوں نہ ہوں، وہ عملی طور پر بے فائدہ تھیں کیونکہ قریش ہرگز ان کو ماننے والے نہ تھے جو اس وقت مکہ کے سرکش سرداروں کے زیر اثر تھے۔ چنانچہ اس قسم کی موافق رپورٹوں اور بیانات کے باوجود آپ نے قریش کے مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان لیا۔ اور وہ امن معاہدہ کرکے مدینہ واپس چلے آئے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصی سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی سے نزاع پیدا ہو تو "منطقی انصاف" کے بجائے "عملی حل" کو اہمیت دینا چاہیے۔ ایسے معاملات میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کس آدمی نے ہمارے موافق بات کہی ہے یا ہمارے نقطۂ نظر سے منصفانہ بیان دیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے ساتھ اصلاً نزاع برپا ہوئی ہے وہ خود کس طرح نزاع کو ختم کرنے پر راضی ہوں گے، اور پیدا شدہ مسئلہ کا عملی حل

کیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اصل مقصود مسئلہ کا عملی حل ہے نہ کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ۔

اس سنت کا تقابل ہندستانی مسلمانوں کے موجودہ طریقہ سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے دانشور اور رہنما مسلسل طور پر اس سنت نبوی کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ آدھی صدی سے وہ یہی کر رہے کہ مسلم۔ ہندو معاملات میں وہ مسئلہ کے عملی حل کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ البتہ کوئی غیر مسلم اگر قانونی تجزیہ کر کے ایسی بات کہے جس سے مسلمانوں کی حمایت نکلتی ہو تو فوراً وہ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

مثلاً اگر کوئی غیر مسلم کچھ نکتوں کو لے کر یہ کہہ دے کہ ملک کا بٹوارہ مسلمان نے نہیں کرایا بلکہ ہندوؤں نے کرایا۔ کوئی کمیشن یہ لکھ دے کہ فلاں فساد میں اصل غلطی پولیس کی تھی۔ کسی اخبار میں یہ چھپ جائے کہ مسلمانوں کے ساتھ سرکاری سروسوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی کوئی بات کوئی غیر مسلم کہے یا لکھے تو مسلمان خوب اہتمام کے ساتھ اس کا چرچا کرتے ہیں۔ مگر انھیں ایسی باتوں کی طرف کوئی رغبت نہیں ہوتی جس میں صلح حدیبیہ کے اصول پر عملی حل کی تدبیر بتائی گئی ہو۔

مسلم دانشوروں اور مسلم رہنماؤں کا یہ مزاج کھلے طور پر سنت رسول کے خلاف ہے۔ اور جو مسلم گروہ سنت رسول کے خلاف چلے اس کے لیے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ کبھی اس دنیا میں عزت کی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔

دو گروہوں کے جھگڑے میں جو لوگ آئیڈیلزم کی بات کریں، ان کی بات کچھ سادہ لوح افراد کو اچھی لگ سکتی ہے۔ مگر یقینی طور پر یہ اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ اجتماعی جھگڑے، خواہ وہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہوں یا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان، ان میں ہمیشہ ایسی نزاکتیں شامل ہو جاتی ہیں جو معیاری حل میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ایسے موقع پر معیاری حل کی بات کرنا صرف مسئلہ کو مزید پیچیدہ بنانا ہے نہ کہ مسئلہ کو ختم کرنا۔

عقل اور دین دونوں کا تقاضا ہے کہ ایسے موقع پر عملی حل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ معیاری حل خارجی اصولوں کی بنیاد پر وضع کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس عملی حل معاملہ کے دونوں فریقوں کی رعایت کے تحت مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسے موقع پر معیاری حل ایک شاعری ہے۔ اور عملی حل مسئلہ کے خاتمہ کی طرف ایک حقیقی قدم۔

دو منٹ کی بات

لندن کی ایک ٹی وی کمپنی انسائٹ ٹیلی وژن (Insigh Television) کی ٹیم ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ کو اسلامی مرکز میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم ۱۲ منٹ کا ایک ویڈیو پروگرام ریکارڈ کر رہے ہیں۔ اس میں چھ آدمی دو دو منٹ کے لیے بولیں گے۔ یہ پروگرام ساری دنیا میں دکھایا جائے گا۔ ہر آدمی سے ایک سوال کیا جائے گا اور وہ صرف دو منٹ میں اس کا جواب دے گا۔ سوال یہ تھا :

We are today a deeply divided society. To what principle of life should we turn, Hindus and Muslims and others, so that we can live in harmony?

میں نے کہا کہ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ ایک بچہ آپ سے پوچھے کہ مجھ کو گلاب کا پھول لینا ہے۔ لیکن گلاب کے پیڑ میں کانٹے بھی ہیں۔ پھر میں کیا کروں۔ آپ کہیں گے کہ تم کانٹے سے بچو اور اس کے پھول کو لے لو۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان کے اندر بھی کانٹا اور پھول دونوں ہے۔ ایگو اس کا کانٹا ہے اور کانشنس اس کا پھول ہے۔ آپ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے ایسا کریں کہ اس کے ایگو کو نہ چھیڑیں۔ آپ ہمیشہ اس کے کانشنس کو ٹچ کریں۔ اس کے بعد سماج میں ہر طرف ہارمنی ہی ہارمنی دکھائی دے گی۔

ہر آدمی کے اندر فطری طور پر دو فیکلٹی ہوتی ہے ـــــ ایگو اور کانشنس۔ ایگو نفرت کا سورس ہے اور کانشنس محبت کا سورس۔ مگر دونوں ہی سوئی ہوئی حالت میں ہیں۔ یہ آپ کے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس کو جگائیں۔ اگر آپ نے ایگو کو جگایا تو آپ کو اس سے نفرت اور دشمنی ملے گی۔ اور اگر آپ نے کانشنس کو جگایا تو محبت اور دوستی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

مدھیہ پردیش کے ایک ٹاؤن میں ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ وہ چلتا ہوا مسلم ایریا میں آیا۔ یہاں مسجد کے امام سے جلوس والوں کی تکرار ہوگئی۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے جلوس پر پتھر پھینکے اور پھر فرقہ وارانہ فساد ہوگیا۔ بعد کو امام صاحب کی سمجھ میں آیا کہ فساد کا سبب یہ تھا کہ جلوس پر پتھر پھینک کر جلوس والوں کے ایگو کو بھڑکا دیا گیا۔ انھوں نے طے کیا کہ اب جلوس نکلا تو وہ ان کے کانشنس کو جگائیں گے۔

اگلے سال پھر اسی طرح ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ جب وہ چلتا ہوا مسجد کے سامنے پہنچا تو امام صاحب پیشگی منصوبہ کے تحت پھولوں کا ہار لے کر باہر آئے۔ انھوں نے جلوس کے ہندو لیڈر سے کہا : ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے پھولوں کا ہار لیڈر کے گلے میں ڈال دیا۔

، الرسالہ نومبر ۱۹۹۳

جیسے ہی امام صاحب نے ایسا کیا لیڈر کی گردن انسانیت کے اعتراف میں جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر امام صاحب کو پرنام کیا۔ اس نے کہا کہ امام صاحب، مسلمانوں کے پتھر مجھ کو نہیں جھکا سکے تھے، مگر آپ کے پھولوں نے مجھ کو جھکا دیا۔ اب تک میں آپ کو دشمن کے روپ میں دیکھتا تھا۔ مگر آج سے آپ میرے دوست ہیں۔ اور یہ دوستی اب کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

دونوں میں فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کا پچھلا رویہ لیڈر کے ایگو کو جگانے والا تھا۔ امام صاحب کے موجودہ رویہ نے لیڈر کے کانشنس کو جگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سال جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو مارا تھا، وہیں دونوں ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ کل کے دشمن آج کے بھائی بن گئے۔

دونوں واقعہ میں فرق کیا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ بستی کے مسلمانوں نے اس سے پہلے جلوس والوں کی انا کو بھڑکایا تھا۔ اب انھوں نے جلوس والوں کے ضمیر کو جگا دیا۔ انا نفرت کا سرچشمہ ہے اور ضمیر محبت کا سرچشمہ۔ انا سے آگ اور دھواں نکلتا ہے اور ضمیر سے خوشبو اور ٹھنڈک۔ انا انسانیت کو توڑنے والی ہے اور ضمیر انسانیت کو جوڑنے والی۔

عام طور پر لوگ انسانوں کو اچھے اور برے کے خانے میں بانٹتے ہیں، وہ کچھ افراد کو دوست سمجھ لیتے ہیں اور کچھ اور افراد کو دشمن۔ مگر یہ تقسیم مصنوعی ہے۔ اپنی ابتدائی فطرت کے اعتبار سے تمام انسان صرف انسان ہیں۔ وہ اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے بے ضرر ہیں۔ ہر انسان اپنے ذاتی مفاد میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے کی فرصت نہیں۔

اس کے باوجود دشمنی کیوں پیدا ہوتی ہے۔ دشمنی ایک استثنائی حالت ہے نہ کہ عام اور معتدل حالت۔ دشمنی ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ قول یا عمل سے کسی کے غصہ کو بھڑکا دیا جائے۔ اگر آپ آدمی کے اندر سوئے ہوئے غصہ کو نہ بھڑکائیں تو آپ اس کے نقصان سے بھی لازمی طور پر بچے رہیں گے۔

دو خبریں

آپ ۱۶ جون ۱۹۹۳ کا ہندستان ٹائمس یا ٹائمس آف انڈیا دیکھیں تو آپ کو دو بالکل مختلف قسم کی خبریں پڑھنے کو ملیں گی۔ ایک طرف دونوں میں یہ خبر ہے کہ دہلی کا ایک تاجر کرشن کمار (۴۵ سال) پنجاب نیشنل بنک (کیشو پورم) سے چار لاکھ پینتالیس ہزار روپیہ لے کر واپس آرہا تھا کہ راستہ میں ۱۲ بجے دن کو چار نوجوان سفید ماروتی کار پر آئے۔ انھوں نے تاجر کے اسکوٹر کو روکا۔ ریوالور سے گولیاں چلا کر اسے گرادیا اور اس کا بریف کیس لے کر فرار ہو گئے۔

دوسری طرف دونوں ہی اخباروں میں ایک اور خبر ہے۔ دہلی کا ایک ہیڈ کانسٹبل پریم پال (قرول باغ) رات کو گشت کر رہا تھا۔ اس کو سوریہ کرن ہوٹل کے پاس ایک بریف کیس پڑا ہوا ملا۔ اس نے کھولا تو اس کے اندر دوسرے کاغذات کے علاوہ ۹۷ ہزار ۴ سو روپیہ نقد رکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً بریف کیس کو بند کیا اور اس کو لاکر اسی طرح تھانہ میں جمع کر دیا۔ تھانہ کے ذمہ دار اب بریف کیس کے اصل مالک کو تلاش کر رہے ہیں۔

یہ ایک علامتی خبر ہے جو بتاتی ہے کہ سماج میں ہمیشہ دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ اس لیے کسی سماج کے بارہ میں رائے قائم کرتے ہوئے آدمی کو بہت زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ اس کو نہ ایک طرف پوری طرح جھک جانا چاہیے اور نہ دوسری طرف۔

مذکورہ خبروں میں اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ وہ صرف کرشن کمار کے واقعہ کو لے اور اس کو عام بنا کر یہ کہے کہ ہندستان کے لوگ تو سب کے سب قاتل اور لٹیرے ہیں۔ تو اس کی یہ رائے درست نہ ہوگی۔ اسی طرح کوئی شخص پریم لال کے واقعہ کو لے اور اس کو عمومی صورت دے کر یہ کہنے لگے کہ ہندستان کے تمام آدمی انتہائی دیانت دار ہیں تو یہ بات بھی واقعہ کے مطابق نہ ہوگی۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر سماج میں دونوں ہی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس دنیا میں اس طرح رہنا ہے جیسے کہ ہم ایک ایسے راستہ میں چل رہے ہوں جس میں کانٹے بھی ہوں اور اسی کے ساتھ پھول بھی۔ ایسے راستہ کے مسافر کے لیے کامیاب سفر کی تدبیر صرف ایک ہے۔ وہ کانٹوں سے اپنا دامن بچائے، اور پھولوں سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہے۔

حوصلہ مندی

سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ کے اندر حوصلہ باقی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی آپ نے کچھ نہیں کھویا ——— حوصلہ بلا شبہہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ بلکہ حوصلہ ہی زندگی میں سب کچھ ہے۔

آدمی کا اصل سرمایہ اس کا حوصلہ ہے۔ آدمی حوصلہ ہی کی بنیاد پر بڑی بڑی بات سوچتا ہے۔ حوصلہ ہی کے ذریعہ وہ اقدام کرتا ہے۔ حوصلہ ہی کے بل پر وہ جوکھم میں کودتا ہے۔ حوصلہ ہی کے سہارے وہ مشکلات پر قابو پاتا ہے۔ حوصلہ ہی کی مدد سے وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ثابت قدم رہتا ہے۔ حوصلہ ہی آدمی کے اندر اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے جو تمام ترقیوں اور کامیابیوں کو پانے کا واحد ذریعہ ہے۔

حوصلہ مند انسان وہ ہے جو سطحی باتوں سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ جو ماحول سے غیر متاثر رہ کر اپنی رائے بنائے۔ خطرات جس کا راستہ نہ روکیں اور نقصانات جس کو دل شکستہ نہ کرسکیں۔ جو اپنے آپ میں جینے کی طاقت رکھتا ہو، خواہ تمام لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں، خواہ اسباب کے نام کی کوئی چیز اس کے پاس باقی نہ رہے۔

بے حوصلگی سب سے بڑی کمزوری ہے اور حوصلہ سب سے بڑی طاقت۔ آدمی اگر بے حوصلہ ہو جائے تو ۹۹ چیز رکھتے ہوئے بھی وہ ایک چیز کھونے کی خاطر اپنا خاتمہ کرلے گا۔ اور اگر وہ اپنے حوصلہ کو باقی رکھ سکے تو وہ ۹۹ چیزیں کھو کر ایک چیز کے بل پر دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔

بے حوصلہ آدمی مرا ہوا آدمی ہے، اور حوصلہ مند آدمی زندہ آدمی۔ بے حوصلہ آدمی جس چیز کو مشکل سمجھتا ہے، حوصلہ مند آدمی اس کو اپنے لئے زینہ بنا لیتا ہے۔ بے حوصلہ آدمی جہاں ایک عذر لے کر رک جاتا ہے، حوصلہ مند آدمی وہاں سے اپنے لئے آگے بڑھنے کا نیا راستہ پالیتا ہے۔ بے حوصلہ انسان کی نظر واقعات کے تاریک پہلو پر ہوتی ہے اور حوصلہ مند انسان کی نظر واقعات کے روشن پہلو پر۔

ترقیوں کی تاریخ حوصلہ مند انسانوں کے عمل کی تاریخ کا دوسرا نام ہے۔

صبح کا انتظار

ہر شام کے بعد دوبارہ نئی صبح آتی ہے۔ مگر صبح کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جو صبح کے آنے تک اس کا انتظار کرے ـــــــ اس دنیا میں روشن صبح اپنے آپ آتی ہے۔ مگر انتظار کرنے والے اس کا انتظار نہیں کرتے۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری عجلت پسندی ہے۔ وہ تاریک حالات کو دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں رات اور دن کا نظام ہر روز اس کو سبق دے رہا ہے کہ روشنی بہر حال آئے گی، کوئی تاریکی اتنی لمبی نہیں ہو سکتی جو آنے والی روشن صبح کو آنے سے روک دے۔

دنیا میں تلخیاں بھی ہیں۔ لیکن تلخیوں کو اگر سہہ لیا جائے تو اس کے بعد مٹھاس بھی ضرور آکر رہتی ہے۔ یہاں آدمی ناکامیوں سے بھی دوچار ہوتا ہے، لیکن ہر ناکامی وقتی ناکامی ہے۔ اگر وقتی ناکامی کی چوٹ برداشت کر لی جائے تو اس کے بعد لازماً وہ مرحلہ آتا ہے جو آدمی کو کامیابی کی منزل پر پہنچا دے۔

موجودہ دنیا میں کسی چیز کو ٹھہراؤ نہیں۔ اسی طرح یہاں کامیابی اور ناکامی کو بھی ٹھہراؤ نہیں۔ یہاں ہر ناکامی کے بعد کامیابی ہے، اور ہر کامیابی کے بعد ناکامی۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کامیابی پیش آئے تب بھی وہ اعتدال پر قائم رہے، اور ناکامی کا تجربہ ہو تب بھی وہ اعتدال اور توازن کو نہ کھوئے۔

جس طرح صبح اپنے آپ آتی ہے، اسی طرح اس دنیا میں ناکامی کے بعد کامیابی بھی اپنے آپ آتی ہے۔ آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ انتظار کی ہمت کر سکے۔ اس دنیا میں ہر ناکامی ایک وقتی وقفہ ہے اور ہر کامیابی آئندہ ظاہر ہونے والا لازمی واقعہ۔

جس طرح شام کا آنا یقینی ہے اسی طرح شام کے بعد صبح کا ظاہر ہونا بھی یقینی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کائنات کا پورا نظام جس کے ساتھ ہو اس کو کسی اور سے اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

ہار کے بعد جیت

شکست خواہ کتنی ہی بڑی ہو ، وہ ہمیشہ وقتی ہوتی ہے۔ اور دوبارہ زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعہ اس کو فتح میں تبدیل کیا جاسکتا ہے ——— اس دنیا میں ہر چیز عارضی ہے ، اسی طرح ہار بھی عارضی ہے ، اس دنیا میں کوئی ہار مستقل ہار نہیں۔

ہارنے کے بعد آدمی کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جنگ ہارنے کے بعد ہمت بھی ہار جائے۔ وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ رہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ یہ سوچنے میں لگ جائے کہ میں ہارا تو کیوں ہارا۔ وہ فریق ثانی کے جیتنے کا سبب اور اپنے ہارنے کا سبب معلوم کرے۔

یہ دوسری سوچ آدمی کے ذہن کو کھولتی ہے۔ اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زیادہ اعلیٰ تیاری کے ساتھ دوبارہ اقدام کر سکے۔ اور جو شخص ایسا کرے وہ پہلی بار نہیں تو دوسری بار ضرور کامیاب ہو کر رہتا ہے۔

اس دنیا میں ناکامی کے ساتھ کامیابی لگی ہوئی ہے اور کامیابی کے ساتھ ناکامی وابستہ ہے۔ جو شخص ناکام ہو جائے ، اس کے اندر دوبارہ اٹھنے کے لئے نیا عزم جاگتا ہے۔ اس کے دماغ کے نئے نئے گوشے بیدار ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف جو آدمی کامیاب ہوا ہو ، اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ وہ اطمینان کی نفسیات میں مبتلا ہو کر سو جاتا ہے۔

اس طرح ہارنے والے کے لئے ہار نئی زندگی کا سبب بنتی ہے ، اور جو آدمی جیتتا ہے اس کی جیت اس کو سُلا کر زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو وہ کبھی مایوس نہ ہو۔ وہ ناکامی کے بعد کبھی بددلی کا شکار نہ ہو ، خواہ اس کی ناکامی بظاہر کتنی ہی زیادہ بڑی کیوں نہ ہو۔

یہ دنیا ہارنے کے بعد جیتنے اور جیتنے کے بعد ہارنے کا کھیل ہے۔ اس دنیا میں کامیاب کھلاڑی وہ ہے جو کھیل پر نظر رکھے نہ کہ ہار اور جیت میں کھو کر رہ جائے۔

شکست وقتی حادثہ ہے ، شکست مستقل بربادی نہیں۔ شکست آپ کو باہر کی چیزوں سے محروم کرتی ہے۔ وہ آپ کے اندر کی چیزوں کو آپ سے نہیں چھینتی۔ آپ اپنے اندر کی چیزوں کو لے کر دوبارہ نئی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

شام کے بعد صبح

ایک شخص نے کہا کہ شام ہوگئی۔ دوسرا شخص بولا : یوں کہو کہ صبح آنے والی ہے ـــــ اگر آپ معاملات کو حال کے اعتبار سے دیکھیں تو بظاہر آپ کو تاریکی دکھائی دے گی۔ لیکن اگر آپ معاملہ کو مستقبل کے اعتبار سے دیکھیں تو سامنے کے افق پر روشنی ابھرتی ہوئی نظر آنے لگے گی۔

بیشتر لوگوں کی نظر اپنے آج پر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ان کے آج کے حالات اچھے نہ ہوں تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں اچھی زندگی حاصل نہیں۔ حالاں کہ عقلمندی کی بات یہ ہے کہ آنے والے کل پر نظر رکھی جائے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ اکثر آنے والا کل ایسے مواقع لے کر آتا ہے جس کو اس سے پہلے آدمی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

زمین ہر لمحہ گھوم رہی ہے۔ زمین کے اوپر بار بار شام بھی آتی ہے اور صبح بھی طلوع ہوتی ہے۔ جن لوگوں کی نظر صرف قریب پر ہو، وہ جب شام کو دیکھیں گے تو کہہ دیں گے کہ اب تو زندگی کی شام آگئی۔ مگر جو لوگ دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ شام کو شام کے اعتبار سے نہ دیکھو۔ اس کو اس نظر سے دیکھو کہ وہ آنے والی صبح کی تمہید ہے۔

زندگی میں جب بھی کوئی ناموافق صورت حال پیش آئے تو وہ ایک نئی موافق صورتحال کی تمہید ہوتی ہے۔ وہ ایک نئے مستقبل کی خبر دیتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے اپنے ذہن کو استعمال کرے۔ وہ اپنی سوچ کو حرکت میں لاکر آگے بڑھ جائے۔

اس دنیا میں آدمی جو کچھ پاتا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جس کو اس نے نہیں پایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑے کو کھو کر زیادہ کو پانے کا موقع پھر بھی آدمی کے لئے باقی رہتا ہے۔ آدمی ذرّہ کو کھو کر افسوس کرتا ہے حالاں کہ ابھی پورا پہاڑ اس کے حوصلوں کے امتحان کے لئے موجود ہے۔ وہ ایک قطرہ سے محرومی پر فریاد کرتا ہے، وہ بھول جاتا ہے کہ ابھی تو خدا کی دنیا میں پورا سمندر باقی ہے جس کو پانے کے لئے وہ از سر نو اپنی کوششوں کو جاری کر سکے۔

دنیا میں کوئی کھونا آخری کھونا نہیں۔ ہر کھونے کے بعد پانے کا نیا امکان آدمی کے لئے موجود رہتا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو کھونے کو بھلا دے، وہ ہمیشہ پانے کی طرف دیکھتا رہے۔

بڑا دل

بڑے دل والا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور چھوٹے دل والا آدمی ہمیشہ ناکام —— اس دنیا میں کامیابی کسی کو اس کے دل کے پیمانہ سے ملتی ہے۔ یہاں کامیابی کا اصول یہ ہے کہ جتنا بڑا دل اتنی ہی بڑی کامیابی۔

اس دنیا میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل کرنے کے لئے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا پڑتا ہے۔ لوگوں کے سلوک سے بلند ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کرنا ہوتا ہے۔ لوگوں کو یہ خیال کئے بغیر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہم کو کیا دیا اور کیا نہیں دیا۔

اس قسم کا کردار بڑے دل کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے اس دنیا میں بڑے دل کے بغیر کوئی بڑی کامیابی بھی کسی کو ملنے والی نہیں۔ خواہ ایک ملک ہو یا دوسرا ملک، خواہ ایک زمانہ ہو یا دوسرا زمانہ، ہر مقام پر اور ہر جگہ کے لئے یہی ایک اصول ہے۔ اس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

جو آدمی چھوٹے دل کا ہو وہ ذرا ذرا سی بات میں لوگوں کے خلاف شکایت لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ان معمولی باتوں میں الجھ جاتا ہے جو اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسا آدمی راستہ کے درمیان میں اٹک کر رہ جائے گا۔ وہ آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے برعکس جو آدمی راستہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے نہ الجھے، وہ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ وہ اپنی دل جمعی کو ہر حال میں باقی رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی تلخ تجربہ سے بے حوصلہ نہیں ہوتا۔ ایسے آدمی کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ کر رہے۔ وہ پستیوں سے گزر کر آخری بلندی تک پہنچ جائے۔

اس دنیا میں آدمی دل کی طاقت سے جیتتا ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں جو آدمی بے دل ہو جائے وہ اپنی ملی ہوئی صلاحیتوں کو بھی کھو دے گا۔ اور جو آدمی ہر حال میں اپنے دل کو بھرپور رکھے وہ اپنی صلاحیتوں میں مزید اضافہ کرے گا۔

تمام کامیابیوں کا اصل میدان آدمی کا اپنا دل ہے۔ آپ باہر کی دنیا کو نہ دیکھئے بلکہ اپنے دل کی دنیا کو دیکھئے۔ اپنے اندر ہی آپ وہ سب کچھ پا سکتے ہیں جس کو آپ پانا چاہتے ہیں۔

کمزور تعمیر

بچوں کا گھروندا جتنی دیر میں بنتا ہے ، اس سے بھی کم مدت میں وہ زمیں بوس ہوجاتا ہے ——— یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضبوط اور مستحکم زندگی کیا ہے ۔ اور وہ زندگی کیا ہے جو کمزور بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہو ۔

بارش اور طوفان میں جب کوئی مکان گر پڑتا ہے تو باہر کا طوفان اس کو نہیں گراتا ، مکان کی اپنی کمزوری اس کو گرادیتی ہے ۔ آندھیاں اٹھتی ہیں تو چھپر اڑ جاتے ہیں مگر پتھر سے بنے ہوئے قلعے آندھیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں ۔

ہر آدمی اپنے عمل سے اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے ۔ مگر تعمیر کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک تعمیر وہ ہے جس کے پیچھے گہری بنیاد نہ ہو ، جس کا ڈھانچہ بس اوپر اوپر کھڑا کر دیا گیا ہو ۔ ایسی زندگی ہمیشہ حادثات کی زد میں رہتی ہے ۔ مخالفت کا معمولی جھونکا بھی اس کو ہلانے کے لئے کافی ہوجاتا ہے ۔ اس کے لئے زمین پر قرار اور استحکام نہیں ۔

دوسری زندگی وہ ہے جو گہری بنیادوں پر تعمیر کی جائے ۔ جس کے تمام اجزا پختہ مادہ سے تیار کئے گئے ہوں ۔ ایسی زندگی کو کوئی ہلا نہیں سکتا ۔ مخالفین کی مخالفتیں اور دشمنوں کی سازشیں صرف اس کی مضبوطی کی تصدیق کرتی ہیں ۔

کمزور تعمیر میں وقت بہت کم لگتا ہے ، اس لئے اکثر لوگ کمزور تعمیر کی طرف دوڑ پڑتے ہیں ۔ مگر کمزور تعمیر روزانہ گرتی ہے اور روزانہ بنائی جاتی ہے ۔ اس کے برعکس مستحکم تعمیر کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بار بنا دی جائے تو صدیوں تک اپنی جگہ اٹل ہو کر کھڑی رہتی ہے ۔ مستقبل کے لحاظ سے دیکھئے تو سب سے کم وقت مستحکم تعمیر میں لگتا ہے ، مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے ۔

اگر آپ کو بنانا ہے تو قلعہ بنائیے ، بچوں کا گھروندا نہ بنائیے ۔ اس کے بعد آپ کو کسی کے ظلم کی شکایت نہ ہوگی ۔ کیوں کہ اس کے بعد کوئی ظالم آپ کے قلعہ کو توڑنے کی ہمت ہی نہیں کرے گا ۔ اور اگر کسی نے توڑنا چاہا تو اس کا اپنا سر تو ضرور ٹوٹ جائے گا ، مگر آپ کا قلعہ توڑنے میں وہ کامیاب نہ ہوگا ۔

کل اور آج

ہر آدمی اپنے گزشتہ کل کو کھو چکا ہے، کامیاب وہ ہے جو اپنے آج کو نہ کھوئے ——— پچھلا دن جاچکا۔ اب تو آپ کے پاس صرف آج ہے۔ پھر آج کو آپ کیوں کھوئیں۔

اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے پچھلے کل کو استعمال نہ کرسکے تو اپنے آج کے دن اس کا افسوس لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ کل کی خاطر آج کو بھی کھونا ہے۔ نہ ملے ہوئے کی فکر میں ملے ہوئے کو بھی برباد کر دینا ہے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو اس دہرا نقصان سے بچائے۔

اگر آپ کا پچھلا کل کھو گیا ہے تو اس کو کھویا ہوا نہ سمجھئے، اس کو تجربہ سیکھنے کا ذریعہ بنا لیجئے۔ اس طرح آپ کا کھویا ہوا سرمایہ بھی پایا ہوا سرمایہ بن جائے گا۔ ماضی کے تجربہ کے سرمایہ کو اپنی حال کی پونجی میں ملا دیجئے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کی کھوئی ہوئی چیز بھی مزید اضافہ کے ساتھ آپ کو دوبارہ مل گئی ہے۔

پچھلے کل کا غم کرنا گویا اپنی صلاحیت کے ایک حصہ کو ضائع کر دینا ہے۔ آپ ایسی غلطی کیوں کریں۔ آپ نئے دن میں اپنی ادھوری صلاحیت کے ساتھ کیوں داخل ہوں۔ پچھلے کل کے غم سے اپنے دماغ کو خالی کر دیجئے اور اپنی پوری طاقت کو لے کر اپنے نئے دن کے منصوبہ میں لگ جائیے۔ یہی کامیاب زندگی کا صحیح طریقہ ہے۔

آپ خواہ کتنا ہی زیادہ گزشتہ کل کی فکر کریں، گزشتہ کل اب دوبارہ آپ کی طرف واپس آنے والا نہیں۔ جانے والی چیز جاچکی، رہنے والی چیز باقی ہے۔ جانے والی چیز کو بھلا دیجئے اور رہنے والی چیز کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ پکڑ لیجئے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد راز ہے۔ یہاں کامیابی حاصل کرنے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

پچھلے کل کا محاسبہ کرنا بہت ضروری ہے، مگر پچھلے کل پر غم کرنا اتنا ہی بے فائدہ ہے۔ آپ یہ ضرور دیکھئے کہ پچھلے کل کو آپ نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ مگر یہ دیکھنا نصیحت کے لئے ہو نہ کہ افسوس کرنے کے لئے۔

آج کو استعمال کیجئے۔ کیونکہ گزرا ہوا کل تو اب کبھی واپس آنے والا نہیں۔

مستقبل کو دیکھئے

جب آدمی کا ماضی اور حال لٹ ہو چکا ہو، اس وقت بھی اس کا مستقبل محفوظ رہتا ہے ــــــ ایک شخص کسی کا ماضی اور حال چھین سکتا ہے، مگر کوئی شخص کسی کا مستقبل چھیننے پر قادر نہیں۔

ماضی کی محرومی واقع ہو چکی، حال کی محرومی واقع ہو رہی ہے، مگر مستقبل وہ زمانہ ہے جو ابھی آنے والا ہے۔ مستقبل میں وہ تمام مواقع مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہیں جو ماضی اور حال میں آپ کے لئے ممکن تھے۔ اس لئے اگر آپ نے ماضی اور حال کو کھو دیا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے۔ مستقبل کے اعتبار سے از سر نو اپنے عمل کی منصوبہ بندی کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ آپ اتنی بڑی کامیابی حاصل کریں جو ماضی اور حال کے تمام نقصانات کی تلافی کر دے۔

زندگی کے رازوں میں سے ایک راز یہ ہے کہ آدمی کے اندر بھلا دینے کی طاقت ہو۔ اگر آپ کا ماضی اور حال برباد ہو گیا ہو تو اس کو بھلا دیجئے۔ پچھلی بربادی کو بھلانا آپ کے اندر یہ عزم پیدا کرے گا کہ آپ اپنی پوری طاقت کو نئے مستقبل کی تعمیر میں لگا دیں۔

زمانہ اگر ٹھہرا ہوا ہوتا تو آپ کو بھی ٹھہرنا پڑتا۔ اس کے بعد آپ کی محرومی ابدی محرومی بن جاتی۔ مگر زمانہ ٹھہرا ہوا نہیں ہے، زمانہ حرکت میں ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک موقع کے کھوتے ہی دوسرا موقع سامنے آجاتا ہے۔ ایک امکان کھونے کے بعد آدمی دوسرا امکان پا لیتا ہے جس کو استعمال کر کے وہ آگے بڑھ جائے۔

موجودہ دنیا میں کوئی آدمی نقصان سے بچ نہیں سکتا۔ یہاں بڑے کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور چھوٹے کو بھی۔ یہاں طاقت ور بھی نقصان اٹھاتا ہے اور کمزور بھی۔ اس لئے آپ کبھی نقصان پر بد دل نہ ہوں۔ ہر بار گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کی کوشش کیجئے۔

زمانہ کا سفر ماضی اور حال پر ختم نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ مستقبل کی طرف جاری رہتا ہے۔ اگر ماضی اور حال کا سرا آپ سے چھوٹ گیا ہو تو آپ مستقبل کا سرا پکڑ لیجئے۔ آپ دوبارہ کامیابی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

نیا طلوع

اس دنیا میں کوئی غروب آخری نہیں۔ ہر غروب کے بعد ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ بشرطیکہ آدمی اپنی شام کو دوبارہ صبح میں تبدیل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو ——— اس دنیا کا سب سے بڑا واقعہ روزانہ سورج کا ڈوبنا اور پھر دوبارہ اس کا نکلنا ہے۔ یہ سب سے بڑا واقعہ اس سب سے بڑی حقیقت کا مظاہرہ ہے کہ ہر ہار کے بعد دوبارہ جیت ہے، اور ہر کھونے کے بعد دوبارہ پانا۔

ہم جس دنیا میں ہیں، اس کا مالک کوئی انسان نہیں ہے، بلکہ خدا ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ طاقت رکھنے والا ہے۔ جس وقت کوئی انسان آپ کو محرومی سے دوچار کرتا ہے۔ یا جس لمحہ حالات کا کوئی جھونکا آپ کے چراغ کو بجھا دیتا ہے، عین اسی وقت خدا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میری دنیا میں ہر محروم ہونے والے کو دوبارہ دیا جاتا ہے، اور ہر بجھے ہوئے چراغ کو از سر نو روشن کیا جاتا ہے۔

اس خدائی امکان کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی شرط صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی متاع کو کھونے کے بعد اپنی ہمت کو نہ کھوئے۔ وہ ہر گرنے کے بعد دوبارہ اٹھے، وہ محرومی کے بعد دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگ جائے۔

شام کے بعد دوبارہ صبح کو ظہور میں لانے کے لئے کائناتی طاقت درکار ہے۔ پھر جس دنیا میں اتنے بڑے واقعہ کا ظہور ممکن ہو وہاں یہ نسبتاً بہت چھوٹا واقعہ ظہور میں کیوں نہیں آئے گا کہ ایک آدمی یا ایک قوم ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ جائے۔

خدا نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ کسی کی شکست اس کے لئے آخری شکست نہ بنے۔ ایسی حالت میں شکست پر بے ہمت ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کو اپنی دوبارہ فتح پر اتنا ہی یقین ہونا چاہئے جتنا کوئی شخص شام کے بعد دوبارہ صبح کے وقت سورج کے نکلنے کا یقین رکھتا ہے۔

لوگ عام طور پر "جو کچھ ہو چکا ہے" اس کو جانتے ہیں۔ "جو کچھ ہو سکتا ہے" اس کو نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر لوگ اس دوسری بات کو جانیں تو وہ کبھی مایوس نہ ہوں۔ کیوں کہ اس دنیا میں مایوسی وقتی ہے اور امید دائمی۔

حکیمانہ تدبیر

فساد صرف حکیمانہ تدبیروں سے ختم ہوتا ہے نہ کہ فساد ختم کرو کا مطالبہ کرنے سے ــــــ یہ اصول بلاشبہہ صد فی صد درست ہے۔ اس کے سوا فساد کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

دو انسانی گروہ جب ایک ساتھ رہیں گے تو عین فطری قانون کے تحت ایسا ہوگا کہ ان کے درمیان بار بار اختلاف اور نزاع کے مواقع پیش آئیں گے۔ مثلاً ایک کا نعرہ دوسرے کو برا لگے گا۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے عبادت خانہ کا وہ احترام نہ کرسکے گا جیسا کہ وہ گروہ کرتا ہے جس کا وہ عبادت خانہ ہے۔

اس طرح کی مختلف صورتیں ہیں جن میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے شکایت پیدا ہوگی۔ اس شکایت کا حل جوابی شکایت نہیں ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کیا جائے۔ اختلافی امور میں رواداری اور تحمل کا اصول اختیار کرنا چاہئے نہ کہ نزاع اور جوابی کارروائی کا۔

ہم فطرت سے لڑ نہیں سکتے۔ اور اختلافی بات پیش آنے پر ردعمل کا طریقہ اختیار کرنا گویا فطرت سے لڑنا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے اختلافات عین فطری اسباب کے تحت پیش آتے ہیں۔ ایسی حالت میں فطرت سے مطابقت مسئلہ کا حل ہے، فطرت سے ٹکراؤ کبھی مسئلہ کا حل نہیں بن سکتا۔

ہر مسئلہ کا حل ہے۔ مگر یہ حل صرف حکیمانہ تدبیر میں ہے۔ اگر ہم ایسا کریں کہ مسئلہ پیش آنے کے بعد ہم جھنجلاہٹ کا شکار نہ ہوں، بلکہ ٹھنڈے طریقہ سے پوری صورت حال پر غور کریں۔ مسئلہ کو صرف مسئلہ کی حیثیت سے دیکھیں، اس کو ساکھ اور وقار کا معاملہ نہ بنائیں تو یقینی ہے کہ ہم ایسی تدبیر دریافت کرلیں گے جس کے ذریعہ اس مسئلہ کو آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکے۔

جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے تو اپنے آپ کو منفی جذبات کا شکار ہونے سے بچائیے۔ اپنے ذہن کو صرف تدبیر ڈھونڈنے میں لگا دیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ مسئلہ اس طرح حل کرلیا گیا ہے جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

ودیشا کا سفر

۳ جنوری ۱۹۹۳ کا واقعہ ہے۔ میں دہلی میں اپنے دفتر میں تھا کہ دو اجنبی آدمی اندر داخل ہوئے۔ اس دن سے پہلے میں ان سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ بھی اس سے پہلے میرے بارہ میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر ودیشا کے رہنے والے ہیں۔ سوامی ویویکانند کے جنم دن ۱۲ جنوری کو ودیشا میں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں وہ دہلی آئے تھے۔ انھوں نے اپنا نام ——— ویمل کمار اور پترو اشیشی (Pitru Ashishi) بتایا۔

ان سے میرے تعارف کا ذریعہ دہلی کے ہندی اخبار جن ستا کا ایک شمارہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ آج کے جن ستا میں ہم نے آپ کا ایک انٹرویو پڑھا۔ اس سے پہلے ہم آپ کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر اس انٹرویو کو پڑھ کر ہمیں یقین ہوگیا کہ اپنے جلسہ کے لئے ہمیں جس اسپیکر کی تلاش تھی وہ بس آپ ہی ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری دعوت کو قبول کریں اور ۱۲ جنوری کو ودیشا آکر ہمیں مارگ درشن کرائیں۔ آپ ہی اس میں مین اسپیکر ہوں گے۔

یہ میرے لئے ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس وقت مدھیہ پردیش سے فرقہ وارانہ فساد کی خبریں آرہی تھیں۔ مذکورہ حضرات سے براہ راست کوئی واقفیت نہ تھی۔ ودیشا کا بھی میں نے صرف نام سنا تھا۔ تاہم مذکورہ صاحبان کے مخلصانہ اصرار پر میں نے ان کی دعوت منظور کرلی۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو بذریعہ مالوہ اکسپریس دہلی سے ودیشا کے لئے روانگی ہوئی۔ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو حسب معمول انسانوں کی بھیڑ ادھر سے ادھر دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج کا انسان اپنی معاشی دوڑ میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اس کو کسی اور بات کے بارہ میں غور کرنے کی فرصت نہیں۔ اس پر ٹھہراؤ کا لمحہ صرف اس وقت آتا ہے جب کہ وہ موت سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر جب موت کی گھڑی آجائے تو کہنے کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے اور سننے کا وقت بھی۔

ٹرین میں داخل ہو کر میں اپنی برتھ پر سو گیا۔ قدیم زمانہ میں آدمی کو جاگ کر سفر کرنا پڑتا تھا آج آدمی سوتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا سفر بھی تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوتا رہتا ہے۔ جانور اپنے پاؤں سے چلتے ہیں۔ چڑیاں اپنے بازوؤں سے اڑتی ہیں۔ مگر انسان کے ساتھ کرمنا بنی آدم کا معاملہ کیا گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں انسان جانوروں کی پیٹھ پر سواری کرتا تھا۔ اب وہ مشینی پہیہ یا مشینی بازو کے اوپر سفر کرتا ہے۔

۱۲ جنوری کی صبح کو نیند کھلی تو ودیشا کا ریلوے اسٹیشن قریب آچکا تھا۔ پلیٹ فارم پر اترتے ہی کانفرنس کے منتظمین مل گئے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر شہر آیا۔ یہاں میرا قیام مسٹر بدھا کے مکان پر تھا۔

ودیشا ایک نہایت قدیم تاریخی شہر ہے۔ وہ دہلی سے ساڑھے چھ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ودیشا کی قدامت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم سنسکرت کتابوں، مہابھارت اور رامائن میں اس کا حوالہ پایا جاتا ہے۔ موریہ اور گپتا راج کے زمانہ میں وہ ایک زبردست مذہبی، اقتصادی اور سیاسی مرکز تھا۔ ۱۲۳۵ میں وہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ ریاست مدھیہ پردیش کا ایک حصہ ہے۔

ودیشا میں کثرت سے بدھزم کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کچھ بدھسٹ اسٹوپا یہاں ایسے ہیں جن کی تاریخ دوسری صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ودیشا کے آس پاس کے علاقوں میں بھی دور تک قدیم آثار کھنڈر کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

ودیشا کے یہ آثار گویا اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ کسی کا حال خواہ کتنا ہی شاندار ہو، اس کا مستقبل بہر حال کھنڈر ہو کر رہتا ہے۔ اس میں استثناء صرف ان لوگوں کا ہے جو فانی چیزوں سے بلند سطح پر اپنے لئے زندگی کا راز دریافت کریں۔

رہائش گاہ پر کئی تعلیم یافتہ ہندو جمع ہو گئے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ لوگ زیادہ تر اسلام کے بارہ میں سوالات کرتے رہے۔

ایک صاحب نے شاہ بانو بیگم کے معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں اگر ایسا حکم ہے تو وہ بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر اسے گھر

سے نکال دے اور پھر اس کو گزر بسر کے لئے کچھ دینے سے بھی انکار کر دے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ کو اس کے پورے احول میں رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بالکل درست ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حکم اس سماج کے لئے ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ ہوا اور اسلام کا نظام قائم ہو۔ ایسے سماج میں حکومتی خزانہ (بیت المال) ہر ضرورت مند بیوہ کا پوری طرح کفیل ہوتا ہے۔ مطلقہ عورت کو سابق شوہر سے گزارہ نہ دلواکر وہ حکومت کے خزانہ سے زیادہ بہتر طور پر اس کا گزارہ دلواتا ہے۔

سابقہ شوہر سے گزارہ لینا کسی عورت کے لئے باعزت طریقہ نہیں ہوسکتا۔ اسلام جب کسی مطلقہ عورت کو اس کے سابق شوہر سے گزارہ نہیں دلواتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کے لئے بے عزت گزارہ کے بجائے باعزت گزارہ کا انتظام کر رہا ہے۔

مگر ۱۹۸۶ میں کچھ مسلمانوں نے شاہ بانو بیگم کے نام پر جو اندولن چلایا اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ اس ملک کے قائم شدہ نظام میں سرکاری خزانہ سے گزارہ دلوانے کا انتظام نہیں ہے۔ پھر جب ایک مطلقہ کو حکومت کے خزانہ سے گزارہ دلوانا ہمارے اختیار میں نہیں تو ہم اس کو دوسرے ممکن ذریعہ سے لینے پر روک کیوں لگائیں۔

بھوپال کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ سے واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ آپ ہمیشہ صلح حدیبیہ کی بات کرتے ہیں۔ اسلام میں تو جنگ بدر اور جنگ احد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ عمل ہمیشہ حالات کے مطابق کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں مختلف طریقے اختیار کئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ ہر روز آپ لوگوں سے بس جنگ بدر اور جنگ احد لڑ رہے ہوں۔

میں نے کہا کہ کچھ مسلمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں جمعہ کی نماز کی اذان بلند ہوتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص کہے کہ چلو مسجد، چلو مسجد، تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ تم تو بس ہر وقت مسجد اور نماز ہی کی بات کرتے ہو۔ آخر اسلام میں جنگ اور قتال کا حکم بھی تو ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو یقیناً آپ اس کو یہ جواب دیں گے کہ اِس وقت اسلام کا جو حکم ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ہم اٹھیں اور وضو کر کے مسجد پہنچیں تاکہ جمعہ کی اجتماعی عبادت ادا کر سکیں۔

اسی طرح آج ملت کے جو حالات ہیں ان میں یہ دیکھنا ہے کہ کون سا حکم ہے جو اس وقت ہم سے مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہندو مسلم معاملہ میں اس وقت اسلام کا جو حکم ہمارے لئے قابل انطباق ہے وہ جنگ نہیں ہے بلکہ وہی ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں صلح مطلوب ہے۔ آج جنگ مطلوب نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی "سنگھ پریوار اور مسلمان" کے موضوع پر ان سے گفتگو ہونے لگی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم تعلقات کو نارمل بنانے میں اصل رکاوٹ یہ ہے کہ مسلمان تاریخ کی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں:

The stumbling block is the reluctance to accept facts of history.

انھوں نے اس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بابر نے "ایودھیا اسٹرکچر" بھارت واسیوں کی تحقیر (humiliation) کے لئے کھڑا کیا۔

میں نے کہا کہ سنگھ پریوار کے کہنے سے کوئی چیز تاریخی حقیقت نہیں ہو جاتی۔ تاریخ کو تاریخ داں طے کرتے ہیں۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں انڈین ہسٹری کے جو پروفیسر ہیں، ان کا ایک بورڈ بنا دیجئے۔ وہ جو فیصلہ کریں اس کو آپ بھی مان لیں اور مسلمان بھی مان لیں۔ اس پر وہ راضی نہیں ہوئے۔

آدمی دلیل کا نام لیتا ہے۔ مگر دلیل جب اس کو اپنے خلاف جاتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ دلیل کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

دوپہر کا کھانا ایک آشرم میں تھا جو یہاں کے اسپتال سے ملا ہوا ہے۔ اس آشرم کا خرچ زیادہ تر ایک مقامی ہندو تاجر ادا کرتے ہیں۔ آشرم کی مختلف سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ ایک روپیہ کی علامتی قیمت پر ضرورت مندوں کو عمدہ کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آشرم کے ذمہ دار روزانہ صبح کو سڑک پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دیہات کے لوگ جو علاج کی غرض سے اسپتال آتے ہیں یا دوسرے دیہاتی جو کسی ضرورت کے تحت شہر آتے ہیں، ان کو ایک روپیہ لے کر ایک ٹکٹ دیدیتے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر کو مقرر وقت پر وہ آشرم آتے ہیں اور ٹکٹ واپس کر کے

کھانا کھاتے ہیں۔

میں نے ۱۲ جنوری کو دوپہر کا کھانا اسی آشرم میں کھایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کھانا اگر ہوٹل میں کھایا جائے تو اس پر بآسانی پانچ روپیہ سے بھی زیادہ خرچ آئے گا۔ مگر یہ صاف ستھرا کھانا روزانہ ۲۰۰ آدمیوں کو صرف ایک روپیہ کی برائے نام قیمت پر کھلایا جاتا ہے۔ اور کھانا کھلانے کا کام ملازمین نہیں کرتے۔ بلکہ خود مذکورہ ہندو سیٹھ اور دوسرے حضرات رضاکارانہ طور پر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔

۱۲ جنوری کو سہ پہر کے وقت مقامی پترکاروں سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ میں نے صحافی حضرات سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اکثر برائیوں کی جڑ ہماری صحافت ہے۔ ہماری صحافت میں سب سے زیادہ اہمیت گرما گرم خبر (hot news) کو دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر میں خدانخواستہ دیشا کے کسی پولیس افسر پر بم ماروں تو آپ حضرات فوراً اس کو رپورٹ کریں گے۔ مگر آج میں نے یہاں ایک آشرم دیکھا جو ۲۰ سال سے اسی طرح چل رہا ہے۔ اور اب تک اس کی خبر ہمارے اخبارات میں نہ آسکی۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی اصطلاح میں وہ کوئی "گرم خبر" نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ اچھی خبروں کو نہ چھاپنا اور بری خبروں کو چھاپنا، اسی کا نام زرد صحافت ہے۔ ہمارے تمام اخبارات کم و بیش اسی زرد صحافت کا نمونہ ہیں۔ اور جس ملک کی صحافت زرد صحافت ہو جائے، اس کا سماج بھی آخر کار زرد سماج بن کر رہ جائے گا۔

اس کے بعد اجودھیا کے واقعہ پر اور ملک کے مستقبل کے بارہ میں مختلف سوالات ہوئے جن کا میں نے اپنے انداز میں جواب دیا۔

۱۲ مارچ کو نماز عشاء کے بعد جلسہ کا انتظام تھا۔ وہاں پہنچا تو ایک وسیع شامیانہ میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کی بڑی تعداد بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک ہندو نے بھائی نے میرے کان میں کہا: "یہ سب لوگ آپ ہی کو سننے کے لئے آئے ہیں۔"

میں سخت الجھن میں تھا۔ آخر وقت بھی میرا ذہن یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ آج مجھے کیا کہنا ہے۔ اسی ذہنی پریشانی کے ساتھ میں منچ پر بیٹھا تھا کہ اعلان ہوگیا کہ "اب مولانا صاحب آپ کو مارگ درشن کرائیں گے۔"

میں اس حال میں مالک کے سامنے آیا کہ احساس عجز کے تحت میری آنکھوں میں آنسو آگئے

تھے۔ میں نے خاموش الفاظ میں دعا کی کہ خدایا : یہ تیری پیدا کی ہوئی روحیں ہیں جو سچائی کی بات سننے کے لئے یہاں اکٹھا ہوئی ہیں۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں ان سے کیا کہوں۔ خدایا، آج تو ہی میرے لئے پبلک اسپیکر بن جا۔ تاکہ میں وہ بات کہہ سکوں جو تیری پسند کے مطابق ہو۔

اس کے بعد میں نے تقریر شروع کی اور دیوانگی کے عالم میں تقریباً ایک گھنٹہ تک بولتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔ مگر بعد کو بمبئی کے مسٹر مدھو مہتا نے بتایا کہ آپ کی تقریر کے دوران لوگ اس قدر محو تھے کہ کروٹ بھی نہیں بدل رہے تھے۔ اکثر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ حتیٰ کہ عورتوں کو بھی میں نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھیں۔

یہاں کے ہندوؤں میں سوامی ویویکانند کو ماننے والے بہت سے لوگ ہیں۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ سوامی ویویکانند امریکہ گئے۔ وہاں ۱۸۹۳ء میں انھوں نے شیکاگو کی عالمی مذاہب کانفرنس (World's Parliament of Religions) میں ہندو ازم پر تقریر کی۔ شیکاگو کے اسٹیج پر سوامی ویویکانند کے اس ظہور کو سنسنی خیز ظہور (sensational appearance) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (15/623)

وہاں کے تمام مقرر مغربی قاعدہ کے مطابق، لیڈیز اینڈ جنٹلمن کے الفاظ سے اپنی تقریر شروع کر رہے تھے۔ سوامی ویویکانند جب کھڑے ہوئے تو ہندستانی روایت کے مطابق، ان کی زبان سے نکلا کہ امریکہ کے بہنو اور بھائیو (sisters and brothers of America) یہ الفاظ لوگوں کی فطرت کے اتنے زیادہ مطابق تھے کہ ہال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس کانفرنس میں سوامی جی کی تقریر سب سے زیادہ پسند کی گئی۔

میں نے کہا کہ سو سال پہلے باہر کے دیشوں کے لوگ انڈیا کے لئے بہن اور بھائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ خود دیش کے لوگ بھی اب بہن اور بھائی نہیں سمجھے جا رہے ہیں۔ اس ذہن کو ہمیں بدلنا ہوگا ورنہ دیش تباہ ہو جائے گا۔

ودیشا کے سفر کا شاید سب سے اہم واقعہ مسٹر مدھو مہتا سے ملاقات ہے۔ اس سے پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل ناواقف تھے۔ ودیشا میں پہلی بار ان سے میری ملاقات ہوئی۔ موجودہ ملکی حالات پر باتیں ہوئیں۔ جلسہ میں انھوں نے میری تقریر سنی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ

مجھے ایک "مسلم مولانا" کی تلاش تھی۔ کیوں کہ اجودھیا کے بعد ملک میں جو سنگین مسئلہ پیدا ہوا ہے، اس کو ایک مسلمان عالم ہی حل کر سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ میں نے آپ کی ذات میں اس مسلمان عالم کو پا لیا ہے۔

مسٹر مدھو مہتا بمبئی کے ممتاز افراد میں سے ہیں۔ ان کے تعلقات اعلیٰ سطح کے ہندوؤں سے ہیں۔ وہ ہندستانی اندولن کے چیرمین ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ بمبئی آئیے۔ وہاں آپ اپنا "اصلاحی پروگرام" پیش کیجئے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کو ہر طرح کی سپورٹ دلواؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد انھیں کے زیر اہتمام بمبئی کے لئے میرا یہ سفر ہوا۔ ہر سفر خدا کے فضل سے غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۳ کو میں بذریعہ ٹرین دہلی واپس آیا۔ ٹرین اس نئے دور کی ایک علامت ہے جب کہ انسانی تمدن کو حرکت دینے کے لئے مشینی پہیہ حاصل ہو گیا۔ کمیونی کیشن کے اس انقلاب میں ٹرین اب بہت پیچھے کی چیز ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی اس زمین پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اگرچہ بظاہر ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوں، مگر اپنی سوچ کے اعتبار سے وہ ٹرین سے بھی پیچھے کے دور میں جی رہے ہیں۔ جسم کے اعتبار سے وہ بیسویں صدی کے مسافر ہیں مگر اپنے شعور کے اعتبار سے صرف پچھلی صدی کے مسافر۔

روسی زبان میں اسلامی لٹریچر

ایک روسی مسلمان ڈاکٹر ایوجین بی۔ ٹرائفونوف نے اسلامی مرکز کی ایک کتاب سچا راستہ (The Way to Find God) کا روسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اپنے خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ روس میں اسلام کے تعارفی لٹریچر کی شدید ضرورت ہے۔ مالی وسائل کی کمی اور دوسری دقتوں کے باوجود وہ یہ عزم رکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسلامی مرکز کی اہم مطبوعات کے روسی ترجمے چھاپ کر شائع کریں۔ جو حضرات اس سلسلہ مالی تعاون دینا چاہتے ہوں تو براہ راست حسب ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:

Dr Eugene B. Tryphonov, M.D.
Ul. Kompozitorov, 29/1, apt 379,
Saint Petersburg 194358
Russia

سفر بندرابن

کچھ تعلیم یافتہ ہندو صاحبان نے بندرابن میں ایک چار روزہ سمواد پر یاس کا انتظام کیا تھا اس کی دعوت پر بندرابن اور متھرا کا سفر ہوا۔ اس سفر کی مختصر روداد حسب ذیل ہے۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو ہم لوگ بذریعہ کار دہلی سے بندرابن کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے قافلہ میں چار آدمی تھے ـــــ ڈاکٹر راجکمار بھاٹیا، ڈاکٹر مہیش شرما، ڈاکٹر سریندر شرما، اور راقم الحروف۔ یہ گاڑی ڈاکٹر بھاٹیا (پروفیسر جواہرلال نہرو یونیورسٹی) کی تھی اور وہ خود ہی اس کو چلا رہے تھے۔

راستہ میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ قافلہ کے دو آدمی جے پرکاش نرائن (۱۹۷۹-۱۹۰۲) کے ساتھیوں میں سے تھے، چنانچہ زیادہ تر گفتگو کا موضوع جے پرکاش نرائن کی ذات اور ان کا مشن رہا۔

میں نے کہا کہ جے پرکاش کو تھنکر کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو تھنکر کہنا بہت مشکل ہے۔ میں کبھی ان سے ملا نہیں۔ مگر ان کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں بار بار اپنا نظریہ بدلتے رہے اور آخر وقت میں فکری بے اطمینانی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔ ایسے آدمی کو سیکر (seeker) کہنا چاہئے نہ کہ تھنکر۔

میں نے کہا کہ ۱۹۷۷ کے الکشن میں جے پرکاش نرائن نے ٹوٹل ریولیوشن (پورن کرانتی) کا نعرہ دیا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں یہ تاثر دیا کہ کانگرس پارٹی کو الکشن میں ہرانا ہی دیش میں پورن کرانتی لے آنا ہے۔ مگر واقعات نے ثابت کیا کہ یہ محض ان کی سادگی یا خوش فہمی تھی۔ الکشن میں کانگرس مکمل طور پر ہار گئی، اس کے باوجود مکمل انقلاب نہ آسکا۔ الکشن کی ہار جیت سے کسی ملک میں مکمل انقلاب نہیں آیا کرتا۔ اگر جے پرکاش نرائن تھنکر ہوتے تو وہ پیشگی طور پر اس کو جان لیتے، مگر وہ اس کو نہ جان سکے۔

ایک صاحب نے جواب میں کہا کہ جے پرکاش نرائن بنیادی طور پر ایک شریف اور دیانتدار آدمی تھے۔ وہ فوری تاثر کے تحت ایک رائے قائم کرتے اور پھر کچھ دن بعد نئی رائے بنا لیتے تھے۔ یہ سب کچھ انسانی ہمدردی کے تحت ہوتا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو

جے پرکاش نرائن ایک شریف انسان تھے نہ کہ منکر انسان۔

بندرابن پہنچ کر ہم گیتا آشرم گئے۔ یہیں پر قیام اور اجلاس دونوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ آشرم میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ اجلاس جاری ہے۔ چنانچہ ہم لوگ سیدھے آشرم کے ہال میں پہنچے اور اجلاس میں شریک ہو گئے۔ اس ہال تک پہنچنے کے لئے جامع مسجد دہلی کی طرح اونچی سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

اس آشرم میں ایک ہاسٹل ہے جس میں سنسکرت کے طلبہ کے لئے قیام کا انتظام ہے۔ یہ طلبہ شہر کے سنسکرت کالج میں پڑھتے ہیں اور ان کے لئے قیام و طعام کا انتظام آشرم کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ یہ برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ تقریباً ۲۰ کی تعداد میں تھے۔

میں نے دیکھا کہ یہ نوجوان طلبہ ہر روز صبح سویرے ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوتے ہیں اور گیتا کا پاٹھ کرتے ہیں۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ہمارے یہاں تجویدکے مدارس میں ہوتا ہے۔ ایک پنڈت سامنے بیٹھ کر گیتا کے سنسکرت اشلوک اصول قرأت کے مطابق پڑھتا اور بقیہ تمام طلبہ اس کو دہراتے تھے۔ اس عمل کے خاتمہ پر سب مل کر ایک ہندی نظم پڑھتے تھے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

پاٹھ گیتا کا سدا کرنا بڑا است دھرم ہے — پاٹھ گیتا کا سدا کرنا ہی مانو دھرم ہے

گیان گیتا کا سدا ہردے میں دھرنا چاہئے — منش کو ہر روز گیتا پاٹھ کرنا چاہئے

میں نے پنڈت جی سے پوچھا کہ پورے دیش میں گیتا کے کتنے لاکھ حافظ ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ لاکھ تو نہیں، شاید کچھ ہزار ہوں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ آپ کو تو پوری گیتا یاد ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، کچھ کچھ۔ وہاں ۲۰ طالب علم تھے۔ سب کے سب معمولی گھروں کے دکھائی دئے۔ تاہم آشرم کی عمارت کافی شاندار اور وسیع تھی۔

یہاں آگرہ کا ہندی اخبار دینک جاگرن (۱۵ جنوری ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کے پہلے صفحہ کی کچھ سرخیاں یہ تھیں:

بمبئی میں دنگائیوں نے ۸ لوگوں کو زندہ پھونکا

احمد آباد میں چھرے بازی کی چٹ پٹ وار داتیں۔

مسجد ڈھانا بھاجپا کی سوچی سمجھی سازش (ارجن سنگھ)

مسلم دھارمک نیتاؤں کا اندولن اور تیز

اجودھیا کی طرح ہی ہم دلی کی جامع مسجد پر قبضہ کریں گے

۱۵ اگست کو ہمیں سیاسی آزادی ملی ۶ دسمبر کو ہمیں مذہبی آزادی ملی۔

بعض سرخیوں کو اشتعال انگیز سمجھ کر کوئی مسلمان غصہ ہو سکتا ہے۔ مگر میں نے ان سرخیوں کو پڑھ کر سوچا کہ اردو آج بھی ہندی لپی کے روپ میں زندہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم بول چال کی زبان آج بھی اس ملک میں اردو ہے۔ یہ بہت زیادہ قابل شکر بات ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور برادران وطن کے درمیان آج بھی لسانی بعد (Language gap) نہیں پیدا ہوا۔

۱۵ جنوری کو میں دوپہر کا کھانا کھا کر اٹھا۔ باہر برآمدہ میں گیتا آشرم کے دو طالب علم کھڑے ہوئے لوگوں کا ہاتھ دھلا رہے تھے۔ ایک طالب علم تولیہ لئے ہوئے کھڑا تھا اور دوسرا طالب علم مگ کے ذریعہ پانی ڈال رہا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو سیمنار میں شرکت کرنے والے ایک صاحب جو سوٹ بوٹ میں تھے، وہ ان طالب علموں سے بات کر رہے تھے۔ میں آگے بڑھ کر ہاتھ دھونے لگا۔ اس دوران گفتگو کی آواز کان میں آئی۔

مذکورہ صاحب نے طالب علموں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کیا پڑھتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ہم سنسکرت پڑھتے ہیں۔ موصوف نے لاپروائی کے انداز میں کہا: سنسکرت پڑھنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ سائنس پڑھو، کچھ اور پڑھو۔ جیون برباد مت کرو۔

یہ ریمارک دینے والے صاحب ایک مسلم نوجوان تھے۔ اس کے بعد اسی دن شام کو ان طالب علموں کے استاد نے اپنے کمرہ میں ہم چند لوگوں کو چائے پر بلایا۔ یہ نہایت صاف ستھرا دو کمروں کا ایک سیٹ تھا جس میں ٹیلی فون اور دوسری چیزیں موجود تھیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ آج کے ایک "پنڈت" کے لئے کیا مواقع کھل چکے ہیں۔ وہ پرانے زمانہ کے روایتی پنڈت پر آج کے زمانہ کے جدید پنڈت کو قیاس کر رہے ہیں۔

۱۵ جنوری کی صبح کو اچانک شور و غل سنائی دیا۔ میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا تو آشرم کے نوجوان طلبہ اپنے ہاتھوں میں ڈنڈا لئے دوڑ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ آشرم میں کچھ بندر گھس آئے ہیں، ان کو بھگایا جا رہا ہے، کیوں کہ وہ جب آتے ہیں تو کچھ نہ کچھ نقصان کرتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ بندران لوگوں کے نزدیک ایک مقدس جانور ہے۔ مگر جب یہ مقدس جانور ان کے انٹرسٹ کے لئے خطرہ بن جائے تو وہ اس کو مارنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جب خود اپنے عقیدہ کے مطابق ایک مقدس حیوان کے ساتھ ان کا یہ سلوک ہے تو عام انسانوں کے ساتھ ان کا سلوک کیوں کر مختلف ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کا یہی معاملہ ہے۔ وہ کسی کو صرف اس وقت تک قابل احترام سمجھتا ہے جب تک وہ اس کے لئے بے ضرر حیثیت رکھتا ہو۔ جیسے ہی وہ ضرر رساں دکھائی دے، آدمی اس کا مخالف بن جائے گا۔ اب اس کے پاس ایسے آدمی کے لئے ڈنڈا ہوگا نہ کہ پھول۔

سمینار کے شرکاء کے لئے قیام کا انتظام گیتا آشرم میں کیا گیا تھا۔ ایک کمرہ میں دو آدمی کو ٹھہرایا گیا تھا۔ میرے ساتھ آر ایس ایس کے ایک خاص رکن تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور آر ایس ایس کے انٹلکچول میں شمار کئے جاتے تھے۔ کمرہ میں ایک ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر ہم دونوں ایک ساتھ سوتے تھے۔

وہ صبح کو فجر سے پہلے اٹھ جاتے تھے۔ میں بھی اسی وقت اٹھتا تھا۔ ایک روز جب وہ سو کر اٹھے تو بستر پر بیٹھے بیٹھے میں نے ان سے ایک سوال کیا۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ آپ لوگ مسلمانوں سے کیا چاہتے ہیں۔ مسلمان کیا کریں کہ آپ لوگوں کی شکایت ان سے ختم ہو جائے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں یک طرفہ طور پر ہندوؤں سے ایڈجسٹ کر کے رہیں۔

انھوں نے فوراً کہا: "نہیں مولانا صاحب، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ مسلمان برابر کے ناگرک بن کر رہیں۔ مسلمان بھائیوں سے ہم صرف ایک بات چاہتے ہیں۔ یہ کہ وہ اس دیش کو اپنا دیش سمجھیں"۔ یہ ایک ایسے شخص کے الفاظ تھے جو آر ایس ایس میں عہدیدار کی حیثیت رکھتا ہے۔

"بندرابن" کو آپ پرانی کتابوں میں پڑھیں تو وہ ایک افسانوی مقام معلوم ہوگا۔ مگر ۱۴ جنوری ۱۹۹۳ کو ۱۰ بجے جب میں بندرابن کے اندر داخل ہوا تو وہ ایک عام قصبہ کی مانند تھا۔ آج وہاں ایسی چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو قدیم کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

یہاں "سنواد پریاس" گیتا آشرم میں رکھا گیا تھا۔ گیتا آشرم کافی بڑا ہے۔ پہلے وہ قدیم

طرز کا ایک مندر رہو گا مگر اب یہاں خالص جدید طرز کی ایک شاندار عمارت بنائی گئی ہے۔ وہاں گیتا کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اور اسی کے ساتھ کئی ہال ہیں۔ ایک ہال میں ہمارے کانفرنس کی کارروائی ہوئی۔

اس مضمون میں وہاں کی تمام کارروائیوں کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ باتوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

موجودہ ملکی حالات پر یہ سمینار چار دن تک جاری رہا۔ ہر ایک نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک روز میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندو راشٹر عام حالات میں ہندستان میں قائم نہیں ہوسکتا۔ آر ایس ایس یا بھارتیہ جنتا پارٹی کے لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ محض اپنی طاقت سے اس ملک میں ہندو راشٹر قائم کر دیں۔

ہندستان میں ہندو راشٹر کا قیام تمام تر مسلمانوں کے رویہ پر منحصر ہے۔ اگر مسلمان خاموشی کا رویہ اختیار کرلیں۔ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی یا آر ایس ایس کی مخالفت نہ کریں تو ہندو راشٹر کے قیام کی تحریک کی ناکامی یقینی ہے۔ ہندو راشٹر صرف اس وقت قائم ہوسکے گا جب کہ اس کے علمبرداروں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوجائے کہ مسلمان اپنے نادان لیڈروں کی غلط رہنمائی میں پڑکر اس کے خلاف دھوم مچانا شروع کر دیں۔

بندرابن کے اس سمینار میں مجھے اس حقیقت کا علم ہوا کہ ہندوؤں میں بھی ایک اعتبار سے وہی صورت حال ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں آج جو لوگ مختلف سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں کام کر رہے ہیں، ان کی اکثریت "انقلابی اسلام" سے متاثر نظر آتی ہے۔ اس کا سبب بہت زیادہ نظر یاتی نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اسکول یا کالج کی تعلیم کے زمانہ میں ان لوگوں نے ان اسلامی مفکرین کی پرجوش کتابیں پڑھیں جن میں اسلام کو انقلابی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ پختگی سے پہلے کی اس عمر میں انھیں اسلام کی یہ تشریح اچھی لگی۔ اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ عملاً ان میں سے ہر ایک کا مذہب مادی انٹرسٹ ہے۔ مگر ٹیبل ٹاک کے لئے وہ اپنے سابقہ تاثر کے تحت بدستور اسلام کی انقلابی تشریح کو اختیار کئے ہوئے ہے۔

یہی معاملہ ہندوؤں کا ہے۔ آر ایس ایس اور اس طرح کی دوسری تحریکوں نے "ہندو انڈیا" جو رومانی تصور دیا وہ بہت سے ہندو نوجوانوں کو پسند آگیا۔ بعد کو اگرچہ وہ عام لوگوں کی طرح

دنیا کے کمانے میں مشغول ہوگئے۔ تاہم ایک دل پسند تاثر کے طور پر ہندو احیاء کا آئیڈیا بھی ان کے ذہن میں موجود رہا جو لکھنے اور بولنے کی سطح پر حسب موقع ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ بس اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انھیں میں سے ایک مسٹر ارن شوری ہیں۔

اس سیمنار کے شرکاء میں اگرچہ اکثریت آر ایس ایس کے ذہن کے لوگوں کی تھی۔ تاہم یہاں فکری غلبہ کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ ہر ایک کو آزادی تھی کہ وہ کھلے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ مقررین کی کچھ باتیں یہاں مختصر طور پر نقل کی جاتی ہیں۔

سوامی اگنی ویش نے کہا کہ مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ لوگوں میں (fixed notions) بنے ہوئے ہیں۔ لوگ پہلے ہی سے یہ مانے ہوئے رہتے ہیں کہ مسلمان ہے تو ایسا ہوگا اور ہندو ہے تو ایسا ہوگا۔ ہمیں سوچنے کا یہ طریقہ بدلنا ہوگا۔ ورنہ نیشن بلڈنگ کا کام نہیں ہوسکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ دیش کے حالات اگرچہ بہت خراب ہیں۔ مگر حالات کا کچھ پازیٹو پہلو بھی ہے۔ مثلاً بابری مسجد کو ڈھایا گیا تو میں دیکھتا ہوں کہ اس کی چنتا جتنی مسلمان کو ہے اس سے زیادہ چنتا ہندوؤں کو ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج یہ حالت ہے کہ دیش کا ایجنڈا پولٹیکل لوگ طے کرتے ہیں۔ یہ ایک دربھاگیہ کی بات ہے۔ دیش کو کچھ لوگوں کے پولٹیکل انٹرسٹ پر بھینٹ نہیں کیا جاسکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ دیش کو الٹے راستہ پر لے جایا جارہا ہے۔ نان اشو کو اشو بنایا جارہا ہے۔ اس کے خلاف ہمیں اٹھنا ہوگا ورنہ دیش تباہ ہوجائے گا۔

ایک ہندو نوجوان نے کہا کہ مسلمان آج بھی پاکستان کی طرف اپنا دھیان لگائے ہوئے ہیں۔ اسی لئے جب کرکٹ میں پاکستان کے کھلاڑی جیتتے ہیں تو وہ یہاں خوشی مناتے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے راج موہن گاندھی نے کہا کہ ان چیزوں کو آپ اتنی زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ یہ تو خود آپ کی ذہنی ناپختگی کا ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں ہائی کمشنر تھا۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ میچ میں اگر ہندستانی کھلاڑی اچھا گیند مارتا تو وہاں کے ہندستانی تالیاں بجاتے اور اگر پاکستانی کھلاڑی اچھا کھیل دکھاتا تو پاکستانی لوگ تالیاں بجاتے۔ اور انگریز جو وہاں ہوتے وہ کسی پر غصہ نہ ہوتے بلکہ دونوں پر مسکرا دیتے۔ یہی آپ کو بھی کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر مہیش شرما نے کہا کہ آج کی سیاسی پارٹیوں کے اندر ایک دوسرے کا احترام نہیں۔ دوسروں میں بھی وہی ہے جو مجھ میں ہے، یہ دیکھنے کی طاقت لوگوں میں نہیں۔ تمام سمجھدار لوگوں کا کہنا ہے کہ دشمن اگر کوئی ہے تو وہ تمہارے اندر ہی ہے۔ پر اب ہم نے دشمن بدل لئے ہیں۔ اب ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دشمن ہمارے اندر نہیں ہے، باہر ہے۔ بھاجپا کا دشمن کانگرس، کانگرس کا دشمن بھاجپا۔ یہ سوچ بدلنا ہوگا۔ اپنے بارہ میں کڑوی بات سننے کی اشتھی ہونی چاہئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت بھارت میں بھٹکی ہوئی حالت ہے۔ ہم ۸۵ کروڑ لوگ آج بھٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو نہیں معلوم کہ کدھر جائیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ دھرم کو آدھار بنا کر ہندوؤں نے پہلے کام نہیں کیا۔ آج وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی کر رہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اٹل بہاری باجپئی نے چیتاونی دیتے ہوئے کہا ہے کہ رام کا مندر بنانے میں بھارت کا مندر نہ ٹوٹ جائے۔

ایک ہندو ڈبل گیسٹ نے ۱۴ جنوری کی میٹنگ میں کہا کہ کیلاش پربت اور مان سرور جھیل ہندوؤں نیز بدھوں میں بہت اہم مقدس مقام (Most important holy site) مانا جاتا ہے۔ ہندو تو اس کو بھگوان شیو کا سورگ مانتے ہیں۔ ہماری اتنی مقدس جگہ پر ۱۹۶۲ میں چین نے حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن آر ایس ایس یا بھاجپا یا ہندو پریشد کے لوگ اس کے خلاف کوئی اندولن نہیں چلاتے۔ اور ایودھیا کے اوپر اتنی دھوم مچاتے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں۔

ایک صاحب نے کہا کہ رام منوہر لوہیا کہا کرتے تھے کہ دیش کو گرماؤ۔ چنانچہ ہم نے دیش کو گرمایا۔ مگر نتیجہ دیکھنے کے بعد اب سمجھ میں آتا ہے کہ لوہیا کا نعرہ ٹھیک نہیں تھا۔ زیادہ ٹھیک نعرہ یہ ہے کہ —— دیش کو ٹھنڈا کرو۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمیں کسی بھی حال میں گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے۔ ایک وقت تھا کہ کمیونزم کو ساری دنیا میں (unassailable ideology) سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج اس کے برعکس سمجھا جا رہا ہے۔

ایک صاحب گاندھیائی علوم کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ مہاتما گاندھی نے ایک بار اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ ہندو مسلم ایکتا دیش کی ترقی کے لئے اتنا زیادہ ضروری

ہے کہ اس کے بغیر میں بھی دیش کو ترقی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندو مذہب کا بنیادی عقیدہ سرو دھرم سمبھاوا ہے۔ یعنی ہر مذہب کا احترام (respect to all religions) مگر آج جو لوگ ہندو کاز کے لئے اٹھے ہیں وہ اسی بنیادی بات کو بھولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس قسم کی باتوں کو سن کر میرا احساس یہ ہے کہ ہندو ضمیر تڑپ اٹھا ہے۔ اس لئے کہ سیکڑوں سال سے ہندوؤں کو بتایا جا رہا تھا کہ سچائی ہر جگہ ہے۔ جس طرح مندر مقدس ہے اسی طرح مسجد اور گرجا بھی مقدس ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ تاریخ پر افسانہ (myth) کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اخلاق اور قانون کو توڑا جا رہا ہے، انسانیت کو بلڈوز کیا جا رہا ہے۔ اس انجام کو دیکھ کر سنگھ پریوار کے خیر خواہ بھی اس کی طرف سے متوحش ہو رہے ہیں۔

ایک دلت دانشور ناگپور سے آئے تھے۔ انھوں نے کافی جارحانہ انداز میں تقریر کی۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تاریخ کی غلطیوں کو درست کریں گے۔ تو تاریخ کی غلطیاں تو اجودھیا کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے برہمنوں نے بودھ مندروں کو توڑا اور ان کی جگہ پر ہندو مندر بنا دیا۔ پھر آپ ان تاریخی غلطیوں کی اصلاح کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ ہریجنوں پر ماضی میں بہت زیادہ ظلم کئے گئے۔ ہم ان کے بارہ میں بولتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ پھر آپ بھی اسی طرح اجودھیا اور کاشی اور متھرا کی بات کو کیوں نہیں بھول جاتے۔ خود تو آپ یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے کہتے ہیں کہ بھلا دو۔

ایک صاحب نے کہا کہ تلک اور گاندھی کا جھگڑا برہمن اور اُبرہمن کا جھگڑا تھا۔ گویا کہ وہ جاتی وادی کا جھگڑا تھا۔ وہ کوئی نظریاتی جھگڑا نہ تھا۔ یہی آج بھی ہو رہا ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ میں اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں آر ایس ایس سے قریب ہو گیا تھا۔ لیکن تب اور اب میں بہت انتر ہے۔ کل کی آر ایس ایس اور آج کی آر ایس ایس میں بڑا فرق آگیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی کا نام سبھی لوگ لیتے ہیں۔ مگر ہم لوگ گاندھی کو صرف آدھا مانتے ہیں۔ آج خطرہ میں ڈیموکریسی نہیں ہے۔ آج خطرہ میں دیش نہیں ہے۔ آج خطرہ میں ہندو نہیں ہے۔ آج خطرہ میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ دراصل وہ لڑائی ہے جس کو مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ تک پہنچایا

تھا۔ مگر اس کے آگے ہم اس کو جاری نہ رکھ سکے۔

رام بہادر رائے نے کہا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ نے اگلے دس سال تک کا ایجنڈا طے کر دیا ہے۔ ۶ دسمبر کی گھٹنا نے طے کر دیا ہے کہ اگلے دس سال تک دیش کی پالٹکس ہندتو کے ارد گرد گھومے گی۔ ان کی تقریر ختم ہوئی تو دوسرے ہندو مقرر نے کہا: یہ دیش کے لئے بہت درگھٹنا کی بات ہوگی کہ دیش کا دس سال کا ایجنڈا صرف کوئی ایک دن طے کرے۔ میرا دل ایسی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔

ڈاکٹر راجکمار بھاٹیا اسکول کی زندگی سے آر ایس ایس سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے والد کٹر آر ایس ایس تھے۔ چنانچہ بیٹے بھی آر ایس ایس سے وابستہ ہو گئے۔

میں نے ڈاکٹر بھاٹیا سے پوچھا کہ ہندو مسلم تعلق کو نارمل بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں میں (interaction) بڑھایا جائے۔ میں نے کہا کہ اور کوئی عملی چیز جو مسلم سے آپ چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اجودھیا اشو پر آپ لوگ راضی ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کافی نہ ہو۔ کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو سنگھٹن کے لئے اینٹی مسلم فیلنگ ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اگر اجودھیا اشو ختم ہو جائے تو آپ لوگ کوئی اور اشو ڈھونڈ کر کھڑا کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ اس کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جیل کے زمانہ میں مسلمان اور آر ایس ایس دونوں دوست بن گئے تھے۔

بی کے رائے، الہ آباد یونیورسٹی میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کمبھ میلے میں گیا۔ وہاں ایک کروڑ سے زیادہ آدمی آتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا۔ کسی آدمی کے پاس ایک پیسہ نہ ہو تب بھی اس کو کھانا مل جاتا ہے۔ یہ دھرم کی طاقت ہے۔

ایک صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ پی اے سی میں افسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندو دھرم کے مطابق سچائی کئی ہو سکتی ہے اس لئے ہندوازم کا نباہ تو ہر ایک سے ہو سکتا ہے۔ مگر اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے مطابق، سچائی صرف ایک ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا نباہ دوسروں سے کس طرح ہوگا۔

میں نے کہا کہ "سچائی کئی ہے" محض کہنے کی بات ہے۔ وہ عمل میں آنے والی نہیں۔ اگر وہ کوئی حقیقی

بات ہوتی تو ماضی میں برہمن لوگ بدھوں کے مندر نہ توڑتے۔ یا آج ہندتو کے علمبردار ۶ دسمبر کو بابری مسجد نہ توڑتے۔ میں نے کہا کہ اختلاف زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ روزانہ کی زندگی میں گھر کے اندر اور گھر کے باہر ہم طرح طرح کے اختلافات سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہاں ہم کیا کرتے ہیں۔ وہاں ہم برداشت کے اصول پر عمل کرکے زندگی گذارتے ہیں۔ یہی طریقہ مذہب میں بھی اختیار کرنا ہے۔ یعنی مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود ٹالرنس (tolerance) ۔

"۱۹۴۷ کے بعد نیشن بلڈنگ کا کام نہ ہو سکا" ایک صاحب نے کہا۔ اپنی بھومیکا (ذمہ داری) کو پورا کرنے کا دھیان آج بھی لوگوں میں نہیں۔ ۶ دسمبر کے بعد نیشن بلڈنگ میرے نزدیک ایجنڈا میں نمبر ایک پر ہے۔

۱۹۸۴ میں ہم لوگ بات کرتے تھے کہ کسی گھر میں ایک وکیتی مرا ہو تو اس کے گھر میں کتنا زیادہ آتنک واد پیدا ہوگا۔ اب یہی بات اور زیادہ بڑھ کر ہمارے سامنے ہے۔ آج جن گھروں میں لوگ مرتے ہیں ان کے یہاں اور کتنا زیادہ آتنک وادی پیدا ہوں گے۔

اوشیش سوامی (بندرابن) نے کہا کہ اس شکتی کے نام تو انیک ہیں۔ لیکن شکتی ایک ہی ہے جسے جگن نینتا، خدا، گاڈ، رب، واہی گرو، نام انیک ہیں۔ کنتو سمبھودن ایک ہی شکتی کو کیا جاتا ہے۔ جھگڑا پوجا کا نہیں ہے اور پوجا پدھتی کا بھی نہیں ہے۔ جھگڑا کیول اپنی دکانداری کا ہے۔ کیوں کہ کچھ لوگوں کی دکانداری انھیں مدّوں کے ذریعہ سے چلتی ہے اس لئے آپسی تناؤ بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔ یدی روحانی نظر سے دیکھیں تو سروم کھلو دم برہم یعنی برہم ہی سب میں سمایا ہوا ہے۔ جب سبھی میں برھم سمایا ہوا ہے تو جاتی گت جھگڑے، اونچ نیچ کے جھگڑے، بھاشائی جھگڑے رہ ہی کہاں جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنے نظریہ کو دنیاوی نظر کے ساتھ روحانی نظر والا بھی بنانا ہوگا۔

ایک بڑے ہال میں فرش بچھا ہوا ہے۔ سمینار میں حصہ لینے والے تقریباً ساٹھ آدمی دائرہ کی صورت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختلف لوگ موجودہ ملکی حالت پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اتنے میں ایک لڑکا ایک تھال لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ تھال میں کٹی ہوئی مولی مع پتہ رکھی ہوئی ہے جس پر نمک چھڑکا ہوا ہے۔ وہ لڑکا تھال لئے ہوئے سب کے سامنے سے گزرتا ہے۔ ہر ایک بقدر خواہش مولی لے لیتا ہے اور اس کو کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آخر میں چائے لائی جاتی ہے اور ہر ایک کے

سامنے چائے کی ایک پیالی رکھ دی جاتی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندرابن کا یہ سمینار کتنا سادہ تھا اور اس کی کارروائی کتنے بے تکلفی کے انداز میں کی گئی۔ یہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔ کیوں کہ سادگی میری فطرت ہے۔ میں ہر معاملہ میں سادگی کو پسند کرتا ہوں۔

ایک صاحب نے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ مدّا کیا ہے۔ دیش مدا ہے، یا دھرم مدا ہے۔ دیش پہلے ہے یا دھرم پہلے ہے۔ دھرم کو کچھ لوگوں نے مدا بنایا۔ اس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا کہ خود دیش خطرہ میں پڑ گیا۔ اس لئے اب اس کو ختم کرو۔ دیش کو مدا بناؤ۔

ایک صاحب نے کہا کہ جس طرح انگریزوں کے اسٹیچو یہاں غلامی کی یادگار تھے۔ ان کو ہم نے ہٹایا۔ اسی طرح بابری مسجد جیسے ڈھانچے بھی مسلم غلامی کی یادگار ہیں۔ ان کو بھی توڑ کر ختم کرنا ہوگا۔ جب تک غلامی کی یہ یادگاریں کھڑی ہوئی ہیں، دیش میں شانتی آنے والی نہیں۔

ایک صاحب نے بابری مسجد ڈھانے کو عین درست بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر ہمارے لوگ معذرت کا انداز کیوں اختیار کرتے ہیں۔ اگر پندرہ اگست پر ہم کو کوئی شرم نہیں ہے تو ۶ دسمبر پر بھی ہم کو شرمانا نہیں چاہئے۔

اس سمینار میں ایک خاص تجربہ یہ ہوا کہ اگر مسلمان چپ رہیں تو خود ہندو لوگ ہم سے بہتر اور موثر انداز میں اس کا جواب دیں گے۔ اس کا تجربہ بندرابن میں کئی بار ہوا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی مقرر نے مسلم دشمن تقریر کی۔ میں چپ رہا۔ اس کے بعد کوئی ہندو اٹھا اور اس نے نہایت طاقتور انداز میں اس کا جواب دیا، ایسا کہ اگر میں جواب دیتا تو شاید میں اتنا طاقتور جواب نہیں دے سکتا تھا۔

اودے پور کے کشور سنت (Telephone 28271) نے بڑی دردمندانہ تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ آج یہ لوگ ساری بات گاندھی کے نام پر کر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہی گاندھی واد ہے۔ اس اندولن سے جو شکتی ابھری ہے وہ تو ہنسک شکتی ہے۔ پھر وہ گاندھی واد کیسے ہے۔ جب کہ گاندھی واد اہنسا کا نام ہے۔ میں نے گاندھی کے زمانہ کو دیکھا ہے۔ مگر آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھ کر مجھے اپنا جیون بالکل نرر تھک لگتا ہے۔ نفرت کی آگ آج ویاپک ہے۔ گاندھی کا دیش اب نہیں ہے۔ بالکل اندھکار ہے۔

بندر ابن کی اس میٹنگ میں زیادہ بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو بھارتیہ جنتا پارٹی سے کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتے تھے۔ مجھے تقریر کا موقع دیا گیا تو میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے موجودہ سنگل پوائنٹ پروگرام (single-point programme) کے تحت کبھی مرکزی حکومت تک نہیں پہنچ سکتی۔ کچھ لوگ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایک قسم کی منتظر حکومت (government-in-waiting) کا درجہ دئے ہوئے ہیں، مگر موجودہ حالت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی ہندتو یا ہندو راشٹر قائم کرنا چاہتی ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد پر سیاسی نظام بنانا یہ روح عصر (spirit of the age) کے خلاف ہے۔ اور جو نظریہ عصری مزاج کے خلاف ہو اس کو قائم کرنا عملی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی قریبی مثال مسلم ملکوں کا تجربہ ہے۔ مصر، پاکستان، الجزائر، سوڈان اور دوسرے ملکوں میں کچھ مسلم جماعتوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ بلند کیا۔ انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں بھی دیں۔ مگر ان کو صد فی صد ناکامی ہوئی۔ اور اس کی وجہ اصلاً یہی تھی کہ مذہب کی بنیاد پر سیاسی نظریہ بنانا ایک ایسا نظریہ ہے جس کو وقت کی غالب سوچ کی تائید حاصل نہیں۔

میں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اگر مرکزی سرکار بناتی ہے تو اس سے مجھے نہ اختلاف ہے اور نہ اس کو میں کوئی خطرہ سمجھتا ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ "مندر۔ مسجد" کے اشو کی بنیاد پر وہ کبھی مرکز میں نہیں پہنچ سکتی۔ مرکز میں طاقت حاصل کرنے کے لئے بھارتیہ جنتا پارٹی کو کوئی ایسا اشو لینا ہوگا جو پورے ملک کی دل چسپی کا اشو ہو، جو دیش کو بنانے کا اشو ہو نہ کہ محدود طور پر مندر بنانے کا اشو۔

یہ عجیب بات ہے کہ عملی تجربہ کے بعد جو حالات سامنے آئے، اس کے بعد خود بھارتیہ جنتا پارٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ پارٹی کے بنگلور سیشن (جون ۱۹۹۳) میں انھوں نے صاف طور پر اپنی پالیسی میں تبدیلی کا اعلان کر دیا۔ پارٹی کے موجودہ صدر مسٹر لال کرشن آڈوانی نے کہا کہ اب ہمارا فوکس رام مندر بنانے پر نہیں ہوگا بلکہ بھارت کا مہا مندر بنانے پر ہوگا۔ ہمیں ملک سے بھرشٹاچار کو ختم کرنا ہے اور یہاں سماجی نشاۃ ثانیہ (social renaissance) کا دور لے آنا ہے۔

ایک صاحب نے غلطی کی تصحیح کے نظریہ پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح مسجد ڈھانے کے عمل کو اگر ایک بار آپ جائز (legitimate) مان لیں تو پھر مسئلہ مسجد تک نہیں رہے گا۔ وہ آگے تک جائے گا۔ بس اب ختم کرو، یہ کہنے کی ہمت ہمارے اندر ہونی چاہئے۔ ورنہ آئندہ بات یہاں تک پہنچے گی کہ ایک آدمی آپ کے گھر پہنچے گا اور کہے گا کہ یہ زمین تمہارے دادا نے میرے دادا سے زبردستی لے لی تھی، اب میں دوبارہ اس پر قبضہ کروں گا۔ اس کے بعد ہمارے سماج کا کیا حال ہوگا۔ اس کو سوچئے۔ اس طرح کے عمل سے ہنسا کو (legitimacy) ملتی ہے۔

ایک ہندو اسکالر نے اپنی تقریر کے دوران یہ واقعہ بتایا کہ گاندھی جی نے لکھا ہے کہ سکنڈ راونڈ ٹیبل کانفرنس (۱۹۳۱) کے موقع پر گاندھی جی کی ملاقات علامہ اقبال سے لندن میں ہوئی۔ اقبال نے اپنا تعارف کراتے ہوئے گاندھی جی سے کہا: میں کشمیری پنڈت ہوں۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ہندو اور مسلمان دونوں عام طور پر اسی طرح اپنے پن کے انداز میں بات کرتے تھے۔ مگر اب "دوقومی نظریہ" کی مصنوعی تحریک کے نتیجہ میں دونوں طرف کا مزاج بدل گیا ہے۔ اب اس طرح کی بولی بولنے میں قومی عصبیت حائل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر مہیش شرما نوجوانی کی عمر سے آر ایس ایس سے وابستہ ہیں۔ ایک روز گفتگو کے دوران میں نے کہا اس وقت قومی ایکتا لانے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ٹالرنس ہے۔

انھوں نے کہا کہ گروگولوالکر ٹالرنس کے شبد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم دوسروں کو صرف ٹالریٹ نہیں کرتے، ہم تو دوسروں کا سواگت کرتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ — میں سچا تو تم بھی سچے۔

کئی لوگوں نے یہ بات کہی کہ دھرم سے متعلق جھگڑوں میں ہم کو زیادہ توجہ نہیں دینا چاہئے۔ زیادہ توجہ کے قابل دوسرے اشو ہیں، مثلاً تعلیم، اقتصادیات، افراد کے اندر نیشنل کیرکٹر پیدا کرنا۔ وغیرہ۔ آج سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ نئی نسل کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دیش کی ترقی میں اپنا صحیح رول ادا کر سکے۔

جن ستا کے پترکار مسٹر رام بہادر رائے سب سے کم بولتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب

کبھی وہ بولتے ہیں تو لوگ بہت توجہ کے ساتھ ان کی بات سنتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ بعض لوگ زیادہ بولنے کو اہم سمجھتے ہیں۔ مگر کم بولنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ مگر کم بولنے کے لئے تحمل کی طاقت درکار ہے، اور تحمل کی طاقت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ دیش میں ہنسا (تشدد) بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم لوگ ہنسا کا وروده اہنسا سے کریں گے، یہ طے کرکے یہاں سے ہمیں اٹھنا ہے۔

ہم لوگوں کو ہر طرح کے بھید بھاؤ سے اوپر اٹھنا ہے۔ انسان سب سے بڑھ کر ہے، یہ مان کر یہاں سے جانا ہے۔ انسان پہلے ہے اور دھرم اور پالٹکس سب اس کے بعد ہے۔

مسٹر راج نرائن سنگھ (P.A.C.) اعظم گڑھ میں پولیس افسر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمانوں کو دیش کے پچھلے پر وج کو اپنا پر وج ماننا ہوگا۔ اس کے بنا کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک صحیح اور باقی سب غلط ہیں تو ایسی حالت میں ایڈجسٹمنٹ اور بھائی چارہ کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی نظر میں ہندو سب کے سب کافر ہیں تو دونوں میں برابری کا تعلق کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کو ایسے تمام عقیدوں کو (disown) کرنا ہوگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمبندھ میں یہ ایک مہت پورن مدا ہے۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ پاکستان اگر کرکٹ جیتے تو وہ یہاں لڈو بانٹتے ہیں، پھر ان کی دیش بھگتی پر کیسے نہ شبہ کیا جائے۔

ایک روز کانفرنس کے اجلاس میں ایک انتہا پسند ہندو نے بڑی گرماگرم تقریر کی۔ مسلم نقطہ نظر سے وہ کافی اشتعال انگیز تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ تقریر سنتا رہا۔ اس کے بعد وقفہ ہوا تو میں کانفرنس ہال کے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا باہر بالکل دوسرا منظر ہے۔ ہال کے باہر مقرر کی "اشتعال انگیزی" کا کوئی اثر نہ تھا۔

یہاں اب بھی درخت اسی طرح ہریالی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ آسمان کی وسعتیں بدستور اپنی جگہ قائم تھیں۔ سورج اپنی روایتی شان کے ساتھ اب بھی اپنی روشنی پھیلائے ہوئے تھا۔ چڑیوں کی آوازیں اس طرح سنائی دے رہی تھیں جیسے کہ انھیں ان باتوں کی کوئی پرواہی نہ ہو۔ دوسری طرف مقامی بازار میں دیکھا تو یہاں بھی لوگ اسی طرح لین دین میں مشغول تھے۔

وہ اس طرح اپنے اپنے کاموں میں سرگرم تھے جیسے کہ وہ ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ وہ چیز جس سے لوگ بھڑکتے ہیں وہ تو صرف کانفرنس کے کمرہ کی گونج ہے۔ وہ بس ایک وقتی آواز ہے جو کبھی کبھی اخباروں میں چھپ جاتی ہے۔ اس کے سوا بقیہ ساری انسانیت اور بقیہ تمام کائنات کے لئے وہ گویا ایک نہ ہونے والی بات (non-event) ہے۔ اس قسم کے الفاظ سے غیر متاثر رہ کر وہ اپنے فطری راستہ پر چل رہی ہے۔ جو واقعہ وسیع تر دنیا کے اعتبار سے اتنا کم اہم ہو اس پر مشتعل ہونے کی کیا ضرورت۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم لوک تنتر کی بات کرتے ہیں۔ مگر ہم اس کو زور زبردستی سے لانا چاہتے ہیں۔ یہ تو متضاد بات ہے۔ جب جب ہم کروانے اور منوانے کی بات کرتے ہیں تو ہم ہنسا کی بات کرنے لگتے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کو اس دیش میں لوک تنتر لانا ہے یا ہنساوادلانا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ جے پرکاش کے اندولن میں ہم لوگ بہت بڑی تعداد میں جڑے تھے، ہم کو آشا تھی کہ اس سے کچھ اچھا نکلے گا۔ مگر جے پرکاش یہ کہہ کر مرے کہ میری تو کوئی سنتا نہیں۔ اسی طرح گاندھی بھی آزادی کے بعد یہ کہہ کر مرے کہ اب میری نہیں چلتی۔

ایک صاحب نے کہا کہ اگر انگریز کا راج برا تھا تو بابر کا راج کیوں برا نہیں تھا۔ انگریزوں کی حکومت اگر غلامی تھی تو بابر کی حکومت کیوں غلامی نہیں تھی۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر ان الفاظ کے ساتھ شروع کی: میں تو سننے کے لئے آیا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے بولنا شروع کیا تو سب سے زیادہ لمبی تقریر انھیں نے کی۔ مزید یہ کہ سب سے زیادہ زور زور سے بھی وہی بولے۔

گاندھی جی کے پوتے راج موہن گاندھی نے کافی مایوسانہ انداز میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ بھارت کے سب لوگ بھارتیہ ہیں، یہ میں مانتا ہوں۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی سوچ یہ نہیں۔ آج ہی میں نے اخبار میں پڑھا کہ بمبئی کے کچھ نوجوانوں نے کچھ لوگوں کو پکڑا اور ان سے زبردستی "جے شری رام" کہلایا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آزادی دینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ اگر اس دیش کا مسلمان اپنے آپ کو ہندو نہیں کہتا تو کیا زبردستی اس

سے کہلوانا چاہتے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔

۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو ہوا اس سے سارے دیش میں الگاؤ وادبڑھے گا۔ اس میں شک نہیں۔ پھر دیش کہاں جائے گا۔ اگر اجودھیا پر بات نہیں رکتی تو اس کے بعد کیا ہو جائے گا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اب کیا کرنا چاہئے، اس کے لئے میرے پاس کوئی سجھاؤ نہیں ہے۔ لیکن اگر بات ایودھیا پر رک جائے تو نئی شروعات ہو سکتی ہے۔ وہ جو مانگ ہے کاشی اور متھرا کی، اسے تو چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر ہم اس کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر تو مجھ کو اندھکار ہی اندھکار دکھائی دیتا ہے۔

بندرابن ہندوؤں کا مقدس شہر ہے۔ یہاں تقریباً پانچ ہزار مندر ہیں، کئی سو کی تعداد میں آشرم ہیں۔ یہاں ہمارا قیام گیتا آشرم میں تھا۔ اس نام سے تقریباً دو درجن آشرم مختلف مقامات پر ہیں۔ ان سب کا ہیڈ کوارٹر ہردوار میں ہے۔

مقامی سنسکرت ودیالیہ کے ۲۰ طلبہ آشرم کے ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ یہ سب برہمن کے لڑکے ہیں۔ یہاں تعلیم و تربیت پانے کے بعد وہ اپنے وطن چلے جائیں گے اور وہاں پنڈت کا کام سنبھالیں گے۔ ان کی ضرورت کی تمام چیزیں یہاں مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ آشرم کی تعمیر بالکل جدید انداز میں ہوئی ہے۔ پورا فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ طلبہ کو نہایت صاف ستھرا کھانا دیا جاتا ہے۔

اس کا رسوئی گھر مجھے بہت پسند آیا۔ یہاں روزانہ تقریباً تین سو آدمی کا کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑے کمرہ میں واقع تھا۔ میں نے اندر کی طرف دیکھا تو درمیان میں ایک بڑا سا چوکور توا رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر بیک وقت پندرہ روٹیاں پکائی جا سکتی ہیں۔ توے کے نیچے گیس کا چولھا جل رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ آشرم کے پاس چالیس گیس سلنڈر کا لائسنس ہے۔

آشرم کے طلبہ صبح ۴ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ ہر لڑکا سب سے پہلے اشنان کرتا ہے۔ کپڑا بدلتا ہے۔ اس کے بعد تیار ہو کر ایک بڑے کمرہ میں سب کے سب جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں سوامی اوشیشا نند ان کو گیتا کا پاٹھ کراتے ہیں۔ آخر میں سب مل کر ایک ہندی نظم پڑھتے ہیں۔

آر ایس ایس کے ایک دانشور نے کہا کہ دیش بنانا ہے، یہی اصل مدا ہے۔ "دیش بنانا ہے" یہ کام میرے حساب سے دس بارہ سال سے نہیں ہو رہا ہے۔ کون بنا رہا ہے، کون بنائے

گا۔ مجھے کوئی نہیں ملا جو کہے کہ "میں بناؤں گا"
"راج نیتی نے دیش بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اس کام کو بگاڑا اور اتنا زیادہ بگاڑا کہ وہ مجرم ہیں۔ ان کے ساتھ جو بھی کیا جائے کم ہے۔" ہر ویکتی میں یہ بھاؤنا آنا چاہئے کہ "میں دیش بناؤں گا" انھوں نے کہا کہ رچنا تمک چھیتر میں آر ایس ایس نے ۶۰ سال تک کام کیا ہے۔ اب ہم کو دیش بنانے کے لئے راج نیتک چھیتر کو لینا ہوگا۔

اس قسم کی باتوں کو سن کر مجھے غصہ نہیں آتا۔ بلکہ میں سوچتا ہوں کہ موجودہ اتھل پتھل شاید اس لئے ہو رہی ہے کہ ہندوازم جو ابھی تک صرف نظری طور پر قابل رد تھا، وہ عملی اعتبار سے بھی قابل رد ہو جائے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو میں بندرابن سے متھرا گیا۔ اس سفر کا مقصد کرشن جنم استھان کے معاملہ کو براہ راست طور پر دیکھنا اور سمجھنا تھا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر مہیش شرما، ڈاکٹر راج کمار بھاٹیا، مسٹر رام بہادر رائے بھی تھے۔

وہاں میں نے دیکھا کہ کرشن جنم استھان کے نام سے ایک بہت بڑا کامپلکس بنا ہوا ہے اور مسجد اس سے بالکل الگ ہے۔ کرشن کا جنم استھان پوری طرح مندر کے احاطہ میں ہے۔ اور وہاں روزانہ درشن اور پوجا کا عمل جاری ہے۔ ہم لوگ جب اس خاص کمرہ کو دیکھ کر باہر آئے جس کو کرشن کا جنم استھان کہا جاتا ہے تو مسٹر رام بہادر رائے نے کہا: متھرا اور کاشی کو اجودھیا کی کٹ گری میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ کرشن کا جنم استھان تو مسجد میں شامل ہی نہیں۔

دوسرے صاحب نے کہا: یہاں جنم استھان پر قبضہ کا جھگڑا نہیں ہے۔ یہاں یہ جھگڑا ہے کہ جنم استھان کا دوار کدھر سے ہو۔ یہ لوگ مسجد کی طرف اس کا دوار کھولنا چاہتے ہیں۔

کرشن جنم استھان کی سیڑھی کے پاس ایک بڑا سا بورڈ رکھا ہوا ہے۔ اس پر ہندی میں کئی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس پر درج ہے کہ شری کرشن کا اوتار اس جگہ پر ۳۱۶۸ ق م میں ہوا تھا۔ اس مندر کو پہلی بار محمود غزنوی نے ۱۰۱۷ء میں توڑا۔ ۱۱۵۰ء میں راجہ وجے پال نے دوبارہ سے اس کو بنوایا۔ سکندر لودی نے سولھویں صدی میں اس کو پھر توڑا۔ اس کے بعد ۱۶۱۳ء میں ویر سنگھ دیو نے اس مندر کو پھر بنوایا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے ۱۶۶۹ء میں اس کو توڑا، اور مندر

کی زمین کا بڑا حصہ لے کر یہاں مسجد بنوائی۔ اب پھر یہاں زیادہ بڑے پیمانے پر مندر کا پبلکس بنوایا جارہا ہے۔

کرشن جنم استھان کے اوپر سے مسجد دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہاں پہنچنے کا کوئی اچھا راستہ نہیں۔ آدمی ایک کچے اور زنگ راستہ سے گزر کر ایک گہرے نالہ کے سامنے پہنچتا ہے۔ اس نالہ پر کوئی پل نہیں ہے۔ اس کے اندر اتر کر اس کو پار کرنا پڑتا ہے۔ ان مراحل سے گزر کر ہم لوگ مسجد کے پاس پہنچے۔

یہ ایک خوبصورت شاہی دور کی مسجد ہے، اس کے سامنے ایک اونچا گیٹ ہے جو بعد کو ۱۳۴۶ھ میں علی خاں، رئیس مسعود آباد نے بنوایا تھا۔ اس کے اوپر ایک فارسی قطعہ ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

بکرد انجمن انتظامیہ آں کار صدائے آفریں برخاست از صغار وکبار

اس مسجد کے پاس کچھ مسلمان آباد ہیں۔ ان کے تقریباً ۲۰۰ گھر ہیں۔ یہ لوگ گائے اور بھینس کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہاں ہر طرف گندگی اور بے ترتیبی کے مناظر تھے۔ پورا محلہ کوڑے خانہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کچھ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک ظہور محمد صاحب تھے۔ مسجد کے امام صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

معلوم ہوا کہ مسجد میں پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ جمعہ کے روز پوری مسجد بھر جاتی ہے۔

ظہور محمد (۷۵ سال) مسجد کے پاس رہتے ہیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح بھینس کا کام کرتے ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ ۱۹۵۴ تک یہاں سب مسلمانوں کی آبادی تھی۔ پیچھے کی جگہ خالی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ مقدمہ قائم ہوا۔ کوتوال وغیرہ نے صلح کرائی۔ مسلمان اس پر راضی ہوئے کہ خالی جگہ مندر کے لئے دیدی جائے۔

کوتوال نے کہا کہ ہندو لوگ یہاں مندر بنائیں تو آپ لوگوں کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ مسلمانوں نے کہا کہ نہیں۔ اگر وہ اپنی ذاتی کوٹھی بنائیں تو ہم کو اعتراض ہوگا۔ اگر وہ مندر بنائیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں۔ ظہور محمد صاحب نے کہا —— میں قوم سے جاٹ، مذہب سے مسلمان اور پیشہ سے گھوسی ہوں۔

ڈاکٹر سریندر شرما۔ بندرابن (۶۵ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے متھرا کے بارہ میں حسب ذیل کہانی سنائی: یہاں پہلے سے کیشو دیوجی کا مندر تھا۔ اس کو کیشو دیو کٹرا کہا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس مندر کو توڑا اور اسی کی نیو پر مسجد بنائی۔ مرہٹہ کا راج ہوا تو انھوں نے اس کو نزول بھومی ڈکلیر کر دیا۔ مگر بنوایا نہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ادھیکار آگیا تب بھی نزول بھومی رہی۔ کمپنی کے زمانہ میں نیلامی ہوئی۔ تقریباً چودہ سو روپیہ میں راجہ ٹینی مل نے سارے چھیتر کو خرید لیا۔ پھر اس کے بعد اسی چھیتر میں ریلوے لائن نکلی۔ ریلوے لائن نے معاوضہ راجہ کو دیا۔ مسلمانوں نے برٹش گورنمنٹ کے ٹائم میں دعویٰ پیش کیا کہ اس کو نہیں دیا جائے۔ لور کورٹ میں مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ میں بھی خارج ہوگیا۔ ۱۹۲۸ میں مسلمانوں کی طرف سے پھر مقدمہ دائر کیا گیا۔ ۱۹۳۲ میں فیصلہ ہوا۔ اس فیصلہ میں اس کی پوری ہسٹری شامل کی گئی۔ اب منوہر لال شرما ایڈوکیٹ نے رٹ دائر کی ہے الہ آباد ہائی کورٹ میں۔ اس میں معاہدہ کو کالعدم کرنے کو کہا گیا ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو دہلی واپس آیا۔ جب گیتا آشرم سے نکل کر ہماری گاڑی بندرابن کے بازار سے گزری تو میں نے دیکھا کہ بازار کے لوگ بدستور اپنی تجارتی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ یہاں ہندو اور مسلم سوال کو بھول کر لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کمانا اور کھانا ہے۔ تمہارے بھاشنوں سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں۔

شہر سے باہر نکلے تو دنیا اور زیادہ وسیع تھی۔ یہاں فطرت کا ماحول ایک آفاقی پیغام دے رہا تھا۔ آسمان کی وسعتیں بدستور قائم تھیں۔ درخت بدستور اپنی ہریالی دکھا رہے تھے۔ سورج اور چاند کا نظام بدستور اپنی جگہ قائم تھا۔ ہواؤں کے جھونکے بدستور اپنا سہانا پیغام دے رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ لوگ اشتعال انگیز باتوں پر بھڑکتے ہیں۔ مگر جو آواز اتنی بے قیمت ہو کہ بولنے کے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔ یا اخبار میں چھپ کر شام تک ردی کی ٹوکری میں پہنچنے والی ہو، اس پر بھڑکنے یا مشتعل ہونے کی کیا ضرورت۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۱

۱۔ بمبئی میں حلقۃ الرسالہ کے کچھ لوگ (نسیم علی خاں صاحب وغیرہ) نے ایک مفید کام شروع کیا ہے۔ یہ کام وہ اسلام پر تیچے کیندر کے نام سے کر رہے ہیں۔ یہ مثبت انداز میں اسلامی پیغام پہنچانے کا کام ہے۔ اس کام کی نوعیت اس سے سمجھ میں آتی ہے کہ بمبئی کے شیو سینا کے اخبار سامنا (۱۰ جولائی ۱۹۹۳) میں ایک مضمون چھپا۔ اس کا عنوان تھا : پہلے قرآن پڑھو پھر چلاؤ۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہندستان کے فسادات کا سبب قرآن کی کچھ آیتیں ہیں۔ اسلام پر تیچے کیندر والوں نے اس کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ البتہ سامنا کے اگلے شمارہ (۲۲ جولائی ۱۹۹۳) میں ایک اشتہار چھپوایا۔ اس میں اعلان تھا کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے قرآن کا ترجمہ اور دوسری کتابیں ہم سے مفت حاصل کریں۔ اس اشتہار کے چھپنے کے بعد تقریباً ۹۰ آدمیوں نے خط یا ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ قائم کیا اور کہا کہ ہم اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ مسز سنجولا شرما نے ۲ اگست ۱۹۹۳ کو ہندستان ٹائمس کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ریلیجن بل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہب بلاشبہہ ہر آدمی کا مقدس حق ہے۔ مگر کسی کو یہ اجازت نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ یہ انٹرویو ہندستان ٹائمس ۱۵ اگست ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔

۳۔ مسلم انٹیلیجنسیا میٹ کی طرف سے ۸ اگست ۱۹۹۳ کو جے این یو سٹی سنٹر (نئی دہلی) میں ایک کنونشن ہوا۔ اس میں علماء اور مسلم دانشور بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کنونشن کا موضوع تین طلاق کا مسئلہ تھا۔ اس موضوع پر وہاں صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا (۹ اگست) اور دہلی کے دوسرے اخبارات میں شائع ہوئی۔

۴۔ آئی وٹنس ([illegible]) کی نمائندہ مسز نشتھا جین نے ۹ اگست ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع "اسلام میں عورت کا مقام" تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام میں عورت اور مرد کا ورک پلیس بنیادی طور پر الگ الگ رکھا گیا ہے۔ اور یہی اصول حیاتیاتی حقائق کے مطابق ہے۔

پیرس (فرانس) کی ایک خاتون مریم غالمی [illegible] جدید اسلامی تحریکوں پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ انھوں نے ۱۲ اگست ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا اس سلسلہ میں تفصیلی انٹرویو لیا۔ تحریکی مسائل کے مختلف پہلو زیر بحث آئے۔ یہ ریسرچ وہ پیرس یونی ورسٹی کے شعبۂ سماجیات کے تحت کر رہی ہیں۔

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے ہال میں ۱۵ اگست ۱۹۹۳ کو یوم آزادی کی تقریب سے ایک جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور وہاں ایک مفصل تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا ـــــ انڈیا کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ۔

- ریاض کی جامعۃ الامام کے چھ عرب اساتذہ کا وفد دکتور عبد العزیز بن عبد اللہ العمار کی قیادت میں ۱۵ اگست ۱۹۹۳ کو مرکز میں آیا اور صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ گفتگو کا موضوع مرکز کی سرگرمیوں سے لے کر ملت اسلامیہ کے مسائل تک محیط تھا۔

- آئی ڈنس [illegible] کی ویڈیو ٹیم ۱۸ اگست ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ویڈیو پر ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام سے تھا۔ اسلام میں بندہ اور خدا کا تعلق، اسلام میں علماء کا مقام، اسلام میں شوہر اور بیوی کے حقوق، اسلام میں جدید تقاضوں کا حکم، وغیرہ امور پر سوال و جواب کی صورت میں وضاحت کی گئی۔

- آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی دو تقریر نشر کی گئی۔ ایک ۲ ستمبر ۱۹۹۳ کو اور دوسری ۹ ستمبر ۱۹۹۳ کو۔ دونوں کا موضوع اخلاقی تعلیمات تھا۔ دونوں میں یہ بتایا گیا کہ بہتر سماج بنانے کے لیے افراد کے اندر کون سے اخلاقی اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

- ہندی روزنامہ ہندستان (دہلی) کے نمائندہ مسٹر موہن سنگھ نے ۲۱ اگست ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس میں ہندستانی مسلمانوں کے مختلف مسائل زیر بحث آئے۔

- ہفت روزہ نئی دنیا (دہلی) کے نمائندہ نے ۲۴ اگست ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع سیرت رسولؐ تھا۔ یہ انٹرویو اخبار کے سیرت نمبر کے لیے تھا۔

۱۲- ریڈیو آسٹریلیا کے نمائندہ مقیم دہلی نے ۲۴ اگست ۱۹۹۲ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا مختصر انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق تطلیقات ثلاثہ کے مسئلہ سے تھا۔ انھیں اس سلسلہ میں دونوں نقطۂ نظر بتادیے گئے۔

۱۳- ۲۴ اگست ۱۹۹۲ کی شام کو نئی دہلی کے تال کٹورہ اسٹیڈیم میں ایک کانفرنس تھی۔ دہلی اور دہلی کے باہر کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس کا نظم بھارتیہ جنتا پارٹی نے کیا تھا۔ ان کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور قرآنی آیت الصلح خیر کی روشنی میں ایک تقریر کی۔

۱۴- رابطۂ عالم اسلامی اور سعودی عرب کی وزارت اوقاف کے زیر اہتمام کولمبو میں ایشیائی مسلمانوں کے مسائل پر ایک کانفرنس ۲۶ - ۲۸ اگست ۱۹۹۲ کو ہوئی۔ اس کے دعوت نامہ پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں ایک عربی مقالہ پڑھا اور مباحثہ میں شرکت کی۔ اس کی تفصیلی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کی جائے گی۔

۱۵- انگریزی ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے کے اسپشل کرسپانڈنٹ مسٹر فرزند احمد نے ۸ ستمبر ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کا ملی منصوبہ یا ان کی سیاسی پالیسی کیا ہونا چاہیے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی پالیسی مخالفتِ غیر پر مبنی ہونے کے بجائے تعمیرِ خویش پر مبنی ہونا چاہیے۔

۱۶- نیویارک میں کچھ لوگوں نے "مکتبہ الرسالہ" کی شاخ قائم کی ہے۔ وہ الرسالہ کی انگریزی مطبوعات کو دوبارہ چھاپ کر پھیلا رہے ہیں۔ حال میں انھوں نے دی ٹیچنگز آف اسلام (دینی تعلیم کا انگریزی ترجمہ) اور دوسری کئی انگریزی کتابیں فوٹو کاپی کے ذریعہ خوب صورت انداز میں چھپوائی ہیں اور ان کو امریکہ میں پھیلا رہے ہیں۔ اسی قسم کا کام کچھ عرب نوجوان یورپ میں بھی کر رہے ہیں۔

۱۷- ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام "عظمتِ اسلام" ہے۔ وہ تقریباً ۵۰۰ صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے مختلف پُرعظمت پہلو بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق نظریہ سے بھی ہے اور تاریخ سے بھی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے قع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔
- کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۳ ، شمارہ ۲۰۵

اھم اعلان

بمبئی میں علما کنونشن جو ماہ نومبر میں طے تھا۔ بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے مزید کچھ عرصہ کے لیے موخر کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری اطلاع آئندہ اشاعتوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

قرآن میں مختلف انداز سے جنّت کی راحتوں سے بھری ہوئی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یک مقام پر جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے : نعم الثواب وحسنت مُرتفقا (وہ کیسا اچھا انعام ہے اور کیسی اچھی رہنے کی جگہ) الکہف ۳۱

ہر آدمی خوشی اور آرام کی زندگی چاہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف خوشی اور آرام کے سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری طاقت ان چیزوں کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ مگر جب وہ ان چیزوں کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اب وہ جانتا ہے کہ راحت کے ہر قسم کے سامان کے باوجود وہ راحت کی زندگی سے محروم ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو سامانِ راحت کو تلاش کرنے کی خوشی تو ملتی ہے مگر سامانِ راحت سے متمتع ہونے کی خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں راحت کا صرف تعارف ہے، راحت سے تمتع (enjoyment) موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن نہیں۔ راحت سے متمتع ہونے کے لیے ایک کامل دنیا درکار ہے۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہاں راحت سے متمتع ہو سکے۔

آدمی کے اس مطلوب کو پانے کا مقام صرف آخرت ہے۔ آخرت ایک کامل دنیا ہوگی۔ وہاں راحت کے تمام سامان اپنی آخری معیاری صورت میں فراہم کیے جائیں گے۔ یہ دنیا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔ اسی کے ساتھ خود انسان کی وہ تمام محدودیتیں (limitations) ختم کر دی جائیں گی جو سامان راحت سے حقیقی تمتع میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ان انتظامات کے بعد پہلی بار انسان کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی کو بھرپور طور پر پا سکے۔

آخرت کے لیے عمل کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اہمیت دے۔ جو دکھائی دینے والی چیزوں سے گزر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں جی لگائے۔ جو آج کے فائدے کے مقابلہ میں کل کے فائدہ کو ترجیح دے۔ جو اپنی ذات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

انسان جاگ اٹھا

۲۴ جنوری ۱۹۹۳ کو میں جبل پور میں تھا۔ یہاں ناگپور کے جناب عبد السلام اکبانی (پیدائش ۱۹۴۷) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

عبد السلام اکبانی صاحب (Tel. 0712-41241) نے ۱۹۹۰ میں ناگپور کے ایک ہندو پربھاکر ہزارے سے ۶ لاکھ روپے میں ایک زمین کی خریداری کا معاملہ کیا۔ طے ہوا کہ عبد السلام صاحب بطور ایڈوانس ۲ لاکھ روپے مالک کو دے دیں گے۔ چھ ماہ بعد رجسٹری ہوگی اور اسی وقت بقیہ رقم ادا کر دی جائے گی۔ دو مہینے کے بعد مالکِ زمین نے کچھ وجہ بتا کر دو لاکھ روپے اور وصول کر لیا۔ اب مالکِ زمین کے ہاتھ میں چار لاکھ روپے آگیا۔ اس درمیان میں زمین کی قیمت بڑھ گئی۔ اس کے بعد مالک زمین کا ارادہ بدل گیا۔

چھ مہینے کے بعد عبد السلام صاحب نے مالک زمین سے کہا کہ اب مقرر وقت پورا ہو گیا ہے اب زمین کی رجسٹری کرا دو۔ مگر وہ حیلے والی باتیں کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہمارا ارادہ رجسٹری کرنے کا نہیں ہے۔ اس طرح وہ برابر رجسٹری کے معاملہ کو ٹالتا رہا۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ عبد السلام صاحب کا چار لاکھ روپے تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ عدالت میں میرے خلاف کیس کریں گے۔ میں مقدمات کا ماہر ہوں۔ ان کو عدالت میں دوڑاتا رہوں گا۔ آخر کار وہ مجبور ہو کر میری شرطوں پر صلح کر لیں گے۔

ایک روز عبد السلام صاحب مسٹر ہزارے کے یہاں پہنچے۔ اس وقت وہاں ان کے سسر مسٹر ساورکر بھی موجود تھے۔ ان کا آر ایس ایس سے گہرا تعلق تھا۔ مسٹر ساورکر نے کچھ دل خراش باتیں کہیں۔ آخر میں یہ کہا کہ آپ کیا کر سکتے ہو۔ آپ یہی کروگے کہ ہمارے خلاف کورٹ میں جاؤ گے۔ اور اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ کی چپلیں گھسوا دیں گے۔

عبد السلام صاحب نے کہا کہ آپ میری چپلیں جب گھسواؤ گے جب کہ میں کورٹ میں جاؤں۔ مگر میں کورٹ میں جاؤں گا ہی نہیں۔ پھر آپ کیسے میری چپلیں گھسواؤ گے۔ مسٹر ساورکر نے کہا کہ پھر آپ کیا کریں گے۔ عبد السلام صاحب نے کہا کہ میں خود آپ کو ثالث بناؤں گا۔ ایک

آپ کا داماد ہے۔ دوسری طرف آپ کا یہ بھتیجا ہے۔ اب آپ کو جو ٹھیک لگے اس
ملہ کر دو۔

مسٹر ساورکر کی بیوی اندر بیٹھی ہوئی اس گفتگو کو سن رہی تھی۔ اس نے اشارہ سے مسٹر
کر کو بلایا۔ اندر کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد مسٹر ساورکر باہر آئے تو وہ بدلے ہوئے تھے۔
یں مسٹر ساورکر کی بیوی اندر سے چائے لے کر آگئی۔ مسٹر ساورکر چپ چاپ چائے پیتے
۔ اس کے بعد کہا کہ اچھا آپ کل آجائیے۔ ہم کل ہی آپ کا فیصلہ کرا دیتے ہیں۔ اگلے
عبد السلام صاحب وہاں گئے تو مسٹر ساورکر خود اپنی گاڑی پر لے کر انھیں رجسٹرار آفس
۔ وہ اثر رسوخ والے آدمی تھے۔ چنانچہ انھوں نے کوشش کر کے اسی دن زمین کی
ی کرا دی۔ عبد السلام صاحب نے صرف طے شدہ رقم ادا کی۔

اس کے بعد مسٹر ساورکر کا یہ حال ہوا کہ جب بھی وہ سڑک پر ملتے تو گاڑی روک کر
لسلام صاحب کو حسب قاعدہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے اور خیریت پوچھتے۔ ایک
عبد السلام صاحب اپنے کسی کام سے ہاؤسنگ فائننس بورڈ کے دفتر میں گئے۔ اتفاق سے
مسٹر ساورکر بھی موجود تھے۔ مسٹر ساورکر نے جب عبد السلام صاحب کو دیکھا تو بورڈ کے
کٹر سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا: میں نے مسلمان تو بہت دیکھے مگر بڈھے
کا جوان باپ ایک ہی بار دیکھا۔ اور وہ یہ عبد السلام ہے۔ اس نے میرے کو بہت بڑا
سکھایا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ آدمی اگر کسی سے مقدمہ نہ لڑے تو کورٹ میں اس کی
بھی گھسنے والی نہیں ہیں۔

مسٹر ساورکر اگرچہ آر ایس ایس سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک
ن تھے۔ عبد السلام صاحب نے ان سے جب یہ کہا کہ میں آپ کا بھتیجا ہوں اور یہ آپ کا
ہے۔ آپ خود ہی ثالث بن کر دونوں کے درمیان فیصلہ کر دو، تو انھوں نے اپنے اس
نے مسٹر ساورکر کے "انسان" کو جگا دیا۔ اور جب کسی کے اندر کا انسان جاگ اٹھے
وہ ہمیشہ انصاف ہی کا فیصلہ کرتا ہے۔ کسی کا انسان ظلم اور بے انصافی کا فیصلہ
نے پر قادر نہیں۔

ایک تشریح

مشہور حدیث کے مطابق ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے ۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کو برا کہے ۔ اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو دل میں اس کو برا سمجھے ، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے ۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی پر صبر کرنا رخصت کی بات ہے ، وہ مومن کے لیے عزیمت یا اعلیٰ درجہ کی پسندیدہ بات نہیں ۔

دوسری طرف قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر فرمایا گیا ہے کہ صبر کرو ، کیوں کہ صبر کرنا عزیمت کی بات ہے ۔ وہ اولو العزم پیغمبروں کا طریقہ ہے (الاحقاف ۳۵) یہ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں ۔ پھر ان کے درمیان تطبیق کیا ہے ۔

اصل یہ ہے کہ دونوں حکم الگ الگ موقع کے لیے ہیں ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو حدیث ہے ، اس کا تعلق مسلم سوسائٹی سے ہے ۔ اور صبر کی مذکورہ آیتوں کا تعلق غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ سے ۔ دونوں حکموں کا محل ایک دوسرے سے جدا ہے ۔

مسلم معاشرہ کی داخلی اصلاح کے لیے یہ مطلوب ہے کہ ہر مسلمان کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ موجود ہو ۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر زیادتی کرے تو پورا معاشرہ اس کا سخت نوٹس لے ۔ لوگ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دوڑیں ۔ زبان سے اس کی مذمت کریں ۔ اور بالفرض کوئی مسلمان ایسا کرنے کی حالت میں نہ ہو تو اس قسم کا واقعہ دیکھ کر اس کے دل میں سخت کراہت پیدا ہونی چاہیے ۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو ایسے آدمی کا ایمان ہی مشتبہ ہو جائے گا ۔

مگر جہاں تک دعوت کے عمومی کام کا تعلق ہے ، اس میں عزیمت یہی ہے کہ صبر کیا جائے ۔ یہاں مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا لازمی طور پر ضروری ہے ۔ اگر مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کیا جائے تو داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا ہی نہیں بنے گی جو دعوتی عمل کی صحیح انجام دہی کے لیے ضروری ہے ۔

قرآنی ہدایت

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں ان کو تم برا نہ و۔ ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر بے علمی کی بنا پر اللہ کو برا کہنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر ہ وہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوش نما بنا دیا ہے (الانعام ۱۰۹)

لوگوں نے اللہ کے سوا جو معبود بنائے ہیں، ایک توحید پرست اگر ان میں سے کسی معبود کو ا کہے تو اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بری چیز کو برا کہہ رہا ہوگا۔ لیکن دوسرے لوگ چونکہ اس کو عبود برحق فرض کیے ہوئے ہیں اس لیے وہ بھڑک اٹھیں گے اور جھوٹے معبود کی حمایت میں سچے معبود کو برا کہنا شروع کر دیں گے۔

اس سے اجتماعی معاملات میں اسلام کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی ں مومن کو ایسا نہیں کرنا ہے کہ ایک عمل اگر قانونی اعتبار سے درست ہے تو اس کو وہ فوراً رگزرے۔ بلکہ اس کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ دوسروں کی طرف سے اس کا کیا ردعمل سامنے آئے گا۔ گر دوسروں کی طرف سے برا ردعمل سامنے آنے والا ہو تو مومن پر لازم ہے کہ ایسے عمل سے مکمل پرہیز کرے۔

اس قرآنی حکم کی روشنی میں دیکھا جائے تو انڈیا کے مسلمانوں نے بار بار اس کے خلاف کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں نے مسلم یونی ورسٹی کے مسئلہ پر احتجاجی تحریک چلائی۔ پنے نزدیک وہ اپنے ایک دستوری حق کے لیے لڑ رہے تھے۔ مگر انتہا پسند ہندوؤں نے پنے ذہن کے مطابق اس کو یہ حیثیت دی کہ مسلمان دوبارہ یہاں ایک منی پاکستان بنانا چاہتا ہے۔ مسلمانوں نے شاہ بانو کے معاملہ میں احتجاجی تحریک چلائی۔ وہ سادہ طور پر سمجھتے تھے کہ وہ مداخلت فی الدین کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں مگر ہندو انتہا پسندوں نے اپنے ذہن کے طابق، اس کا یہ مطلب سمجھا کہ مسلمان اس ملک میں ایک ایسے امتیازی گروہ کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں جن کو یہ حق ہو کہ وہ جب چاہیں عدالتی حکم کو ماننے سے انکار کر دیں۔

اسلامی عمل وہ ہے جس کا نقشہ نتیجہ کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو۔

احیاءِ ملّت

احیاءِ امت کا کام اصلاً احیاءِ افراد کا کام ہے۔ یہ کام اسٹیج کی تقریروں اور جلسہ جلوس کے ہنگاموں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کو جماعتی اور تنظیمی ڈھانچہ بنا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لیے خاموش قسم کی فکری مہم درکار ہے جس کو موثر ترین سطح پر اٹھایا جائے اور اس کو ہر طرف سے یکسو ہو کر مسلسل چلایا جاتا رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اندر مطلوبہ ذہنی انقلاب آجائے۔ امت میں نئی سوچ اور نیا مزاج رکھنے والے افراد پیدا ہو جائیں۔

یہ افراد وہ ہیں جو اسلام کو از سرِ نو دریافت کریں۔ جن کی معرفت اتنی بڑھے کہ براہ راست خدا سے ان کا اتصال قائم ہو جائے۔ صبح و شام ان کو رزقِ رب ملنے لگے۔ پوری دنیا ان کے لیے ایمانی غذا کا دسترخوان بن جائے۔ آخرت کا استحضار ان کے اوپر اتنا طاری ہو گویا کہ وہ جنت اور جہنم کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ان کی زندگی عملِ صالح کا نمونہ بن جائے۔ وہ اس احساس کے ساتھ بولیں کہ ان کے الفاظ انسانوں تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کریں یہ سوچ کر کریں کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے مالکِ کائنات کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان کا ایک شخص جب دوسرے شخص کے ساتھ معاملہ کرے تو اس کو نظر آرہا ہو کہ ان کے ساتھ ایک تیسرا بھی شریک ہے اور وہ اللہ ہے۔

ایمان کے اثر سے ان کا شعور اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ وہ دلیل اور مغالطہ کے درمیان تمیز کرنے لگیں۔ وہ شعوری طور پر جان لیں کہ کب دو چیزوں میں ظاہری مشابہت کے باوجود فرق ہوتا ہے اور کب دو چیزوں میں ظاہری فرق کے باوجود مشابہت۔ وہ عسر کے حالات میں یسر کے سرے کو پالیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ مومن بننے کے بعد ان کی حیثیت داعی کی ہو چکی ہے اور بقیہ لوگوں کی حیثیت مدعو کی۔ اور جہاں دو گروہوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت قائم ہو جائے وہاں سارا معاملہ یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مدعو کے اوپر داعی کا کوئی حق نہیں، اس کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں جن کو اسے آخری حد تک ادا کرنا ہے اور ان کو ادا کرتے ہوئے اسے اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۹۳ ۹

دعوہ کلچر

اسلامی کلچر حقیقۃً دعوہ کلچر ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کو گن کلچر کے ہم معنی بنادیا ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا جرم ہے جو موجودہ زمانہ کے کچھ نام نہاد انقلابی مفکرین کی رہنمائی میں مسلمانوں کا ایک طبقہ انجام دے رہا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ مسلمان اقوام عالم کے اوپر رحمت کی بارش برسائیں۔ مگر وہ اقوام عالم کے اوپر آگ کی بارش برسانے والے بنے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا عمل خواہ کتنا ہی زیادہ اسلام کے نام پر کیا جائے وہ بلاشبہ باطل ہے، وہ خدا کے منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔

یہ دنیا کیا ہے۔ دنیا جنتی انسانوں کی انتخاب گاہ ہے۔ قیامت سے پہلے کے مرحلہ میں جنتی انسانوں کا انتخاب کیا جارہا ہے، قیامت کے بعد کے مرحلہ میں جنتی انسانوں کو جنت کی ابدی آرامگاہوں میں بسایا جائے گا۔ یہ حقیقت قرآن میں آخری حد تک واضح ہے، بشرطیکہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ قرآن پر غور کرے۔

قرآن بتاتا ہے کہ زمین وآسمان اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ اولوالالباب اس کو دیکھ کر آیاتِ خداوندی کا ادراک کرسکیں (آل عمران ۹۱ - ۱۹۰) انسان کو اس لیے تخلیق کیا گیا ہے تاکہ امتحانی حالات میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون ہے جو جنت کی نفیس فضاؤں میں بسائے جانے کے لائق ہے (الملک ۲) اللہ کے پیغمبر اس لیے بھیجے گئے تاکہ وہ انسانوں کو ہدایت کا وہ راستہ بتائیں جو انھیں جنت میں لے جانے والا ہے (ابراہیم ۱)

زمین وآسمان کی کائنات اس لیے پھیلائی گئی ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر خدا کی بے پناہ کبریائی کو محسوس کرے، وہ خدا کے عظمت وجلال کے احساس سے کانپ اٹھے۔ دنیا میں رنگ اور خوشبو اور راحت اور معنویت کا سیلاب اس لیے بہایا گیا ہے کہ آدمی ان کے اندر خدا کی عنایتوں کو دیکھے، وہ ہمہ تن خدا کی رحمتوں کا طلب گار بن جائے۔ حق کے داعی اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں تاکہ ان کا اعتراف کر کے آدمی صاحب معرفت ہونے کا ثبوت دے، وہ حق کی حمایت کر کے خدا کے خصوصی بندوں میں شامل ہوجائے۔ اس مزاج کے تحت جو کلچر بنتا ہے وہ دعوہ کلچر ہوتا ہے نہ کہ گن کلچر۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۹۳

بولنا، چپ رہنا

ایک بار ایک سینیر صحافی نے پبلک سکٹر کمپنیوں کے تعلقات عامہ کے افسروں سے پریس کے رول کے موضوع پر خطاب کیا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ بیرونی اخبارات میں ہندستان کے بارہ میں بہت کم خبریں شائع ہوتی ہیں۔ البتہ ہندستان کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جن سے اس کی بدنامی ہوتی ہے، بہت اچھالا جاتا ہے۔

صحافی نے کہا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس دنیا میں صرف طاقت ور لوگوں کو عزت اور نیک نامی ملتی ہے، ان لوگوں کو نہیں جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر پانچ جاپانیوں کا کوئی وفد کہیں جاتا ہے تو ملاقات کے وقت صرف ایک آدمی بولتا ہے۔ اور باقی افراد سر ہلا ہلا کر اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر پانچ ہندستانی افراد کہیں جاتے ہیں تو وفد کا سربراہ جب بولنا شروع کرتا ہے تو باقی چار افراد اس کو بیچ بیچ میں ٹوکتے ہیں، وہ اس کی تردید کرتے رہتے ہیں (چندر کانت سردانا، جنرل منیجر بی ایچ ای ایل، مستقبل، نئی دہلی)

بولنا بلاشبہہ ایک ضروری کام ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کو چپ ہونا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی ایک شخص کو موقع ملتا ہے کہ وہ بولے۔ جنھیں چپ رہنا ہے، اگر وہ چپ نہ ہوں تو جس کو بولنا ہے وہ بھی بولنے کا کام نہ کر سکے گا۔

کیا وجہ ہے کہ لوگ زیادہ بولتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ سوچے بغیر بولنا چاہتے ہیں۔ سوچنا ایک محنت ہے، آدمی محنت کرنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ ایسا کرتا ہے کہ جو خیال دماغ میں آیا، فوراً اس کو زبان سے اگل دیا۔ آدمی اگر بولنے سے پہلے سوچے تو وہ بیش تر حالات میں بولنے سے رک جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بولنے سے زیادہ بڑا کام سننا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ لوگوں کا کلام سنے۔ اس پر غور کرے۔ اس کو اچھی طرح ہضم کرے۔ اس کے بعد جب ضرورت ہو تو بولے۔ بولنے والے کے لیے بھی بولنا اس وقت درست ہے جب کہ سننے والے لوگ سننے کے لیے تیار ہوں۔

۱۱ الرسالہ دسمبر ۱۹۹۳

بولنے والے کو چاہیے کہ اپنی بات کا مخاطب سب سے پہلے خود اپنے آپ کو بنائے۔ وہ اچھی طرح جانچے کہ جو بات وہ کہنے جارہا ہے کیا واقعی وہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ اگر وہ کہنے کے قابل بات ہو تو کہے ورنہ چپ رہے۔

بولنے والے کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کا بولنا کسی کی بات میں خلل ڈالنے کا سبب تو نہیں بن رہا ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے ذہن میں کوئی خیال رینگ گیا تو وہ فوراً ہی اس کو اگلنا شروع کر دیں گے۔ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان کا خیال لیا اظہار کے قابل ہے یا نہیں۔

اظہار کے قابل بات کا بھی ہر حال میں اظہار کرنا ضروری نہیں۔ اگر ایک شخص بول رہا ہے اور آپ کا اظہار خیال اس کی بات میں صرف خلل ڈالنے کے ہم معنی بننے والا ہے تو ایسی حالت میں فرض کے درجہ میں ضروری ہو جاتا ہے کہ آدمی چپ رہے۔ ایسے موقع پر چپ رہنا ایک خدمت ہے اور بولنا محض خلل اندازی۔

درست اور مفید بولنا یہ ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے چپ ہونے کی صلاحیت کا ثبوت دے۔ وہ دوسروں کو سنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنی بات کا مخاطب بنائے۔

بولنے سے پہلے چپ ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پہلے اپنی بات پر غور کرے۔ وہ اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا جائزہ لے۔ وہ اس سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرے۔ اپنی بات پر یقین کر لینے سے پہلے وہ اپنی بات کی تحقیق کرے۔ وہ دوسروں کی سوچ اور اپنی سوچ میں تقابل کرے اور دیکھے کہ کیا واقعی اس کے پاس ایسے طاقت ور دلائل ہیں جو دوسروں کو مطمئن کر سکیں۔

بولنا برائے بولنا اس دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ بولنا وہی بولنا ہے جس سے کوئی واقعی مقصد پورا ہوتا ہو۔ اور ایسا بولنا کسی شخص کے لیے صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ ۱۰ منٹ بولنے کے لیے اس نے اس سے پہلے دس گھنٹے اس پر غور کیا ہو۔

قول سدید

يا ايها الـذين آمنوا اتقوا الله وقولوا قَوْلاً سَدِيْدا۔ يُصْلِح لكمْ اَعْمالكم وَيَغْفِرلكمْ ذُنُوبكمْ ومَن يطع الله و رَسُولَہ فقَدْ فازَ فوزاً عظيما (۳۳/۷۰ - ۷۱)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست با(ت) کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کو درست کردے گا ا(ور) تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص ا(للہ) اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس ۔ بڑی کامیابی حاصل کی ۔

قرآن کی اس آیت میں اہل ایمان کو قول سدید کا حکم دیا گیا ہے ۔ قول سدید کا مطلب ۔ درست بات، ٹھیک بات ۔ دوسرے لفظوں میں مطابق واقعہ بات ۔ یعنی کوئی معاملہ جیسا ہے ٹھیک ویسا ہی اس کو بیان کرنا۔ بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے قول سدید کا اہتمام کیا تو تمہارے اعمال درست ہو جائیں اور تم اللہ کی مدد سے کامیاب رہو گے ۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام معاملات بگڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب ہے کہ ان کے یہاں قول سدید کا اہتمام باقی نہیں رہا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان ایسے ر(ہنما) اٹھے جو یا تو شاعر تھے یا خطیب یا انشا پرداز، اور شاعر اور خطیب اور انشا پرداز کی خصوصیت ہ(وتی) ہے کہ وہ غیر سدید انداز میں کلام کرتا ہے ۔

مثال کے طور پر اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کو مسلمانوں کے درمیان "مفکر اسلام" کا درجہ حاصل موجودہ مسلمانوں پر غالباً سب سے زیادہ اثر اقبال کا ہوا ہے۔ اقبال بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اس۔ ان کا بیشتر کلام قول غیر سدید کا نمونہ ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے ذہن کو، قرآن کے الفاظ میں غیر اصلاح یافتہ ذہن بنا دیا ہے۔ اور قرآن کے مطابق غیر اصلاح یافتہ ذہن کے لیے اس دنیا کامیابی نہیں ۔

مثال کے طور پر اقبال کا ایک شعر ہے جو مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ مقبول ہوا ہے۔ اس میں وہ موجودہ مسلمانوں کے بارہ میں کہتے ہیں :

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

یہ شعر سراسر سداد قول کے خلاف ہے۔ اس میں درست گفتاری کی صفت نہیں پائی جاتی۔ اور جس قول میں درست گفتاری کی صفت نہ ہو اس سے درست عمل کا ظہور کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم کے لیے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ مگر وہ نبوت کا معاملہ تھا۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایمان کا معاملہ نہ تھا۔ پیغمبر کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ مدعو کے مقابلہ میں اس کی کامل حفاظت کی جائے تاکہ وہ ان کے اوپر اتمام حجت کی حد تک دعوت کا کام کر سکے۔ حضرت ابراہیم کے لیے آگ کا معاملہ اس سنت الٰہی سے تعلق رکھتا تھا۔ جب مخالفین نے آپ کو آگ میں پھینک دیا اور آگ آپ کے اوپر ٹھنڈی ہو گئی تو اس کا ٹھنڈا ہونا مذکورہ شعر کے مطابق "ایمان" کے زور پر نہ تھا بلکہ خدا کے مخصوص حکم کی بنا پر تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔

جس چیز کا تعلق خدا کے خصوصی حکم سے تھا اس کا تعلق اس شعر میں ایمان سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ساری بات بدل گئی۔ اس معاملہ کا صحیح تصور آدمی کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جب کہ مذکورہ شاعرانہ تصور آدمی کے اندر جھوٹا بھرم پیدا کر کے اس کو بے معنی ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔

اقبال نے حضرت ابراہیم کے معاملہ کو ایمان کا معاملہ بتا کر مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ ایمان کو لے کر اگر تم آگ میں کود پڑو تو آگ تمہارے لیے گلزار ہو جائے گی۔ بھڑکتے ہوئے شعلے تمہارے ایمان کے زور پر ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔

اس غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان آج بار بار "آگ" میں کود رہے ہیں۔ مزید یہ کہ جب آگ انھیں جلاتی ہے تو اپنے غلط ذہن کی بنا پر وہ دوبارہ اس کو دشمنوں کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کو انھیں اپنی اور اپنے رہنماؤں کی نادانی کے خانہ میں ڈالنا چاہیے۔ ایسے ہر تجربہ کو انھیں فریاد کا مسئلہ بنانے کے بجائے نصیحت کا مسئلہ بنانا چاہیے۔ فریاد سے جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور نصیحت سے اصلاح۔

محرّر ہے وحید الدین

بے اصل

یہود اپنے بارہ میں یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ جنت ان کے لیے لکھ دی گئی ہے۔ وہ تمام قوموں میں سب سے افضل ہیں۔ ان کا یہ حق ہے کہ وہ دوسروں کے اوپر حکومت کریں۔ یہ احساس ایک قسم کا مصنوعی غلاف بن کر ان کے ذہن پر چھا گیا۔ ان کی یہ فطری صلاحیت آخری حد تک بجھ گئی کہ وہ کسی حق کو بے لاگ طور پر دیکھیں اور کھلے ذہن کے تحت اس کا اعتراف کریں۔

یہی حال یہود کے بعد دوسری قوموں کا بھی ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بعد کی قوم دوبارہ گراوٹ میں مبتلا ہو۔ اور اسی طرح فخر کی نفسیات کی شکار ہو جائے۔ وہ اپنے کو تمام قوموں سے برتر سمجھنے لگے۔ اس کا خیال یہ ہو جائے کہ اس کے لیے جنت میں داخلہ یقینی ہے۔ وہ اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ وہ تمام دنیا کے لوگوں پر حکمراں بنے۔

اس قسم کے احساسات انتہائی بے اصل ہیں۔ وہ انسانی فطرت سے آخری حد تک غیر مطابق ہیں۔ جو گروہ اس قسم کے احساسات میں جینے لگے اس کے دل و دماغ پر ایک مصنوعی پردہ پڑ جائے گا۔ اس کی فطری صلاحیتیں مرجھا جائیں گی۔ سنجیدگی اور اعتراف اور انصاف پسندی جیسے انسانی اوصاف اس سے چھن جائیں گے۔

فطرت تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کی پہلی بنیاد ہے۔ فطرت کی زمین ہی پر ایمان کی اگلی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ فطرت کا زندہ ہونا استعداد کا زندہ ہونا ہے۔ اور جن لوگوں کے اندر استعداد زندہ ہو وہی حقائق ایمانی کا اعتراف کریں گے، وہی اپنے آپ پر عمل کر کے حیاتِ ربانی کی تعمیر کریں گے۔

اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ مصنوعی خیالات ان کی فطرت پر چھا جائیں، وہ صحت فکر اور اعتراف حق سے محروم ہو جائیں گے۔ اور جو لوگ صحت فکر اور اعتراف حق سے محروم ہو جائیں ان کو امتحان کی اس دنیا میں کبھی سچائی کا راستہ ملنے والا نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ بھٹکتے رہیں، یہاں تک کہ ابدی بربادی کے گڑھے میں جا گریں۔

دو قسم کے انسان

ایک ہے دلیل سے چپ ہونا، دوسرا ہے طاقت سے چپ ہونا۔ موجودہ دنیا دلیل سے چپ ہونے کا امتحان ہے۔ آخرت وہ دنیا ہے جہاں طاقت کا ظہور آدمی کو چپ کر دے گا۔ مگر دونوں یکساں نہیں۔ دلیل سے چپ ہونے والے آدمی کا نام حق کا اعتراف کرنے والوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ اور جو لوگ طاقت کے ذریعہ چپ ہوں، ان کا چپ ہونا صرف یہ ثابت کرے گا کہ وہ مجرم تھے۔ وہ دلیل کے آگے نہیں جھکے۔ وہ صرف اس وقت جھکے جب کہ وہ جھکنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔

وہب بن منبہ تقدیر کے قائل تھے۔ کسی مخالف نے جھوٹا قصہ بنا کر ان کے بارہ میں مشہور کر دیا کہ وہ تو کہتے ہیں کہ قوم لوط اپنے اعمال بد کی جواب دہ نہیں، کیوں کہ یہ تو خود خدا تھا جس نے قوم لوط کے افراد کو ایک دوسرے کے اوپر سوار کیا۔ طاؤس کو یہ خبر پہنچی تو وہ وہب بن منبہ سے ملے اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ وہب بن منبہ نے اس کو سن کر کہا: اعوذ باللہ۔ اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور بات ختم ہو گئی (اسلامی زندگی ۸۸)

راقم الحروف کی ملاقات ۱۹۶۶ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی۔ ان کا نام ڈاکٹر سمیع اللہ خاں تھا۔ وہ ملحد تھے مگر نہایت سنجیدہ مزاج آدمی تھے۔ مذہب پر گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائٹیرین (criterion) ، کیا ہے۔ میں نے جواب میں کہا: وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔ اس کے بعد نہ انھوں نے کچھ کہا اور نہ میں نے۔ بس انھیں دو جملوں پر بات ختم ہو گئی۔

مذکورہ واقعات میں طاؤس دلیل نقلی کے زور پر چپ ہوئے تھے اور ڈاکٹر سمیع اللہ خاں دلیل عقلی کے زور پر چپ ہو گئے۔ اسی کا نام اعتراف ہے، اور اعتراف بلاشبہ موجودہ امتحان کی دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

جو لوگ نہ نقلی دلیل پر چپ ہوں اور نہ عقلی دلیل پر، وہ حیوان کی مانند ہیں۔ وہ اس نعمت سے ہمیشہ محروم رہیں گے جس کو اعتراف کہا جاتا ہے۔

بمبئی کا سفر

۱۲ جنوری ۱۹۹۳ کو میں ایک پروگرام کے تحت ودیشا (مدھیہ پردیش) میں تھا۔ وہاں اتفاقی طور پر مسٹر مدھو مہتا سے ملاقات ہوئی۔ موصوف مشہور ہندستانی اندولن کے چیرمین ہیں جس کا ہیڈکوارٹر بمبئی (Tel. 3624471) میں ہے۔ موصوف سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان سے موجودہ ملکی حالات پر گفت گو ہوئی تو وہ میرے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ بمبئی واپس جانے کے بعد ان کے کئی ٹیلیفون آئے۔ وہ بمبئی میں میرا کچھ پروگرام رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اصرار پر بمبئی کا سفر ہوا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو بمبئی کے لئے روانگی ہوئی، اور ۵ فروری کی شام کو دہلی واپس آگیا۔

دہلی ایر پورٹ پہنچا تو وہ بھیانک ہوائی حادثہ یاد آیا جو تین ہفتہ پہلے ۹ جنوری کو یہاں پیش آیا تھا۔ روسی ساخت کا ایک جہاز (Tu-154) جو کہ انڈین ایرلائنز کے استعمال میں تھا، حیدرآباد سے اڑکر دہلی پہنچا۔ اس وقت ہوائی اڈہ پر کچھ کہر تھی۔ جہاز نیچے اترا تو پائلٹ جہاز کو رن وے کی سنٹر لائن پر نہ اتار سکا۔ جہاز کا دائیں طرف کا پہیہ پختہ رن وے سے اتر کر کچی زمین پر چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں جہاز ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ تاہم اس کے ۱۶۳ مسافر معجزاتی طور پر بچ گئے۔

زندگی کی بھی ایک پختہ سڑک ہے۔ اور اس کے دائیں اور بائیں کچے راستے ہیں۔ سڑک کے سفر کا اصول ہے کہ احتیاط کے ساتھ چلو (drive cautiously) یہی اصول زندگی کے عام سفر کا بھی ہے۔ حقائق کی رعایت کرکے زندگی کا سفر طے کرنا گویا پختہ سڑک پر چلنا ہے۔ اور جذباتی ابال یا خوش گمانی کے تحت بلا احتیاط اپنی گاڑی چلانا گویا کچی زمین پر اپنی گاڑی کو دوڑانا ہے۔ ایک صورت میں زندگی کی گاڑی محفوظ سفر کرکے اپنی منزل تک پہنچے گی۔ اور دوسری صورت میں صرف یہ ہوگا کہ وہ بربادی کے گڈھے میں گر کر تباہ ہو جائے۔

دہلی سے بمبئی کے لئے انڈین ایرلائنز کے جہاز کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ آج کے اخبارات دیکھے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں ملی جس کو میں یہاں درج کر سکوں۔ آجکل کے اخباروں

ایہ حال ہے کہ ان میں زیادہ تر ایسی خبریں اور ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں کوئی سبق نہ ہو۔
۔گویا کہ نمک کے پہاڑ ہیں جن میں شکر کے کچھ ذرات مل جاتے ہیں جن کو ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے۔
انگریزی شاعر کے الفاظ میں "پانی پانی ہر طرف ، مگر پینے کے لئے ایک قطرہ نہیں :

Water, water everywhere. Nor a drop to drink.

جہاز میں ایک ہندو سائنٹسٹ سے ملاقات ہوئی ۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد
وہ وہیں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگئے تھے ۔ پھر انھیں خیال آیا کہ اپنے دیش جائیں اور
وہاں سائنسی علوم کو ترقی دیں ۔ مگر یہاں آنے کے بعد انھیں بہت تلخ تجربہ ہوا ۔ انھوں نے پایا
کہ یہاں کے تمام سائنس داں کیریرسٹ سائنس داں (careerist scientists) ہیں ۔
وہ اپنے سوا کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیتے ۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے حوصلہ شکن تجربات
بتاتے ہوئے کہا کہ اب میں دوبارہ امریکہ چلا جاؤں گا ۔ کیوں کہ انڈیا میں میرا کوئی مستقبل نہیں :

I will go back to the States, as there would hardly be any future for me in India.

جس ملک میں خود اس ملک کے اپنے دماغ مایوس ہو جائیں ، وہ ملک گویا کہ خود اپنے معماروں
سے محروم ہوگیا ۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا ۔
ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ عدالت
میں جب جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوتا ہے تو ایک طرف ہم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ہمارا
مخالف وکیل ۔ اس وقت ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم ایسی بات کہیں جس سے ہمارا مخالف
مشتعل ہو جائے ۔ اگر کسی طرح ہم نے اس کو مشتعل کر دیا تو اس کے بعد ہماری کامیابی یقینی
ہو جاتی ہے ۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ مشتعل آدمی کا ذہن ڈسٹرب ہو جاتا ہے ۔ وہ اس قابل نہیں
رہتا کہ غیر متاثر ذہن کے تحت معاملہ کے تمام پہلوؤں پر دھیان دے سکے ۔ اس کا ذہن اصل
معاملہ سے ہٹ کر حریف کی شخصیت کی طرف چلا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر متعلق
باتیں کرنے لگتا ہے ۔ متعلق باتیں اس کی پکڑ سے باہر ہو جاتی ہیں ۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو جائے

وہ کبھی مقابلہ کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اسی کا نام صبر ہے۔ ایک ہے عاجلانہ فکر، دوسری ہے صابرانہ فکر۔ عاجلانہ فکر وہ ہے جب کہ آدمی ردعمل میں مبتلا ہو کر سوچے۔ صابرانہ فکر یہ ہے کہ آدمی فریق ثانی کی اشتعال انگیزی سے غیر متاثر رہے۔ وہ آزادانہ سوچ کر اپنے عمل کا رخ متعین کرے

آج ۳۱ جنوری کو بمبئی ایرپورٹ پر ایک حادثہ پیش آیا۔ برٹش ایرویز کا ایک جہاز (Boeing 747) بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہوا۔ مگر ایک گھنٹہ کے اندر دوبارہ وہ واپس آگیا۔ اس کے اوپر عملہ کے ۱۸ لوگوں کو ملا کر کل ۳۲۷ عورت اور مرد سوار تھے واپسی کی وجہ یہ ہوئی کہ فضا میں بلند ہونے کے بعد جہاز کے پائلٹ نے پایا کہ اس کا ایک انجن جنریٹر (engine generator) فیل ہو گیا ہے۔ اب جہاز کو آگے لے جانا اس کو منزل کی طرف لے جانا نہیں تھا بلکہ اس کو تباہی کی طرف لے جانا تھا، اس لئے پائلٹ نے پیچھے کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا

آگے بڑھنا بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس دنیا میں کبھی پیش قدمی کو روک کر پیچھے کی طرف واپس جانا آدمی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی کمیوں کو درست کر کے دوبارہ پیش قدمی کے قابل ہو جب کہ اس وقت آگے بڑھنے کا مطلب عملی طور پر یہ بن جاتا ہے کہ اپنے وجود ہی کا خاتمہ کر لیا جائے

بمبئی ایرپورٹ پر یہاں کے کئی احباب موجود تھے۔ ان کے ساتھ شہر کے لئے روانگی ہوئی ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کو فجر کی نماز میں نے نظام الدین کی کالی مسجد میں پڑھی تھی۔ اور اسی دن ظہر کی نماز کے وقت میں بمبئی پہنچ چکا تھا۔ جب کہ دہلی اور بمبئی کے درمیان تقریباً ۱۵۵۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک واقعہ وہ گزرا جس کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے —— پاک ہے وہ اللہ جو ایک رات اپنے بندے کو مکہ کی مسجد حرام سے دور کی مسجد (فلسطین) تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ (الاسراء)

"اسراء" کے اس معاملہ پر سوچتے ہوئے خیال آیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ کا شاید ایک پہلو یہ بھی ہو کہ تاریخ میں آپ ایک ایسے

انقلاب کا آغاز کرنے والے ہیں جب کہ انسان کے لئے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ "ایک رات" میں دور کی کسی منزل کا سفر کرے اور پھر اسی رات کو دوبارہ اپنے مقام پر واپس آجائے۔

بمبئی میں میرا قیام ریجنسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۰۵ میں تھا۔ یہ بمبئی کے ایک پرسکون علاقہ (نیپین سی روڈ) پر واقع ہے۔ اس لحاظ سے وہ میری پسند کے مطابق تھا۔

بمبئی ہندستان کا سب سے بڑا شہر ہے، بمبئی کے ساتھ بے شمار یادیں اور تاریخیں وابستہ ہیں۔ جون ۱۸۸۸ میں موہن داس کرم چند گاندھی یہیں کے ساحل سے مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ انھوں نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر پانی کے جہاز کا ٹکٹ حاصل کیا تھا۔ بنیا کمیونٹی کو معلوم ہوا تو اس نے موہن داس کو ذات باہر (outcaste) قرار دیا۔ لوئی فشر کے الفاظ میں، ان کا مذہب سمندری سفر طے کرکے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کیوں کہ وہاں ہندو دھرم پر عمل نہیں کیا جا سکتا تھا:

Their religion forbade voyages abroad because Hinduism could not be practiced there. (p.23)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سے سو سال پہلے تک انڈیا کا سماج کتنا بند سماج تھا۔ اس بند سماج کو ۵۰ فیصد مسلم تہذیب نے کھولا، اور بقیہ ۵۰ فیصد مغربی تہذیب نے۔

بمبئی فساد کے زمانہ میں پاکستانی اخبارات میں صفحہ اول پر نہایت اشتعال انگیز خبریں چھپ رہی تھیں۔ روزنامہ وفاق جو پاکستان کا اسلامی اخبار سمجھا جاتا ہے، اس کے شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۹۳ کے صفحہ اول کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا:

بمبئی فسادات کا جہنم بن گیا۔ شہر پر جنونی ہندوؤں اور غنڈوں کا راج

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت اس قسم کے اخبارات ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات زرد صحافت کی بدترین مثال ہیں۔ ان اخبارات نے کوئی بھی تعمیری کردار ادا نہیں کیا۔ انھوں نے پچھلے سو سال میں صرف ایک کام کیا ہے۔ مسلمانوں کے مزاج کو بگاڑنا۔ انھیں آخری حد تک دوسری قوموں سے متنفر کر دینا۔ اسی منفی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اس دنیا

میں ترقی کا راز برداشت ہے نہ کہ اشتعال۔

۳۱ جنوری کی شام کو مسٹر مدھو مہتا کے مکان پر ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس دوران انھوں نے کئی دلچسپ باتیں سنائیں۔ سردار پٹیل کے سکریٹری نے ایک بار انھیں بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب پاکستان سے ریفیوجی بڑی تعداد میں دہلی آئے تو وہ چاندنی چوک کے علاقہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے اور وہاں سامان رکھ کر بیچنے لگے۔ اس کے بعد چاندنی چوک کے دکانداروں کا ایک وفد سردار پٹیل سے ملا جو اس وقت ہوم منسٹر تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ان شرنارتھیوں نے جب سے آکر فٹ پاتھ پر کاروبار شروع کیا ہے، ہمارا بزنس ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے ان شرنارتھیوں کو یہاں سے ہٹائیے۔

سردار پٹیل ان تاجروں کی بات چپ چاپ سنتے رہے۔ جب انھوں نے اپنی بات ختم کی تو سردار پٹیل نے پرسکون لہجہ میں کہا: اس کا حل بہت آسان ہے۔ آپ لوگ دکان چھوڑ کر فٹ پاتھ پر آجائیے اور فٹ پاتھ والوں کو دکان میں بٹھا دیجئے۔ اس کے بعد تمام دکاندار خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے —— سردار پٹیل کا یہ جواب بتاتا ہے کہ ایڈمنسٹریشن چلانے کے لئے کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسٹر مدھو مہتا نے بتایا کہ ۱۹۴۶ میں جب پنجاب اور بنگال میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا۔ پولیس اور فوج اس کو کنٹرول کرنے سے عاجز ہو گئی تھی۔ اس وقت گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن برلا ہاؤس، دہلی گئے اور مہاتما گاندھی سے ملے۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ ملک میں آگ لگی ہوئی ہے، اور میری فورس اس کو روکنے میں ناکام ہوچکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی اس کو روک سکتے ہیں۔ آپ میری واحد نفری فوج ہیں:

You are my one-man army.

بمبئی میں ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر الوین فرنینڈیز (Allwyn Fernandes) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بمبئی کے لوگ مسٹر مدھو مہتا کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ غیر مقبول کاموں کے چیمپین ہیں:

Madhu Mehta is the champion of unpopular causes.

مسٹر مدھو ہتا کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ایک بااصول آدمی ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اصول کی خاطر کرتے ہیں نہ کہ مفاد کی خاطر۔ لوگ عام طور پر ان اشوز کو لے کر اٹھتے ہیں جو عوام پسند ہوں، جن کے ذریعہ فوراً مقبولیت حاصل ہوتی ہو۔ مگر مدھو ہتا صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا صحیح ہے۔ اس دنیا میں مفاد کو نظر انداز کرنے والا آدمی مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مدھو ہتا ایسے ہی ایک نادر آدمی ہیں، اسی لئے ان کے بارہ میں کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ غیر مقبول مقاصد کے چیمپئن ہیں۔

اخباروں میں یہ بات آچکی ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا، اس کے پڑوسی علاقہ بھیونڈی میں فساد نہیں ہوا۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ علمی مطالعہ حقیقۃً تقابلی مطالعہ کا دوسرا نام ہے۔ اس معاملہ میں علمی مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ بمبئی میں فساد ہوا تو بھیونڈی میں فساد کیوں نہیں ہوا۔ نارتھ انڈیا میں فساد ہوتا ہے تو ساؤتھ انڈیا میں فساد کیوں نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان اس دشمن ملک میں امن وسکون کے ساتھ کس طرح رہتے ہیں۔

اگر اس طرح تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جہاں فساد ہوتا ہے اس کا سبب کیا ہے، اور جہاں مسلمانوں کو امن وسکون کے ساتھ رہنے کا موقع مل رہا ہے وہاں ایسا کس طرح ہوتا ہے۔

میں نے اس پہلو سے بہت غور کیا ہے۔ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں مسلمان حقیقت پسندانہ انداز میں رہتے ہیں وہاں فساد نہیں ہوتا ہے اور جہاں جذباتی انداز میں رہتے ہیں وہاں فساد ہو جاتا ہے۔ فسادی عناصر تو ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا مثبت ردعمل ایک جگہ بم کو ڈیفیوز کر دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا منفی ردعمل دوسری جگہ بم کو انفجار تک پہنچا دیتا ہے۔

بہار کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موجودہ انتظامی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دلچسپ قصہ بتایا۔ بہار کی ایک سڑک پر کچھ ڈاکوؤں نے ایک مسافر بس کو روکا۔ وہ گن لئے ہوئے بس میں داخل ہوئے اور تمام مسافروں کو حکم دیا کہ جس کے پاس جتنی رقم ہو وہ سب ہمارے حوالے کر دے۔ مسافروں کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رقم

ڈاکوؤں کے حوالے کر دی۔

آخر میں ڈاکوؤں کے سردار نے حاصل شدہ رقم کو گنا تو وہ کل سات ہزار تھی۔ اس نے کہا کہ اس میں تو ہم کو گھاٹا ہو جائے گا۔ کیوں کہ ہمیں دس ہزار روپیہ تو پولیس کو دینا ہے۔ چنانچہ اس نے تمام کی تمام رقم مسافروں کو دوبارہ واپس کر دی۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو ۵ بجے گورنر ہاؤس میں مہاراشٹر کے گورنر پی سی الکزینڈر (P.C. Alexander) سے ملاقات ہوئی۔ اس میں میرے علاوہ اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، مدھو مہتا، جسٹس دھرم ادھیکاری، انا ہزارے اور دوسرے کئی لوگ شریک تھے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ انھوں نے میرے کچھ انگریزی مضامین پڑھے ہیں اور شانتی یاترا کا ٹیپ دیکھا ہے۔ اس سے وہ کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ملک میں جو سنگین مسئلہ ہے اس کو پولیٹکل لوگ حل نہیں کر سکتے۔ اس کو صرف مذہبی اور روحانی شخصیتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔

اس ملاقات کی رپورٹ راج بھون پریس ریلیز کے تحت بمبئی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (یکم فروری ۱۹۹۳) میں چھپی۔ اس میں یہ صراحت بھی تھی کہ یہ ملاقات خود گورنر کی درخواست پر ہوئی:

Various religious leaders and prominent citizens met the governor at Raj Bhavan at his request. (p.3)

یکم فروری کی شام کو مسٹر مدھو مہتا کی قیام گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ بمبئی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے خطاب کیا۔ خطاب کے دوران میں نے کہا کہ لوگ اجودھیا کو پرابلم بنائے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اجودھیا کو سبق اور نصیحت کا واقعہ بنا دیا جائے۔

یہاں سوال و جواب بھی ہوئے۔ ایک نوجوان راہل شرما (Rahul Sharma) نے کہا کہ مسلمان اپنے آپ کو پاکستان کے ساتھ آئیڈنٹیفائی کرتے ہیں۔ اس کے بارہ میں آپ کا خیال کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہاں شاید کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں جو اپنے آپ کو پاکستان کے ساتھ آئیڈنٹیفائی کرتا ہو۔ دونوں ملکوں کے درمیان کرکٹ میچ میں کچھ مسلمان لڑکے بعض طفلانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ میں اس قسم کی حرکتوں کو لغو سمجھتا ہوں۔ مگر وہ صرف

ں قابل ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کی بنیاد پر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں رائے
ماننا صحیح نہیں۔

ٹائمس آف انڈیا کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر ایلون فرنانڈیز (Allwyn Fernandes)
نے مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ریجنسی ہوٹل کے کمرہ ۳۰۵ میں ریکارڈ کیا گیا۔ ٹائمس آف انڈیا
کے شمارہ ۲ فروری ۱۹۹۳ میں یہ انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔

سوالات زیادہ تر مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں تھے۔ میں نے ایک بات یہ کہی کہ ہندو
اور مسلمان دونوں کو ایک بات واضح طور پر جان لینا چاہئے کہ جب مختلف لوگ مل کر ایک سماج
میں رہتے ہیں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک کو دوسرے سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ ایسا ہمیشہ
ہوتا ہے۔ اور وہ ہر سماج میں ہوتا ہے خواہ وہ انڈیا کا معاملہ ہو یا اور کسی ملک کا معاملہ۔

ایسی حالت میں کیا کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ لوگ ایک
دوسرے کو اوائڈ کریں۔

جنرل ایس کے سنہا (۶۶ سال) پٹنہ کے رہنے والے ہیں۔ ان سے یہاں ملاقات ہوئی۔
۱ فروری کی ملاقات میں میں نے کہا کہ آپ لمبی مدت تک فوج میں رہے ہیں۔ اپنی فوجی زندگی
کا کوئی واقعہ بتائیے۔

انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کے زمانہ میں جو فوج تھی وہ آج سے بہت مختلف
تھی۔ اس میں زبردست کیرکٹر پایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۴ میں لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ کلکتہ میں
انگریزوں کی ایک بٹالین تھی۔ اس میں ایک ہزار انگریز سپاہی تھے۔ ان میں سے کچھ انگریز کلکتہ کی ایک
کینٹین میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔ ہندستانی ملازم نے کھانا لانے میں کچھ دیر کی۔ ایک انگریز سپاہی
جو شراب پئے ہوئے تھا غصہ میں آگیا۔ اس نے ہندستانی ملازم کو گھونسا مار دیا۔ اتفاق سے وہ مر گیا۔
یہ واقعہ اخبار میں چھپ کر کافی مشہور ہوا۔

اس کے بعد یہ کیس فوج کی کورٹ آف انکوائری میں آیا۔ انگریز فوجیوں نے طے کیا کہ وہ
گواہی نہیں دیں گے اور یہ کہہ دیں گے کہ ہم کو نہیں معلوم کہ کس نے گھونسا مارا۔ آخر کار قاتل کا
ثبوت نہ مل سکا۔ فوجی ذمہ داروں نے وائسرائے کو لکھ کر بھیج دیا کہ قاتل کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔

اس لئے اس کیس کو کلوز کر دیا جائے اور مقتول کے وارثوں کو پانچ ہزار روپیہ بطور تلافی دے دیا جائے۔

لارڈ کرزن نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ مقتول کو پانچ ہزار روپیہ ہم دے دیتے ہیں۔ مگر کیس کو ہم کلوز نہیں کریں گے۔ بلکہ پوری انگریز بٹالین کو اس کی سزا دیں گے۔ چنانچہ وائسرائے نے ایک ہزار فوجیوں کی اس انگریز بٹالین کو برما کے ایک غیر ترقی یافتہ علاقہ میں بھیج دیا جو کہ ملیریا کا علاقہ تھا۔ وہاں پوری بٹالین دو سال تک بطور سزا رہی۔ بہت سے لوگ ملیریا کی وجہ سے بیمار ہو گئے اور ستره انگریز فوجی وہیں مر گئے۔

ڈاکٹر عبدالکریم نائک بہت باشعور اور دردمند آدمی ہیں۔ وہ اپنے دو صاحبزادوں ، ڈاکٹر محمد نائک اور ڈاکٹر ذاکر نائک کے ساتھ نہایت مفید انداز میں "دعوہ ورک" کر رہے ہیں

یکم فروری کی شام کو مدھو مہتا صاحب کی رہائش گاہ پر جو میٹنگ ہوئی، اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں اجتماع کے بعد ان لوگوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دوسری انگریزی کتابیں لوگوں کے درمیان تقسیم کیں۔ لوگوں نے بہت شکریہ کے ساتھ قبول کیا

ڈاکٹر نائک صاحب نے کہا کہ مسلم نوجوان اکثر شکایت کرتے ہیں کہ ان کے لئے مواقع نہیں جو مواقع بظاہر مہیا نہیں ہیں ان کی تو وہ شکایت کرتے ہیں۔ مگر جو مواقع مہیا ہیں ان کو وہ استعمال نہیں کرتے۔

انھوں نے کہا کہ ایک چیز یہ ہے کہ آدمی ڈسپلن والی زندگی اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں ایک ضروری کام یہ ہے کہ ہر آدمی ڈائری رکھے اور روزانہ اپنی سرگرمیوں کا اس میں اندراج کرے۔ اسی طرح ملک میں بہت سے رضاکارانہ ادارے (volunteers bodies) ہیں جو مفت میں مختلف قسم کی چیزیں سکھاتے ہیں۔ مثلاً جرنلزم، اسمال اسکیل انڈسٹری، جمنازیم اسکاوٹنگ۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی رضاکار تنظیموں سے وابستہ ہو کر مسلم نوجوانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

۲ فروری کی دوپہر کو مہاراشٹر اسٹیٹ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک تاریخی بلڈنگ میں قائم ہے۔ یہاں انسپکٹر جنرل آف پولیس مسٹر جی این اوبالے (G.N. Ubale)

اور ڈپٹی کمشنر آر ایس راٹھور (R.S. Rathod) اور دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

عام طور پر لوگ پولیس کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ پولیس کے لوگ بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ اس کو چھیڑیں تو وہ غصہ میں آجاتا ہے۔ حتی کہ مقدس بزرگ بھی۔ جب آدمی کسی کے اوپر غصہ ہوتا ہے تو وہ اس کے خلاف ہر کارروائی کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ جس آدمی کے پاس کنکر ہے وہ کنکر پھینک کر مارے گا۔ اور اگر بندوق ہے تو وہ بندوق چلائے گا۔ گویا کہ یہ معاملہ وہ ہے جس کی بابت فارسی شاعر نے کہا کہ:

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

مسٹر آر ایس راٹھور بمبئی پولیس میں ڈپٹی کمشنر ہیں۔ ان کی فرمائش پر ۳ فروری کی شام کو ان کے یہاں کھانا کھایا۔ کھانا، فرنیچر، مکان، ہر چیز میں سادگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف تنخواہ پر گزارہ کرتے ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ عام پولیس افسروں سے بہت مختلف ہیں۔

کھانے کے دوران انھوں نے کئی قصے بتائے۔ ایک یہ تھا کہ ۱۹۷۷ میں جب جنتا گورنمنٹ نے اندرا گاندھی کو گرفتار کیا، اس وقت وہ پربھنی میں پولیس افسر تھے۔ اس وقت شہر میں دو جلوس نکلے۔ ایک کانگرس پارٹی کا جو حکومت کے خلاف بطور احتجاج تھا۔ دوسرا جنتا پارٹی کا جو حکومت کی حمایت میں تھا۔ دونوں ایک ہی سڑک پر مخالف سمتوں سے آرہے تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ ایک پوائنٹ پر پہنچ کر دونوں میں ٹکراؤ ضروری ہے۔

دونوں طرف ہزاروں آدمی تھے اور دونوں ہی جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ مسٹر راٹھور وردی میں ملبوس ہو کر موقع پر پہنچے۔ انھوں نے جلوس کا مائک اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس یہاں کافی فورس موجود ہے۔ اگر آپ لوگ تشدد کرتے ہیں تو میں بھی تشدد کروں گا اور فوراً فائرنگ کا آرڈر دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ جلوس میں بہت سے معصوم (innocent) لوگ ہیں۔ اگر فائرنگ ہوئی تو سب سے پہلے یہی معصوم لوگ مریں گے۔ اس لئے میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنی جان بچانا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں سے چلے جائیں۔

اس اعلان کے بعد آدھے سے زیادہ لوگ جلوس سے نکل کر چلے گئے۔ اس کے بعد جلوس

والے اتنا پریشان ہوئے کہ انھوں نے راستہ بدل دیا اور کسی ٹکراؤ یا ایکشن کی نوبت نہیں آئی۔

۲ فروری کو مسٹر مدھو مہتا کی رہائش گاہ پر جنرل سنہا اور راماکرشنن (S. Ramakrishan) سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر راماکرشنن نے میری کل کی تقریر کے بارہ میں کہا کہ اس کو سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی رشی بول رہا ہے۔ آپ کے شبد ہونٹوں سے نہیں بلکہ دل سے نکل رہے تھے۔

مسٹر راماکرشنن ایک بہت بڑا مشن چلا رہے ہیں۔ اس کا نام ڈی ڈیوائن لائف سوسائٹی ہے۔ انھوں نے اپنی سوسائٹی کی چھپی ہوئی کئی کتابیں دیں جو اخلاق اور روحانیت کی تعلیمات پر مبنی تھیں۔ انھوں نے راج گوپال اچاری کے کئی واقعات بتائے۔

راج گوپال اچاری کے متعلق میرا خیال ہے کہ مہاتما گاندھی کے بعد وہ پورے ملک میں سب سے زیادہ قابل اور لائق آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد اگر وہ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم ہوتے تو شاید ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

مسٹر پرتاپ بھوگی لال بمبئی کے ایک صنعت کار ہیں (فون نمبر 3623688) ان کی رہائش گاہ پر ۲ فروری کی شام کو مغرب بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً چالیس لوگ شریک ہوئے۔ وہ زیادہ تر ممتاز تجارتی افراد تھے۔ اس موقع پر میں نے سہ نکاتی فارمولے کی وضاحت کی نیز یہ بتایا کہ موجودہ ملکی مسائل کا حل کیا ہے۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔

۲ فروری کو مسٹر اشیش شاہ (Ashish Shah) نے نہایت تفصیلی انٹرویو لیا یہ انٹرویو مڈڈے (Mid-day) کے لئے تھا۔ وہ مڈڈے کے شمارہ ۱۳ مئی ۱۹۹۳ میں شائع ہو چکا ہے۔

مسٹر ہرندر دوے ایک گجراتی اخبار جنم بھومی (جاری شدہ ۱۹۳۴) کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ اشعار کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ نکمی لیڈرشپ پر سلام مچھلی شہری کا ایک شعر سنایا:

سمندر تیز طوفانی ہوا ٹوٹی ہوئی کشتی ۔۔۔ یہی اسباب کیا کم تھے کہ اس پر ناخدا تم ہو

مسٹر ہرندر دوے روحانی مزاج کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں پرارتھنا بھی کرتا ہوں تو بھگوان سے یہ کہتا ہوں کہ جو بھی اچھی بات میرے لئے ہو اس کو آپ میرے لئے کر دو۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ سوامی ویویکانند کے بہت معتقد تھے۔ انھوں نے سوامی ویویکانند کے عالمی مذہب (universal religion) کے نظریہ کی حمایت کی۔ انھوں نے ایک کتاب دکھائی۔ اس میں تھا کہ سوامی ویویکانند نے ۱۸۹۳ میں امریکہ کے ایک لکچر میں کہا تھا کہ نام نہاد ٹالرنس ایک بد دینی کی بات ہے۔ میں ٹالریٹ کرنے کے بجائے قبول کرنے میں یقین رکھتا ہوں۔ ٹالرنس کا مطلب یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم غلط ہو اور میں تم کو صرف زندہ رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ کیا یہ سوچنا بددینی نہیں ہے کہ میں اور تم دونوں ایک دوسرے کو بس زندہ رہنے کا حق دے رہے ہوں۔ میں سارے ہی مذہبوں کو قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ یہ ایک خوبصورت تخیل تو ہے مگر وہ کوئی خوبصورت نظریہ نہیں۔ نظریہ وہ ہے جو قابل عمل ہو۔ یہ بات موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔ یہاں عملی طور پر جو چیز ممکن ہے وہ ٹالرنس ہی ہے۔ اس کے ناقابل عمل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والے ایسے مذہب کی تو قدر کرتے ہیں جو انھیں کی طرح یہ کہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ مگر جو مذہب یہ کہے کہ سچا مذہب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اس کی قدر دانی کرنے کے لئے یہ لوگ کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ حالانکہ اپنے نظریہ کے مطابق انھیں ایسے مذہب کی بھی پوری قدر کرنا چاہئے۔

تعدد حقیقت کے اس ہندو نظریہ کو مغربی ملکوں میں بہت مقبولیت ملی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے توحید حقیقت کے نظریہ کو وہاں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اس کو مغرب کے لوگوں کا تعصب قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اسلام دشمنی کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ رائے درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل مغرب کے لئے ہندوازم کا نظریہ زیادہ مفید مطلب (convenient) ہے، جب کہ اسلام کا نظریہ انھیں اپنے لئے موافق نظر نہیں آتا۔

اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ مذہب ان کے سیاسی اور تمدنی معاملات میں داخل نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کہا کہ مذہب ایک پرائیویٹ انسانی معاملہ ہے۔ ہندوازم کے نظریہ میں ہی ان کو یہی فائدہ دکھائی دے رہا ہے۔ جس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے مذہب

کو ایک پرائیویٹ معاملہ بتایا تھا وہی مقصد انھیں ہندوازم کے اس نظریہ میں بھی الفاظ بدل کر حاصل ہو رہا ہے۔

ایک صاحب سے گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ عربی، اردو، فارسی، انگریزی میں مسلمانوں کے جتنے بھی اخبار یا رسالے نکلتے ہیں، ان سب کو ایک ہی مشترک نام دیا جاسکتا ہے، اور وہ پروٹسٹ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہر صحافت نامہ احتجاج نامہ ہے۔ ان میں اغیار کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار بتا کر ان پر سب وشتم کیا جاتا ہے۔

یہ یقینی طور پر قرآن کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمہارے اوپر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانا عملی طور پر قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے۔ مگر قرآن کا یہ عملی انکار ساری مسلم دنیا میں علی الاعلان کیا جارہا ہے۔ اور یہ عملی انکار وہ لوگ کر رہے ہیں جو قرآن اور اسلام کے نام ہی پر اپنی ساری مہم چلا رہے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ دستور نے ہم کو برابری کا حق دیا ہے اور کوئی بھی شخص ہم کو اپنا دستوری حق لینے سے روک نہیں سکتا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا :

None can curtail minorities rights bestowed by the constitution.

میں نے کہا کہ یہ واقعہ تو خود آپ لوگوں کے بیان کے مطابق، پچھلے چالیس سال سے جاری ہے کہ مسلم اقلیت کو اس کا دستوری حق نہیں مل رہا ہے۔ پھر کیوں نہیں آپ نے اس کو روک دیا۔ میں نے کہا کہ کسی گروہ کو اس کا حق دستوری الفاظ کی بنیاد پر نہیں ملتا بلکہ اس کے اپنے استحقاق کی بنا پر ملتا ہے۔ آپ اگر دستور میں لکھا ہوا حق لینا چاہتے ہیں تو اس قسم کی پرجوش تقریر نہ کیجئے۔ بلکہ مسلمانوں کو تعلیم اور دوسرے شعبوں میں آگے بڑھا کر اس قابل بنا دیجئے کہ وہ اپنا حق وصول کرنے کے قابل ہو جائیں۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا جو لکھنے اور بولنے والا طبقہ ہے، اس

ی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم معاملات میں اپنے لئے اپوزیشن سے رہنمائی لیتا ہے۔ وزیشن کا سیاسی فائدہ یہ ہے کہ وہ حکمراں پارٹی کو بدنام کرے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فساد یا اور کسی وقع پر اپوزیشن کے افراد فوراً یہ کرتے ہیں کہ اس کو لے کر انتظامیہ کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ س پالیسی کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام انتظامیہ (یعنی حکمراں پارٹی) سے بدظن ہو جائیں اور گلے الیکشن میں ان کو ووٹ نہ دیں۔

مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے بھی عین یہی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ ہر مسئلہ میں ان کو بس ینے کی ایک ہی بات معلوم ہے، اور وہ یہ کہ "انتظامیہ" کو ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف متی بیانات شائع کریں۔

یہ پالیسی ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ ہم کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ انڈیا میں جو ہندو مسلم عاملہ ہے اس کا بہت کم تعلق نام نہاد انتظامیہ سے ہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق مسلم عوام اور ہندو وام سے ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات ید اکریں اور لوگوں کو یہ نصیحت کریں کہ وہ اختلافی معاملات میں صبر وضبط اور حکمت و تدبیر سے ام لیں نہ کہ جوش اور مشتعل مزاجی سے۔ اس کے سوا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ تباہ کن ثابت ہوگا۔

ایک مجلس میں کسی نے کہا کہ ملک میں سب سے بڑا مسئلہ روزگار کا مسئلہ ہے۔ مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ یہ بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے دیش میں لوگوں کے اندر کام کرنے کا جذبہ نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بس انھیں ایک ملازمت مل جائے اور پھر کام نہ کر کے بھی تنخواہ لیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں امریکہ گیا اور وہاں مختلف لوگوں سے ملا۔ میں نے پایا کہ ایک امریکی جوان جس کے پاس کوئی جاب نہ ہو وہ اپنے بارہ میں بتاتے ہوئے یہ کہے گا کہ میں کام کی تلاش ں ہوں:

I am for work.

ر انڈیا میں معاملہ اس کے الٹا ہے۔ انڈیا کا ایک نوجوان بے روزگار ہے تو وہ اپنی حالت کو بتاتے وئے یہ کہتا ہے کہ میں ایک جاب کی تلاش میں ہوں:

I am looking for a job.

امریکہ کا نوجوان "کام" کی تلاش میں ہوتا ہے، اور انڈیا کا نوجوان "ملازمت" کی تلاش میں۔ دونوں دیشوں کے مزاج میں جو فرق ہے وہ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

بمبئی میں مسلسل ملاقاتوں اور میٹنگوں کی وجہ سے اخبار پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا۔ تاہم کم از کم ایک اخبار میں ضرور پڑھ لیتا تھا۔ جب کہ دہلی میں روزانہ میں چار اخبار دیکھتا ہوں۔

ٹائمس آف انڈیا (۳ فروری ۱۹۹۳) میں علی گڑھ کی ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے چند لڑکوں نے بعض نام نہاد لیڈروں کی کال پر ۲۶ جنوری کو کالا جھنڈا لگایا۔ مگر وہاں کے مسلمانوں نے اس کی سخت مذمت کی۔ رپورٹر نے لکھا تھا کہ ۲۶ جنوری کو میں علی گڑھ شہر میں گیا۔ لیکن وہاں کسی ایک گھر کے اوپر بھی کالا جھنڈا نظر نہیں آیا:

This correspondent could not spot a single black flag on any house. (p.17)

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اب علی گڑھ کے مسلم نوجوان یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے شدت پسند لوگ (hardliners) مسلمانوں کو رہنمائی دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کو حقیقت پسند اور روشن خیال قیادت (realistic and enlightened leadership) کی ضرورت ہے۔ یہ صرف علی گڑھ کی بات نہیں۔ یہ آج ملک کے تمام مسلمانوں کی آواز ہے۔ اب وہ حالات پوری طرح تیار ہو چکے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان نئی صالح قیادت ابھرے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے۔

۴ فروری کی دوپہر کو میں بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ جے جے ہاسپٹل کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی عمارت دکھائی دی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ پولیس چوکی ہے۔ حالیہ فساد کے دنوں میں اس کو مسلمانوں کے ہجوم نے توڑنے کی کوشش کی تھی۔

ہندستان کے مسلم لیڈروں نے عام طور پر اپوزیشن کی بولی کو اختیار کر لیا ہے۔ اپوزیشن کے لیڈر مخصوص مصالح کے تحت ہمیشہ پولیس یا انتظامیہ کے خلاف بیان دیا کرتے ہیں۔ اس کی نقل میں نام نہاد مسلم لیڈر بھی یہی کر رہے ہیں۔ ہر فساد کے بعد وہ آنکھ بند کر کے ایک ہی بیان جاری

کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ انتظامیہ (پولیس) نے فساد کرایا۔

اس طرح کے بیانات کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مسلمان عام طور پر پولیس کے بارہ میں منفی سوچ کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے جب وہ پولیس کی پارٹی کو دیکھتے ہیں تو فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں انتہائی غیر ضروری طور پر مسلم — پولیس تصادم پیش آتا ہے۔ پولیس کی مفروضہ مسلم دشمنی حقیقۃً مسلم لیڈروں کے غلط بیانات کا نتیجہ ہے۔ مگر اس کو خلاف واقعہ طور پر ہمارے اخبارات پولیس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

۴ فروری کی شام کو ۵ بجے خلافت ہاؤس میں تقریر تھی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صدارت کر رہے تھے۔ ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ باہر بھی کافی آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: اس نازک وقت میں بمبئی میں کیوں آیا۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ جو کہانی آپ نے بار بار خون کے قطروں سے لکھنے کی کوشش کی مگر وہ لکھی نہ جا سکی۔ اب ایک بار ہم اس کہانی کو آنسوؤں کے قطروں سے لکھنے کی کوشش کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ ہماری دل فگاری کو قبول کر لے۔ جو کہانی خون کے قطروں سے لکھی نہ جا سکی وہ آنسوؤں کے قطروں سے لکھ کر تیار ہو جائے۔

میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان اٹھا۔ اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا: ہم نہیں سنیں گے۔ تم واپس جاؤ۔ وغیرہ۔ میں خاموش ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہال کے حاضرین میں سے بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے ہیں اور اس نوجوان سے کہہ رہے ہیں کہ تم کو نہیں سننا ہے تو تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کیوں کہ ہمیں تو سننا ہے۔ کچھ دیر تک آوازوں کا شور رہا۔ آخر کار وہ لڑکا باہر چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی اور سارا مجمع نہایت خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ حاضرین کی فرمائش پر میں نے اس موقع پر تین نکاتی فارمولا کی وضاحت کی۔

۴ فروری کو بمبئی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ حالات اب تو یہاں کافی اعتدال پر آگئے ہیں مگر پچھلے ہفتہ تک عجیب حال تھا۔

انھوں نے بتایا کہ لوکل ٹرینوں میں لوگ خاموشی سے داخل ہو جاتے اور مکمل طور پر چپ رہتے۔ کوئی شخص بھی بولتا نہیں تھا۔ ڈبوں کے اندر ٹرین کے چلنے کی آواز کے سوا کوئی اور آواز مطلق سنائی

نہیں دیتی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے بمبئی سے تھانے تک ٹرین میں سفر کیا۔ یہ تقریباً ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ مگر پورے سفر میں کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی۔ لوگوں کو ڈر ہوتا تھا کہ اگر وہ بولیں تو فوراً ان کی آئیڈنٹٹی معلوم ہو جائے گی۔ اگر کبھی بولنا ضروری ہو جائے تو لوگ سوچنے لگتے تھے کہ ہندی میں بولیں یا مراٹھی میں۔ انھوں نے بتایا کہ عام طور پر ٹرینوں میں لوگ وقت گزارنے کے لئے تاش کھیلتے ہیں یا بھجن گاتے ہیں۔ مگر فساد کے دنوں میں سب کچھ مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔

۴ فروری کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت میں ۳۰ ویں منزل پر جانا ہوا۔ یہاں ایڈیٹرس گلڈ کی میٹنگ تھی جس میں مجھ کو خطاب کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ "اڈیٹرس گلڈ" کے زیر اہتمام دہلی کے ممتاز جرنلسٹوں کی ایک ٹیم بمبئی آئی تھی تاکہ یہاں کے فساد کے بارہ میں فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل کرے۔ یہ سب لوگ یہاں موجود تھے۔ چالیس سے زیادہ کی تعداد میں تمام بڑے بڑے ہندی اور انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر اس میں شریک ہوئے۔ ہال کی ساری سیٹیں بھر گئیں۔ آخر کار مزید کرسیاں منگانی پڑیں۔ زیادہ تر ہندو اور کچھ کرسچین تھے۔ کنڈکٹر نے آغاز کرتے ہوئے کہا:

Unusually it is a very large meeting.

مقررین نے بمبئی کے فساد پر زیادہ تر انتظامیہ کو سخت سست کہا۔ ایک صاحب نے پرجوش طور پر بولتے ہوئے کہا:

Who is policing the police.

دوسرے نے کہا کہ اصل قصور پولیس کا نہیں ہے بلکہ سیاسی لیڈروں کا ہے۔ پولیس کسی مجرم کو پکڑتی ہے اور اس کو سزا دینا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی کسی لیڈر کا ٹیلی فون پولیس افسر کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ میرا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو۔ لیڈر جب تک پولیس کے کام میں دخل دینا نہیں چھوڑیں گے، امن نہیں ہو سکتا۔

اکثر لوگ غصہ کے انداز میں بول رہے تھے کہ آخر اس قسم کے بھیانک فساد ملک میں کیوں ہوتے ہیں۔ ہر آدمی لمبی لمبی تقریر کرتا تھا۔ مگر اس کی تقریر زیادہ تر غیر متعلق باتوں سے بھری رہتی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ پر جب بھی گفت گو ہوتی ہے تو اس کا عنوان ہوتا ہے : انڈیا میں فساد کا مسئلہ۔ حالاں کہ یہ عنوان ہی غلط ہے۔ کیوں کہ فساد جو ہو رہا ہے وہ پورے انڈیا میں نہیں ہو رہا ہے، وہ زیادہ تر نارتھ انڈیا میں ہو رہا ہے۔ گویا کہ اس وقت ہم جس مسئلہ کے حل کے بارہ میں بحث کر رہے ہیں، وہ آج بھی انڈیا کے نصف حصہ میں حل شدہ ہے۔ ایسی حالت میں کوئی نئی بحث چھیڑنے کے بجائے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ ملک کے محفوظ حصہ (ساؤتھ انڈیا) کا مطالعہ کرکے جانیں کہ وہاں فساد کیوں نہیں ہوتا۔

میں نے اس کی تحقیق کی ہے۔ میری دریافت یہ ہے کہ ساؤتھ انڈیا کے لوگوں میں برداشت کرنے کا مزاج ہے، اسی لئے وہاں فساد نہیں ہوتا۔ اس بنا پر میری رائے میں فساد کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں میں برداشت کا مزاج پیدا کیا جائے۔ برداشت کا مزاج آتے ہی فساد اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ کام سب سے زیادہ اخبارات کر سکتے ہیں۔

۵ فروری ۱۹۹۳ کی شام کو انڈین ایر لائنز کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ بمبئی ایر پورٹ پر اور جہاز میں کئی لوگ ایسٹ ویسٹ ایر لائنز کی بات کرتے ہوئے سنائی دئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں تو ایسٹ ویسٹ سے سفر کرنا چاہتا تھا، مگر اس میں جگہ نہیں ملی۔

چالیس سال پہلے ایک ایکٹ (Air Corporation Act 1953) پاس ہوا تھا۔ اس کے سکشن ۱۸ کے مطابق، انڈیا میں سرکاری ہوائی کمپنی کے سوا کسی اور شخص یا ادارہ کے لئے ہوائی جہاز چلانا غیر قانونی تھا۔ مگر موجودہ حکومت نے پرائیویٹ کمپنیوں کو ہوائی سروس کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ تقریباً چالیس کی تعداد میں پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ بہتر ایسٹ ویسٹ ایر لائنز سمجھی جاتی ہے جو مسلمانوں نے قائم کی ہے اور اس کے چیرمین نصیر الدین عبد الوحید ہیں۔ ایسٹ ویسٹ خود سرکاری انڈین ایر لائنز کے لئے چیلنج بنتی جا رہی ہے۔

جس ملک میں یہ امکانات ہوں کہ ایک مسلم ادارہ قائم ہو کر اتنی ترقی کرے کہ وہ خود گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے چیلنج بن جائے، اس ملک میں جو لوگ کہتے کہ یہاں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں، وہ ملک کے بارہ میں خبر نہیں دیتے بلکہ خود اپنی بے بصیرتی کا اعلان کر رہے ہیں۔

مدراس کا سفر

پیس مشن کے تحت ایک سفر ہوا۔ اس کا راستہ اس طرح تھا ـــــ دہلی، مدراس، کانچی پورم، منگلور، سرنگیری، بمبئی، پونہ، دہلی۔ اس سفر میں میرے ساتھ حسب ذیل مزید افراد شامل تھے: اچاریہ سوشیل کمار، سوامی چیدانند، مدھو مہتا، شانتی لال موتھا، نابُجل ایڈمنڈ ٹولی۔ اس سفر کی مختصر روداد تاریخ وار درج کی جاتی ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۹۳

صبح فجر سے پہلے نظام الدین سے روانہ ہو کر دہلی ایر پورٹ پہنچا۔ ایر پورٹ پر ساڑھے پانچ بجے نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو یہ الفاظ زبان پر آگئے: یا اللہ، آپ کا ایک کمزور ترین بندہ ایک مشکل ترین کام کے لئے نکلا ہے۔ اس کی مدد فرمائیے۔ ملک میں امن قائم فرمائیے اور اہل وطن کے لئے اپنی رحمت و برکت کے دروازے کھول دیجئے۔

دہلی سے مدراس کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۳۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دہلی سے اس قافلہ میں اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند اور نابُجل ٹولی (آسٹریلیا) شریک تھے مدراس پہنچ کر مسٹر مدھو مہتا (ہندستانی اندولن) اور مسٹر شانتی لال موتھا بھی اس میں شامل ہوگئے یہ دونوں بمبئی سے براہ راست مدراس پہنچے تھے۔

دہلی اور مدراس کے درمیان سفر میں اچاریہ جی اور سوامی جی سے اس پر بات ہوئی کہ ملک میں امن و امان کس طرح قائم ہو۔ دونوں نے اس سے اتفاق کیا کہ بے غرض اور غیر متعصب قسم کی مذہبی شخصیتوں کو سامنے آنا چاہئے۔ ایسے ہی لوگ اس وقت کوئی موثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ سوامی جی نے کہا کہ بہتر انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ ایگو ہے۔ "میں" ذہن ٹکراؤ پیدا کرتا ہے، اور اگر میں کا ذہن ختم کر دیا جائے تو اپنے آپ میل ملاپ ہو جائے گا:

The term "I" in the vertical form stands for ego, but in the horizontal form it becomes a bridge between two points.

موجودہ حکومت کی اوپن اسکائی پالیسی (open-sky policy) کے نتیجہ میں اس وقت تقریباً چالیس پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں ملک میں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ایسٹ ویسٹ (East West Air Ways) ہے۔ اس کو بمبئی کے مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔ اس کے مینیجنگ ڈائرکٹر ٹی اے وحید ہیں۔ یہ ایک بڑی کمپنی ہے جو ۱۶ سکٹر میں اپنے دس جہاز چلا رہی ہے۔

انڈیا کے مسلمانوں میں سے جو لوگ مسائل تلاش کر کے ان میں الجھے رہتے ہیں، ان کے پاس شکایت اور احتجاج کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو تلاش کرتے ہیں ان کو یہاں ایسے مواقع مل جاتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر لیں۔

درمیان میں ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے حیدرآباد میں اترا۔ اس کے بعد وہ مزید پرواز کر کے مدراس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ مدراس میں ہم لوگوں کا قیام ایک ہندو تاجر کے مکان پر تھا۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا گیا۔ کھانے کی میز کے گرد کئی مقامی اور غیر مقامی ہندو صاحبان موجود تھے۔ وہ لوگ مسلسل بات کرتے رہے۔ میں خاموشی کے ساتھ صرف ان کی باتیں سنتا رہا۔

اس گفتگو کے بعد میری وہ رائے مزید پختہ ہو گئی جو اس سے پہلے اپنے مطالعہ کے دوران میں میں نے قائم کی تھی۔ وہ یہ کہ مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۴۷ سے پہلے جو سیاست مسلمانوں کے درمیان چلائی، ٹھیک اسی انداز کی سیاست اب ہندو انتہا پسند ہندوؤں کے درمیان چلا رہے ہیں۔

یہ خطرہ کی سیاست ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے کچھ فرضی یا واقعی باتوں کو لیکر مسلمانوں کو بتایا کہ ہندو تمہارے لئے زبردست خطرہ ہے۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ تمہارے ملی وجود کو مٹا دے گا۔ وہ تم کو ترقی نہیں کرنے دے گا۔ اسی کے ساتھ زرد صحافت کو استعمال کر کے انھوں نے بیشتر مسلمانوں کو بہکایا۔ انھوں نے نان اشو کو اشو بنایا اور پھر اس کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکا دیا۔ اس کا نتیجہ ملک کا بٹوارہ تھا۔

اب ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر ٹھیک اسی مریضانہ سیاست کو ہندوؤں میں دہرا رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو خطرہ کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ بے بنیاد باتوں کو لے کر انھیں اشو بنایا۔ ان کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ انھوں نے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ مسلمان اس ملک کے لئے مستقل خطرہ ہیں۔ حتی کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے ذریعہ کچھ برسوں کے بعد وہ بھارت کو اسلامستان

بنا دیں گے۔

اس جناحی سیاست نے پہلے ملک کا بٹوارہ کیا تھا۔ اب وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا بٹوارہ کر رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں میں اتنی زیادہ دوری آچکی ہے کہ ایک سماج میں دونوں کا معتدل طور پر رہنا ہی ناممکن دکھائی دینے لگا ہے۔ مزید دردناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے نااہل لیڈر اپنی ناعاقبت اندیشانہ کارروائیوں کے ذریعہ اس دوری میں صرف اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔

مدراس سے سنکراچاریہ کے یہاں جانا تھا۔ چنانچہ یہاں سے بذریعہ کار کانچی پورم کے لئے روانگی ہوئی۔ وہاں ہم لوگ ڈھائی بجے دن میں پہنچے۔ کانچی کے سنکراچاریہ (جگت گرو سنکراچاریہ) سے تقریباً دو گھنٹہ کی ملاقات رہی۔ یہ آشرم کافی بڑا ہے۔ مگر وہ اتنا ہی سادہ ہے۔ نظم اور صفائی کا زیادہ اہتمام نظر نہیں آتا۔

کانچی کے سنکراچاریہ معمر ہیں اور انتہائی سادہ مزاج آدمی ہیں۔ گفتگو میں ہنسی کا انداز غالب رہتا ہے۔ ابتدائی مشاہدہ میں مجھے خیال ہوا کہ وہ بالکل سیدھے سادے ایک سنت ہیں۔ مگر بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور ہر معاملہ میں نہایت جچی تلی رائے دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے احوال سے بھی وہ کافی باخبر نظر آئے۔

سنکراچاریہ نے جو باتیں کہیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ مندر اور مسجد کا جھگڑا اس طرح طے کیا جانا چاہئے کہ دیش کی شانتی بھنگ نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ دیش میں اگر شانتی نہ ہو تو اس کے بعد دوسرا کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا۔

اسی دن ہم لوگ کانچی پورم سے لوٹ کر مدراس آ گئے۔ یہاں شام کو نماز مغرب کے بعد ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ مدراس کے انگریزی اور تامل اخباروں کے رپورٹر موجود تھے۔ یو این آئی کی طرف سے بھی ایک نمائندہ اس میں شریک تھا۔ گفتگو زیادہ تر اجودھیا کے مسئلہ پر ہوئی۔ میں نے تین نکاتی فارمولا کی وضاحت کی۔ اس پریس کانفرنس میں میرے علاوہ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند بھی موجود تھے۔

۱۶ فروری ۱۹۹۳

مدراس میں کئی تعلیم یافتہ افراد سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہندو تاجر مسٹر سی ایل مہتانے کہاکہ اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو کچھ ہوا، اس کا مکمل ویڈیو فلم تیار کیا گیا تھا۔ اس کو اب جگہ جگہ دکھایا جارہا ہے۔ اگر پہلے سے اس کا منصوبہ نہ بنایا گیا ہوتا تو اس عمل کا پورا فلم کیسے تیار کیا جاسکتا تھا۔ اس فلم کے اثرات بے حد خطرناک ہیں۔ ایک ہندو نوجوان نے اس فلم کو دیکھ کر کہا : آخر کار ہم نے فتح پالی۔ ایک اور ہندو نوجوان اس کو دیکھنے کے بعد بول اٹھا : غلامی کا نشان مٹ گیا۔ ایک اور ہندو نوجوان نے کہا : مسلمان دباؤ کی بھاشا سمجھتے ہیں، یہ بات اب پکی ہو گئی۔

مدراس سے ہم لوگوں کو منگلور جانا تھا۔ اور پھر وہاں سے سرنگیری جاکر دوسرے سنکراچاریہ سے ملنا تھا۔ قیام گاہ سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے تو گاڑی میں میرے ساتھ آسٹریلیا (سڈنی) کے ۳۴ سالہ مسٹر نائجل ایڈمنڈ ٹولی (Nigel Edmund Tolley) بھی موجود تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ انڈیا اور آسٹریلیا میں آپ نے کیا فرق دیکھا۔ انھوں نے بہت سے مادی فرق بتائے۔ مثلاً زیادہ آمدنی، زیادہ صاف سڑکیں، زیادہ اچھے گھر، ہر چیز اعلیٰ صنعتی معیار کی۔

میں نے کہا کہ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آسٹریلیا کے لوگ ہندستان سے زیادہ خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ خوشی کا تعلق دل سے ہے، اس کا تعلق مادی چیزوں سے نہیں :

Happiness comes from the heart, not from money.

مسٹر ٹولی نے ایک لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ مگر چند سال کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ اب دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ دونوں غیر مطمئن ہیں۔ دونوں میں سے کسی نے ابھی تک دوسرا نکاح نہیں کیا۔ مغربی ملکوں میں طلاق کی کثرت کی وجہ انھوں نے یہ بتایا کہ آزادی کا تصور اتنا غالب ہے کہ عورتیں مرد کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔

مدراس سے منگلور کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۵۵۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں انڈین اکسپریس (۱۶ فروری) دیکھا۔ اس میں صفحہ ۶ پر ایک کتاب کا تذکرہ تھا:

Dr Barbara Theiring, Jesus the Man

ڈاکٹر باربرا نے ۲۰ سال تک بحر مردار کی دستاویزات (Dead Sea scrolls)

کامطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مذکورہ کتاب تیار کی ہے۔ اس میں حضرت مسیح کی زندگی کے جو حالات ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں جو موجودہ انجیل میں ہیں یا مسیحی چرچ میں بتائے جاتے ہیں۔ اس کے مطابق حضرت مسیح نے دو بار نکاح کیا۔ ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک بچی کا نکاح پال سے ہوا۔ حضرت مسیح سولی کے بعد بھی زندہ رہے۔ اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر ان کی وفات ہوئی۔ وغیرہ۔ مبصر نے ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> The Christ whom Christians worship and the Jesus of the New Testament do not appear to be the same person. The former is the romantic product of theology and the latter, an intolerant prophet who denied his own mother at a wedding party, cursed a tree for not bearing fruit, promised to divide family members against each other.

۱۰ بجے دن میں ہمارا جہاز منگلور کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ ہمارے قافلہ میں پانچ آدمی تھے۔ یہاں سے ہم لوگ کار کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ سڑک کے دونوں طرف دور تک سرسبز وادیوں کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ تاہم مسلسل سفر کی وجہ سے میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سر کے اندر چکر کی سی کیفیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ قدرتی مناظر کو دیکھنے کی خوشی حاصل کروں۔ مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ذہنی حالت اس میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

میرے دل نے کہا کہ قادر مطلق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ انسان کو امپرفکٹ دنیا دے مگر وہ اس کو پرفکٹ دنیا سے محروم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا یہ محسوس کرنا کہ یہ دنیا اس کے لئے امپرفکٹ ہے، یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پرفکٹ دنیا بھی ضرور اس کے لئے تیار کی گئی ہے۔

منگلور سے بذریعہ روڈ ہم نے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ ڈیڑھ بجے دن میں سرنگیری (Sirengeri) میں داخل ہوگئے۔ یہیں پربستی کے کنارے ایک بڑے رقبہ میں سنکر اچاریہ کا آشرم ہے جو ۱۲ سو سال سے قائم ہے۔

سرنگیری میں ایک معلوماتی کتاب ۱۲۵ صفحہ کی ملی۔ یہ ۱۹۹۱ میں انگریزی میں چھاپی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جگدگرو آدی سنکر اچاریہ (۸۲۰ - ۷۸۸ء) نے صرف ۳۲ سال کی عمر پائی۔ مگر انھوں نے انڈیا کی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے دلیفس بھر کا سفر کر کے چار کونوں پر

چارمٹھ بنائے۔ دوارکا (ویسٹ) بدری کسرما (نارتھ) جگنا تھ (ایسٹ) سرنگیری (ساؤتھ)

تعارفی کتاب کا ایک ذیلی عنوان ٹیپو سلطان کے بارہ میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ٹیپو سلطان کے کئی خطوط مٹھ کے دفتر میں محفوظ ہیں۔ ایک خط کے بارہ میں یہ الفاظ درج ہیں:

In a letter, he reiterated his conviction that his strength and hope were reared upon the three fold basis of God's grace, the holy Jagadguru's blessings, and the prowess of the arms of the realm. (p.68)

سرنگیری کے سنکراچاریہ سے ملنے کے لئے یہاں کا سفر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آدی سنکراچاریہ نے بھارت میں چار مرکز قائم کرنے کے بعد یہیں قیام کیا تھا۔ ان کے آخری ایام اسی جگہ گزرے۔ سرنگیری مٹھ بالکل جدید طرز پر بنا ہوا ہے۔ ۴۶ ایکڑ کے رقبہ میں واقع اس مٹھ میں نظم اور صفائی اعلیٰ معیار کی نظر آئی۔

یہ مٹھ قدرتی مناظر کے درمیان واقع ہے۔ جگہ نہایت پرفضا ہے۔ پورے ماحول میں ایک خوشگوار سکون چھایا ہوا ہے۔ چڑیوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز آنفاً فاً ہی کبھی سنائی دیتی ہے۔ ندی، باغ پل، پارک، پہاڑیاں، یہ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے یہاں کھایا۔ میرے علاوہ سوامی چیدانند، مدھومہتا، شانتی لال موتھا اور مسٹر ٹولی شریک تھے جو ہندوازم سے متاثر ہیں۔ ایک بڑے کمرہ میں سادہ میز کے چاروں طرف سادہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر کیلے کے ہرے پتے بچھائے گئے۔ پھر اس پتہ کے اوپر روٹی، چاول، سالن وغیرہ باری باری لاکر رکھا گیا۔

ہر چیز صاف ستھری اور صحت بخش تھی۔ سرنگیری مٹھ کے ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر گوری شنکر (V.R. Gowri Shankar) بھی کھانے میں شریک تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر مٹھ کے اندر اپنے کمرہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد آرام کیا۔ شام کو چار بجے سنکراچاریہ سے ہم لوگوں نے ملاقات کی۔

سنکراچاریہ سے بہت اچھے ماحول میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمارے پیس مشن کی مکمل حمایت کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ دھرم کا مطلب مذہب نہیں ہے۔ بلکہ کرتو

(ڈیوٹی) ہے۔ یہ سیاسی لوگ ہیں جنھوں نے دھرم کو مذہب کا معنی دے دیا ہے۔ دھرم تو انسان کا کرتو ہے۔ جیسے پتنی کا دھرم، راجہ کا دھرم، وغیرہ۔ ہندو کا لفظ ہماری کتابوں میں کہیں نہیں۔ یہ لیڈر ہیں جنھوں نے "ہندو" کو وہ نام دیا ہے جو آج سمجھا جاتا ہے۔

مسٹر مدھو مہتا نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک میں ہر چیز بزنس ہوگئی ہے۔ حتی کہ روحانیت کو بھی تجارت کی چیز بنا دیا گیا ہے:

Even spiritualism has been commercialised in this country.

۱۷ فروری ۱۹۹۳

آج صبح کو سرنگیری سے واپس ہونا تھا۔ یہاں میں نے اپنے کمرہ میں فجر کی نماز پڑھی۔ سینہ میں جذبات کا تلاطم برپا تھا۔ مگر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ جذبات الفاظ کی صورت میں ڈھل نہیں رہے ہیں۔ جذبات جب بہت زیادہ گہرے ہوں تو کیفیات کا غلبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ الفاظ کے لئے ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ خدایا، اس دعا کو میری طرف سے لکھ لے جس کے لئے میرے پاس الفاظ بھی نہیں۔

ہمارے ساتھی شانتی لال موتھا (پونہ) نے کل شام کو یہاں کے مطبخ میں کہہ دیا تھا کہ صبح کو ہم لوگ اڈلی کا ناشتہ کریں گے۔ چنانچہ صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر ہم لوگ کھانے کی میز پر آئے تو کیلے کے پتہ پر اڈلی، ناریل کی چٹنی اور کافی رکھی ہوئی تھی۔ یہ جنوبی ہند کا عمومی ناشتہ ہے۔ اس سے فراغت کے بعد ہمارا قافلہ سرنگیری سے منگلور کے لئے روانہ ہوا۔

پورا راستہ سبزہ سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان طے ہوا۔ قدرت کے پھیلے ہوئے مناظر اتھاہ سکون کا پیغام دے رہے تھے۔ کبھی کبھی سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جب سامنے کی گاڑی اور ہماری گاڑی قریب آتی تو ٹرافک اصول کے مطابق، ایک گاڑی دائیں کی طرف اور دوسری گاڑی بائیں کی طرف کترا کر نکل جاتی۔ میں نے سوچا کہ دونوں گاڑی اگر سیدھا چلنے پر اصرار کرے تو دونوں ہی تباہ ہو جائیں۔ اور جب دونوں ایک دوسرے کو اوائڈ کرتی ہیں تو دونوں کو زندگی کی شاہراہ مل جاتی ہے۔

راستہ میں سوامی چیدانند اپنی دلچسپ باتیں سناتے رہے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ پیار کی

کرنسی ایسی ہے جو دنیا میں ہر جگہ چلتی ہے۔ پھر اس خیال کو موزوں کرتے ہوئے کہا: پیار کا دیا جلاؤ، دشمنی کا اندھیرا بھگاؤ۔

۱۰ بجے دن میں ہم لوگ منگلور ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں لاونج میں کچھ وقت گزارا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ ایک ہندو بھائی نے کہا کہ ہم مندر۔ مسجد پالٹکس کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ بمبئی میں میرا کارخانہ ہے۔ میں ایکسپورٹ کا سامان تیار کرتا ہوں۔ میرے علاقہ میں فساد نہیں ہوا، مگر فساد کی خبریں پھیلیں تو میرے ورک فورس کا ۹۵ فیصد حصہ بھاگ گیا۔ اب میری انڈسٹری ٹھپ پڑی ہوئی ہے۔ بھلا اس طرح دیش ترقی کرسکتا ہے۔

دوسرے ہندو بھائی نے کہا کہ اشوک سنگھل جیسے لوگوں کا کہنا ہے کہ:

دیش کو بچانا ہے غلامی کا کلنک مٹانا ہے۔

مگر یہ نعرہ بالکل الٹا ہے۔ ان لوگوں کو کہنا چاہئے کہ غلامی کا کلنک مٹانے کے نام پر دیش کو تباہ کرنا ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جھوٹی سیاست سے دیش کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ اور پھر خود ہی وہ دیش کو بچانے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اسی کو فارسی زبان میں کہا گیا ہے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ یہ سیاست کی بدترین قسم ہے۔ اس میں کچھ فرضی چیزوں کو اشو بنایا جاتا ہے۔ اور پھر جذباتی تقریروں کے ذریعہ اس کو بڑھا کر آخری حد پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا قومی نشہ ہے، اس کا قومی ترقی سے کوئی تعلق نہیں۔

انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ نمبر ۱۶۰ کے ذریعہ منگلور سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں آج کے دو اخبار پڑھے۔ انڈین ایکسپرس اور حیدرآباد کا نیوز ٹائم۔ نیوز ٹائم (۷ فروری) میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس کو ورلڈ نیوز لنک نے ریکارڈ کیا تھا۔

ایک سوال یہ تھا کہ مسلم دنیا میں جو فنڈمنٹلسٹ تحریکیں چل رہی ہیں ان کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ڈاکٹر نصیف نے جواب دیا کہ ہر مذہب میں ایسے لوگ ہیں جو اپنے جوش کے تحت رات دن کے اندر نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم

بڑھائی جائے۔ اخلاقی اقدار پیدا کی جائیں۔ اسی طرح ایک اور سوال یہ تھا کہ سلمان رشدی کے خلاف موت کا فتویٰ جو ایران کے مذہبی لیڈر نے دیا تھا، اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نصیف کا حسب ذیل جواب اخبار میں نقل کیا گیا ہے:

> Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. But otherwise, human rights should be given to everybody.

یہ بات اگر ہندستان یا پاکستان کا کوئی شخص کہے تو نام نہاد علماء اس کے قتل کا یا کم از کم اس کو کوڑا مارنے کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ مگر یہی پرجوش حامیان اسلام اس وقت خاموش رہتے ہیں جب کہ وہ سعودی عرب کے کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے کہی گئی ہو۔ کیسا عجیب ہو گا وہ اسلام جو بھارت جیسے ملک میں کچھ اور رہو اور پٹرو ڈالر والے ملک میں پہنچتے ہی کچھ اور ہو جائے۔

بمبئی میں ہمارے ساتھی ایرپورٹ پر موجود تھے۔ تاہم پروگرام کے مطابق، آج پونہ جانا تھا بمبئی میں دو گھنٹے گزار کر بذریعہ کار پونہ کے لئے روانگی ہوئی۔

مسٹر شانتی لال موتھا نے مجھ کو پیچھے کی سیٹ پر لٹا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا میں باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانتی لال موتھا نے پوچھا کہ آپ کو کیا چاہئے۔ کیا چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سڑک کے کنارے کوئی مسجد ہو تو اتر کر نماز پڑھ لوں۔ انھوں نے کہا کہ مسجد تو ابھی ہمارے پیچھے تھی۔ فوراً گاڑی روک کر پیچھے کی طرف لے گئے۔ اور مسجد کے پاس اس کو کھڑا کر دیا۔ میں نے اتر کر وہاں نماز پڑھی اور پھر ہم لوگ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔

مغرب کے وقت ہم لوگ پونہ پہنچ گئے۔ یہاں پہلے مسٹر شانتی لال موتھا کے آفس میں ٹھہرا۔ کچھ دیر بعد جناب عبد الصمد صاحب اور جناب محمد یونس صاحب آگئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں نیوا یرا کالونی میں آگیا۔ یہاں میرا قیام محمد یونس صاحب کے مکان پر تھا۔ پونہ کے کئی لوگ خبر سن کر یہاں آگئے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے تک ان لوگوں سے بات ہوتی رہی۔

میں نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ ہندو مسلم تعلقات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ

کی ضرورت ہے۔ اکثر مسلمان ایسا کرتے ہیں کہ وہ برادران وطن کو حلقوں اور جماعتوں میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں۔ یہ آر ایس ایس کا آدمی ہے۔ یہ کانگرس کا آدمی ہے۔ یہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا آدمی ہے۔ یہ اس جماعت کا آدمی ہے۔ یہ اُس جماعت کا آدمی ہے۔ اس قسم کی سوچ سراسر بے بنیاد ہے۔ صحیح اسلامی بات یہ ہے کہ تمام لوگوں کو انسان کی نظر سے دیکھا جائے۔ جماعتی تعلق ہمیشہ اضافی ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک انسان ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ انسان کے اعتبار سے معاملہ کرنا چاہئے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۳

آج فجر کی نماز نیو ایرا (پونہ) کی مسجد میں پڑھی۔ امام صاحب نے آخری رکعت میں قرآن کا جو حصہ پڑھا، اس کی آخری آیت یہ تھی: واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیہم ولا تک فی ضیق مما یمکرون۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ہم محسنون (النحل ۱۲۸-۱۲۷)

نماز کے بعد کچھ لوگ میری قیام گاہ پر اکٹھا ہو گئے۔ میں نے مذکورہ آیات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن کے اس بیان پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو موجودہ حالات کے اعتبار سے بہت بڑا سبق ملے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ یہاں ہمارا اصل مسئلہ ہمارے خلاف سازش کی موجودگی نہیں ہوگی۔ بلکہ اصل مسئلہ خود ہمارے اندر صبر اور تقویٰ اور حسن عمل کی غیر موجودگی ہوگی۔ گویا یہاں سارا معاملہ خود ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ہمیں باہر کی سازشوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خود اپنے اندر تقوی اور صبر اور حسن عمل کی صفت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر داخلی سطح پر ہمارے اندر یہ اوصاف موجود ہوں تو اس کے بعد تمام بیرونی مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

پونہ کے تعلیم یافتہ افراد میری رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے مختلف قسم کے دینی اور ملی امور پر باتیں ہوتی رہیں ۔ عبد القادر عبد الغنی صاحب (۵۳ سال) نے گفتگو کے دوران کہا کہ آج کا مسلمان جھگڑا بالکل نہیں چاہتا۔ آج اگر مسلمان لیڈر کسی جھگڑے والی بات کے لئے بلائیں تو مسلمانوں کی طرف سے انھیں کوئی رسپانس ملنے والا نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ۶ دسمبر کے حادثہ کا ایک روشن پہلو ہے۔ ۶ دسمبر کو جب بابری مسجد کی عمارت ڈھائی گئی تو اسی کے ساتھ موجودہ نام نہاد مسلم قیادت بھی ہمیشہ کے لئے ڈھ گئی۔

شام کو نماز عشاء کے بعد ڈاکٹر عبد الرزاق شیخ کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے اجودھیا کے مسئلہ پر تقریر کی اور تین نکاتی فارمولا کی تشریح کی۔ آخر میں سوال وجواب پر مجلس برخاست ہوئی۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا کا پونہ کے لئے ایک ضمیمہ نکلتا ہے۔ اس کا نام پونے پلس (Pune Plus) ہے۔ ڈاکٹر شیخ کا ایک مراسلہ اس کے کل کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے تین نکاتی فارمولا کی مکمل حمایت کی ہے۔

۱۹ فروری ۱۹۹۳

صبح ساڑھے نو بجے پونہ کے اردو ٹاورس کے ہال میں وسیع پیمانہ پر ایک کانفرنس ہوئی۔ حاضرین میں پونہ کے ہر طبقہ کے ممتاز افراد شریک ہوئے۔ میرے علاوہ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند کی تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے بعد سوال وجواب ہوا۔ پریس کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ چنانچہ اگلے دن انگریزی، مراٹھی، ہندی، کے تمام اخباروں میں مفصل رپورٹیں شائع ہوئیں۔

شام کو ۵ بجے سندھیوں کے بڑے گرو دادا واسوانی سے ان کے آشرم پر ملاقات ہوئی۔ وہ تواضع اور شرافت اور انکسار کی سراپا تصویر تھے۔ انھوں نے مسجد کو گرا کر وہاں مندر بنانے پر بہت دکھ کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا:

They are killing the spirit of India.

انھوں نے کہا کہ اگر اجودھیا میں رام مندر بنتا ہے تو اس کے ساتھ وہیں ایک مسجد بھی بننا چاہئے۔ اور اگر ایسا ہوا تو میں خود وہاں جاکر اذان دوں گا اور وہاں نماز پڑھونگا۔

مغرب کی نماز پونہ میں پڑھ کر بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک چھوٹے بازار میں کچھ کام کے لئے رکے۔ دکاندار نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہم نے آپ لوگوں کو ٹی وی پر دیکھا ہے۔ ٹی وی کسی شخصیت کی توسیع ہے۔ وہ اس عقیدہ کو قابل فہم بناتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ رات کو ساڑھے دس بجے ہم لوگ بمبئی پہنچے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳

فجر کی نماز بمبئی میں جوہو اسکیم میں پڑھی۔ صبح کا کچھ وقت یہاں گزرا۔ اس کے بعد ہمیں میرے ٹاورس پہنچنا تھا۔ ہمارا قافلہ تین کاروں میں روانہ ہوا۔ میں مسٹر افضل الاانہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے نئے تھے۔ وہ الکٹرانک سنٹر چلاتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے نئی ماروتی کار خریدی ہے۔ اس پر وہ مجھ کو لے کر روانہ ہوئے۔

لمبے راستہ میں ایک گھنٹہ تک زیادہ تر وہی بولتے رہے۔ ان کی گفتگو تمام کی تمام اس پر تھی کہ آج مسلم نوجوانوں میں زبردست فرسٹریشن ہے۔ یہ فرسٹریشن لڑائی جھگڑے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے موجودہ حالات کی ذمہ داری سب سے زیادہ ملکی تعصب پر ڈالی۔

ان کے ذاتی حالات معلوم کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ بمبئی آئے تو انھوں نے ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کی " پگار " پر کام کرنا شروع کیا۔ عام رواج کے خلاف، انھوں نے کبھی سیٹھ سے تنخواہ اور الاؤنس بڑھانے کی بات نہیں کی۔ وہ بس اپنے کام میں محنت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کو کافی تجربہ ہو گیا۔ اب وہ الکٹرانکس میں اپنا ذاتی کاروبار کرتے ہیں اور بمبئی میں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

آخر میں میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی عملی زندگی الگ ہے، اور آپ کی سوچ الگ۔ آپ نے اپنی زندگی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بلاشبہ کامیابی کا طریقہ تھا۔ مگر یہ طریقہ آپ کی سوچ میں شامل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی زبان سے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ انڈیا میں مسلم نوجوانوں کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ حالاں کہ عین اسی وقت آپ اسی انڈیا میں مکمل کامیابی حاصل کئے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ہی جیسا معاملہ آجکل اکثر مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذات کی سطح پر محنت کر کے کامیاب زندگی حاصل کی ہے۔ مگر جب وہ بولتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کا تجربہ بیان نہیں کرتے۔ بلکہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر شکایت اور مایوسی کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ اگر صرف یہ کریں کہ وہ خود اپنا تجربہ لوگوں کے سامنے بیان کریں تو

ملت کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے۔

۱۰۰۰ ق م میں بمبئی صرف مچھیروں کی ایک معمولی بستی تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ اشوک کی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس کے بعد وہ مختلف راجاؤں کے ماتحت رہا۔ ۱۲۹۴ میں وہ خلجی خاندان کے قبضہ میں آیا۔ ۱۵۰۷ میں یہاں سمندر کے راستہ سے پرتگالی داخل ہوئے۔ ۱۶۶۱ میں جزیرہ بمبئی انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ایک عرصہ تک وہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام رہا۔ ۱۸۵۷ میں پہلی سوتی مل یہاں قائم ہوئی۔

بمبئی میں میں "جوہو اسکیم" کے علاقہ میں ٹھہرا تھا۔ یہاں ہندوؤں کا اوپر کا طبقہ اور کچھ اعلیٰ طبقہ کے مسلمان رہتے ہیں۔ مختصر قیام کے دوران یہاں اس طبقہ کے لائف اسٹائل کو دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اس اختلاط کے دوران یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہندو۔ مسلم اشوز کو اگر محدود دائرہ میں رکھا جائے، ان کو قومی پرسٹیج کی حد تک نہ پہنچنے دیا جائے تو ہندوؤں کا اوپر کا طبقہ ان معاملات میں غیر جانب دار رہے گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کے اوپر کے طبقہ کا وزن اس قسم کی تحریکوں کو نہ ملے تو اس کی واحد یقینی تدبیر یہ ہے کہ ان کو قومی پرسٹیج کی حد تک جانے سے روکا جائے۔

مثلاً اجودھیا کے مسئلہ کو اگر اجودھیا تک محدود رکھا جاتا، شاہ بانو بیگم کے معاملہ میں ملکی اندولن نہ چلایا جاتا تو فرقہ پرست یا تشدد پسند عناصر کو اوپر کے طبقہ کے ہندوؤں کا تعاون ہرگز نہ ملتا۔

بمبئی میں مسٹر ایس آر سنگھوی (Tel. 750866, 750625) سے ملاقات ہوئی۔ وہ کلکتہ میں رہتے ہیں اور اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ کلکتہ کا پروگرام بنائیے۔ ہم اس میں پورا تعاون دیں گے۔

انھوں نے بتایا کہ ان کی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ یہاں کالج میں مسلم لڑکے بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا تھا۔ کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے بھائی کی طرح ملتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ہندو و مسلم ذہن کے ساتھ نہیں سوچتا تھا۔ مگر ۵-۶ سال میں بہت زیادہ فرق آگیا۔ ایک دوسرے کے درمیان بہت دوری

ورع ہوئی۔ ان تحریکوں نے سارے ماحول میں زہر گھول دیا۔

گویا کہ موجودہ فرقہ وارانہ منافرت نہ مسلم دورِ حکومت کی دین ہے اور نہ ملک کے بٹوارہ کا نتیجہ۔ وہ قریب کی بعض تحریکوں کا نتیجہ ہے جو نہایت غیر دانش مندانہ انداز میں چلائی گئیں۔ فرقہ پرست ہندو اگر ماضی کی بعض باتوں کو آج دہرا رہے ہیں تو اس کی حیثیت حقیقۃً نکتۃ الوقوع کی ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد مسٹر خوراکی والا (شریف بمبئی) نے پلنج پر شہر کے کچھ خاص لوگوں کو بلایا تھا۔ ان موجودہ حالات پر لوگوں سے گفت گو ہوئی۔ مسٹر خوراکی والا نے گفت گو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ملک جدھر جا رہا ہے اس پر سب کو دکھ ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ ذاتی مفاد اور پارٹی پالی ٹکس سے اوپر اٹھ کر دیش کے مفاد کو سپریم بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ قومی مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں۔

آج دن میں شہر کی کئی ممتاز شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ ہر ایک نے "تین نکاتی فارمولا" سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کو ملک میں امن کے قیام کا ذریعہ بتایا۔

شام کو ۵ بجے جم خانہ کلب کے ہال میں عمومی اجتماع ہوا۔ تمام سیٹیں پوری طرح بھری ہوئی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، ہندو اور مسلم دونوں بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ مقررین میں میرے علاوہ ماریہ سوشیل کمار، سوامی چیدانند، نانی پالکھی والا، کارڈینال سائمن پینٹا، لوبالوپ زنگ اور ایف خوراکی والا تھے۔

مسٹر سعید نقوی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میں فیض آباد کا رہنے والا ہوں جو اجودھیا کے پڑوس میں ہے۔ مگر ۱۹۸۶ کے ایجی ٹیشن سے پہلے تک میرے والدین کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بابری مسجد کہاں ہے۔ یہ صرف تحریکوں کی دھوم تھی جس نے لوگوں کو اس سے باخبر کیا۔

پالکھی والا نے اپنی تقریر میں کہا انڈیا میں اس وقت آپس کے جو جھگڑے ہیں وہ شرمناک حد تک بے معنی ہیں۔ ہم کو اگر ترقی کرنا ہے تو ہمیں ان آپسی جھگڑوں کو ختم کرنا ہوگا۔ انھوں نے

اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی : یا تو بھائیوں کی طرح زندگی گزاریئے یا جانوروں کی طرح مرجائیے :

Live as brother or die as animals.

میں نے اپنی تقریر میں تین نکاتی فارمولے کی تشریح کی۔ آخر میں اچاریہ سوشیل کمار مائک پر آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں میں سے جن لوگوں کو فارمولے سے اتفاق ہے وہ ہاتھ اٹھائیں۔ اچانک کچھ مسلمان اٹھ کر شور کرنے لگے۔ ان کے شور میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف یہ سنائی دیا کہ : ہم مولانا کے فارمولے کو نہیں مانتے۔

اس کے بعد سوامی چیدانند اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں میری حمایت کی۔ اس سے لوگ ٹھنڈے ہوئے۔ اس کے بعد نانی پالکھی والا آئے۔ انھوں نے شاندار انگریزی تقریر میں میری زبردست حمایت کی۔ ان کی تقریر نہایت علمی اور نہایت موثر تھی۔ اس کے بعد مجمع بالکل خاموش ہوگیا۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳ کو بمبئی کے مذکورہ جلسہ میں جس مسلمان بزرگ نے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کیا، وہ مولانا ضیاء الدین بخاری تھے۔ موصوف ابتداءً ایک " معمولی اور گم نام ٹیچر تھے۔ اس کے بعد وہ بمبئی کی مسلم سیاست کے میدان میں آئے۔ اپنی جوشیلی تقریروں کے ذریعہ انھوں نے مقامی مسلم حلقوں میں کافی شہرت حاصل کی۔ وہ " بیباک مسلم لیڈر" کے روپ میں ابھرے۔ اور ایک صحافی کے الفاظ میں، بمبئی کے مسلمانوں کی مزاحمتی سیاست کی علامت بن گئے۔ (ہندستان، بمبئی، ۲۱-۲۲ اپریل ۱۹۹۳)

۲۰ فروری کے جلسہ میں انھوں نے اتنا شور کیا کہ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ دو ماہ بعد ۲۱ اپریل ۱۹۹۳ کو یہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ بمبئی کے علاقہ بائی کلہ کی فائن پیلس بلڈنگ میں واقع ان کے دفتر میں چار مسلح لوگ داخل ہوئے اور ریوالور سے مسلسل فائر کرکے ان کو ہلاک کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بمبئی کے سفر پر روانگی سے پہلے بمبئی سے کئی ٹیلیفون آئے تھے کہ آپ بمبئی نہ آئیں۔ یہاں کچھ افراد آپ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ آپ کے خلاف کچھ بھی حرکت کر سکتے ہیں۔ تاہم میں اللہ کے بھروسے پر بمبئی گیا۔ جس وقت ہال میں کچھ مسلمان ہنگامہ کر رہے تھے اور میں اسٹیج پر

س بیٹھا ہوا تھا، ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ کسی بھی طرف سے گولی آسکتی ہے اور یہیں میرا خاتمہ ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ میرے دل میں اس وقت ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی کا پردہ اس کے ذمہ داروں نے کھینچ دیا۔ اس کے بعد دو پولیس افسر میرے دائیں اور بائیں ۔وہ باہر گاڑی میں سوار ہونے تک مسلسل میرے ساتھ رہے۔

۲۰ فروری کی شام کو میں مسٹر افضل الانہ کی گاڑی میں ایئرپورٹ جانے کے لئے بیٹھا۔ عین وقت دو ہندو نوجوان گاڑی میں داخل ہوئے اور میرے دائیں اور بائیں بیٹھ گئے۔ یہ دونوں ے لئے نئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی حفاظت کے لئے یہاں بیٹھے ہیں۔ ایک نوجوان ہا: مولانا جی، یدی کوئی آپ پر گولی چلاتا ہے تو وہ گولی پہلے ہمارے سینہ کو چھیدے گی۔ اس بعد ہی وہ آپ تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ لوگ ایئرپورٹ کے دروازہ تک میرے ساتھ رہے

شام کو فلائٹ نمبر ۱۸۳ کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ کسی قدر لیٹ ہو کر زنے ۹ بجے بمبئی سے پرواز شروع کی۔ راستہ میں چند اخبار ہندی اور انگریزی کے دیکھے ری اخبار سندھیہ ٹائمس (۲۰ فروری ۱۹۹۳) میں ایک تفریحی کالم ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہے ٹ پٹے سوال، چٹ پٹے جواب۔ اس کے دو سوال وجواب اس طرح تھے:

ال: جب دنیا کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت راستہ کون دکھاتا ہے۔

اب: ہمت۔

ال: یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر ایک مہاشے کو شکایت ہے کہ گذ پانچ ورشوں کی کڑی محنت کے بعد بھی پھل کڑوا ہی ملا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔

اب: پانچ سال میں محنت سے کریلے ہی بوئے ہوں گے۔

ا فروری ۱۹۹۳ کی رات کو میں دہلی واپس پہنچا۔ تاخیر کا سبب یہ تھا کہ جہاز غیر معمولی طور پر کئی گھ یٹ ہو گیا۔ مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ مجھے اس کی اطلاع بمبئی میں پہ طور پر مل گئی تھی اور میں نے اس وقت کو بمبئی میں استعمال کر لیا تھا۔

125 5-83
11.95

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

30/- A-14 متفرق سورتیں ۱
30/- A-15 متفرق سورتیں ۲
30/- A-16 متفرق سورتیں ۳

ویڈیو کیسٹ

200/- V-1 پیغمبر انقلاب
200/- V-2 اسلام دائی امن
– V-3 اسلام دور جدید کا خالق
– V-4 امت مسلمہ اور جدید چیلنج
– V-5 اسلام اور سماجی انصاف
– V-6 اسلام اور دور حاضر

God Arises Rs 85/-
Muhammad 85/-
The Prophet of Revolution
Islam As It is 40/-
God Oriented Life 60/-
Words of the Prophet –
Indian Muslims (Hb) 145/-
Indian Muslims (Pb) 55/-
Introducing Islam –
Religion and Science 30/-
Tabligh Movement 20/-
Islam the Voice of Human Nature
Islam the Creator of Modern Age
The Way of Find God 6/-
The Teachings of Islam 7/-
The Good Life 7/-
The Garden of Paradise 7/-
The Fire of Hell 7/-
Man Know Thyself! 4/-
Muhammad The Ideal Character 6/-
Polygamy and Islam 3/-
Words of Wisdom –

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

1982 سال 100/-
1985 100/-
1986 100/-
1987 100/-
1988 100/-
1989 100/-
1990 100/-
1991 100/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)
1984 تا 1990 فی جلد 100/-
فائل الرسالہ ہندی (مجلد)
1990-91 100/-

روشن مستقبل 7/-
صوم رمضان 7/-
علم کلام 7/-
صداقت اسلام –
علماء اور دور جدید 8/-
ہندستانی مسلمان 7/-
سیرت رسولؐ –
ہندستان آزادی کے بعد 3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے 8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ 7/-
اسلام کا تعارف 4/-

ہندی

سچائی کی تلاش 2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان 6/-
پیغمبر اسلام 3/-
عربی 3/-
الاسلام یتحدی 85/-
الاسلام والعصر الحدیث –

منزل کی اور 10/-
آڈیو کیسٹ 7/-

25/- A-1 حقیقت ایمان 5/-
25/- A-2 حقیقت نماز 7/-
25/- A-3 حقیقت روزہ 7/-
25/- A-4 حقیقت زکوٰۃ 7/-
25/- A-5 حقیقت حج 10/-
25/- A-6 سنت رسولؐ 5/-
25/- A-7 میدان عمل 7/-
25/- A-8 پیغمبرانہ رہنمائی 7/-
25/- A-9 اسلامی دعوت 7/-
کمیونزم 7/-
25/- A-10 اسلامی اخلاق 10/-
25/- A-11 اتحاد ملت 7/-
25/- A-12 تعمیر ملت –
25/- A-13 نصیحت لقمان 3/-

– 5/- 20/- 20/- 30/- – 8/- 5/- 7/- 6/- 7/- 5/- 5/- 5/- 5/- 7/- 7/- 7/- 7/- 10/- 7/- 5/- 7/- 10/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, NIZAMUDDIN WEST MARKET, NEW DELHI-110 013